ترجمے

افضال احمد سید — فہمیدہ ریاض

رفیق احمد نقش — عطا صدیقی — مبین مرزا

ذیشان ساحل — اجمل کمال

کراچی کی کہانی (۱)

شمارہ ۲۰ — خزاں — ۱۹۹۵

ترتیب: اجمل کمال

شمارہ ۲۰ . حزاں ۱۹۹۵
اکتوبر ۔ دسمبر ۱۹۹۵

مینیجنگ ایڈیٹر
زینت حسام

اہتمام
آج کی کتابیں
ای ۱۴۰ ، سیکٹر ۱۱ ای ، نارتھ کراچی ٹاؤن شپ ، کراچی ۷۵۸۵۰

طباعت
ایجوکیشنل پریس
پاکستان چوک ، کراچی

رابطے کے لیے پتا
اے ۱۶ ، سفاری ہائٹس ، بلاک ۱۵ ، گلستانِ جوہر ، کراچی ۷۵۲۹۰
فون ۸۱۱۳۴۷۴
ای میل aaj@biruni erum com pk

بیرونِ ملک خریداری کے لیے پتا
محمد عمر میمن
۵۴۱۷ ، ریجنٹ اسٹریٹ ، میڈیسن ، وسکانسن ۵۳۷۰۵ ، یو ایس اے

انتساب

جمشید نسروانجی کے نام

اظہارِ تشکر

"کراچی کی کہانی" کو ترتیب دینے کے عمل میں بہت سے بزرگوں اور دوستوں کا پُرخلوص تعاون میسر رہا جس کے بغیر اس کام کی تکمیل ممکن نہ تھی۔ ان کرم فرماؤں کے نام اظہارِ تشکر کے طور پر درج کیے جا رہے ہیں

ضمیر نیازی، محترمہ شیریں فیروز ناما، ڈاکٹر غلام علی الانا (ڈائرکٹر، انسٹیٹیوٹ آف سندھالوجی)، علی احمد بروہی، عارف حسن، ولی رام ولبھ، محترمہ اینا غلام علی، آصف فرخی، رفیق احمد نقش، عرفان احمد خان، ایس اکبر زیدی، ڈاکٹر سید جعفر احمد، طاہر مسعود، ڈاکٹر مبارک علی، زاہد ڈار، تسنیم صدیقی، گل محمد مغل (لائبریرین، انسٹیٹیوٹ آف سندھالوجی)، کیتھ فرنانڈیز (آرٹس ریسورس سنٹر)، محمد حنیف، آسیہ صادق، سعید قادری، ڈاکٹر مشرف احمد، عبدالرحیم آزاد، ڈاکٹر یونس حسنی، پروفیسر سحر انصاری، ایس ایم شاہد، معین مرزا، اسرار رانا، محمد یونس، حسن مجتبیٰ، نفیسہ شاہ، ہدایت علی قمر، شاہ محمد پیرزادہ، رضوان الحق قریشی، کرن سنگھ، اویس توحید، عدنان فاروقی۔

کراچی کی کہانی (۱)

عارف حسن

۳۷۹

کراچی شہر ــــ تغیرات کی زد میں

***

نقشے

Understanding the city implies loving the city and vice versa, we love what we understand and fear what we do not New arrivals - and even long-time inhabitants - have difficulty relating emotionally to today's city, but not for want of good will What can they offer their feelings to? Something that has so ceased to be a city they cannot even see it clearly, perceive it as it should be perceived, identify it as such? Something they find harder and harder to "recreate" in their minds?

The idea that the city as such and each city in and of itself represents a complex metaphorical system deeply embedded in the consciousness of civilized humanity leads us to the inevitable question of whether we understand or are even dimly aware of the irreparable losses the disappearance of the city would entail If the city is an unsurpassed storehouse of memories, one that far outstrips the memory of a nation, race or language (we residents of Belgrade bear within us active "memories" - be they ever so minute - of Celtic, Magyar and Turkish Belgrade, and rightly accept them as our own), what will be the consequences of its dispersion, the dispersion of so priceless a deposit of "anthropological memory"? Will it not sweep away an important aspect perhaps the finest aspect of human existence?

There is a saying, a wise saying, that goes, "The contract builds the house" But every contract needs a common language To establish what it is we want and to have something to refer to when decisions need to be made, we must more or less agree on the values, the pluses (and the minuses, for that matter) of the city, we must share a set of images, a conceptual framework
To that end I propose, as the only viable approach at this point, that we reteach people - every man, woman and child - the lost art of "reading the city" For unless we can read our cities, we shall never proceed to the next stage the art of writing the city The latter was long a great collective art and human right, but it too has been lost The time has come to revive it

Before contemporary urban planners undertake their rescue mission, they must have support for the fateful step from all quarters In other words, the experts must have an unequivocal answer from the public to an unequivocal question Do we or do we not wish to save the city?

Bogdan Bogdanovic, "The City and Death "

تعارف

جون ۱۹۹۴ میں "آج" کے شمارہ ۱۷ ـــــ سرائیوو سرائیوو ـــــ کو بوسنیا کی صورتِ حال کے مطالعے کے لیے مخصوص کیا گیا تھا۔ اس شمارے کا ایک نہایت اہم مضمون "شہر اور موت" بلغراد شہر سے تعلق رکھنے والے ماہرِ تعمیر بوگدان بوگدانووچ (Bogdan Bogdanovic) کا تحریر کردہ تھا۔ بوگدانووچ کا کہنا ہے "کسی شہر سے محبت کرنے کے لیے اسے سمجھنا ضروری ہے۔"

"کراچی کی کہانی" کراچی شہر کی حقیقت کو سمجھنے کی ایک کوشش ہے، کیوں کہ کسی شہر کی حقیقت کو جانے بغیر اس کو درپیش مسائل کا احاطہ کرنا اور ان کا کوئی ممکنہ حل دریافت کرنا ممکن نہیں۔ یہ کہانی بہت سے راویوں کی زبانی بیان کی گئی ہے ـــــ کسی شہر کی کہانی کوئی ایک شخص کیوں کر بیان کر سکتا ہے؟ ان میں سے ہر راوی اس شہر کے بارے میں اپنا ذاتی تصور اور تجربہ رکھتا ہے، جو تعجب کی بات نہیں کیوں کہ شہر کی تصویر انھیں انفرادی تصورات اور تجربات سے مل کر بنتی ہے۔

کراچی دس برس سے زائد عرصے سے اندوہ ناک تشدد کا شکار ہے۔ اس تشدد کے اسباب اور اس سے نجات کے طریقے سب سے لوگ بیان کرتے ہیں، ان میں سے ہر شخص کی بنائی ہوئی تصویر کی بنیاد اس شہر کے بارے میں اس کے ذاتی تصور پر ہے۔ شہر کی صورتِ حال کی یہ تصویریں ایک دوسرے سے اس درجہ مختلف ـــــ بعض اوقات متضاد ـــــ ہیں کہ ان میں سے کسی ایک پر انحصار کر کے کراچی کے حالات کو سمجھنا ممکن نہیں رہا۔ کراچی میں کیا ہو رہا ہے؟ اس سوال کا جواب پانے کے لیے ہم نے اس نقطے سے آغاز کرنے کا فیصلہ کیا کہ یہ شہر کیا ہے اور یہاں اس سے پہلے کیا کچھ ہوتا رہا ہے۔

یہ بات بہت اہمیت رکھتی ہے، کیوں کہ کراچی شہر کے ماضی کے بارے میں کوئی ایسا مشترک تصور موجود نہیں ہے جیسا مثال کے طور پر لاہور یا دلی کے بارے میں پایا جاتا ہے، اور اس مشترک تصور کی غیرموجودگی میں مختلف نقطہ نظر رکھنے والے لوگ ایک دوسرے سے کوئی بامعنی یا مثبت مکالمہ کرنے سے قاصر ہیں۔ ہمارے ہاں کئی انتہاپسندانہ سیاسی موقف رائج ہیں، ان میں سے ہر ایک کراچی کو بیان کرنے کے لیے اس کے ماضی کے کسی نہ کسی دور ـــــ اور نتیجتاً حال کے کسی نہ کسی پہلو ـــــ کو اپنی بنائی ہوئی تصویر سے خارج رکھتا ہے۔ ایک موقف، جسے کراچی میں خاصی مقبولیت حاصل ہے، شہر کی تاریخ کو ۱۹۴۷ سے شروع کرتا ہے اور اس سے پہلے کے کراچی کو اہمیت دینے یا جاننے کی کوشش کرنے سے یکسر انکاری ہے۔ اس موقف کے ماننے والوں کے خیال میں موجودہ کراچی شہر کو بنانے والے وہ لوگ ہیں جو پاکستان کے قیام کے بعد ہجرت کر کے یہاں آباد ہوئے، اور وہ اس "خالص مہاجر" شہر پر دوسری برادریوں سے زیادہ حق رکھتے ہیں۔ دوسری طرف وہ موقف ہے جسے دیہی سندھ کے باشندوں میں مقبولیت حاصل ہے جو کراچی کو "خالص سندھی" شہر کہتے ہیں، ۱۹۴۷ کے بعد اس شہر میں آنے والی تبدیلیوں کو تسلیم نہیں کرتے، یہاں رہنے والے بیشتر باشندوں کو غیرقانونی پناہ گزین قرار دیتے ہیں اور انھیں یہاں سے نکال دینا ضروری ـــــ اور ممکن ـــــ سمجھتے ہیں۔

"کراچی کی کہانی" کے مختلف راویوں کے بیانات سے شہر کا جو مجموعی تصور ابھرتا ہے اس کی رو سے یہ

دونوں موقف غیر معقول اور غیر حقیقت پسندانہ ہیں۔ کراچی کی تاریخ ۱۹۴۷ سے شروع نہیں ہوتی، اور نہ ۱۹۴۷ میں ختم ہو جاتی ہے۔ اس تاریخ کو ۱۹۸۱ پر بھی نہیں روکا جا سکتا جب یہ مہاجر اکثریت کا شہر تھا۔ کراچی کی دور اور قریب کی تاریخ کی یہ ادھوری تصویریں کراچی کے حالات کو اپنی مرضی کے رنگ میں دیکھنے کی کوششیں ہیں۔ یہ دونوں موقف تعصب اور تشدد کو ہوا دینے کے سوا کچھ حاصل نہیں کر سکے، اور نہ کچھ حاصل کر سکیں گے، کیوں کہ ان کا مشترک نقص یہ ہے کہ یہ صورتِ حال کو نسلی عصبیت کی اصطلاحات میں بیان کرنا چاہتے ہیں جب کہ حقائق پر مبنی تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عنصر شہر اور صوبے کو درپیش مسائل میں بنیادی اہمیت نہیں رکھتا ۔ اگرچہ تعصب سے پیدا ہونے والا اندازِ فکر حالات کو سمجھنے میں بہت بڑی رکاوٹ یقیناً پیدا کرتا ہے۔ یہ یقین کرنے کا خاصا جواز موجود ہے کہ دونوں طرف کے نسل پرست سیاست دانوں کی طرف سے نسلی اختلاف پر زور دینے کا مقصد یہی ہے کہ اس شہر اور صوبے کے اصل مسائل کی پردہ پوشی کی جا سکے۔

کسی صورتِ حال کے تجزیے کا حقائق پر مبنی ہونا ضروری ہے، کیوں کہ تعصب کا علاج رومانیت یا جذباتیت سے نہیں بلکہ حقیقت کو جاننے کی کوشش ہی سے ممکن ہے۔ معروف برطانوی اخبار نویس اسکوبی مارسیٹ نے کہا تھا "ہمیں اپنی رائے رکھنے کی آزادی حاصل ہے، لیکن اپنی رائے کو حقائق کی بنیاد پر قائم کرنے کی نہیں۔" مارسیٹ نے یہ بات برطانوی معاشرے کے بارے میں کہی تھی اور اس کا سیاق و سباق یہ تھا کہ وہاں کی حکومت عوام کو تنقید کرنے کی آزادی تو دیتی ہے لیکن ایسی سرکاری اطلاعات کو اُن کی رسائی سے باہر رکھتی ہے جن کی مدد سے وہ اس تنقید کو ثابت کر سکیں۔ اس محدود سیاق و سباق سے قطعِ نظر، یہ بات پاکستانی معاشرے پر کہیں زیادہ مکمل طور پر صادق آتی ہے، اور یہاں حکومت کے علاوہ اَور بھی بہت سی چیزیں اپنی رائے کو حقائق کی بنیاد پر استوار کرنے کی راہ میں حائل ہیں۔

سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ لوگ زمین پر موجود حقائق کو اپنی ذاتی یا گروہی خواہشات کا تابع دیکھنا چاہتے ہیں، اور اسے ناممکن پا کر اپنے رویے میں جھنجھلاہٹ پیدا کر لیتے ہیں۔ یہ رویہ ظاہر ہے کہ حقائق کو تبدیل کرنے سے تو قاصر رہتا ہے، البتہ نقطۂ نظر کو ادھورا، غیر معقول اور غیر حقیقت پسندانہ بنا دیتا ہے۔ اس کے نتائج، جیسا کہ ہم اس شہر، اس صوبے اور اس ملک میں دیکھ رہے ہیں، اکثر اوقات نہایت مضحکہ خیز اور المناک ہوتے ہیں۔ مثلاً اس وقت کراچی کے بارے میں یہ بنیادی بات حتمی طور پر جاننا ممکن نہیں کہ اس شہر کی آبادی کتنی ہے اور اس میں مختلف گروہوں کی تعداد کا تناسب کیا ہے؛ وجہ یہ ہے کہ ملک میں مردم شماری، جسے ۱۹۹۱ میں ہونا تھا، اب تک نہیں کرائی گئی ہے۔ اس سے قطعِ نظر کہ مردم شماری کے قابلِ اعتبار نتائج کی غیر موجودگی میں ہوش مندانہ سرکاری منصوبے یا پالیسیاں وضع کرنا ناممکن ہے، یہ صورت متعصب سیاست دانوں کے مقصد کے لیے بہت موزوں ہے کیوں کہ اس طرح وہ اپنے مخصوص موقف کے حق میں کوئی بھی دعویٰ کر سکتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا مطالبہ ہے کہ مردم شماری کرائی جائے لیکن ساتھ ہی ہر ایک کا یہ بھی کہنا ہے کہ اگر اس کے نتائج اس کی مرضی کے مطابق نہ ہوئے تو وہ انھیں تسلیم نہیں کرے گا۔ اس خطرناک تعطل کا فائدہ براہِ راست ملک کے حکمراں طبقوں کو پہنچ رہا ہے جو اقتدار میں آنے والی ہر قسم کی حکومت پر مکمل اختیار رکھتے ہیں اور ملک کے سیاسی اور اقتصادی نظام میں کوئی مثبت تبدیلی کرنے کے روادار نہیں۔

تاہم، اس حقیقت کا اندازہ لگانا اب تک دستیاب اعداد و شمار کی روشنی میں بھی ممکن ہے کہ پاکستانی

معاشرے میں گہری تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں جو پوری دنیا میں تاریخ کے سفر سے ہم آہنگ ہیں۔ لیکن، جیسا کہ اس شمارے کے اہم ترین تجزیہ نگار عارف حسن نے اپنے مضمون "کراچی کی صورتِ حال — تناظر اور تجزیہ" میں بتایا ہے، حکومتوں اور سیاسی پارٹیوں کا رویہ ان تبدیلیوں کو تسلیم کرنے اور ملک کے سیاسی اور اقتصادی نظام کا حصہ بنانے کے حق میں نہیں بلکہ ان کی راہ روکنے کے حق میں رہا ہے۔ اس رویے سے انتشار اور تشدد بھی جنم لے سکتا ہے جس کا مشاہدہ آج کل کراچی میں کیا جا رہا ہے۔ اس تجزیے کی رو سے ایسی کسی خوش فہمی کی گنجائش نہیں نکلتی کہ یہ صورتِ حال کراچی تک محدود رہے گی۔

کراچی کی صورتِ حال کے بارے میں اس اہم تجزیے کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ شہر کی کہانی کے مختلف ادوار کا ترتیب وار مطالعہ کیا جائے۔ یہ کہانی نہ صرف دلچسپ ہے بلکہ شہر کو درپیش معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی مسائل کا پس منظر جاننے کے لیے بہت کارآمد بھی ہے۔ ہمیں ہرگز یہ دعویٰ نہیں کہ آئندہ صفحات میں پیش کی گئی یہ کہانی اپنی تفصیلات میں کسی بھی طرح مکمل ہے، لیکن اس انتخاب کے مشمولات طے کرتے ہوئے یہ کوشش ضرور کی گئی ہے کہ ابتدا سے اب تک شہر کی زندگی میں آنے والی بڑی بڑی تبدیلیوں کا ایک خاکہ مرتب ہو جائے جو مستقبل میں شہر کے کسی زیادہ تفصیلی مطالعے کی بنیاد بن سکے۔

کہانی کی ابتدا سیٹھ ناؤں مل ہوت چند کی یادداشتوں سے ہوتی ہے جن میں موجودہ کراچی شہر کے بسائے جانے سے برطانوی قبضے میں آنے تک کا احوال ملتا ہے۔ اس کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کے ریلوے انجینئر جان برنٹن کی یادداشتیں پیش کی گئی ہیں۔ برنٹن نے کراچی میں ۱۸۵۷ کے واقعات اور شہر کو ریلوے لائن کے ذریعے سندھ اور پنجاب سے منسلک کرنے کے اہم اقدام کی کچھ تفصیلات بیان کی ہیں۔ اس اقدام کے نتیجے میں کراچی نے زرعی اجناس کی برآمد کی نہایت اہم بندرگاہ کی حیثیت حاصل کی اور شہر کا کاسموپولیٹن کردار متعین ہوا۔ انگریزوں کے قبضے کے چند عشروں بعد، برصغیر کے دوسرے خطوں کی طرح، سندھ کے معاشرے میں مغربی تعلیم کے زیرِ اثر سماجی اور سیاسی بیداری پھیلنی شروع ہوئی۔ اس دور کی مجموعی تصویر کیول رام رتن مل ملکانی کی کتاب کے اقتباسات کو ترتیب دے کر بنائی گئی ہے۔ تاریخی عوامل کا نتیجہ تھا کہ بیداری کی اس تحریک میں سندھ کے ہندوؤں نے مسلمانوں سے بڑھ کر حصہ لیا، چنانچہ مقامی تعلیم یافتہ درمیانہ طبقے میں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ اس حقیقت سے صوبے اور شہر میں ہندو مسلم کشیدگی میں اضافہ ہوا، گو یہ کشیدگی کسی حد تک انگریزوں کی آمد سے پہلے کے زمانے میں بھی موجود رہی تھی۔ پیر علی محمد راشدی نے سندھی مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے کراچی شہر اور اس کی بعض شخصیات کا بےحد دلچسپ احوال بیان کیا ہے اور ۱۹۴۷ سے پہلے کے سیاسی حالات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس کے بعد پیش کیے جانے والے تین مضامین کراچی شہر کی زندگی کے مختلف ادوار کے بارے میں گلیدہر ناتھ گپتا، لوک رام ڈوڈیجا اور سہراب کٹرک کی ذاتی یادداشتوں پر مشتمل ہیں۔ کٹرک کا مضمون برطانوی عہد کے کراچی کی تصویر پیش کرتا ہے اور اس شہر کی زندگی میں پارسیوں کے نمایاں حصے کی بھی نشاندہی کرتا ہے۔ ڈاکٹر فیروز احمد نے افریقی نسل سے تعلق رکھنے والے ان باشندوں کی کہانی بیان کی ہے جو کراچی کے قدیم علاقے لیاری کے شہری ہیں۔ کراچی شہر کا روایتی مذہبی، لسانی اور نسلی تنوع صرف مذکورہ بالا برادریوں تک محدود نہیں، ہمیں احساس ہے کہ ایسی متعدد برادریوں — مثلاً گوا سے تعلق رکھنے والے رومن

کیتھولک مسیحیوں، گجرات سے آنے والے بوہرہ اور آغاخانی باشندوں وغیرہ ــــ کے بارے میں مضامین ہماری محدودات کے باعث موجودہ انتخاب میں شامل نہیں کیے جا سکے، لیکن اس سے شہر کی زندگی میں ان باشندوں کے فعال کردار کی اہمیت کو کم کرنا مقصود نہیں۔

ان تحریروں کے بعد آنے والا مضمون، جو گوپال داس کھوسلا کا تحریر کردہ ہے، سندھ کی ہندو مسلم سیاست کا جائزہ لیتا ہے اور ان حالات کی تصویر پیش کرتا ہے جن کے زیرِ اثر سندھ کی ہندو برادری کی اکثریت کو نقل مکانی پر مجبور ہونا پڑا۔ اس کے بعد سندھی زبان کے تین ممتاز ادیبوں ــــ موہن کلپنا، شیخ ایاز اور سوبھو گیان چندانی ــــ کی یادداشتوں کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ ان ادیبوں نے شہر کی زندگی کو اپنے اپنے زاویۂ نظر سے دیکھا ہے اور اپنے تجربات بیان کیے ہیں جو کراچی کی کہانی کا حصہ ہیں۔

اس کہانی کا اگلا، اور نہایت اہم، حصہ جمشید نسروانجی کی شخصیت اور کراچی شہر کے لیے ان کی خدمات کے موضوع پر لکھے گئے چار مضامین پر مشتمل ہے۔ ہمارے نقطۂ نظر سے نسروانجی کی شخصیت کا مطالعہ اس شہر کے حقیقی کردار سے واقف ہونے کے لیے لازمی ہے۔ نسروانجی بلاشبہ اس شہر سے تعلق رکھنے والی عظیم ترین شخصیت تھے، اور دو جلدوں پر مشتمل اس انتخاب کو ان کے نام سے منسوب کرنا کسی جذباتیت کا نتیجہ نہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ کراچی کے مسائل کو سمجھنے اور ان کا حل دریافت کرنے کی کوئی کوشش شہر اور شہر کے تمام باشندوں سے گہری وابستگی، حقیقتِ حال کو جاننے کی پُرخلوص طلب اور بلاتعصب خدمت کی ان اقدار کو رائج کیے بغیر سر کرکامیاب نہیں ہو سکے گی جو نسروانجی کی شخصیت کا حصہ تھیں۔

نسروانجی کی زندگی کے مطالعے سے چند انتہائی سادہ اصول برآمد ہوتے ہیں (۱) کسی صورتِ حال کو سمجھنے کے لیے اس کے تمام پہلوؤں سے واقف ہونا اور تمام عوامل کو مناسب اہمیت دینا ضروری ہے، خوش فہمی یا غلط فہمی کی بنیاد پر قائم کیا جانے والا کوئی نقطۂ نظر مسائل کو سمجھنے اور ان کا حل نکالنے کے لیے کارآمد نہیں ہو سکتا۔ (۲) تبدیلی کسی معاشرے کی زندگی کی اہم ترین حقیقت ہے، اور تبدیلیوں کو ہونے کے لیے ایسے حالات پیدا کرنے چاہییں کہ انتشار پیدا نہ ہو اور معاشرے کے تمام طبقے اور گروہ ان سے برابر فائدہ اٹھا سکیں۔ (۳) کسی طبقے یا گروہ کو درپیش مسائل کو نظرانداز کرنے یا ان کی حالت کے بارے میں بے حسی کا طرزِ عمل اختیار کرنے سے غیر صحت مند حالات اور تکلیف دہ مسائل پیدا ہوں گے جو آخرکار پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیں گے۔ نسروانجی کمیونسٹ یا سوشلسٹ نہیں تھے، مگر ہم انھیں سندھ کے ہاریوں کی حالت بہتر بنانے کے لیے کوشاں، شہر کے کم آمدنی والے طبقوں کے لیے قابلِ عمل رہائشی اسکیم کی بنیاد ڈالنے میں مصروف اور لیاری کے پس ماندہ مسلمانوں میں تعلیم کے فروغ کے لیے کی جانے والی کوششوں میں حصہ لیتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ ان کا مسلم لیگ یا تحریکِ پاکستان سے بھی، ظاہر ہے، کوئی تعلق نہ تھا، اور قیامِ پاکستان کے بعد کراچی میں آنے والے مہاجروں کی مفلوک الحال اکثریت سے انھیں کوئی نظریاتی یا جذباتی وابستگی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے باوجود، جیسا کہ حسن حبیب اور اے کے بروہی کے مضامین سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے، نسروانجی ان کی حالت پر پریشان اور ان کے مسائل حل کرنے کا قابلِ عمل منصوبہ تجویز کرنے کے لیے بے تاب تھے۔ لیکن اس وقت تک شہر کا انتظام ان کے ہاتھ سے نکل چکا تھا، اور نئے حکمران ــــ جن میں شہر میں وارد ہونے والی موقع پرست مہاجر

قلیت بھی نمایاں طور پر شامل تھی ــــ اس دردمندی، حقیقت پسندی اور انساں دوست بصیرت سے محروم تھے جو شہر اور اس میں بسنے والوں کے مسائل حل کرنے کے لیے لازمی تھی۔ بعد میں آنے والے حکمرانوں نے بھی اس سے بہتر طرزِ عمل پیش نہیں کیا۔

خود غرض اور کوتاہ اندیش سیاست دانوں نے گروہی مفادات پر ایسی پالیسیوں کی بنیاد رکھی جس سے ملک، صوبے اور شہر میں گروہی تقسیم کا عمل تیز ہوتا گیا۔ ۱۹۴۸ میں کراچی کو سندھ سے الگ کر دیا گیا، اس اقدام نے نہ صرف صوبہ سندھ کی ترقی کے عمل کو سخت نقصان پہنچایا بلکہ صوبے میں بسنے والی دو بڑی برادریوں ــــ سندھیوں اور مہاجروں ــــ کو باہمی افہام و تفہیم پیدا کرنے اور ایک دوسرے کے مسائل میں دل چسپی لینے کے نادر موقعے سے محروم کر کے متصادم گروہوں کی شکل دے دی۔ ہمیں یقین ہے کہ ان دونوں برادریوں کے درمیان حقیقی اختلافات ایسے شدید نہیں تھے ــــ اور نہ آج ہیں ــــ جنھیں رفتہ رفتہ دور کرنا انصاف اور روشن خیالی پر مبنی طرزِ عمل اختیار کرنے سے ممکن نہ ہو۔ کراچی ۱۹۴۸ سے ۱۹۷۰ تک کے بائیس برسوں میں سندھ سے الگ رہا اور اس کے ارتقائی عمل کو قریب سے جاننے اور اس میں حصہ لینے کا دیہی سندھ کے باشندوں کو کوئی موقع نہ ملا۔ انوار شیخ اور میر امداد علی کے مضامین بائیس برس کے اس عرصے کے آثار اور اختتام سے تعلق رکھتے ہیں اور ان دونوں موقعوں پر سندھی رائے عامہ کے رجحانات کی عکاسی کرتے ہیں۔ عبدالحمید شیخ کے تحقیقی مقالے کی تلخیص شہر کے دیہی حصے ــــ یعنی کراچی کے گوٹھوں ــــ کا احوال بیان کرتی ہے۔

۱۹۷۰ کے انتخابات کے بعد جب دیہی سندھ کے منتخب نمائندوں کو ــــ جو درحقیقت سندھ کے جاگیردار طبقے کے نمائندے تھے ــــ کراچی کے انتظامی معاملات اور وسائل پر تصرف حاصل ہوا، تب تک نہ صرف شہری اور دیہی سندھ کے درمیان رابطے کی خلیج بہت وسیع ہو چکی تھی بلکہ ملک میں ہونے والی دوررس معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی تبدیلیوں کے نتیجے میں کراچی شہر کی صورت بالکل بدل چکی تھی۔ ملک کے شمالی علاقوں کے باشندے روزگار کی تلاش میں بہت بڑی تعداد میں کراچی آ کر شہر کی آبادی میں شامل ہو رہے تھے۔ کراچی کی آبادی میں ہونے والا اضافہ پورے ملک کے مقابلے میں کہیں زیادہ تیز رفتار سے ہو رہا تھا، اور شہر کے انتظامی ادارے اپنی کمزوری، نااہلی اور بدعنوانی کے باعث اس اضافے کی مناسبت سے شہری سہولتیں فراہم کرنے سے قاصر تھے۔ کراچی ــــ جو ایک وقت میں برصغیر کے خوش انتظام ترین شہروں میں شامل تھا ــــ شدید بدانتظامی کا شکار ہو چکا تھا اور شہر کی منصوبہ بندی اور انتظام پر مفادپرست مافیاؤں اور بدعنوان سرکاری اہلکاروں نے غلبہ حاصل کر لیا تھا۔ ان مافیاؤں اور اہلکاروں میں شہر کے تمام بڑے لسانی اور نسلی گروہوں کے لوگ شامل تھے، اور اس بدانتظامی کا شکار ہونے والے عام شہریوں میں بھی ان تمام گروہوں کے لوگ موجود تھے۔ ۱۹۷۰ کے انتخابات کے بعد پیدا ہونے والی تبدیلیوں کے نتیجے میں شہر کے انتظامی معاملات اور وسائل پر شہری اور دیہی سندھ کے مفادپرست طبقوں کے درمیان کش مکش ہوئی جسے صوبے کے ان دونوں حصوں کے عوام کے درمیان موجود خلیج کا فائدہ اٹھا کر لسانی تنازعے کا رنگ دے دیا گیا۔ تب سے دونوں طرف کے متعصب سیاست داں اس خلیج کو مسلسل وسیع، گہرا اور خطرناک بنانے میں تن دہی سے مصروف ہیں۔

کراچی کی زندگی میں ۱۹۴۷ کے بعد آنے والی تبدیلیوں کی کچھ جھلکیاں اردو کے دو ممتاز ادیبوں ــــ حسن منظر اور اسد محمد خاں ــــ کے مضامین میں ملتی ہیں جو انھوں نے اس انتخاب کے لیے ہماری درخواست پر تحریر

کیے ہیں۔ سویڈش خاتون سگرڈ کاسلے ۱۹۵۰ کی دہائی میں کراچی کی تھیٹر کی تحریک سے وابستہ رہی تھیں، اور انھوں نے اپنے مضمون میں اُس دور کی یاد تازہ کی ہے۔ انیتا غلام علی کے مضمون سے کراچی شہر کے روایتی کردار کی نہایت دل آویز تصویر ابھرتی ہے۔

"کراچی کی کہانی" کی جلد اول کا آخری مضمون ـــ کراچی شہر ـــ تعمیرات کی زد میں ـــ شہر کی ابتدا سے اب تک ہونے والی نمایاں تبدیلیوں اور ان کے اثرات کا ملکی تاریخ کے پس منظر میں مجموعی جائزہ لیتا ہے۔ یہ مضمون کراچی کے ایک ممتاز شہری عارف حسن کا تحریر کردہ ہے جو فنِ تعمیر اور شہری منصوبہ سازی کے شعبے سے وابستہ ہیں اور پاکستانی معاشرے میں آنے والی تبدیلیوں کا قریبی مطالعہ کرتے رہے ہیں۔ آپ محسوس کریں گے کہ ان کے نقطۂ نظر میں شہر سے وابستگی، حقیقت پسندی اور دردمندانہ معقولیت کی وہی خصوصیات موجود ہیں جو خورشید نسروانجی کا ورثہ ہیں۔

جلد اول کے آخر میں کراچی کے مختلف ادوار سے تعلق رکھنے والے چند نقشے شامل کیے گئے ہیں جو شہر کی بدلتی ہوئی طبعی صورتِ حال کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔

"کراچی کی کہانی" کی جلد دوم میں شامل مضامین شہر کے موجودہ حالات کو مختلف زاویوں سے دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس جلد کی ابتدا فہمیدہ ریاض کی طویل تحریر "کراچی" سے ہوتی ہے جس میں شہر کی صورتِ حال کے مختلف عناصر کو ایک دوسرے سے جوڑ کر دیکھنے کی تخلیقی کوشش کی گئی ہے۔ اس تحریر کو ہیئت کے اعتبار سے کسی خانے میں قید کرنا ممکن نہیں، لیکن ایک زندہ اور جرأت مند ادبی دستاویز کے طور پر یہ منفرد ہیئت اپنا جواز خود پیش کرتی ہے۔

دوسرا مضمون اختر حمید خاں کے کئی مطبوعہ مضامین کو مدوّن کر کے تیار کیا گیا ہے۔ اختر حمید خاں کی شخصیت کو کسی تعارف کی ضرورت نہیں، وہ کراچی کے ایک ایسے شہری ہیں جن کا وجود شہر کے لیے اعزاز ہے۔ لیکن اس اعزاز پر محض ناز کرنا کافی نہیں؛ ان کی بصیرت سے فائدہ اٹھانے اور اُن عملی مثالوں کا قریبی مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے جو انھوں نے کراچی شہر کے حقیقی مسائل کو سمجھنے اور ان کا حل دریافت کرنے کے سلسلے میں قائم کی ہیں۔

آصف فرخی فکشن نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر بھی ہیں اور شہر کے مفلوک الحال باشندوں کی حالت میں بہتری پیدا کرنے کی کوششوں کا حصہ بھی رہ چکے ہیں۔ ان کا مضمون "اس شہر میں رہنا" ان کے کراچی کے محسوسات اور مشاہدات پر محیط ہے اور اس شہر کے بہت سے خوشگوار اور افسوسناک پہلوؤں کو سامنے لاتا ہے۔ ان کے مضمون سے کراچی شہر کی اس خصوصیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں تبدیلی کی رفتار کس قدر تیز ہے۔ یہ بات کراچی اور پاکستان کے دوسرے بڑے شہروں کو سمجھنے کے لیے بہت اہم ہے کہ چالیس برس سے کم عمر کے شہری بھی یہ محسوس کرنے پر خود کو مجبور پاتے ہیں کہ جو شہر اُنھوں نے اپنے لڑکپن میں دیکھا تھا وہ اب باقی نہیں رہا۔

محمد حنیف اور زینت حسام کے مضامین شہر کے دو اخبار نویسوں کے تجربات اور مشاہدات پر مبنی ہیں۔ محمد حنیف گو اس شہر میں پیدا نہیں ہوئے لیکن انھوں نے اخبار نویس کے طور پر اپنی عملی زندگی کا آغاز اسی شہر

سے کیا اور ایسی جرأت مندانہ اور معروضی رپورٹنگ کے ذریعے خود کو کراچی کا ایک باشعور شہری ثابت کیا۔ ان کا مختصر مضمون پچھلے چند برسوں کے اُس کراچی کی جھلکیاں پیش کرتا ہے جب اس شہر پر تعصب اور تشدد کا راج قائم ہو چکا تھا۔ زینت حسام نے اپنے مضمون "گزرے دن گزرے دن" میں کراچی کی ابتلا کا شکار ہونے والے چند محلوں کی موجودہ حالت کو اپنے بچپن کی یادوں کے پس منظر کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان مضامین سے یہ کلیدی نکتہ بھی سامنے آتا ہے کہ کراچی شہر دو واضح حصوں میں تقسیم ہو چکا ہے، اور اس کے خوش حال علاقوں کے شہری اُن علاقوں کی حالت سے بے خبر — اور شاید بیزار — ہیں جو اس شہر کے مسائل کو جھیل رہے ہیں اور جہاں کے باشندوں کی زندگیاں شہر میں ہونے والے تشدد کے ہاتھوں تار تار ہو رہی ہیں۔

کراچی کا حال دریافت یا بیان کرتے ہوئے بار بار محسوس ہوتا ہے جیسے دو الگ الگ شہروں کا ذکر ہو رہا ہو۔ کراچی کی اس طبقاتی تقسیم کی بنیاد ۱۹۴۷ کے فوراً بعد پڑ گئی تھی اور اس کا سبب نوزائیدہ ملک کے حکمرانوں کی یہ پالیسی تھی کہ یہاں سے ہجرت کر جانے والے غیر مسلموں کی جائیدادیں مشرقی پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں سے آنے والے مہاجروں میں کلیم کی بنیاد پر تقسیم کی جائیں گی۔ اس فیصلے کے نتیجے میں لُوٹ کھسوٹ کی ایک اندھی دوڑ شروع ہو گئی جس میں مہاجروں اور مقامیوں دونوں نے مقدور بھر حصہ لیا۔ اُس زمانے کے ایک روشن خیال سیاست داں میاں افتخار الدین کا کہنا تھا کہ کلیم کی بنیاد پر جائیدادیں تقسیم کرنے کا فیصلہ اصولی طور پر غلط ہے کیوں کہ اس کی پشت پر یہ خیال کارفرما ہے کہ جو شخص یا خاندان ہندوستان میں جس طبقے سے تعلق رکھتا تھا پاکستان میں اسے اُسی طبقے کا حصہ بننے کا حق ہے۔ اس کے برخلاف، اُن کی تجویز تھی کہ غیر مسلموں کے چھوڑے ہوئے وسائل ہجرت پر مجبور ہونے والے تمام باشندوں کو یکساں بنیادی سہولتیں فراہم کرنے کے لیے استعمال کیے جائیں تاکہ وہ نئے ملک میں اپنی زندگی سرے سے شروع کر سکیں۔ یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ حکمرانوں کے لیے ایسی کوئی تجویز قابلِ قبول نہ تھی، چناں چہ بے ایمانی کے ذریعے راتوں رات مالدار ہو جانے کا کلچر ابتدا ہی میں رائج ہو گیا۔ سندھ میں ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی تیرہ لاکھ ایکڑ زرعی زمین میں سے سات لاکھ ایکڑ پر مقامی سندھی زمینداروں نے قبضہ کیا۔ باقی زمین مہاجروں کو دی گئی، لیکن سندھ میں مہاجر زمیندار طبقہ پیدا کرنے کی کوشش کامیاب نہ ہوئی اور ان میں سے اکثر کو اپنی زمینیں چھوڑنی پڑیں۔ کراچی میں ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی جائیداد شہری مہاجروں کی اقلیت کے حصے میں آئی۔ سندھ کے عوام کی اکثریت کی طرح مہاجروں کی بدحال اکثریت کو بھی وسائل کی اس غیر منصفانہ تقسیم میں کچھ حصہ نہ ملا۔ البتہ سندھی عوام سندھیوں کے حقوق کے نام پر اور مہاجر عوام مہاجروں کے حقوق کے نام پر ایسے ایسے خوش حال اور موقع پرست سیاست دانوں کے ہاتھوں استعمال ہوتے رہے اور آج بھی ہو رہے ہیں۔

بے ایمانی اور لُوٹ کھسوٹ کے اس عمل نے کراچی کی آبادی کو شروع ہی سے دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ۱۹۶۰ کی دہائی سے پہلے تک اقلیتی اور اکثریتی دونوں طبقوں کے لوگ بیش تر مہاجروں پر مشتمل تھے۔ اس کے بعد آنے والی تبدیلیوں کے نتیجے میں دونوں طبقوں میں دوسری برادریوں کے لوگ بڑی تعداد میں شامل ہوئے۔ شروع کے برسوں میں یہ تقسیم تازہ مالداروں کی ہاؤسنگ سوسائٹیوں اور خستہ حال لوگوں کی جھونپڑیوں کی شکل میں دکھائی دیتی تھی، آج بھی یہ شہر خوش حال منصوبہ بند علاقوں اور غریب محلوں میں بٹا ہوا ہے۔

کراچی شہر کے تقریباً نصف باشندے کچی آبادیوں میں بسے ہیں، اور اگر آبادی میں اضافے کی موجودہ شرح برقرار رہتی ہے تو یہ غریب لوگ چند ہی برسوں میں شہر کی آبادی کی اکثریت پر مشتمل ہوں گے کیوں کہ کچی آبادیاں پورے شہر کے مقابلے میں دُگنی رفتار سے پھیل رہی ہیں۔ یہ کراچی کی اہم ترین حقیقت ہے جس پر سیاست توجہ دیے بغیر شہر کو درپیش مسائل سمجھنا ناممکن ہے۔ شہر کی ایک کچی آبادی کے کچھ باشندوں نے اپنی آبادی کی کہانی اپنے الفاظ میں بیان کی ہے جسے جلد دوم میں عیسیٰ نگری کی زبانی تاریخ کے عنوان سے شامل کیا گیا ہے۔ یہ ایک پُرخلوص، سادہ اور دل چسپ متن ہے جو کچی آبادیوں کی زندگی کے بعض اہم پہلوؤں کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔

کچی آبادیاں کیوں بنتی ہیں، کس طرح آباد کی جاتی ہیں اور اس عمل کے فاعل کردار کون ہیں ـــــ ان سوالوں کے جواب تسنیم صدیقی اور یان فانڈر لنڈن کے مضامین سے ملتے ہیں۔ کچی آبادیوں میں رہنے والے کم حیثیت لوگوں کو بے دخلی اور بے گھری کا خطرہ بھی لاحق رہتا ہے۔ کیسھ فرماڈیر اور عارف حسن نے اپنے مضامین میں دو کچی آبادیوں کے انہدام اور ان کے باشندوں کی بے دخلی کی کہانیاں بیان کی ہیں۔ ان چاروں مضامین سے پتا چلتا ہے کہ کچی آبادیوں کے وجود اور وہاں رہنے والے شہریوں کی دشوار زندگی کے لیے سب سے زیادہ قصوروار شہر کے نااہل اور بدعنوان انتظامی ادارے ہیں جو شہر کے غریب لوگوں کے زندہ رہنے اور روزی کمانے کے حق کو قانونی طور پر تسلیم کرنے کو تیار نہیں اور ان اداروں کے اہلکار شہر میں سرگرم مافیاؤں کے ساتھ مل کر شہریوں کے استحصال میں متواتر مصروف ہیں۔

شہر کی صورتِ حال کو سمجھنے کے لیے یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ شہر کا انتظام کس طرح چلایا جاتا ہے۔ عارف حسن کا ایک اَور اہم مضمون ـــــ شہری بدانتظامی اور تشدد ـــــ اس بات کو بہت خوبی سے واضح کرتا ہے کہ بدانتظامی کس طرح تشدد کو شہر کی معاشرتی زندگی کا لازمہ بنا دیتی ہے۔ اُن کا کہنا ہے کراچی میں شہری منصوبہ بندی اور انتظام کا مروجہ طریق کار شاید محاصروں اور ماورائے عدالت قتل کی وارداتوں سے بھی بڑھ کر انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہے، اور یہ طریقِ حکومت اور شہر کے نچلے درمیانہ اور مزدور طبقے ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔

لسانی گروہوں کی باہمی کشیدگی اور مہلک ہتھیاروں کی فراوانی کراچی میں برسوں سے جاری تشدد کے دو نمایاں پہلو ہیں۔ اکبر زیدی نے اپنے مضمون میں سندھی مہاجر تنازعے کی حقیقت کا تجزیہ کیا ہے اور مارک ٹلی نے ہتھیاروں کی تجارت کا پورے جنوبی ایشیا کے تناظر میں جائزہ لیا ہے۔

جلد دوم کا آخری مضمون اس انتخاب کا اہم ترین تجزیاتی مضمون ہے۔ عارف حسن نے اس مضمون میں اس بحران کا جائزہ لیا ہے جو پورے ملک پر محیط ہے اور جس کا سب سے ہولناک اور پُرتشدد اظہار کراچی میں ہو رہا ہے۔ اس بات پر اصرار بہت ضروری ہے کہ کراچی کی صورتِ حال صرف کراچی کے شہریوں کا مسئلہ نہیں۔ اس صورتِ حال کے بنیادی عناصر پورے ملک میں موجود ہیں، اور اس مسئلے کا حل، یا اس کا مزید بگاڑ، پورے ملک پر اثرانداز ہوگا۔ معقولیت اور حقیقت پسندی کا تقاضا ہے کہ اس صورتِ حال کو پاکستانی معاشرے کی موجودہ حالت کے تناظر میں دیکھا جائے اور کسی خوش فہمی، غلط فہمی یا گروہی تعصب کو نظر کی رکاوٹ نہ بننے دیا جائے۔

بدقسمتی سے ایسی رکاوٹیں بے شمار ہیں۔ کراچی کی صورتِ حال کے دو نمایاں فاعل کردار ـــــ حکمران ور

منسوب سیاسی جماعت ـــ ایسی تردیدوں کے باوجود شہر کے حالات کا اصل سبب لسانی گروہوں کی باہمی کشیدگی ہی کو قرار دیتے ہیں، کیوں کہ یہ ان کے سیاسی مفادات کا تقاضا ہے۔ مقبول عام اخبارات، اگر ان میں دیانت داری اور روشن خیالی کی کوئی رمق ہوتی، اس فریب کا پردہ چاک کر سکتے تھے۔ لیکن عوام کو اس فریب میں مبتلا رہنے دینا انھیں اپنے تجارتی مفادات کے لیے موزوں معلوم ہوتا ہے۔ سندھ سے شائع ہونے والے اردو اور سندھی اخباروں نے صحافت کا ایک شرمناک تصور رائج کیا ہے۔ ایک اور ہولناک حقیقت یہ ہے کہ ہمارا ملک قومی اخبارات کے اہم ادارے سے محروم ہو چکا ہے، یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ ملک کے ایک علاقے کے شہریوں کو دوسرے علاقے کے تفصیلی حالات جاننے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اُن تک یہ اطلاعات پہنچتی بھی ہیں تو قابلِ اعتبار خبروں کی شکل میں نہیں بلکہ تعبیروں کی صورت میں جن میں حقائق کو اپنی مرضی کا رنگ دیا جاتا ہے۔ کراچی کے موجودہ حالات کا خلاصہ دوسرے شہروں تک دو طرح سے پہنچتا ہے یہاں مہاجروں کا قتل عام ہو رہا ہے ، یا یہاں مہاجر دہشت گردوں کا صفایا کیا جا رہا ہے۔ چناں چہ اپنے گروہی تعصب کی بنیاد پر ان اطلاعات کا ردِ عمل طے کرنا نہایت آسان بنا دیا جاتا ہے۔

کراچی میں دہشت گردی ہو رہی ہے اور دہشت گردی کے ملزموں کو، عدالت میں ان کا جُرم ثابت کیے بغیر، موت کی سزا دی جا رہی ہے، یہ پاکستان کی ایک آزاد تنظیم، ہیومن رائٹس کمیشن، کی غیر مبہم رپورٹ ہے۔ کمیشن کا کہنا ہے کہ ۱۹۹۵ میں کراچی میں ۲۶۰ افراد کی پولیس مقابلے میں ہلاکت کی اطلاع ملی، پنجاب میں ایسی ہلاکتوں کی تعداد ۱۸۰ بتائی گئی ہے۔ کراچی کے انگریزی ماہنامے ہیرالڈ نے اطلاع دی ہے کہ دیہی سندھ میں اس سال اس قسم کے ۵۵ واقعات ہوئے۔ کیا ان تمام اطلاعات کو ایک دوسرے سے جوڑ کر پاکستان میں لاقانونیت اور ناانصافی کی خطرناک سطح کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا؟ سیاست اور صحافت پر مسلط افراد کی بہرحال یہی کوشش ہے کہ یہ زاویہ نظر اختیار کرنا زیادہ سے زیادہ دشوار بنا دیا جائے، چناں چہ لوگ اپنی پسند کی لاشیں اٹھا لیتے ہیں اور کسی دوسری جگہ ہونے والے واقعات کو کوئی اور معاملہ سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔

سیاست دانوں کی خود غرضی انھیں کسی صورت حال کے بیان کے لیے نادرست استعارے اختیار کرنے پر اکساتی ہے۔ سیاست داں ـــ اور ان کے اعلان کردہ موقف سے غیر معروضی وابستگی رکھنے والے صحافی اور دانشور ـــ کراچی اور سندھ کے تعلق سے بوسنیا ، کشمیر ، ریڈ انڈین ، ۱۹۴۷ ، فلسطین ، ہولوکاسٹ ، ۱۹۷۱ وغیرہ کے استعارے زمین پر موجود صورت حال سے ان کے اہم فرق کو دانستہ نظر انداز کرتے ہوئے استعمال کرتے ہیں تا کہ ان کے مخاطب عام لوگ خود کو سرتاسر مظلوم اور مخالف فریق کو سرتاسر ظالم محسوس کرنے کی تسکین حاصل کر سکیں اور ان میں مطلوبہ اشتعال پیدا ہو۔ یہ اشتعال کراچی کو سندھ سے الگ کرنے کا سبب بن سکتا ہے، اس علیحدگی نے ۱۹۴۸ کے بعد بھی افسوس ناک نتائج پیدا کیے تھے، اور آج بھی اس سے حقیقی مسائل کے حل کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ یہ امکان دیہی اور شہری سندھ کے لیے یکساں خطرناک ہے۔

سیاست اور صحافت سے مایوس ہو کر حقیقت حال جاننے کی خواہش رکھنے والا شہری تخلیقی ادیبوں سے رجوع کرتا ہے کیوں کہ ان سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ سیاسی یا تجارتی مفادات سے بلند ہوں گے اور زندگی کے بارے میں کوئی دانش مندانہ اور انسان دوست نقطۂ نظر رکھتے ہوں گے۔ لیکن یہ توقع عموماً پوری نہیں ہوتی۔ اس

میں سے جو ادیب شدومد سے اپنی پسندیدہ سیاسی جماعت یا اخبار کا موقف پیش نہیں کرتے ہوتے وہ اپنی تن آسانی اور سادہ ذہنی کے باعث حقیقت کو جاننے کی خواہش اور اہلیت سے عاری ہوتے ہیں۔

اس سلسلے میں اردو کے ادیبوں کی مجموعی حالت خصوصاً قابل رحم ہے۔ ان کی عام ذہنی سطح کا اندازہ ان کے اس مرغوب تجزیے کی گہرائی سے لگایا جا سکتا ہے جو وہ کراچی کے حالات کے بارے میں بار بار پیش کرتے ہیں: اس شہر کو کسی کی نظر لگ گئی۔ اردو ادب نے معاشرے کا مطالعہ کرنے کا شغل مدتوں پہلے چھوڑ دیا تھا۔ ہمارے ہاں کوئی بالزاک تو پیدا نہیں ہوا جو کسی [illegible] پر انسانی زندگی کا کوئی [illegible] ہے مگر ایک وقت یقیناً ایسا تھا کہ اردو کے ادیب معاشرے کے مسائل کو اپنا تخلیقی مسئلہ سمجھتے تھے اور عاقل و بالغ شہریوں کی طرح ان کے اصل اسباب جاننے کی کوشش کرتے تھے۔ مثلاً سعادت حسن منٹو کے قلم سے مذکورہ بالا احمقانہ فقرے کے نکلنے کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔

بعض تن آسان ادیب بھی کسی صورت حال کے بیان کے لیے ایسے ایسے استعارے اختیار کرتے ہیں جن کو حقائق سے کچھ سروکار نہیں ہوتا۔ مثلاً اردو کے ایک نامور ادیب انتظار حسین کا اصرار یہ خیال ہے کہ ۱۸۵۷ کی بغاوت، ۱۹۴۷ کی ہجرت، ۱۹۷۱ کی تقسیم، عرب اسرائیل جنگ اور آج کا کراچی ـــــ اندلس کا استعارہ ان سب کے بیان کے لیے کارآمد ہے، کیوں کہ ان کے محترم پیش رو صادق حسین صدیقی سردھنوی ثابت کر چکے ہیں کہ یہ پڑھنے والوں میں ملت کا درد پیدا کرنے کا کارگر نسخہ ہے۔ ان کے تازہ ناول "آگے سمندر ہے" سے کراچی اور غرناطہ میں بس اتنی مماثلت ظاہر ہوتی ہے کہ مصنف کو غالباً دونوں سے یکساں واقفیت ہے۔ حقیقت سے مطابقت نہ رکھنے والا استعارہ نہ صرف لکھنے والے کی لاعلمی کا بلکہ لاعلمی کو علم سمجھنے کے غرور کا بھی پتا دیتا ہے۔ اس غرور کی موجودگی میں وہ انکسار کہاں سے آئے جو زندہ انسانوں کی ابتلا اور معاشرے کے مسائل جاننے اور محسوس کرنے کے لیے لازمی ہے۔

اردو ادب کی موجودہ حالت کے پیش نظر اردو کے ادبی رسالوں سے بھی یہ توقع نہیں کی جاتی کہ وہ ادیبوں کی ذات کا کرب یا ملت کا درد سجا سنوار کر پیش کرنے سے آگے قدم بڑھا کر ایسے موضوعات میں دخل دیں گے جو سیاسی جماعتوں اور اخباروں کی ملکیت سمجھے جاتے ہیں۔ تاہم، اس بات پر اصرار کیا جانا چاہیے کہ ان موضوعات کو پیشہ ور سیاست دانوں اور صحافیوں پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ معاشرے کے حقائق کو جاننے کی کوشش کرنا کسی ادبی رسالے کے منصب کا نہایت اہم حصہ ہے۔ "آج" نے کراچی کی کہانی ترتیب دے کر، پورے انکسار کے ساتھ، یہی منصب ادا کرنے کی کوشش کی ہے اور اس شہر کی حقیقت دریافت کرنے کے راستے پر ایک قدم رکھا ہے۔

کراچی کی کہانی کا اختتام دو ضمیموں پر ہوتا ہے۔ ضمیمہ ۱ میں چند اہم حقائق کو اعداد و شمار کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ اعداد و شمار شہر کی زندگی کے بعض پہلوؤں کو روشن کرتے ہیں۔ ضمیمہ ۲ میں اُن کتابوں، مقالوں، رپورٹوں وغیرہ کی فہرست دی گئی ہے جو کراچی کو کسی نہ کسی زاویے سے زیر بحث لاتے ہیں۔ یہ فہرست نامکمل ہے، لیکن کسی زیادہ مکمل کتابیات کو تیار کرنے یا شہر کا زیادہ تفصیلی مطالعہ کرنے کے لیے بنیاد کا کام دے سکتی ہے۔

اجمل کمال

ذی شان ساحل

کراچی

اور دوسری نظمیں

سرورق اور ڈرائنگز
نعیمہ شاہ

قیمت ۱۰۰ روپے

آج کی کتابیں
اے ۱۶، سفاری ہائٹس، بلاک ۱۵، گلستانِ جوہر، کراچی ۷۵۲۹۰

سیٹھ ناؤں مل ہوت چند (۱۸۰۴ - ۱۸۷۸) کی یادداشتیں جدید کراچی شہر کی ابتدائی تاریخ کے اہم ترین ماخذوں میں شامل ہیں، کیوں کہ ان میں موجودہ شہر کے بسنے کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں انگریزوں کے کراچی پر حملے اور اس کے چند برس بعد سندھ پر قبضے کا بیان بھی ملتا ہے۔ سیٹھ ناؤں مل نے سندھ کے حکمران بلوچ میروں کو شکست دے کر سندھ پر قبضہ کرنے میں انگریزوں کی مدد کی تھی، اس کا پس منظر اور تفصیل بھی اس کتاب سے معلوم ہوتی ہے۔ سندھ کے قوم پرست عموماً ناؤں مل کو سندھ کا غدار قرار دیتے ہیں، لیکن اس سلسلے میں دوسرا نقطۂ نظر بھی موجود ہے جس کی ترجمانی پیر علی محمد راشدی کے ان الفاظ سے ہوتی ہے اگر ناؤں مل نے غداری نہ کی ہوتی تو سندھی مسلمان آج بھی گھوڑوں اور اونٹوں پر، اور سندھی ہندو گدھوں اور خچروں پر سواری کر رہے ہوتے۔ سندھ پر انگریزوں کے قبضے کے عوامل برصغیر کی دوسری ریاستوں پر قبضے کے حالات سے بہت زیادہ مختلف نہیں تھے، اور مورخوں اور تجزیہ نگاروں نے نشان دہی کی ہے کہ یہ انتشار اور شکست و ریخت کے شکار پسماندہ معاشرے پر ایک ترقی یافتہ اور جارح معاشرے کی فتح تھی جسے معروضی حالات کو دیکھتے ہوئے ٹالا نہیں جا سکتا تھا۔

سیٹھ ناؤں مل کی یادداشتیں پہلی بار انگریزی کے ایک محدود ایڈیشن کی صورت میں ۱۹۱۵ میں شائع ہوئی تھیں۔ کتاب کا مکمل عنوان یہ تھا

A Forgotten Chapter of Indian History as told by Seth Naomal Hotchand CSI of Karachi (1804-1878) Written by Himself and Translated by His Grandson Rao Bahadur Alumal Trikamdas Bhojwani, BA Edited with an Introduction by Sir H Evan M James, KCIE, CSI, Commissioner of Sind 1891-1899, Printed for Private Circulation only "

سیٹھ ناؤں مل کی کتاب کا سندھی ترجمہ محمد حنیف صدیقی نے کیا اور یہ پہلی بار سندھی ادبی بورڈ نے ۱۹۶۸ میں شائع کیا۔ آئندہ صفحات میں پیش کیا جانے والا متن ناؤں مل کی کتاب کے منتخب اقتباسات کو ملا کر ترتیب دیا گیا ہے۔ اردو ترجمہ سندھی سے کیا گیا ہے، تاہم اس انگریزی ایڈیشن کو بھی پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔

ناؤں مل ہوت چند

سندھی سے ترجمہ اور تدوین رئیس احمد نقش

یادداشتیں

میرے بزرگ اصل میں کاہری کے رہنے والے تھے۔ کاہری، بھاں شہر اور (مغربی) ہارا دریا کے راستے پر، پانچ میل بھاں سے اور ایک میل ہارا سے دور ہے۔ یہ شہر کسی زمانے میں نہایت آباد اور ترقی یافتہ تھا۔ میرے ایک بزرگ کی، جو سٹس مل کہلاتے تھے، کاہری کے دیہ بڑی زمین داری تھی۔ اس کے علاوہ وہ بڑے بیوپاری اور صراف تھے۔ انھوں نے خوب شہرت پائی اور شہر والے ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ ان کے بیٹے مانک نے اپنے لین دین میں تیزی پیدا کی اور زمین میں بھی اضافہ کیا، وہ بڑے ٹھاٹ سے رہتے تھے۔ ان کے کارندے شاہ بندر، ٹھٹھے، سون میانی، بیلا، شکارپور اور چانڈکا میں ہوتے تھے۔ اُس وقت کراچی کا نام نشان بھی نہ تھا۔ مانک داس نے دو شادیاں کیں، جن سے ان کے چار بیٹے پیدا ہوئے۔

اُس وقت سومرہ اور جیا قوموں کے لوگ سندھ کے اس حصے پر حکومت کرتے تھے اور کاہری، سامتانی پرگنے کا صدر مقام تھا۔ سٹس مل کے بڑے بیٹے بھوجومل سولہ برس کی عمر میں اپنی سوتیلی ماں سے اَن بن کی وجہ سے کاہری چھوڑ کر سیوہن گئے، اور وہاں سے پھر ایک قافلہ تیار کر کے کسی دوسری جگہ قسمت آزمائی کے لیے روانہ ہو گئے۔ اُس وقت کراچی کے موجودہ شہر کا وجود نہیں تھا۔ البتہ حب ندی کے اُس طرف کھڑک بندر نامی ایک شہر تھا جو تجارت کے لیے مشہور تھا۔ بھوجومل وہاں جا بسے۔ انھوں نے اپنے کارندے گوادر، بیلا اور مسقط میں بھیجے۔ مسقط والے کارندے نے مزید آگے بوشہر، شیراز اور بحرین میں کوٹھیاں کھولیں۔ آہستہ آہستہ شاہ بندر اور لاہری بندر میں بھی، جو اُس وقت سندھ کی مشہور بندرگاہیں تھیں، شاخیں کھولی گئیں اور سورت، پوربندر اور ملبار سے تجارت شروع کی گئی۔ کھڑک بندر حب ندی کے دہانے کے پاس تھا۔ کافی عرصے کے بعد بندر کا دہانہ سمندر کی طرف سے ریت سے اَٹ گیا اور جہازوں کا داخلہ بند ہو گیا۔ اُس وقت سارے جہاز بانس کی لکڑیوں سے بنائے جاتے تھے۔ انھیں لوہے کی کیلوں کی جگہ کھجور کی چھال کی رسیوں سے باندھ کر جوڑا جاتا تھا۔

بندر کا دہانہ اَٹ جانے کے باعث سوداگروں کو وہاں لنگرانداز ہونے میں بے حد تکلیف ہونے

لگی۔ سیٹھ بھوجومل وہاں کے دوسرے معزز لوگوں کے مشورے سے آباد ہونے کے لیے کوئی دوسری قریبی جگہ تلاش کرنے لگے جہاں انھیں تجارت میں سہولت ہو۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے ان لوگوں کی نظر کراچی کے ساحلی علاقے پر پڑی۔ وہاں ریت کے بند کے دہانے پر، بیس پچیس میربحروں (ملاحوں) کی جھونپڑیاں تھیں۔ اس جگہ کو اس وقت ڈربو کہتے تھے۔ اس کے قریب ایک پانی کا چشمہ تھا جسے کلاچی کا کُن کہتے تھے۔ کُن کے معنی ہیں ایک گہرے پانی والا گڑھا اور کلاچی ایک میربحر کا نام بھی تھا۔ گڑھے کے ارد گرد کھجور کے پیڑ تھے۔ آخرکار جگہ پسند کرکے، وہاں مکان بنائے گئے اور کھڑک بندر سے سب منقولہ سامان منتقل کیا گیا۔ یہ سب کلاچی کے گاؤں میں آ کر آباد ہوئے جو اس وقت کراچی کہلاتا تھا۔ اُس وقت گھوڑے کی کھاڑی نہیں تھی۔ ماما جزیرے (ماما بیٹ) کے اوپر ایک اور کھاڑی یا خلیج تھی، جسے اب نواں نار یا سی کھاڑی کہتے ہیں، آمدورفت کے لیے یہی استعمال ہوتی تھی۔ گھوڑے کے دہانے پر چٹانوں کا ایک سلسلہ تھا۔ ۱۷۲۹ کے آس پاس کھڑک بندر کے لوگ آ کر کراچی میں آباد ہوئے۔ بھوجومل کے مشورے سے، آسودے مل نامی ایک شخص نے بی بی مراداں کے ساتھ تجویز کیا کہ کراچی میں حفاظت کے لیے ایک قلعہ تعمیر کیا جائے۔ یہ تجویز سب کو پسند آئی۔ لوگوں نے کھجوروں کا جنگل صاف کرکے، لکڑیوں اور مٹی کا قلعہ بنانا شروع کیا۔ شہر کے باسیوں کی مدد کے لیے باہر سے مزدور بھی منگائے گئے۔ انھیں مزدوری میں بکریں اور مسقط کے سکے اور تازہ کھجوریں دی جاتی تھیں۔ تھوڑے عرصے میں ایک اچھا خاصا قلعہ بن کر تیار ہو گیا۔ مسقط سے توپیں منگا کر قلعے کی دیواروں پر رکھی گئیں۔ قلعے کی دیوار کے اندر تقریباً ساٹھ ستر جریبوں کی اراضی تھی۔ قلعے کے دو دروازے تھے۔ مغربی دروازے کو کھارو دروازو یعنی کھارے پانی کی طرف کھلنے والا دروازہ اور دوسرے دروازے کو، جو شمال مشرقی سمت تھا، مِٹھو دروازو یعنی میٹھے پانی کی طرف کھلنے والا دروازہ کہتے تھے۔ لوگ سب قلعے کے اندر رہتے تھے، جس کے ارد گرد کھجور کے پیڑ اور تھوہر کا جنگل تھا۔

شاہ بندر کی بندرگاہ کا دہانہ بھی دریائے سندھ کی ریت سے بند ہو گیا، جس کے باعث بے شمار لوگ وہاں سے کوچ کرکے کراچی آئے۔ اس وقت کلہوڑوں نے خاموشی سے، بغیر کسی مخالفت کے، کراچی پر قبضہ کر لیا۔ ٹھٹھہ بھی کلہوڑوں کے ماتحت تھا اور وہاں ایک نواب حکومت کرتا تھا۔ نواب کا گرجو کھیو نامی ایک ملازم تھا۔ ٹھٹھہ ایک قدیمی شہر ہے اور کہتے ہیں کہ اس کی بنیاد چار سو برس قبل کنڈوسموں نے رکھی تھی۔ ٹھٹھے کے آس پاس جو شاندار ویرانے (مقبرے) ہیں، وہ اُس کے ماضی کی شہادت دیتے ہیں۔ لاہری بندر اور سکرو دھاریجو پر رانا ارجُن نامی ایک ہندو کنور راج کرتا تھا۔ فطری طور پر کلہوڑوں کو یہ بات نہ بھائی۔ انھوں نے ٹھٹھے میں اپنے نواب کو لکھ بھیجا کہ اسے مار کر علاقے پر قبضہ کرے۔ نواب نے گرجو کھیو سے صلاح مشورہ کیا، اور گر نے رانا کو ختم کرنے کا کام اپنے ذمے لے لیا۔ رانا اپنی حفاظت کے لیے معمولی پہرہ رکھتا تھا۔ گرجو کھیو، سیٹھ بھوجومل کا شناسا تھا۔ اس نے یہ کیا کہ سیٹھ سے رقم ادھار لے کر، ملیر کے اسی جو کھیوں کو ساتھ لیے، کراچی کے جنوب میں کلفٹن کے راستے سے لاہری بندر کی طرف

رہا۔ اما ارحس اس وقت رتی کے کاوں میں، حو ایک حریرے پر واقع تھا، سکار کے لیے مسر ل امدار ہا۔ رات کے حب راما ارحس ایسے حیمے میں دیا حلاے، بید کے آعوش میں آرام کرے لگا، سب محر اور اُس کے حواں متنکیروں پر ٹیپر کر، تلواریں ایسے دماںوں میں پکڑے، اس پر حا مارل موے اور اسے قتل کر دیا۔ راما ارحس کی کوئی اولاد یہ تھی، اس لیے مر آسانی سے اس کے علاقے پر قاںس ہو گیا۔ یہ کام حتم کر کے، اس ے ٹھٹے کے لواب کو اطلاع دی، حس ے اسے ایک حاعت بھی دی اور حام کے حطاب سے حوکھیوں کا سردار بھی مقرر کیا۔ قلات کے حاں کا بھائی حارگ حاں، کلھوروں سے لڑتے ہوے مارا گیا اور کلھوڑوں ے اس کے عوص، حوں بہا کے طور پر، کراچی قلات کے حاں کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد قلات کی فوج کا ایک دستہ یہاں رہے لگا۔

بھوحومل ۸۳-۱۷۸۲ میں استقال کر گئے۔ اں کے چاروں بیٹے اکھٹے بڑے پریم سے رہتے تھے اور انھوں ے اپیا تاحرانہ کاروبار بھی حاصا بڑھا لیا تھا۔ کدومل مامی کماشتے کو ۱۷۴۹ میں بمبئی بھیحا گیا جہاں وہ اپسی کوٹھی کے دریعے بنگال اور چین سے تجارت کرتا تھا۔ مسقط والے کماشتے مس راح مل ے ایراں، بصرہ اور بحریں سے ایچھے حاصے تعلقات قائم کیے۔ اں کے کاروبار کی شاحیں کابل، قندھار، ہرات، قلات اور کشمیر میں بھی تھیں۔ سیٹھ دریانومل ے بڑی شاں وشوکت سے رند کی گزاری اور سیٹھ لعل مں داس تاحرانہ کاروبار سبھالتے رہے۔

۱۷۸۳ میں ٹالپروں ے میر بحر کی سرداری میں سدھ کو کلھوڑوں سے چھیں کر اپسے قبضے میں لے لیا۔ کلھوڑوں اور میروں کی آحری لڑائی مالائی بھیلانی کے قریب ہوئی حس میں کلھوڑوں کو شکست ہوئی۔ میر بحر کو حودھ پور کے ملازموں کے ہاتھوں مروا دیا گیا۔ اس کی حگہ میر فتح علی حاں، علام علی، کرم علی اور مراد علی حکمراں ہوے، حو اکٹھے حکومت کرتے تھے۔ ۹۲-۱۷۹۱ کے لگ بھگ میر فتح علی ے کراچی کو حاصل کرے کے لیے یندرہ ہرار بلوچ حملے کے لیے بھیحے۔ وہ توپوں اور گولوں سے مسلح تھے اور انھوں ے اپسی چھاؤنی لیاری کے اس طرف، شہر کی شمال مسرقی سمت باغیچوں میں ڈالی۔ کراچی اس وقت قلات کے حاں کے ماتحت تھا لیکں اس کی حفاطت کا کوئی انتظام نہ تھا۔ شہر کے باسی سب قلعے کے اندر رہتے تھے، حس کے چاروں طرف کھجور اور تھوہر کا حنگل تھا۔ میروں کی حملہ آور فوج کے سرحیل میاں فقیرا اور پلیا تھے۔ قلعے پر توپیں نصب کی گئیں۔ ادھر دیواروں کی حفاطت رعیت کی حاب سے پانچ سو میر بحروں اور میرے بزرگوں کے جہازوں کے حلاصیوں ے ہمارے بزرگ سیٹھ ملرام داس کی نگرانی میں کی۔ شہر کی دفاع کے لیے حو گولا بارود سیٹھ کیول رام ے استعمال کیا تھا وہ ہمارے گوداموں سے منگایا گیا تھا جہاں ہمیشہ ہمارے تجارتی جہازوں کے لیے حنگی اسباب موحود رہتا تھا۔ حملہ آور فوج ڈھائی مہینے شہر کا محاصرہ کیے رہی۔ شہر والے سب قلعے کے اندر تھے۔ اندر کافی سامان جمع تھا۔ اس کے علاوہ سمندر کے راستے ہر روز راستا کھلا ہوا تھا، اس لیے انھیں حوراک کی کوئی تکلیف نہ تھی۔ تاہم اُس وقت لوگ کھانا پکانے اور پینے کے لیے پانی لیاری ندی سے نہ لا سکتے تھے۔ اس لیے انھیں مجبوراً قلعے کے اندر حو کنویں

تھے، ان کے کھارے پانی پر قناعت کرنی پڑی۔ ڈھائی مہینے کے بعد، بلوچیوں کی فوج، تھک ہار کر، محاصرہ ختم کر کے، حیدر آباد لوٹ گئی۔

ایک بار پھر ۹۳-۱۷۹۲ میں میر فتح علی خاں نے کراچی کی فتح کے لیے دوسری فوج بھیجی۔ اس نے بھی لیاری کے کنارے پر اور بانیچے والے محلے میں چھاؤنی ڈال کر، قلعے پر گولا باری شروع کی۔ دوسری بار بھی سیٹھ ملرام داس نے رعیت اور اپنے جہازوں کے خلاصیوں کی مدد سے قلعے کی حفاظت کی اور دشمن کی گولا باری کا جواب اپنے جہازوں کی حفاظت کے لیے رکھے بارود سے دیا۔ اس بار محاصرہ تین مہینے تک چلا، جس کے بعد پھر ۹۵-۱۷۹۴ کے ساون کے مہینے میں، میر فتح علی خاں نے کراچی حاصل کرنے کے لیے بیس ہزار سپاہیوں کا ایک لشکر روانہ کیا۔

میر کرم علی اور سیٹھ دریانومل کے باہم دوستانہ تعلقات تھے۔ اس لیے انھوں نے دریانومل کو لکھا کہ ہمیں یقینی طور پر معلوم ہوا ہے کہ کراچی میں قلات کے خاں کی کوئی حفاظتی فوج نہیں۔ اس میں لڑائی کی ہمت نہیں ہے۔ ہمیں یہ سن کر دکھ ہوا ہے کہ آپ نے ہمارے لوگوں کی مخالفت کی ہے اور اپنے جہازوں کا گولا بارود ہماری فوج کے خلاف استعمال کر کے، انھیں دوبارہ شکست دے کر، پراس کر کے ہٹا دیا ہے۔ ہم کافی عرصے سے دوست ہیں اور ہم وطن بھی ہیں، اس لیے آپ کو ہماری مخالفت زیب نہیں دیتی، وغیرہ۔

خط ملنے کے بعد سیٹھ دریانومل نے قلات کے خاں کو دو تین قاصدوں کے ہاتھ پیغام بھیجا کہ میروں نے کراچی پر حملے کے لیے دو بار فوج بھیجی ہے لیکن ہم نے دونوں بار، سخت محنت اور جدوجہد سے انھیں شکست سے دوچار کر کے ہٹا کر کراچی کو بچایا ہے۔ اب میروں نے شہر حاصل کرنے کے لیے تیسری فوج بھیجی ہے اور عوام میں زیادہ عرصے مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں۔ شہر آپ کے ماتحت ہے، اس لیے مزید فوج بھیجیے، کوئی تدبیر کیجیے۔ خاں نے جواب میں لکھا کہ مجھ میں لڑائی کی طاقت نہیں اور نہ ہی فوج میرے اختیار میں ہے۔ اگر تم شہر کا دفاع کر سکو تو خیر، ورنہ تم پر کوئی الزام نہیں۔

اس پر سیٹھ دریانومل نے اپنے خاص ملازم فقیرا کے ہاتھ، جو ہیرانی بلوچیوں کا معزز فرد تھا، خط بھیجا۔ خط کا مفہوم کچھ یوں تھا: بے شک ہماری کافی عرصے سے دوستی ہے، آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ لیکن میری عرض ہے کہ جب کراچی آپ کے حوالے کیا جائے تو بلوچ سپاہیوں کو، جو ایک سرکش اور بے لگام طبقہ ہیں، شہر میں داخل نہ ہونے دیا جائے۔ دوسری بات یہ کہ جو نواب آپ مقرر فرمائیں وہ ہمارے مشورے سے کام کرے گا اور عوام پر ظلم نہیں کرے گا۔ میر کرم علی نے جواب میں لکھا کہ سیٹھ دریانومل کی شرائط قبول ہیں اور وعدہ ہے کہ کراچی میں میروں کی طرف سے جو نواب مقرر کیا جائے گا اسے ہدایت کی جائے گی کہ وہ ہر بات میں ان سے مشورہ کرے اور انھیں حقیقی مالک سمجھے۔

۹۴-۱۷۹۳ میں، کراچی میں قلات کے خاں کی طرف سے ملا شمبیع علی خاں نواب تھا۔ وہ ایک کٹر مسلمان تھا اور اس نے ایک بار دریا تھاں نامی ہندوؤں کے ایک مندر پر حملہ کر کے مندر اور

سارے گھروں کے بیچ میں ایک مسجد تعمیر کی تھی، جس سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں جھگڑا ہوا تھا۔ میرے نانا سیٹھ لعل من داس، ایک ہٹے کٹے دلیر آدمی تھے۔ جب مسلمانوں نے ہندوؤں کے مندر پر حملہ کیا تو وہ سیدھے مندر میں جا کر، مورتیاں بچا لائے۔ اس واقعے کے بعد، سیٹھ دریانومل نے قلات کے خان کو شفیع علی خانؒ کے مظالم کے بارے میں تحریری فریاد بھیجی۔ جس پر خان نے شفیع علی خان کو برطرف کر کے اس کی جگہ حاجی سعدو کو مقرر کیا۔ وہ ۹۵-۱۷۹۴ تک ملازمت میں تھا۔ جب میروں نے تیسری بار کراچی کو حاصل کرنے کے لیے حملہ کیا، تو سیٹھ دریانومل نے سعدو کو قلات کے خان کے جواب سے آگاہ کیا اور سمجھایا کہ مزید لڑائی جاری رکھنے سے میرے بیوپار کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ تاہم اگر آپ چاہیں تو حملہ آور فوج کا مقابلہ جاری رکھیں۔ حاجی سعدو نے بھی اپنی کمزوری کا اعتراف کیا۔ اسے فکر فقط یہ تھی کہ کس طرح جان بچا کر قلات پہنچوں۔ سیٹھ دریانومل نے اسے محافظ ساتھ دے کر روانہ کیا۔

سارا وقت میروں کا لشکر شہر پر گولاباری کرتا رہا۔ دو تین گولوں نے کچھ نقصان پہنچایا لیکن جلد ہی میاں فقیر اور یلیا سالاروں کو میر فتح علی خان اور کرم علی خان کی طرف سے جنگ بندی کر کے سیٹھ دریانومل سے مشورہ کرنے کی ہدایت ملی، کیوں کہ فریقین کے درمیان صلح ہو گئی تھی۔

اس کے بعد سمت ۱۸۵۱ (مطابق ۹۵-۱۷۹۴ عیسوی) کے بڑے مہینے کی گیارہ تاریخ کو سیٹھ دریانومل نے قلعے کے دروازوں کی چابیاں جا کر میروں کے لشکر کے سالاروں کے حوالے کیں۔ سیٹھ دریانومل نے اپنے ملازم فقیرا خان کے توسط سے (جو بہرامی قوم کا معزز فرد تھا) فقیرا اور یلیا کو اپنے آنے کی اطلاع دی۔ انھوں نے باہر نکل کر نہایت عزت سے اُن کا استقبال کیا۔ سیٹھ دریانومل نے میٹھادر اور کھارادر کی چابیاں میاں فقیرا اور یلیا کے حوالے کیں اور انھوں نے وعدہ کیا کہ حکم کے مطابق کسی بھی سپاہی کو شہر میں اندر آنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ نواب نے اپنا عہدہ سنبھالا اور شہر کی حفاظت کے لیے ایک سو کرمتی قوم کے بلوچ مقرر کیے۔ اس کے بعد فوج حیدرآباد لوٹ گئی۔

میر فتح علی خان اور کرم علی کراچی کی تسخیر کی خبر سن کر بے حد خوش ہوئے۔ میر فتح علی نے میر کرم علی کو مشورہ دیا کہ سیٹھ دریانومل کو اعزاز کے طور پر کراچی کی آمدنی میں سے مقررہ حصہ دیا جائے یا اُن کے باہر سے آمدہ تجارتی سامان پر محصول معاف کیا جائے۔ میر کرم علی خان نے یہ اطلاع دریانومل کو بھیجی لیکن انھوں نے آمدنی کا حصہ لینا قبول نہ کیا، کہنے لگے کہ کہیں عام لوگ یا قلات کا خان یہ نہ سمجھیں کہ میں نے اپنے ذاتی مفاد کے لیے اُن سے دھوکا کیا ہے۔ لیکن میر فتح علی نے حکم جاری کیا کہ سیٹھ کی تجارت پر آبکاری محصول کے تہائی حصے کی اور باغات پر سارے لگان کی معافی دی جائے۔ اس کے علاوہ انھیں اپنی بھٹی میں ذاتی استعمال کے لیے شراب بنانے کی اجازت بھی دی گئی۔ یاد رہے کہ یہ رعایت ان کے خاندان کو کلھوڑوں کے زمانے سے اور قلات کے خان کے دور میں بھی میسر تھی۔ اب روز بروز سندھ کے میروں اور سیٹھ کے تعلقات مزید مضبوط ہوتے گئے۔

اُس زمانے میں گومتی (دوارکا) اور جزیرے کے واگھروں نے سمندر میں قیامت برپا کر رکھی تھی۔

جو جہاز ان کے ہتھے چڑھتے، انھیں وہ لوٹ لیتے تھے۔ ہمارے خاندان کے پاس کراچی والی بڑی کوٹھی کے کاروبار کے لیے پچاس یا ساٹھ ہر قسم اور ہر ناپ کی دیسی کشتیاں رہتی تھیں، جو ہندوستان کے مغربی ساحل کی بندرگاہوں پر کرایہ لیتی تھیں۔ اس کے علاوہ ان کے پاس یوروپی طرز کے اور دوسرے جہاز بھی تھے جن کا تعلق مسقط اور کلکتے کی کوٹھیوں سے رہتا تھا۔ واگھروں کے ڈر سے ہر ایک جہاز توپوں، بارود اور دوسرے جنگی اسباب سے مسلح رہتا تھا۔ چھوٹے جہازوں پر تین تین اور بڑوں پر بارہ سے بندرہ تک توپیں ہوتی تھیں، جن کا طول تقریباً چھ فٹ تھا۔ ہمارا لکھمی پرساد جہاز، ملبار سے لوٹتے ہوئے جب پوربندر کے قریب پہنچا تو واگھروں کے جہازوں نے حملہ کر دیا۔ لکھمی پرساد پر بڑی تعداد میں جوکھیے سپاہی تھے۔ لڑائی میں واگھروں کو شکست ہوئی اور اُن کے بہت سے آدمی مارے گئے۔ اُن کے تین جہاز کتنے ہی لوگوں سمیت پکڑ کر کراچی لائے گئے جہاں لکھمی پرساد کی فاتحانہ آمد کا ہم نے خوشی سے استقبال کیا اور شکرانے بجا لائے۔ جب گومتی کے واگھر سردار کو اس واقع کی خبر ملی تو اُس نے میرے دادا کو لکھا کہ اُس کے آدمیوں کو آزاد کیا جائے۔ ان بحری لٹیروں کا دستور تھا کہ وہ گجرات کے جنوبی ساحل پر سفر کرنے والے جہازوں سے ایک قسم کا باج یا خراج وصول کرتے تھے جس کے عوض وہ جہازوں کو ہر قسم کی راہ داریاں یا پروانے دیتے تھے اور اس سہارے پر وہ سمندر میں آزادی سے واگھروں کی مداخلت کے بغیر آمدورفت کر سکتے تھے۔ واگھروں کا سردار اب خراج سے دست بردار ہو گیا اور اس نے وعدہ کیا کہ جن جہازوں کے پاس آپ کا پروانہ ہو گا اُن سے خراج وصول نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی راہ داری طلب کی جائے گی۔ اُس کی شرائط قبول کی گئیں اور اُس نے اس قسم کے معاہدے پر دستخط کیے۔ اس کے بعد واگھروں کے قیدیوں اور جہازوں کو آزاد کر کے گھر بھیجا گیا۔ ۵-۱۸۰۴ میں آخرکار انگریزی سرکار نے واگھروں کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں سے متاثر ہو کر، گومتی اور جزیرے کے قلعوں پر قبضہ کر لیا لیکن گومتی اور جزیرہ ہندوؤں کی یَوتریاترا میں تھیں، اس لیے یہ گائیکواڑ کی استدعا پر، احمد آباد کے عوض، ان کے حوالے کی گئیں۔ اس طرح مشہور شہر احمد آباد انگریزوں کے ہاتھ آیا۔

۵-۱۸۰۴ میں میر غلام علی نے رحلت کی اور میر کرم علی اور مُراد علی کراچی اور سندھ کے والی ہوئے۔ میر کرم علی اور سیٹھ دریانومل گہرے دوست تھے اور ایک دوسرے سے تحفے تحائف کا لین دین رکھتے تھے۔ یہ بات میر مراد علی کو پسند نہ تھی۔ سیٹھ بھوجومل کے چار بیٹے تھے۔ ان میں سے سیٹھ ٹھاکر داس نے پس ماندگان میں چار بیٹے چھوڑے۔ سیٹھ دریانومل کے دو بیٹے تھے۔ سیٹھ لعل مَن داس کا فقط ایک بیٹا ہوت چند تھا۔ سیٹھ ملرام داس کا بھی ایک بیٹا تھا۔ ہمارے خاندان کے سبھی افراد کا آپس میں مکمل اتحاد رہتا تھا جس کی وجہ سے اس خاندان نے اپنے لیے کافی عزت اور اثر پیدا کیا تھا۔ ان کا کاروبار یوں چلتا تھا گویا ایک چھوٹے پیمانے پر حکومت ہے۔ ان کے پاس جورو نوش کے سامان، شامیانے اور دوسرا اسار و سامان رکھنے کے لیے مستر کہ گودام ہوتے تھے۔ ایک بڑے اصطبل میں چالیس بہترین نسل کے گھوڑے اور گھوڑیاں کھڑی رہتی تھیں۔ ایک اور آنگن میں پالتو ہرن، ہما، مور، مورنیاں، کبوتر اور

جسا میں رکھی ہوئی تھیں۔ کراچی والے گھر کا خانگی خرچ کارندوں کی تنخواہوں سمیت چالیس ہزار روپے سالانہ ہوتا تھا۔

۱۸۰۵-۶ میں میرے کچھ بزرگ تیرتھ کرنے کے لیے بال بچوں کے ساتھ ہنگلاج گئے۔ شہر کے تقریباً دو ہزار آدمی بھی ان کے ساتھ تھے۔ وہاں انھوں نے دان پن میں اور پنڈتوں فقیروں کو کھلانے پر بڑی رقمیں خرچ کیں۔ وہ کراچی سے تقریباً ڈھائی مہینے غیر حاضر رہے اور سخاوت میں اتنا نام کمایا کہ بھانڈ اور برہمن ان کی دان کی تعریف کے گن گانے لگے۔ سیٹھ ہوت چند کے بڑے فرزند پریتم داس ۱۸۰۵-۶ سے پہلے پیدا ہوئے تھے۔ اور میں (مصنف) نے ان کے بعد جنم لیا تھا۔ ۱۸۱۱-۱۲ کے لگ بھگ مالار، کچھ، مارواڑ اور آس پاس کے دوسرے علاقوں میں سخت قحط پڑا اور اناج کی سخت قلت ہوئی۔ اس وقت تک میرے بزرگوں کا کاروبار اس قدر بڑھ گیا تھا کہ تقریباً پانچ سو شہروں میں ان کی کوٹھیاں تھیں۔ قحط کے زمانے میں مالار، کچھ، مارواڑ اور گجرات کے لوگوں کے اژدحام سندھ میں ہر جگہ آ جمع ہوئے۔ اس وقت کا مجھے اچھی طرح شعور ہے کہ اناج کی اتنی قلت تھی کہ دنیادار لوگ بھی، جن کے پاس سونے چاندی کی تھیلیاں تھیں، بھوک کے شکار ہو رہے تھے۔ سندھ میں جوار، مانگلی اور جو جیسے سادہ اناج ایک روپے میں تین چار سیر بھی نہیں ملتے تھے۔ بے شمار آدمی مر گئے۔ میرے بزرگوں سیٹھ دریانومل اور سیٹھ تعلمس داس کے پاس اناج کی کوٹھیاں بھری ہوئی تھیں اور انھوں نے سوچا کہ دان کرنے کا اس سے بہتر موقع اور نہیں ملے گا۔ اس لیے انھوں نے اناج مفت تقسیم کرنا شروع کیا اور ذات پات کی تمیز کے بغیر، ہندو ہو یا مسلمان یا کوئی اور، جس کو بھی اناج کی ضرورت ہوتی اُسے روزانہ فی آدمی سیر بھر باجرا یا چاول کے حساب سے ملتا تھا۔ دان کا کام کوٹھی کے عقبی دروازے پر ہوتا تھا اور تقسیم کا کام صبح سے رات کو دیر تک چلتا تھا۔ بہت سے آسودہ حال لوگ مجبوری کے سبب چہرہ چھپائے آ کر خیراتی اناج لیتے تھے۔ سیٹھوں کو پتا چلا کہ بہت سے معزز خاندانوں کو پیسے دے کر بھی اناج نہیں ملتا اور انھیں دن دہاڑے، بلکہ رات کو بھی، سیٹھوں کے دان سے فائدہ اٹھانے سے شرم آتی ہے، کیوں کہ وہ ڈرتے ہیں کہ کوٹھی کے دیوں کی روشنی میں کوئی انھیں پہچان نہ لے۔ اس لیے انھوں نے حکم دیا کہ آئندہ گودام میں رات کو دیے گل کر دیے جائیں اور کوئی بھی مرد یا عورت ہاتھ پھیلائے تو اُسے سیر بھر اناج دیا جائے۔ اس کے بعد کتنے ہی آسودہ حال خاندانوں نے، جنھیں دولت کے بدلے بھی اناج نہیں مل رہا تھا، سیٹھ کی سخاوت کا فائدہ اٹھایا۔ پھر جب میرے بزرگوں کو خبر ملی کہ بہت سے گھروں میں ایسی بیوائیں اور اپاہج رہتے ہیں جن میں باہر نکلنے کی طاقت نہیں، تو انھوں نے ان کے گھروں میں پیشگی مہینے کا غذائی سامان بھیجنے کا انتظام کیا۔ سندھ کے شمال میں، کچھ اور مالار میں، کتنے ہی غریبوں نے اپنے بیٹے اور بیٹیوں کو بیچ کر اناج خریدا۔ میرے بزرگوں کے گماشتوں نے بھی آٹھ دس آدمی خرید کر کراچی بھیجے۔ کراچی میں ان کی اچھی طرح پرورش کی گئی۔ جب وہ بالغ اور کمانے کے قابل ہو گئے تب انھیں آزاد کیا گیا۔ قحط سات آٹھ مہینے شدت سے چلا۔ اس کے بعد مالک کا کرم ہوا اور دوبارہ خوش حالی ہو گئی۔

۱۲-۱۸۱۱ میں میر غلام علی والیِ سندھ رحلت کر گئے۔ ان کے بعد میر کرم علی اور میر مراد علی مل کر سندھ پر حکومت کرنے لگے۔ میر غلام علی کا ایک بیٹا نور محمد نامی تھا، جسے تاج ملا، لیکن وہ چھوٹا تھا اس لیے اس کے نام پر اس کے چچا ناظم کی حیثیت سے کاروبارِ حکومت چلاتے تھے۔ سندھ، کابل اور قندھار، یعنی افغانستان، کے ماتحت تھا اور سال میں نو لاکھ روپے خراج دیتا تھا۔ میروں کے سفارت کار کابل کے دربار میں رہتے تھے اور شاہ شجاول [شجاع] سدوزئی کے زمانے تک رہتے آئے۔ کچھ عرصے بعد شاہ شجاول اور اس کے وزیروں فتح خان اور عظیم خان بارک زئی کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا۔ شاہ نے فتح خان کی آنکھیں نکلوا دیں۔ اس پر سخت خانہ جنگی ہوئی، جس کا انجام یہ ہوا کہ شاہ شجاول شکست کھا کر، لدھیانے جا کر پناہ گزیں ہوا۔ فتح خان اور عظیم خان، پائندہ خان وزیر کے بیٹے تھے، انھوں نے اپنی حکومت ہرات سے کشمیر تک، بلکہ پنجاب کے نواح تک بڑھالی تھی۔

۱۱-۱۸۱۰ میں قندھار کے وزیر عظیم خان نے سندھ پر چڑھائی کر دی۔ اس کا لاڑکانے تک کسی نے بھی مقابلہ نہ کیا۔ لاڑکانے میں اس سے امیروں نے ملاقات کی اور وہ نو لاکھ روپے خراج لے کر خوشی خوشی لوٹ گیا۔ اس کے بعد جلد ہی خراسان میں حالات خراب ہو لیے اور رنجیت سنگھ کی سرکردگی میں سکھوں نے زور پکڑا۔ رنجیت سنگھ نے شمال میں کشمیر فتح کیا اور جنوب میں ملتان تک قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد سندھ کے میروں نے خراسان یا سکھوں کو خراج نہیں دیا۔

۱۶-۱۸۱۵ میں سیٹھ بھوجومل کی اہلیہ محترمہ پاربی بائی کا انتقال ہو گیا اور ۱۷-۱۸۱۶ میں چاروں بھائی (سیٹھ بھوجومل کے فرزند) اپنی ملکیت چار حصوں میں تقسیم کر کے ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ منقولہ ملکیت، جائیداد، گھر، جہاز، کوٹھیاں سب انھوں نے چار حصوں میں تقسیم کر کے ہر بھائی کو ایک ایک حصہ دیا۔ اس کے بعد ہر ایک الگ اپنے طور پر کاروبار کرتا رہا۔ فقط مسقط والی کوٹھی، جس کا ایرانی خلیج، بصرے اور بوشہر میں سیٹھ بھوجومل کے نام سے بیوپار چلتا تھا، اور ایک یوروپی جہاز، جو کارخانے کی ملکیت تھا، مشترکہ استعمال کے لیے رکھا گیا۔ ۲۱-۱۸۲۰ میں سیٹھ دریانومل نے رحلت کی۔ جب سیٹھ بھوجومل کے فرزندوں نے آپس میں ملکیت تقسیم کی تھی تو سیٹھ بھوجومل کا مدفون خزانہ زمین سے کھود کر نکالا تھا۔ پانچ چھ مٹکے جن میں سے ہر ایک میں تین من کے قریب آسکتے تھے، طلائی مہروں، سیتارامیوں اور پرانے چاندی کے سکوں سے بھرے، ہمارے گھر کے قریب ایک جگہ دفن تھے، جسے سیٹھ جوت چند کا گودام کہتے تھے۔ خزانے کے اوپر پانچ سو من گگر کے پانی میں گوندھ کر لیپے گئے تھے۔ زمین اتنی سخت ہو گئی تھی کہ مٹکے کھود کر نکالنے میں بیس آدمیوں کو ایک مہینا لگا۔

اس دوران میں سیٹھ بھوجومل کے چار میں سے تین فرزند وفات پا گئے تھے اور صرف میرے دادا لعلیں داس رہ گئے تھے۔ وہ تجارت میں بہت ماہر تھے اور سندھ میں سب لوگ انھیں پہچانتے تھے۔ ان کا سارا دھیان اپنے کاروبار پر رہتا تھا۔ انھوں نے اپنا کاروبار بہت پھیلایا، جس سے انھیں بہت فائدہ ہوا۔ ۱۸-۱۸۱۷ میں سیٹھ لعلیں داس بینائی سے معذور ہو گئے اور میں (ناؤں مل) ہمیشہ ان کی خدمت میں

حاضر رہتا تھا۔ جب میں گیارہ برس کا تھا تو روزنامچہ لکھنے کا کام اور کراچی کی کوٹھی کی تجارت کا کاروبار میرے حوالے کیا گیا۔ میں شام چھ بجے سے لے کر رات کو تقریباً دس بجے تک روزانہ کارندوں کو بیوپار کے بارے میں چٹھیاں لکھتا تھا۔ تحریر ہندی، سندھی، پنجابی اور گجراتی حروف میں ہوتی تھی۔ بعض اوقات تو ایک وقت میں بیس پورے صفحے بھی لکھنے پڑتے تھے۔

کچھ عرصے کے بعد سیٹھ لعلمن داس کا کاروبار خوب پھیل گیا۔ دوسرے تین بھائیوں کی اولاد عیش و عشرت میں وقت گزارنے لگی اور انھوں نے اپنا کاروبار کماشتوں کے حوالے کر دیا۔ اس وجہ سے انھیں بڑا نقصان ہوا۔ چنانچہ وہ سیٹھ لعلمن داس سے حسد کرنے اور لڑنے لگے۔ مسقط والی کوٹھی سیٹھ بھوجومل کے نام پر چلتی تھی اور اس میں سارے بھائیوں کا مشترکہ حصہ تھا۔ کماشتوں نے موقع پا کر سیٹھ موتی رام، ویرومل اور لچھی رام کو جھگڑا کرنے کے لیے بھڑکایا۔ انھوں نے سیٹھ لعلمن داس پر الزام لگایا کہ انھوں نے اسی جگہ کی کھدائی سے پہلے پانچ چھ مٹکے نکلے تھے، دوسری کوٹھی سے تین اور مٹکے سونے اور چاندی کے کھدوا کر ہضم کر لیے تھے۔ ان کے بھائیوں نے مزید کہا کہ ہمیں بزرگوں کی ملکیت کے بارے میں کوئی معلومات نہیں، یہ بھی معلوم نہیں کہ تقسیم کس طرح کی گئی تھی۔ اس لیے انھوں نے مطالبہ کیا کہ حساب کتاب سرے سے کیا جائے۔ سیٹھ موتی رام نے میر کرم علی کو شکایت لکھ بھیجی کہ لعلمن داس، جو مشترکہ کارخانہ سنبھالتے ہیں، ہمیں حساب کتاب نہیں دیتے۔ آخر فیصلہ خود میروں کے ذمے کیا گیا۔ ہم بہی کھاتوں کے چھ اونٹ لاد کر حیدرآباد کے لیے روانہ ہوئے۔ میرے والد سیٹھ ہوت چند اور میں بھی ان سے سوال جواب کے لیے گئے۔ ہم نے میر کرم علی سے ملاقات کی۔ انھوں نے سیٹھ موتی رام اور سیٹھ ہوت چند دونوں کو اپنے ساتھ ایک ہی پلنگ پر بٹھایا اور دونوں کی گردن میں اپنی باہیں حمائل کر کے کہا کہ میں نے دریانومل کے سر پر سونے کا تاج رکھا تھا، اب میری مرضی ہے کہ تمھیں میروں کا تاج پہناؤں۔ آپس میں نہ لڑو۔ اگر تم میں کسی کو پیسوں کی ضرورت ہے تو میرے خزانے میں تمھیں دینے کے لیے کافی دولت ہے۔ جو چاہیے سو لے لو لیکن آپس میں نہ لڑو۔ وہاں موتی رام کچھ شرمسار ہوئے اور عرض کیا کہ نجابت نواب ولی محمد کے سامنے ہمارے کاغذات کی جانچ کرے۔ آخر ایک جگہ مقرر کی گئی اور نجابت نے پورے چھ مہینے بیٹھ کر دفتر کی جانچ پڑتال کی۔ اس کے بعد نجابت نے سیٹھ موتی رام، ویرومل اور لچھی رام کے حق میں فیصلہ کیا اور حکم دیا کہ مسقط والی کوٹھی کا کاروبار بند کر کے مالکی طور پر فیصلہ کیا جائے۔

ہم کراچی آ گئے لیکن موتی رام اور ان کے چچازاد اس فیصلے پر راضی نہ ہوئے۔ آخر میرے دو سالوں اور سیٹھ موتی رام کے دو فرزندوں کو خیال آیا کہ فریقین کا کافی خرچ آ چکا ہے، سو انھوں نے بیٹھ کر آپس میں صلاح کی کہ بیچ میں پڑ کر سارے اختلافات کا دوستانہ فیصلہ کرنا چاہیے۔ ان کے کہنے پر ہم میر کرم علی اور میر مراد علی سے رخصت ہو کر کوٹڑی گئے، جہاں انھوں نے کہا کہ ہم مشورہ کر کے آپ کو اپنا فیصلہ سنائیں گے۔ آخر رات گئے، سندھو ندی (دریائے سندھ) کے کنارے پر کافی بحث مباحثے

کے بعد انھوں نے میرے والد سے کہا کہ تم رشتوں کا احترام جان کر، اپنے چچازادوں کا سقیم حال دیکھ کر، انھیں بیالیس ہزار پانچ سو روپے دو۔ میرے والد نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ ایک پیسا بھی ناواجب طور پر نہیں دوں گا۔ پھر انھوں نے میری طرف متوجہ ہو کر عاجزی سے کہا کہ تم بیچ میں پڑ کر ہماری مدد کرو۔ میں بے حد حیران ہوا اور باچار والد کی مرضی کے خلاف اور ان کی ناراضی اور غصے کے باوجود، میں نے انھیں اپنے نام سے مذکورہ رقم کی ہُنڈی لکھ کر دے دی جو قسطوں میں ادا کر دی تھی۔ اس کے بعد ہم پھر شیر و شکر ہو گئے اور راستے میں ساتھ کھاتے پیتے کراچی واپس آئے۔

١٨٢٨-٢٩ میں میرے بھائی پرتم داس کا بڑا بیٹا سیرومل چیچک میں انتقال کر گیا۔ ہندوؤں کے رواج کے مطابق میرے دادا لعل من داس کی مرضی تھی کہ ہم میں سے کوئی سیرومل کے کریا کرم کے لیے دوارکا کے مشہور تیرتھ پر جائے۔ جانے کے لیے بہت سے تیار تھے لیکن میرے دادا نے اس کام کے لیے مجھے پسند کیا۔ انھوں نے کہا کہ میں خود دوارکا یاترا کے لیے ١٧٨٦ میں گیا تھا اور اس کے بعد پھر نہیں جا سکا ہوں۔ یہ ضرور ہے کہ تمھیں گھر میں بہت کام ہے لیکن اچھا ہو گا کہ کچھ عرصے کے لیے جا کر دوارکا کے پوتر پانی میں اشنان کر آؤ۔ ہمارے لیے ناروگر نامی ایک کمیا یعنی دو عرشوں والی بیڑی جو ہماری پوربندر والی کوٹھی کی ملکیت تھی، تیار کی گئی اور میں دوارکا کے لیے روانہ ہوا۔ دوارکا سے میں گومتی کے راستے حریرے کی طرف گیا، یہ بھی ایک پوتر جگہ ہے کہ وہاں ہندوؤں کا ایک مندر ہے۔ میں حریرے میں تھا کہ میرے دادا نے ایک خاص قاصد کے ہاتھ، مچھوے (ایک خاص قسم کی کشتی) میں، پیغام بھیجا کہ مجھے بمبئی کے کارندوں کی طرف سے اطلاع ملی ہے کہ بحیرۂ عرب میں عطوفی ڈاکو سرگرم ہو گئے ہیں۔ اس لیے تم احتیاط سے کام لینا اور ہماری تجارت کے بغیر کراچی لوٹنے کی کوشش نہ کرنا۔ لیکن اگر تمھاری مرضی ہو تو خواہ خشکی کے راستے مانڈوی سے آؤ یا پوربندر جا کر ہماری کوٹھی میں ایک آدھ مہینا رہو، جب تک بمبئی سے کوئی اور اطلاع آئے۔ میں یہ خط پڑھ کر بہت خوش ہوا کیوں کہ بات میرے دل کی تھی۔ میں اسی دن پوربندر روانہ ہو گیا۔ پوربندر پہنچا تو میرا دل وجان سے استقبال کیا گیا اور مجھے بڑی شان سے جلوس میں لے جایا گیا۔ ہماری ایک صدی سے بھی زیادہ عرصے سے پوربندر میں کوٹھی تھی۔ پوربندر کا محصول سال میں تین لاکھ راناشاہی 'کوڑیوں' میں نیلام ہوتا تھا۔ فقط ہماری کوٹھی اپنے مال پر سال میں چالیس ہزار کوڑیاں محصول دیتی تھی۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہماری پوربندر والی کوٹھی کا کتنا کاروبار چلتا تھا۔

میں ابھی پوربندر ہی میں تھا کہ مجھے کراچی سے خبر ملی کہ میر کرم علی خان رحلت کر گئے۔ میں نے کراچی پہنچتے ہی دادا کی قدم بوسی کر کے انھیں پوربندر کی کوٹھی کی حالت سے واقف کیا جتنا مجھے بہی کھاتوں سے پتا چل سکا تھا۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ ١٨٣٠-٣١ میں میرے دادا لعل من داس نے نہایت عجیب اور پُراسرار حالت میں پران تیاگے۔ ان کی چِتا پر بہت خرچ آیا۔ دو ماہ تک ہر طبقے کے لوگوں، ہندوؤں اور مسلمانوں، مردوں اور عورتوں کو کھلایا گیا۔ ہندو ہمارے ہاں آ کر کھاتے تھے اور مسلمانوں کو

گھروں میں کھانا بھجوایا جاتا تھا۔ کئی آدمی الگ الگ مقامات سے تعزیت کرنے آئے۔ ان سب کو کھانا دیا جاتا تھا۔ کراچی کے قریب رہنے والوں کو حَب، گِمپیر اور ملیر تک کھانے کا ساماں بھیجا گیا۔

***

۳۲۔ ۱۸۳۱ میں ایک دن بھریور کے ایک ہندو مزدور کے بیٹے گندا سے اس کے استاد نے، جس کے پاس اس کے باپ نے اسے پڑھنے کے لیے بٹھایا تھا، سختی کی۔ لڑکا بیزار ہو کر جا کر ایک مسجد کے دروازے کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔ یہ مسجد اس محلے میں تھی جہاں اب دھوبی رہتے ہیں۔ کچھ مسلمانوں نے اسے دیکھا اور بہلا پھسلا کر اندر لے جا کر بٹھا دیا۔ اس پر طیش میں آ کر ہندو دکان داروں نے اپنی دکانیں مسلمانوں کے لیے بند کر دیں اور انھیں سودا سلف دینے سے انکار کر دیا۔ مسلمانوں نے انتقام لینے کے لیے لیاری کے کنارے جو کنویں تھے اور جہاں سے ہندو پینے کے لیے پانی بھرتے تھے، انھیں ناپاک کر دیا۔ دوسرے دن نورل شاہ نامی ایک سید نے ہمارے محلے میں بری بھلی باتیں کیں اور فحش الفاظ کہتا ہوا گزر گیا۔ میرے چھوٹے بھائی پرسرام نے، جو اس وقت محلے کے بیرونی دروازے کے پاس کھڑا تھا، سید کو نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی۔ اس پر تُو تُو میں میں ہو گئی اور نورل شاہ نے مذہبی جوش میں آ کر کہا کہ پرسرام نے میری اور ہمارے رسول کی شان میں گستاخانہ الفاظ استعمال کیے ہیں۔ مسلمانوں کا اژدحام آ کر اکٹھا ہو گیا۔ جوش اور انتقام ان کی آنکھوں سے ٹپک رہا تھا۔ ہندو بھی جمع ہو گئے اور منصوبے بنانے لگے کہ اب کیا کیا جائے۔ سید نورل شاہ نے ٹھٹھہ، شاہ بندر، مٹیاری، حیدر آباد اور بالا جا کر، قرآن پاک درمیان رکھ کر، مومنوں کو بھڑکایا۔

یہ خبر سارے سندھ میں پھیل گئی اور پورا صوبہ مذہبی جوش کی آگ کی لپیٹ میں آ گیا۔ مسلمان سب متحد ہو گئے۔ ہندو بھی جمع ہونے لگے۔ اسی دوران میں میرا بھائی پرسرام کسی طرح کھسک کر سندھ سے جیسلمیر چلا گیا۔ مسلمان بڑی تعداد میں حیدر آباد آ کر جمع ہو گئے اور بہت شور کیا۔ انھوں نے میر مراد علی پر زور دیا کہ وہ سیٹھ ہوت چند کو فرمان بھیجیں کہ اپنے بیٹے پرسرام کو حیدر آباد روانہ کرے۔ پرسرام کراچی میں نہیں تھا۔ میر مراد علی نے دوسرا فرمان بھیجا کہ بیٹے کے بدلے تم آ کر حاضر ہو۔ اس لیے سیٹھ ہوت چند تقریباً دو ہزار ہندوؤں کو ساتھ لے کر خود حیدر آباد روانہ ہوئے۔ فرمان کے ساتھ سیٹھ کی حفاظت کے لیے ایک فوجی دستہ بھی آیا تھا۔ اس نے سیٹھ کو جان کی سلامتی کا اطمینان دلایا اور ان سے کہا کہ ہمارے ساتھ چلیں۔ مسلمان سینہ زوری اور سرکشی سے کام لینے لگے مگر میر مراد علی نے انھیں سیٹھ ہوت چند کے خلاف ہاتھ اٹھانے سے روکا۔ پھر مسلمان میر مراد علی کی صاحب زادی کے پاس پہنچے جو تاج کے وارث میر محمد کی اہلیہ تھیں اور انھیں بہت سماجت کر کے اپنا حامی بنایا۔ پھر انھیں قرآن دے کر وفد کے ساتھ میر مراد علی کے پاس بھیجا۔ وہ انھیں انکار تو نہ کر سکے تاہم ان سے کہا کہ سیدوں کو سمجھاؤ کہ حیدر آباد میں کوئی زیادتی نہ کریں۔ اور مزید کہا کہ میں انھیں نصرپور کے پیر کی طرف بھیج دیتا ہوں؛ وہاں

خوجی میں آنے کریں۔ پھر سب نصرپور گئے۔ میر مراد علی کی طرف سے دو ایلچی بھی ان کے ساتھ گئے لیکن میر کے ایلچی متعصب مسلمان تھے اور اندرجانے دوسرے مسلمانوں سے ملے ہوئے تھے۔ نصرپور میں قاضی نے مسلمانوں کی سماعت سے انکار کر دیا اور اپنے سامنے بحث کی اجازت نہیں دی، کیوں کہ اس نے دیکھ لیا تھا کہ مسلمان ظلم پر کمر بستہ ہیں۔ لیکن مسلمان بہت تھے اور ان کا بڑا ہنگامہ تھا۔ وہ ہندوؤں پر اچانک حملہ کر کے سیٹھ ہوت چند کو درمیان سے اغوا کر کے لے گئے۔ وہاں سے وہ سیدھے حیدر آباد آئے، جہاں سے بیڑی کرائے پر لے کر، ٹھٹھ اور تعلقہ شاہ بندر میں ماگانی کی طرف روانہ ہو گئے۔ ماگانی میں سیٹھ ہوت چند کو نورل شاہ کے ایک عزیز مسلو شاہ کے گھر لے جا کر رکھا گیا، جو ایک مشہور کٹر سید تھا۔ وہاں دس گیارہ دن گزر گئے، لیکن سیٹھ ہوت چند نے ایک دن بھی کھانا نہ کھایا اور فقط تھوڑے سے خشک پھلوں اور مُرمُروں پر گزارہ کرتے تھے جو پرو نامی سنار ایک وفادار ملازم انھیں دیتا تھا۔ یہ پرو بھیس اور نام بدل کر سیٹھ کے ساتھ گیا تھا اور سارا عرصہ ان کے ساتھ رہا۔ سیٹھ ہوت چند کو یہ علم تھا کہ مسلمان انھیں فرار ہونے نہ دیں گے، اس لیے وہ جہاں بھی انھیں لے جایا گیا، وہاں ان کے ساتھ نڈر ہو کر گئے۔ ماگانی میں مسلمانوں نے سوچا کہ انھیں زبردستی مسلمان کیا جائے، لیکن اتنی بڑی عمر کے آدمی کا (وہ پچاس برس سے زیادہ عمر کے تھے) ختنہ کرنا قرآن کے خلاف تھا۔ اس کے علاوہ وہ ڈر بھی رہے تھے کہ نہ جانے اس بات کا آئندہ کیا نتیجہ نکلے۔ اس دوران میں میر مراد علی کو ان کے ارادوں سے آگاہ کیا گیا۔ انھوں نے سوچا کہ معلوم نہیں اس بات کا انجام کیا ہو گا، کیوں کہ ہندوؤں نے سندھ کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک ان کارروائیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تھی۔ کچھ اور جیسلمیر کے راجاؤں نے بھی سندھ میں جو کچھ ہو گزرا تھا، اس پر اپنے دُکھ کا اظہار کیا تھا۔ میر مراد علی اپنے کیے پر پچھتائے اور انھوں نے ٹھٹھے کے نواب غلام حیدر جہانگلانی کو واضح حکم بھیجا کہ سیٹھ ہوت چند کو مسلمانوں کے ہتھے سے آزاد کرا کے فوراً اپنے ساتھ حیدر آباد لے آئے۔ چناں چہ غلام حیدر سیدھے ماگانی جا کر سیٹھ ہوت چند کو آزاد کرا کے حیدر آباد لے آیا۔ اس طرح سیٹھ نصرپور سے اغوا ہونے کے بعد دس بارہ دن مسلسل اپنے دھرم کو بچانے کی خاطر، سخت بھوک کاٹ کر اور مسلمانوں کے ہاتھوں طرح طرح کی سختیاں سہہ کر، دوبارہ حیدر آباد آ پہنچے۔ مسلمانوں کی مرضی تھی کہ سیٹھ کو بھوکوں مار کر، مجبور کر کے، اپنے برتنوں میں کھانا کھلائیں۔ آخر حیدر آباد آ کر سیٹھ نے ایک ہندو رسوئیا رکھا جس نے روٹی تیار کی، جو انھوں نے کئی دنوں کے بعد پہلی بار کھائی۔

میر مراد علی کو جب سیٹھ ہوت چند کی آمد کی خبر ملی تو انھیں فوراً اپنے پاس بلا کر پوچھا، اب تمھارا کیا ارادہ ہے؟ سیٹھ نے جواب دیا، مجھے اب دوبارہ اس دنیا میں دنیادار آدمی بن کر رہنے کی خواہش نہیں۔ میں اپنے دن صوفی فقیر بن کر گزاروں گا۔ میر مراد علی نے یہ جواب سن کر اپنی طرف سے دکھ کا اظہار کیا اور کہا، جیسی تمھاری مرضی۔ پھر وہ رخصت ہو کر میر کے ایک حاصیلی، سجاول، کی اوطاق میں جا رہے۔ حیدر آباد میں ہمارے سیکڑوں رشتے دار تھے۔ وہ سارا وقت سیٹھ ہوت چند کی خدمت کے

باہر پھرتے رہے۔ انھوں نے خفیہ طور پر ٹنڈو غلام علی کے میر غلام علی پیرور کی مدد سے انھیں چوری چھپے نکال لے جانے کا انتظام کیا تھا۔ میر غلام علی سیٹھ ہوت چند پر مہرباں تھے کیوں کہ ان کے بزرگوں کی سیٹھ کیول رام سے دوستی رہی تھی۔ ان کی مرضی تھی کہ سیٹھ ہوت چند کے دوست انھیں کسی طرح پھلیلی نہر کے کنارے پہنچا دیں تو وہ خود ہی انھیں سندھ کے مسلمانوں کے شکنجے سے باہر نکال لے جانے کا بندوبست کرلیں گے۔ چناں چہ سیٹھ اسی رات منہ اندھیرے وہ دوستوں کی مدد سے بھیس بدل کر پھلیلی کے اس پار گئے۔ میر غلام علی وہاں خود منتظر کھڑے تھے اور وہ انھیں پو پھٹنے سے کافی پہلے ٹنڈو میر محمود کے قریب راہوؤں کے گاؤں میں خیریت سے پہنچا آئے جہاں وفادار محافظ انھیں لکھپت پہنچانے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ لکھپت میں ہماری کوٹھی تھی جہاں بہت سے گماشتے رہتے تھے۔ ہمارا سر کردہ گماشتہ کرم چند مولیانی تھا جو کچھ کے رائے کو سیٹھ ہوت چند کے بارے میں سب خبریں پہنچاتا تھا۔ جب راؤ کو اطلاع ملی کہ سیٹھ کو لکھپت لایا جارہا ہے تو انھوں نے اپنے خاص کارکن کو لکھا کہ سندھ والی سمت، نہر کے کنارے پر ایک بیڑی، خورونوش کے ساماں اور پچیس سپاہیوں کے ساتھ تیار رکھے تاکہ انھیں فوراً لکھپت پہنچائیں۔ اس لیے سیٹھ جب وہاں پدھارے تو ان کا پُرجوش استقبال کیا گیا۔ جب میر مراد علی اور سندھ کے مسلمانوں کو سیٹھ کے لکھپت پہنچنے اور استقبال کی خبر ملی تو وہ بہت شرمندہ ہوئے اور میر نے اتنا سوگ منایا جیسے کوئی قیمتی شے ان کے ہاتھوں سے اچانک نکل گئی ہو۔ دس برس وہ لکھپت والی کوٹھی کے کاروبار کی نگرانی کرتے رہے۔ ہمیں بڑا نشیمت کے کریا کرم پر لاکھ روپے خرچ پڑے۔

میر مراد علی ۱۸۳۳-۳۴ میں انتقال کر گئے۔ انتقال سے قبل، جب ابھی ان کے حواس بجا تھے، تو انھوں نے اپنے دل کا غبار اس طرح ظاہر کیا: مجھے اب بچنے کی کوئی امید نہیں لیکن مجھے اس بات کا سخت افسوس ہے کہ میں نے شاہ سجاول (شجاع) کو لدھیانے سے حیدرآباد آنے کے بعد، کیوں یہاں رہنے کی اجازت دی اور ان کی رہائش کا انتظام کیوں کیا۔ انگریز سرکار سے معاہدہ کیوں کیا۔ اگر میں زندہ رہتا تو ضرور اسے سنبھالتا لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ میرے جانشیں اس کی عزت یا خیال نہیں رکھیں گے۔ میں اپنے بیٹوں کے درمیاں صلح کرانے میں ناکام رہا۔ میر ان احساسات کو ظاہر کرنے کے دو دن بعد وفات پا گئے۔ ان کی وفات کے بعد شاہ سجاول نے شکارپور میں زور پکڑا اور اپنا اثر بڑھایا۔ اس پر حیدرآباد کے مشترکہ حکمراں میر نور محمد، نصیر خاں، میر محمد خاں اور میر صوبدار خاں سا سوچے سمجھے، ایک بڑا لشکر لے کر شاہ سجاول پر حملہ آور ہوئے۔ وہ روہڑی کے برابر دریائے سندھ کے کنارے چھاؤنی چھائے بیٹھا تھا۔ شاہ سجاول کے وزیر سمندر خاں نے آٹھ روہیلوں اور خراسانی پٹھانوں کی فوج کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا۔ دریائے سندھ کے اس پار سکھر کی سمت سخت لڑائی ہوئی جس میں میروں کی پچاس ہزار فوج نے شکست فاش کھائی۔

***

۱۸۳۵-۳۶ کے آخر میں لیفٹیننٹ کرنل پاٹنجر (بعد میں سر ہنری پاٹنجر) حیدر آباد آئے۔ میری ان سے اس وقت سے آشنائی ہوئی، جس سے آگے چل کر ہمارے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوا۔ ۱۸۳۵-۳۶ میں مسٹر (بعد میں سر) الیگزینڈر برنس جو غوج میں کرنل پاٹنجر کے پاس تھے، مسٹر لیکی کے ساتھ سندھ آئے جہاں سے انھیں بمبئی سرکار کے حکم کے مطابق لاہور اور کابل جانا تھا۔ کابل سے لوٹنے کے بعد مسٹر برنس کو لاہور میں تعینات کیا گیا، جہاں سے انھوں نے ۱۸۳۷ میں مجھے ایک خط لکھا کہ اگر تم سرکار کی خدمت میرے توسط سے کرتے تو میں تمھیں آج کسی بڑے عہدے پر پہنچاتا۔ اُدھر مسٹر لیکی نے جو پیچھے قلات میں رہ گئے تھے، مجھے لکھا کہ ڈھائی سو بھیڑیں لے کر بمبئی بھیجو کہ ان کی انگلینڈ میں ضرورت ہے۔ یہ بھیڑیں سون میانی منگوائی گئیں اور میں نے اپنے گماشتے کو لکھا کہ بمبئی بھیج دے۔

۱۸۳۶-۳۷ میں کرنل پاٹنجر نے مجھے لکھا کہ مسٹر برنس کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر جیمز برنس کو سندھ کے راستے لاہور جانا ہے۔ وہ کراچی میں اتریں گے، جہاں سے حیدر آباد گھومتے ہوئے آگے جائیں گے۔ تم جا کر ان سے ملو اور ان کی مدد کرو۔ حیدر آباد کے میروں کو بھی اطلاع دی گئی کہ ڈاکٹر برنس کراچی گھومنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے اپنے نواب کو لکھا کہ ڈاکٹر برنس کو کراچی میں اترنے کی اجازت نہ دی جائے بلکہ انھیں گذری میں اتار کر پھر دوسری کشتی میں چڑھا کر گیٹی بندر کے راستے حیدر آباد بھیجا جائے۔ میر کے آدمی ڈاکٹر برنس کی تاک میں بیٹھے تھے۔ وہ جیسے ہی پہنچے، انھیں گذری پر اتار کر، وہاں سے کشتی میں سوار کرا کے حیدر آباد روانہ کر دیا گیا۔ میرے آدمی بھی ہوشیار تھے، انھیں جوں ہی موقع ملا، جا کر ڈاکٹر برنس سے ملے اور انھیں میرا سلام پہنچایا اور میری طرف سے مکھن اور خشک میوے نذر کیے۔ انھیں کرنل پاٹنجر کے خط کا پتا تھا اور انھوں نے میرا شکریہ ادا کیا۔

۱۸۳۷-۳۸ میں کرنل پاٹنجر نے لکھا کہ کپتان کارلیس بارہ دوسرے صاحب لوگوں کے ساتھ پالینیورس جہاز میں کراچی کی بندرگاہ کے دہانے کی پیمائش لینے کے لیے آ رہے ہیں، میں کپتان کارلیس کا خیال رکھوں اور ان کی ہر طرح سے مدد کروں۔ انھوں نے یہ اطلاع حیدر آباد کے میروں کو بھی بھیجی تھی کہ ان کی مدد کریں اور ان کے کام میں رکاوٹیں نہ ڈالیں۔ اس پر میروں نے کراچی کے نواب حسن خاں کو لکھا کہ کپتان کارلیس کا انتظار کرے۔ یہ صاحب ۵ مارچ ۱۸۳۷ کو اتوار کے دن، بارہ صاحبان کے ساتھ پہنچے۔ میں گھاٹ پر جا کر انھیں شہر میں لے آیا اور انھیں بتایا کہ میروں نے انھیں پیمائشیں لینے کی اجازت دے دی ہے۔ نواب سے مل کر کیپٹن کارلیس اور ان کے دوسرے صاحب لوگ ساتھی میرے گھر آئے لیکن زیادہ وقت نہیں ٹھہرے۔ دوسرے دن ناشتا کر کے میں کپتان کارلیس کے ساتھ منوڑے سے پرے جہاز پر ملنے گیا۔ جہاز منوڑے سے اتنی دور کھڑا تھا جتنا منوڑا کراچی سے دور ہے۔ وہ جتنا عرصہ کراچی میں رہے، میں انھیں غذائی سامان مہیا کرتا رہا۔ جو یوروپی صاحبان ان کے ساتھ تھے ان میں سے دو تین رات پالینیورس جہاز پر رکے اور دوسرے سورج غروب ہونے کے بعد میرے

پاس آ کر ٹھہرے۔
کراچی کی مال گزاری کا ٹھیکا اللہ رکھیو لوہار کو ملا ہوا تھا۔ ایک دن اس کا بھتیجا احمد، کیپٹن کارلیس کے پاس جا کر انھیں پہاڑیوں میں شکار کی دعوت دے آیا۔ میں نے سواری کے لیے اونٹ اور گھوڑے تیار کرا کے بندرگاہ پر کھڑے کر دیے۔ کیپٹن کارلیس اور آٹھ دوسرے صاحب لوگ احمد کے ساتھ مل کر پہاڑی کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں گھر آ کر اشنان کر کے، ناشتے پر بیٹھا ہی تھا کہ اتنے میں ایک شخص نے آ کر بتایا کہ کراچی کا نواب حسن خان اس بات پر ناراض ہے کہ صاحب لوگوں کی اتنی ہمت ہو گئی ہے کہ وہ بلااجازت احمد کے ساتھ مل کر ہمارے علاقے کے اندر چلے گئے ہیں۔ اُس نے مزید کہا کہ وہ سو آدمی لے کر ان کے تعاقب کرنے کے لیے تیار ہو گیا ہے اور کہہ رہا ہے کہ میں انھیں قتل کر دوں گا۔ مجھے جب یہ پتا چلا تو میں چار پانچ آدمی لے کر گھوڑوں پر جلدی جلدی صاحب لوگوں کے تعاقب میں گیا اور چارا ستھی کی پہاڑیوں کے پاس ان تک پہنچ گیا اور ان سے کہا کہ حسن خان نواب غصب ناک ہو رہا ہے؛ بہتر یہی ہو گا کہ آپ لوٹ چلیں کہ کہیں وہ آپ کا تعاقب نہ کرے۔ احمد خان کو جب پتا چلا کہ حسن خان انھیں قتل کرنے آ رہا ہے تو وہ ہوا کے مانند فرار ہو گیا اور میں صاحب لوگوں کو واپس لے آیا۔ واپسی پر میں نے حسن خان کو آتے دیکھا۔ وہ گھوڑے پر تھا اور پیچھے کئی ہتھیار بند آدمی پیدل آ رہے تھے۔ میں گھوڑا دوڑا کر اس تک جا پہنچا اور صاحب لوگوں سے کہا کہ آپ یہیں ٹھہریں۔ میں نے حسن خان سے پوچھا کہ کیا ماجرا ہے؟ وہ کہنے لگا کہ میں صاحب لوگوں کو نہیں چھوڑوں گا۔ ان کا حوصلہ اتنا بڑھ گیا ہے کہ وہ اجازت کے بغیر میرے علاقے میں شکار کے لیے داخل ہو گئے ہیں۔ میں نے اُس سے کہا کہ اس میں صاحب لوگوں کا کیا قصور؟ ٹھیکے دار کا بھتیجا، جو خود دربار کا عامل ہے، انھیں دعوت دے کر شکار کے لیے لایا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ میں احمد کو پکڑ کر اسے سبق سکھاؤں گا۔ میں نے بتایا کہ احمد تو بھاگ گیا ہے البتہ صاحب میرے آدمیوں کے ساتھ کھڑے ہیں۔ میں نے اس سے کہا کہ آپ خوف ناک ہتھیاروں سے کھیل رہے ہیں، میروں کو یہ روش پسند نہیں آئے گی اور وہ آپ کو ملامت کریں گے۔ اس پر وہ کچھ ٹھنڈا ہوا اور کہا کہ اچھا صاحب لوگوں سے کہو کہ وہ شہر سے باہر سیدھے جہازوں پر جائیں۔ میں نے اُس سے وعدہ کیا کہ صاحب ایسا ہی کریں گے۔ جب اُس نے دیکھ لیا کہ صاحب لوگ بندرگاہ کی طرف جا رہے ہیں، تو وہ بھی الٹے قدموں روانہ ہو گیا۔ ہم بندرگاہ پر پہنچے، اس سے بہت پہلے مدّوجزر ختم ہو گیا تھا اور سمندر کنارے سے بہت ہٹ گیا تھا۔ میں نے سب صاحب لوگوں کو چارپائیوں پر بٹھا کر، مزدوروں سے اٹھوا کر ان کی بیڑی پر پہنچایا۔ مدوجزر کی وجہ سے بیڑی بہت دور چلی گئی تھی اور مزدوروں کو کیچڑ میں سے گزرنا پڑا۔ کپتان کارلیس نے مجھ سے کہا کہ آپ بندرگاہ پر ٹھہریں، جب تک ہماری بیڑی روانہ ہو جائے اور ہم بندوق سے فائر کر دیں۔ میں وہاں اس وقت تک کھڑا رہا جب تک ان کی بیڑی کیماڑی کے پاس سے گزر کر نظر سے غائب نہ ہو گئی۔
میں سورج ڈھلنے کے بعد گھر لوٹ آیا اور دوسرے دن صبح بہار پر گیا حالاں کہ ٹھنڈ بہت تھی اور ہوا

سی لگی۔ میں نے کپتان کارلیس سے گزشتہ دن کے واقعات کے بارے میں بات کی اور انھیں مشورہ دیا کہ جو کچھ ہوا ہے، اس کا سارا احوال حیدر آباد میں میروں کے دربار میں بمبئی سرکار کی طرف سے مقرر کردہ سفیر جیٹھا سد کے توسط سے لکھ بھیجیں۔ آخر منشی بابلی نے جو کرنل پاٹنجر کے کہنے پر کپتان کارلیس کے ساتھ آیا تھا، فارسی میں ایک خط لکھا، جو میں نے ایک قاصد کے ہاتھ منشی جیٹھا سد کو بھیج دیا۔ اڑتالیس گھنٹوں کے بعد وہ خط منشی تک پہنچا۔ اس نے حیدر آباد کے میروں کو خط کے مضمون سے آگاہ کیا۔ میر نور محمد کو حسن خان کی روش پر غصہ آیا اور انھوں نے حکم دیا کہ وہ صاحب لوگوں سے اس ہتک کی فوراً معافی مانگے۔ یہ حکم نامہ پانچویں دن ایک رقعے کے ساتھ مجھے ملا۔ حسن خان ڈر گیا، اس لیے سیدھا میرے پاس آیا کہ تم درمیان میں پڑ کر کپتان کارلیس اور ان کے دوستوں سے مجھے معافی دلوا دو۔ منشی جیٹھا سد کا خط مجھے شام کو ملا اور وہ میں نے کپتان کارلیس کو بھیج دیا اور یہ بھی کہلوا بھیجا کہ حسن خان اب پشیمان ہو گیا ہے۔ دوسرے دن جب میں کپتان کارلیس کی طرف گیا تو حسن خان دوسری سیڑھی میں میرے پیچھے آیا۔ اس نے بار بار معافی مانگی اور پچھتاوا ظاہر کیا۔ پھر کپتان کارلیس نے منشی جیٹھا سد کے نام ایک خط لکھوایا کہ حسن خان نے بڑی خطا کی ہے لیکن چوں کہ وہ شرمندہ ہے اور اس نے معافی مانگی ہے، اس لیے اس کا جرم معاف کیا جاتا ہے۔

کپتان کارلیس تین مہینے کراچی میں رہے۔ ان کے یورپی عمال سارا دن جہاز پر پیمائش کرنے میں مشغول رہتے تھے اور رات کو لوٹ کر میرے گھر آ جاتے تھے۔ تین مہینے گزرنے کے بعد، کپتان کارلیس سون میانی روانہ ہو گئے جہاں سے وہ بصرہ چلے گئے۔ میں نے انھیں دونوں شہروں میں اپنے گماشتوں کے نام تعارفی رقعے دیے۔ مجھے خوشی ہے کہ میرے گماشتوں نے ان کی خاطر خواہ خدمت کی۔ کراچی میں کپتان کارلیس کی مجھ سے دوستی ہو گئی تھی اور وہ میرے پاس رہے تھے، اس لیے سندھ اور ہمسایہ علاقوں کے لوگوں نے سمجھا کہ انگریز سرکار نے سندھ میں مجھے اپنا سفیر مقرر کیا ہے۔

۱۸۳۸ میں کرنل پاٹنجر بھوج سے حیدر آباد پہنچے جہاں سے انھوں نے مجھے لکھا کہ انگریزوں کی ایک بڑی فوج سر جان کین کی قیادت میں، بمبئی سے گھوڑا باری کے راستے ہانسی کوٹ کے لیے روانہ ہو چکی ہے، جہاں سے یہ دریائے سندھ کے راستے شکارپور جائے گی۔ سارے سفر میں اس کی آسائش اور رسد کا انتظام کرنا ہے۔ میں ایسا مشکل اور اہم کام آپ کے علاوہ کسی اور کے حوالے نہیں کر سکتا، کیوں کہ مجھے آپ پر پورا اعتماد ہے۔ امید ہے کہ آپ یہ کام عقل مندی، قابلیت اور پوری جاں فشانی سے نبائیں گے۔ انھوں نے اس خط کے ساتھ دو لاکھ کوڑیوں کی منڈی بھوج کے تاجروں کے نام اور اس کے علاوہ بمبئی اور کلکتے کی منڈیاں بھی بھیجیں۔ انھیں ضرورت کے مطابق بھنا کر رسد کے محکمے کے لیے چاول، گندم، جو اور باجرا خریدنا تھا۔ یہ سامان پھر رفتہ رفتہ مختلف بیڑیوں کے ذریعے، بھوج کے ایک مادھو نامی شخص کے نام گھوڑا باری بھیجا جاتا تھا جو انگریزوں کا کارندہ تھا۔ اسے ہدایت کی گئی تھی کہ وہ رسد کے محکمے

کے عمال سے مل کر، سناماں منگائے۔ اس کے علاوہ مجھے کہا گیا کہ دو ہزار اونٹ اور آٹھ سو یا ہزار بیل، ماہانہ کے حساب سے کرائے پر لے کر، بااعتماد آدمیوں کے ساتھ تیار رکھوں کہ ان کی کسی بھی وقت ضرورت پڑے تو کام آسکیں۔

میں نے ان ہدایتوں کے مطابق اناج خرید کر گھوڑا باری بھیجنا شروع کیا۔ اس خریداری کی وجہ سے کراچی کے بازار میں اناج کے نرخ بڑھ گئے اور میروں کے عمال نے رکاوٹیں ڈالنی شروع کر دیں۔ انھوں نے کراچی کے غریب مسلمانوں کو بھڑکایا کہ وہ میرے دروازے پر دھرنا دے کر ہنگامہ کریں۔ چناں چہ ایک دن صبح کو ہزار مسلمانوں کا ہجوم آ کر میرے دروازے پر اکٹھا ہوا، اور وہ پکارنے لگے کہ تم نے قحط پیدا کیا ہے اور غریبوں کو بھوکوں مار دیا ہے۔ میروں کے عمال نے اس طرح بالواسطہ مخالفت شروع کی لیکن وہ ہمارا کچھ بھی نقصان نہ کر سکے۔ میں نے کسی کی بھی پروا نہیں کی۔ میرے کئی ملکوں پر گماشتے تھے جو سون میانی اور سیوھن سے میرے حکم کے مطابق اناج خریدتے تھے جسے ایمان دار نوکروں کے ہاتھوں دریائے سندھ کے راستے گھوڑا باری بھیجا جاتا تھا۔

اس دوران میں مَیں اونٹوں کا انتظام کرتا رہا۔ ٹالپر حکومت کے عمّال ہر وقت میری کوششوں کو ناکام بنانے کی سعی کرتے رہے۔ وہ ساربانوں کو چوری چھپے ڈراتے تھے اور ان کے دلوں میں یہ خیال بٹھاتے تھے کہ ٹالپروں کے علاقے سے گزر کر جانا کوئی آسان بات نہیں۔ فرنگیوں کی فوج کا ضرور مقابلہ کیا جائے گا اور شاید جنگ ہو، جس میں تم غریب ساربانوں کو بے جا نقصان پہنچے گا اور تم مفت میں مارے جاؤ گے۔ تمھاری بھلائی اسی میں ہے کہ کرائے پر اونٹوں کے دینے سے انکار کر دو۔ یہ باتیں تفصیل سے میرے علم میں آئیں۔ میں نے رہنمائی بلوچوں کو، جو ہمارے بزرگوں کے زمانے سے ملازم تھے اور میرے اخلاقی اثر میں تھے، ملا کر ان سے پانچ سو اونٹ خریدے، جو ان کے قبیلے کی ملکیت تھے۔ اسی طرح میں نے کچھ اور لوگوں سے، جن پر مجھے اعتماد تھا، اونٹ کرائے پر لیے۔ پھر میں نے سوچا کہ کراچی سے تیس کوس دور گھارو میں، جہاں ہماری سو سال سے کوٹھی تھی، جا کر کچھ عرصہ رہا جائے تاکہ زیادہ آسانی سے اونٹ مہیا ہو سکیں، کیوں کہ کراچی میں امکان تھا کہ اونٹوں کی مطلوبہ تعداد نہ مل سکے۔ یہ فیصلہ کر کے میں نے کرائے پر حاصل شدہ اونٹوں کے مالکوں کو مشورہ دیا کہ اونٹوں کو لے کر گھارو چلیں کہ وہاں چارہ بہت ہے۔ پھر میں بھی خاموشی سے گھارو چلا گیا۔ گھارو میں میرے گماشتے مانک رام نے میری ہدایتوں کے مطابق کام کرنا شروع کیا اور دو دن کے اندر اس نے میرے گھر پر ملیر کے میمنوں اور جوکھیوں کے قبیلوں کے معزز افراد اور دوسرے اونٹ والوں کو لا حاضر کیا۔ میں نے ان سے اقرار نامے لکھوا لیے، پھر مزید اطمینان کے لیے ابتدائی انتظام کر کے میں نے لوگوں سے کہا کہ اونٹ گھارو میں لے آؤ تاکہ ان کا داخلہ کر کے، گاؤں کے آس پاس دو تین کوس کے اندر انھیں چارے کے لیے چھوڑ دیں، تاوقتیکہ ان کی ضرورت پڑے۔ اس کے بعد میں نے جوکھیوں کے سردار جام مہر علی کو اس سودے کی خبر دی، چوں کہ میں نے اس کی قوم والوں سے سودا کیا تھا، اس لیے اسے بتانا ضروری سمجھا۔ اس نے اپنے لوگوں پر

بے حد خفگی ظاہر کی کہ تم نے کیوں میرے مشورے کے بغیر اونٹ دے دیے۔ جام ... سائے تھے، اس کا مجھے پتا چل گیا، چناں چہ میں نے مانک رام کو اُس کے گاؤں ملیر بھیجا کہ جا کر اسے لے آئے۔ وہ جام کو لے آیا۔ میری جام سے طویل ملاقات ہوئی اور آخر میں اُسے ہار رکھنے میں کامیاب ہو گیا۔ جام ایک سو کا شیر تھا اور اسے کچھ اناج اور کچھ سودا بیٹھا کرنے کی ضرورت تھی۔ کہنے لگا کہ میں خانہ زاد ہوں، مجھے قرض چاہیے۔ اس پر میں نے مانک رام کو کہا کہ اسے دو ہزار روپے دے دو مگر مانک رام کا اس پر پہلے ہی کسی حساب میں پانچ ہزار روپے قرض تھا۔ وہ اس سے ہمیشہ قرض لیتا تھا۔ مانک رام نے اس دو ہزار روپے مزید دیے، کچھ نقد اور کچھ جنس۔ جام نے وعدہ کیا کہ میں اب وفادار بن کر رہوں گا۔

میں نے سا کرو میں پانچ سو بار بردار بیل ماہانہ حساب سے کرائے پر حاصل کیے اور ان کے مالکوں سے اقرار نامے لیے اور سارے اونٹ گھارو میں منگوا لیے۔ اس کے بعد میں نے اناج اور دیگر غذائی سامان اکٹھا کرنے اور اونٹوں اور بار بردار بیلوں کو حاصل کرنے سے متعلق کرنل پاٹنجر کو احوال لکھ بھیجا۔ وہ بہت خوش ہوئے اور انھوں نے میری لیاقت اور دانش مندی کی تعریف کی۔ جلد ہی پھر کرنل پاٹنجر حیدر آباد سے گھوڑا باری اور وہاں سے ماسی کوٹ روانہ ہو گئے۔ ان کے دو نائب تھے ایک لیفٹیننٹ ڈبلیو جی ایسٹوک اور دوسرا لیکی۔ اسی زمانے میں سر جان کین ایک شاہی فوج کے ساتھ بمبئی سے گھوڑا باری پہنچے۔ اس سے پہلے سر جان کین کے نائب کیپٹن آؤٹرام کو بمبئی کے گورنر نے کراچی بھیجا۔ انھیں ہدایت کی گئی تھی کہ میرے پاس رہ کر پتا چلائیں کہ کرنل پاٹنجر نے مجھے فوج کی رسد کے لیے اناج جمع کرنے اور اونٹ اور بار بردار بیل حاصل کرنے کے لیے جو فرمائشیں کی تھیں، ان کا میں نے کتنا خیال رکھا ہے۔ وہ ایک چھوٹی دیسی بیڑی میں سوار ہو کر آ پہنچے۔ بندر گاہ پر انھیں میرے بھائی پریتم داس اور سکھ رام داس لینے گئے۔ سکھ رام داس انھیں بیڑی سے کنارے تک لے کر آیا۔ کیپٹن آؤٹرام کے ساتھ یقیناً کچھ نوکر تھے لیکن وہ سیدھیوں کے ڈر سے ان کے ساتھ کنارے پر نہیں اترے۔ آؤٹرام کچھ بسکٹ اور ڈبل روٹیاں رومال میں باندھ کر، ایک لٹھ ہاتھ میں پکڑے، میرے بھائی سکھ رام داس کے ساتھ آ گئے۔ آتے ہی انھوں نے میرا پوچھا۔ انھیں بتایا گیا کہ ٹالپروں کی حکومت کے عمال نے کراچی میں اونٹ اور بیل حاصل کرنے میں رکاوٹیں ڈالیں، اس لیے میں خود کوشش کرنے گھارو گیا ہوں۔ کیپٹن آؤٹرام دو دن میری کوٹھی یعنی کاروبار والی جگہ پر رکے رہے۔ وہ مجھ سے ملاقات کے منتظر تھے، اس لیے انھوں نے سکھ رام داس سے کہا کہ میرے ساتھ گھارو چلو۔ ناچار دو سواری کے اونٹ فوراً تیار کیے گئے۔ ایک پر سیٹھ سکھ رام داس اور کیپٹن آؤٹرام ساتھ سوار ہوئے اور دوسرے پر دو نوکروں کو ساتھ لیا گیا۔ شام کو میں اپنے گھر کے آنگن میں کرسی پر بیٹھا تھا، کیا دیکھتا ہوں کہ میرا بھائی اونٹ پر سوار ہے اور اس کے پیچھے ایک فرنگی بیٹھا ہے۔ میں نے یورپی کو عزت سے لا کر پلنگ پر بٹھایا جس پر گدا بچھا ہوا تھا۔ روایتی خیر و عافیت کے بعد کیپٹن آؤٹرام نے مجھے اپنی آمد کے مقصد سے واقف کیا۔ میں نے انھیں اطمینان دلایا کہ کرنل پاٹنجر کے احکام کا ہر طرح خیال رکھا گیا ہے۔ یہ خبر سن کر وہ بے حد خوش ہوئے اور

کہنے لگے کہ مجھے کل ماسی کوٹ جانا ہے، سواری کا انتظام کرو اور مجھے یہاں سوار اور اپنا بھائی سکھ رام بھی ساتھ میں دو۔ دوسرے دن پوپھٹے کیپٹن آؤٹرام گھارو سے ماسی کوٹ روانہ ہو گئے۔ میرا بھائی اور وہ دونوں ایک اونٹ پر سوار ہوئے۔ چلتے وقت کہنے لگے کہ تم بھی جلد ہی ہمارے پیچھے ماسی کوٹ آؤ۔ میں نے ان سے وعدہ کیا کہ میں بار برداری کے جانور بھیج کر آؤں گا تاکہ کچھ جانور پیچھے نہ رہ جائیں۔ دو دن بعد میں ماسی کوٹ جانے کے لیے فارغ ہو گیا۔ انگریزوں کی چھاؤنی کا انتظام اور فوج کی تربیت دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ پوچھتے پاچھتے کیپٹن آؤٹرام اور سکھ داس سے ملا۔ میرا بھائی ایک ہاتھی کے استر والے دوچوبی خیمے میں رہ رہا تھا جو اسے کیپٹن آؤٹرام نے رہنے کے لیے دیا تھا۔ میں بھی اس کے ساتھ جا رہا۔ منشی علی اکبر ایرانی میرے بھائی کی خدمت کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ وہ بھائی پر بہت مہربان تھا۔ کئی گماشتے میرے ساتھ تھے۔ چھاؤنی چار میل کی اراضی میں پھیلی ہوئی تھی اور ہر بات کا اعلیٰ انتظام تھا۔ میں نے وہ رات بھائی کے ساتھ گزاری۔ دوسرے دن دس بجے میں کرنل پاٹنجر سے ملنے گیا۔ میں ان کے حلم، اخلاق اور دور اندیشی سے بے حد متاثر ہوا۔

مجھے یورپی لوگوں کی صحبت کا شرف پہلے کبھی حاصل نہ ہوا تھا اور میں ان کے رسوم و رواج اور عادتوں سے بھی ناواقف تھا۔ میں کرنل پاٹنجر کے پہلے نائب، لیفٹیننٹ ایسٹوک کا شکر گزار ہوں، جنہوں نے مجھے اپنے رسوم و رواج سے اچھی طرح واقف کیا اور کہا کہ ہم سے تعلقات رکھنے میں آپ کو بڑے فائدے ہوں گے۔ اس کے بعد میں زیادہ سرگرمی سے کام کرنے لگا۔ لیفٹیننٹ ایسٹوک ایک نہایت خوش مزاج، بے تکلف، خوش گفتار، حلیم طبع اور صاف گو آدمی تھے۔ انھوں نے اپنی نیک عادتوں سے ہر ایک کا دل موہ لیا تھا۔ وہ سندھ میں اپنی خوش مزاجی کے سبب مشہور تھے۔ میں جب کرنل پاٹنجر سے ملا تو انھوں نے مجھ سے بار برداری کے جانوروں اور فوج کی رسد کی بات پوچھا۔ میں نے ان سے مکمل تفصیلی احوال بیان کیا۔ احوال سن کر وہ نہایت خوش ہوئے۔ پھر انھوں نے مجھے فوج کے سالار سر جان کین کے لیے ایک تعارفی خط دیا اور کہا کہ جا کر ان سے ملو۔ جہاں چہ میں سر جان کین کے خیمے کی طرف گیا اور کرنل پاٹنجر کا رقعہ اندر بھجوایا۔ سپہ سالار مجھ سے نہایت شفقت سے پیش آئے۔ سر جان کین خود ہندوستانی نہیں بول سکتے تھے۔ ان کے ماتحت تین نائب تھے کیپٹن آؤٹرام، کیپٹن پاویل اور میجر کین۔ انھوں نے مجھ سے غذائی سامان کے بارے میں سوالات کیے۔ میں نے انھیں بتایا کہ سب کچھ ٹھیک ہے۔ اس پر انھوں نے حکم دیا کہ سارا سامان رسد کے کمیسری جنرل، میجر ڈیوڈسن کے حوالے کر دو۔ میں نے حکم کی تعمیل کی اور جو سامان سرکار کے کارندے مادھو کی طرف بھیجا تھا اس کا بھی تفصیلی احوال جنرل کو بتایا۔ انھوں نے اونٹ اور بیل دیکھ کر، گن کر اپنے قبضے میں لیے۔ کرنل پاٹنجر نے مجھے ہدایت کی کہ کمیسری جنرل کے احکام کی پوری پوری تعمیل کرنا اور رسد اور بار برداری کے جانوروں کے لیے وہ جو فرمائشیں کریں ان کا دھیان رکھنا۔ مزید کہا کہ اپنے بھائی سکھ رام داس کو کہو کہ اونٹوں اور بیلوں کی دیکھ بھال کرے اور جتنوں کو خوش رکھے۔ میں نے یہ سارا کاروبار، کسی معاوضے کے بغیر کرنے کا وعدہ

کیا۔ در حقیقت شروع میں میں نے انگریزوں کی جو بھی خدمت کی تھی وہ بغیر کسی معاوضے کے تھی۔ میں خدائی ساماں کا ٹھیکے دار نہ تھا۔ میں نے سیاسی خدمت کسی مالی نفع کے ارادے سے نہیں کی تھی۔ میری جان اور مال ہر وقت مشکل میں تھے۔ ہر ایک کو معلوم تھا کہ ٹالپروں کی حکومت، جس کا میں زبردست تھا، سندھ سے انگریزوں کی فوج کو راستا دینے کے خلاف تھی اور اس کی نظر میں انگریزوں کی مدد کرنا اس کے مفاد کے خلاف، بلکہ حکومت کی توہین تھی۔ مگر میرے خاندان سے بعد کے میروں کے مذہبی تعصب کے زیرِ اثر جو ظلم کیے گئے تھے اس کی وجہ سے ہمیں سخت رنج تھا۔ انگریز سرکار کے لیے قربانیاں میں نے فقط اپنے خاندان کے مفاد اور بھلائی کی خاطر دیں۔ اس لیے جو کچھ مجھے کرنل پاٹنگر نے کہا اس کی میں نے خوشی سے تعمیل کی اور خدا کا شکر ہے کہ میں نے، اپنے ذاتی نوکروں، منشیوں اور سپاہیوں کی مدد سے، سب کام خاطر خواہ طریقے سے پورے کیے۔

ہامی کوٹ میں میرے ہوتے حیدر آباد کے میروں کی طرف سے نواب غلام شاہ لغاری، سید زین العابدین اور آغا اسماعیل شاہ نے انگریزوں کی چھاؤنی میں آ کر اپنی خدمات پیش کیں۔ پانچ چھ دن کے بعد فوج نے چھاؤنی اکھاڑ کر ٹھٹھے کی طرف کوچ کیا، جہاں وہ تین دن بعد پہنچے اور شہر اور مکلی کے بیچ منزل انداز ہوئے، جہاں ان کے لیے بہت اچھا انتظام کیا گیا تھا۔

ٹھٹھے میں مجھے کرنل پاٹنگر نے کہا کہ مسٹر وائٹ لاک اس شہر میں ' انگریز کی ماڑھی ' نامی ایک مکان میں رہتے ہیں، ان کے پاس جا کر ریال اور چاندی لے لو اور انھیں پگھلا کر، کسی دیانت دار ملازم کی نگرانی میں، ان سے کوڑیاں ڈھلواؤ۔ میں نے سوچا کہ یہ دھندا ایک نامی کے لیے خطرناک ہے۔ اگر سکّے کے وزن میں یا کسی اور طرح تِل بھر بھی تفاوت ہو گیا تو ناحق ملامت پلے پڑے گی۔ لہٰذا میں نے اپنے خیالات اور اعتراضات کا لیفٹیننٹ ایسٹوک سے ذاتی طور پر اظہار کیا اور ان سے کہا کہ ایسے کام میں بدنامی کا اندیشہ ہے۔ لیفٹیننٹ ایسٹوک وہ شخص تھے جن کی دوستی کی مجھے بڑی قدر تھی۔ میرے دل میں ان کے نیک، شریف اور حقیقت پسند مزاج کے لیے بہت عزت تھی۔ انھوں نے کرنل پاٹنگر سے بات کی، جنھوں نے یہ کام مانک جی نامی ایک پارسی کے حوالے کر دیا، جو چھاؤنی میں رہتا تھا۔ مانک جی نے دو سال مسلسل ٹکسال چلائی، کافی پیسے بنائے اور آخر کار جیل کا دروازہ دیکھا۔

ایک دن ٹھٹھے میں ایک نوجوان بلوچ، برہنہ تلوار لیے، کرنل پاٹنگر کے خیمے میں گھس آیا اور پاگلوں کی طرح نعرہ کر کے، ہوا میں تلوار چلانے لگا۔ کرنل پاٹنگر کے سپاہی اسے پکڑنے کے لیے فوراً اٹھ کھڑے ہوئے، لیکن وہ بھاگ اٹھا۔ وہ سپاہیوں سے تیز تھا، اس لیے وہ اسے پکڑ نہ سکے۔ حکم دیا گیا کہ اس پر گولی چلاؤ، اور بندوق کی ایک ہی گولی نے اس کا کام تمام کر دیا۔

فوج نے ٹھٹھے میں چار دن قیام کیا۔ حیدر آباد کے قریب گدو بندر کے پاس سرکاری گودام میں ساماں کا بڑا ذخیرہ جمع کیا گیا تھا۔ ایک دن اچانک میرپور خاص کے میر شاہ محمد اپنا لشکر لے کر حیدر آباد پر حملہ آور ہوئے اور حیدر آباد کے میروں کے مشورے اور ان کے سپاہیوں کی مدد سے، گدو بندر میں

انگریزوں کے گودام پر حملہ کر کے، لوٹ کر، آگ لگا کر بہت سامال لے گئے۔ جب مسٹر لیکی کو گودام پر حملے کی خبر ملی تو وہ ڈر کے مارے بیڑی تیار کرا کے ٹھٹھ روانہ ہو گئے۔ ان کا یہ اقدام نہایت عاقبت اندیشانہ تھا۔ اگر وہ بلوچوں کے ہاتھ آ جاتے تو وہ ان کا کام تمام کر دیتے۔ مسٹر لیکی جیسے ہی ٹھٹے پہنچے، اسی وقت فوج کو پیش قدمی کا حکم دیا گیا۔ فوراً تعمیل کی گئی اور ٹھٹے سے جھرک تک تیس میل کا فاصلہ ایک ہی مرحلے میں طے کیا گیا۔ چٹانوں اور میدان میں ایک محفوظ جگہ چھاونی لگائی گئی۔ اس وقت میں بھی چھاؤنی میں تھا۔ لیفٹیننٹ ایسٹوک نے مجھ سے کہا کہ جتنوں کا خیال رکھنا، کہیں کسی وقت دھوکا دے کر فرار نہ ہو جائیں۔ مالک کا شکر ہے کہ کسی نے بھی دھوکے بازی یا کوئی چالاکی وغیرہ نہیں کی۔ میں نے سارے اونٹ اور بیل جھرک میں میروں کی شکار گاہ میں کھڑے کر دیے۔ جھرک میں آنے کے کچھ عرصے بعد ایک دن صبح کو دو یورپی جنگل میں سیر کرنے گئے۔ انھوں نے اس خیال سے بندوقیں ساتھ لے لی تھیں کہ اگر موقع ملے تو شکار کیا جائے۔ انھیں کچھ بلوچ سپاہیوں نے، جو جنگل میں چھپے بیٹھے تھے، حملہ کر کے مار دیا۔

جھرک میں انگریزوں کی فوج کی تربیت اور انتظام اتنا اچھا اور رعب دار تھا کہ لوگ دیکھ کر حیران ہو جاتے تھے۔ صاف شدہ بندوقیں اور برچھیوں کی عمودی ایستادہ ٹکڑیاں ریتی لگے فولاد کی طرح چمکتی تھیں۔ میروں نے معلومات حاصل کرنے کے لیے کئی جاسوس جھرک بھیجے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے انگریزوں کے اعلیٰ فوجی انتظام اور طاقت کی انھیں ایسی باتیں بتائی ہوں کہ وہ بدحواس ہو گئے ہوں اور ان کے سارے منصوبے درہم برہم ہو گئے ہوں۔ میری ذاتی رائے ہے کہ ان خبروں نے ٹالپروں جیسے غیر مستقل مزاج لوگوں کے دلوں میں اتنا ہی ہراس پیدا کیا ہو گا جتنا چھاؤنی کا منظر دیکھنے سے ہمارا حوصلہ بڑھتا تھا۔

جھرک میں فوج کے یورپی عہدے داروں کے خیمے سب ایک قطار میں لگے ہوئے تھے۔ میرا خیمہ ان کے سامنے درمیان میں تھا۔ ایک دن صبح دس بجے میں اپنے بڑے خیمے میں تقریباً سو آدمیوں کے ساتھ بیٹھا تھا کہ دو آدمی فقیرانہ بھیس میں آئے اور سامنے کھڑے ہو کر صدا لگائی کہ ہم حج کے لیے جا رہے ہیں، خیرات چاہیے۔ میں انھیں غور سے دیکھ رہا تھا کہ انھوں نے اشارہ کیا، جس پر میں نے اٹھ کر اپنے ذاتی خیمے میں جا کر انھیں اپنے پاس بلایا۔ انھوں نے میرے پاس آ کر ایک لاٹھی کا متھا کھول کر، اس میں سے ایک خط نکال کر میرے حوالے کیا۔ یہ خط خود میر نور محمد کا لکھا ہوا تھا اور میرے نام تھا۔ اس میں لکھا ہوا تھا کہ سیٹھ ناؤں مل، اس وقت ہمارے دوست اور مُربی ہو۔ کرنل پاٹنجر کو بتاؤ کہ گدو بندر اور ٹنڈو میر خان میں انگریزوں کے گودام اور دریائے سندھ میں سامان کی بیڑیاں میرپور کے میر شیر محمد نے میر محمد اور صوبدار کی مدد سے لُوٹی اور جلائی ہیں۔ میرا اس میں کوئی ہاتھ نہیں اور نہ ہی میں نے اس میں کچھ حصہ لیا ہے۔ دستے دار وہ ہیں۔ میں بے گناہ ہوں۔

میں نے قاصدوں کو کھانے کی دعوت دی لیکن انھوں نے معذرت کی اور مجھے دو اور خط بھی

دکھانے جو انھیں فوراً پہنچانے کے لیے دیے گئے تھے۔ ان میں سے ایک ٹھٹے کے میاں حامد کے لیے تھا اور دوسرا گھوڑا باری کے نواب غلام شاہ کے لیے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ان دونوں عمال کو ہدایتیں دی گئی ہیں کہ انگریزوں کے مال کی خاص حفاظت کریں اور فوج کی ہر طرح مدد کریں۔ میں قاصدوں کو زبردستی روک کر سیدھا کرنل پاٹنجر کے خیمے میں گیا اور انھیں خط دیا۔ یہ خط فارسی میں لکھا ہوا تھا اور لیفٹیننٹ ایسٹوک نے پڑھا۔ میں نے انھیں خط کے بارے میں سارا احوال بتایا اور پھر جس طرح انھوں نے لکھوایا، میں نے ویسے ہی قاصدوں کے ہاتھ خط کا جواب بھیج دیا۔

دوسرے دن حیدر آباد کے ٹالپروں کی طرف سے آغا اسماعیل شاہ ٹھٹھ کی میں انگریزوں کی چھاؤنی میں حاضر ہوئے۔ وہ یہ بات سمجھانے کے لیے آئے تھے کہ گدو میں کن حالات میں انگریزوں کے مال گودام لوٹے اور جلائے گئے تھے۔ اس بات پر گرمی بحث چلی۔ کرنل پاٹنجر نے اس پر خوب دل کی بھڑاس نکالی اور آغا اسماعیل شاہ کو، ان کے آقاؤں کے بدلے، مناسب الفاظ میں ملامت اور تنبیہ کی۔ آغا اسماعیل شاہ نے ہاتھ جوڑ کر معافی چاہی۔ آخر انگریز نقصان کے عوض نقد معاوضہ لینے پر رضامند ہو گئے اور آغا اسماعیل شاہ نے ٹالپروں کی طرف سے ستائیس لاکھ روپوں کی قبولیت لکھ دی۔ آٹھ دن کے قیام کے بعد چھاؤنی کوٹری کی طرف روانہ ہوئی جہاں وہ جلد ہی پہنچ گئے۔ ٹالپروں نے، انگریز سرکار کے لیے اپنی دوستی اور خیر خواہی دکھانے کے ارادے سے، کئی قاصد چھاؤنی میں بھیجے۔ کوٹری پہنچنے کے بعد جلد ہی کرنل پاٹنجر نے مجھ سے کہا کہ لیفٹیننٹ لیکی کے ساتھ مل کر، میروں سے اسماعیل شاہ کی طرف سے تحریر شدہ قبولیت والے ستائیس لاکھ وصول کر آؤ۔ میں نے گردن ہلا کر اسی حالت سے انھیں آگاہ کیا اور سمجھایا کہ رقم کے لیے میرا جانا میروں کو اچھا نہ لگے گا۔ وہ اس بات پر رضامند ہو گئے اور میروں کے دربار میں اپنے وکیل منشی جیٹھا نند کو کہلا بھیجا کہ لیفٹیننٹ لیکی اور دوسرے آدمیوں کے ساتھ مل کر رقم وصول کر کے بھیجو۔ میروں نے اس وقت کا رائج سکہ کوڑیاں دینے کا وعدہ کیا تھا، لیکن وہ ان کے پاس خزانے میں موجود نہ تھیں۔ لہذا انھوں نے بقایا رقم گوبندی یا مشہدی سکوں میں دی، جن کی خود بازار میں زیادہ قیمت تھی۔ اس کے بعد جلد ہی فوج نے سیوہن کے راستے شکارپور کے لیے کوچ کیا۔ کرنل پاٹنجر پیچھے ٹنڈو میر خان میں رہے اور میں بھی ان کے ساتھ رہا۔ ان کے اوّل نائب، لیفٹیننٹ ایسٹوک فوج کے ساتھ روانہ ہو گئے۔

گدو بندر میں کچھ بھی سامان نہ چھوڑا گیا۔ فوج کے لیے راستے میں متعدد مقامات پر غذائی سامان اکٹھا کر رکھنا ضروری تھا لہذا یہ فیصلہ کیا گیا کہ سیوہن اور لاڑکانے میں رسد کے گودام کھولے جائیں۔ اس سلسلے میں کرنل پاٹنجر نے مجھ سے مدد چاہی اور کہا کہ اپنے بھائیوں، سکھ رام داس اور گوپال داس کو اجازت دو کہ فوج کے ساتھ شکارپور تک ساتھ چلیں اور غذائی سامان لے کر دیں اور اسے حفاظت سے رکھنے کا انتظام کریں۔ میں نے یہ تجویز خوشی سے قبول کی اور سیوہن، لاڑکانہ اور دوسری جگہوں پر کارندوں کو ہدایتیں بھیجیں کہ سکھ رام داس کے احکام کی تعمیل کریں اور گودام وغیرہ قائم کرنے میں ان کی مدد کریں۔

ایک دن صبح میں ٹنڈو نور حاں میں اپنے خیمے میں بیٹھا ہوا تھا کہ مجھے کرنل پاٹنسر نے طلب کر کے ازراہ کرم بتایا کہ بحیرۂ عرب میں انگریزوں کی فوج کے اعلیٰ بحری سالار ریئر ایڈمرل سر فریڈرک میٹلنڈ بحری بیڑے کے ساتھ کراچی شہر پر قبضہ کرنے والے ہیں۔ انھوں نے مجھے تمہارے اہل خانہ کا خیال رکھنے کو کہا ہے اور مجھے لکھا ہے کہ کراچی کے سیٹھ ناؤں مل کے گھر بار اور املاک کی ہر حال میں حفاظت کرنی ہے۔ وہ اس وقت فوج کے ہمراہ ہیں اور انھوں نے ہماری نہایت سرگرمی اور جاں فشانی سے مدد کی ہے۔ مجھے ان کی جان اور عزیزوں کی فکر ہے۔ ان کی اس طرح حفاظت کی جائے جیسی ہندوستان کے گورنر جنرل کی جان اور عزیزوں کی۔

مجھے انھوں نے تسلی دی کہ تم کراچی میں اپنے عزیزوں کی کوئی فکر نہ کرو کیوں کہ کراچی جلد ہی انگریزوں کے قبضے میں آنے والی ہے۔ میں یہ خبر سن کر بے حد خوش ہوا اور مالک کا شکر بجا لایا جو سب کا داتا ہے۔ میں نے یہ خبر فوراً کراچی میں اپنے عزیزوں کو بھیجی اور ان کو کہا کہ جو بھی انگریز آئے اس کی مدد کریں۔ دوسرے دن مجھے کراچی سے رقعہ ملا کہ انگریزوں کے کئی جنگی جہاز بندرگاہ پر آئے اور انھوں نے منوڑے کے قلعے پر ایسی گولا باری کی کہ تین گھنٹوں کے اندر قلعے کی مغربی دیوار گرادی اور توپوں کے دھویں نے، کالے بادلوں کی طرح، شہر کے اوپر دن کو رات سا دیا تھا۔ ان حالات میں کراچی میں میروں کے عمال، مثلاً بلوچوں کے نطامانی قبیلے کے نواب خیر محمد، حاجی اللہ رکھیو اور دوسرے زبردست، میرے بڑے بھائی پرسٹم داس کے پاس آئے اور ان سے کہا کہ دھویں نے لوگوں کا دم گھونٹ دیا ہے۔ ہم میں انگریزوں سے مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ توپ زنی بند کرانے کے لیے اقدامات کرنے چاہییں۔

اسی دوران دو تین انگریز عہدے دار ساحل پر آئے۔ میرے بھائی کو پتا چلا تو وہ ان سے بندرگاہ پر ملنے گئے جہاں میروں کے آدمی بھی جلد ہی آ حاضر ہوئے۔ انگریز عہدے دار میرے بھائی کے ساتھ مل کر ان کے گھر آئے اور وہاں سے ان کے ساتھ گھڑسوار فوج کی چھاؤنی کے لیے کوئی جگہ ڈھونڈنے گئے۔ شہر اور رام باغ کے درمیان جو میدان تھا، وہ انھوں نے پسند کیا۔ اور دوسرے دن فوج کو اتار کر وہاں منزل انداز کیا گیا۔ میرے رشتے داروں کو سامان اتار کر حفاظت سے رکھنے کا کام سونپا گیا۔ وہ یہ کام رقعوں پر وقتاً فوقتاً دیتے تھے اور یہ کام کافی ذمے داری کا تھا۔ لیکن میرے عزیز یہ خدمت بغیر کسی معاوضے کے خوشی سے انجام دیتے تھے کیوں کہ میں انھیں بار بار لکھتا تھا کہ انگریزوں کی فوج کی زیادہ جاں فشانی سے مدد کریں اور ان کا ہر تقاضا پورا کریں۔ مالک کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ یہ بات ایسی خوش اسلوبی سے نبھائی گئی کہ ریئر ایڈمرل بار بار کرنل پاٹنسر کو خطوں میں میری خدمات اور تعاون کی داد دیتے رہے جس پر کرنل پاٹنسر نے ان کی طرف سے میرا شکریہ ادا کیا۔ میری خدمات کے اعتراف میں اور میری عزت افزائی کے لیے سر فریڈرک میٹلنڈ نے ہمارے آبائی مکان کی حفاظت کے لیے یوروپی سپاہی مقرر کیے۔ فتح کے بعد بھی کافی عرصے تک یہ کرم فرمائی جاری رہی تاہم یوروپی جوکی بدل کر اس کی جگہ دیسی سپاہی رکھے گئے۔ فوج

کے اترنے کے بعد جلد ہی میں نے ریئر ایڈمرل اور ان کے دوستوں کو دعوت دے کر اپنے پاس بلایا۔ انھوں نے یہ دعوت خوشی قبول کی۔ وہ اپنے ساتھ سپاہیوں کا ایک دستہ جھنڈوں اور بینڈ سمیت لے کر آئے۔

میرے چھوٹے بھائی سکھ رام داس نے بھی فوج کی شکارپور تک خاصی خدمت کی۔ شکارپور میں میرے بھائی پر زور دیا گیا کہ وہ فوج کے ساتھ کابل تک چلے اور راستے میں رسد کا انتظام کرے۔ اس نے انھیں جواب دیا کہ میں سیٹھ کے حکم کا بندہ ہوں۔ مجھے فقط شکارپور تک جانے اور فوج کو رسد پہنچانے کا کام سونپا گیا ہے۔ میں ان سے پوچھ کر آگے جانے کی اجازت لوں گا۔ مجھے یہ بات پسند نہ تھی کہ میرا بھائی فوج کے ساتھ افغانستان جائے۔ اس کے علاوہ میں نے ایسا کوئی وعدہ بھی نہیں کیا تھا کہ میں فوج کو غذائی سامان اور باربردار جانور سندھ کی حدود سے باہر بھی مہیا کروں گا۔ اس لیے میں نے کرنل پاٹنجر سے پوچھا کہ آپ کا کیا مشورہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ تم پر فقط سندھ سے فوج کو سلامتی سے روانہ کرنے کی ذمے داری تھی۔ سندھ سے باہر فوج کو سامان مہیا کر کے دینے کی ذمے داری مسٹر الیگزینڈر برنس نے خود لے لی ہے۔ تمھاری مرضی ہو تو تمھارا بھائی افغانستان جا سکتا ہے۔ اس کے بعد میں نے سکھ رام داس کو خط لکھا کہ کابل مت جاؤ اور اجازت لے کر لوٹ آؤ۔ چنانچہ اس نے یہی کیا۔ وہ سب حساب کتاب صاف کر کے، مئی ۱۸۳۹ میں کراچی لوٹ آیا۔

اسی سال کے اپریل تک میں کرنل پاٹنجر کے ساتھ حیدرآباد میں تھا۔ مجھے جو سیاسی خبریں ملتی تھیں وہ میں انھیں پہنچاتا تھا۔ میر نور محمد اور نصیر خاں ان سے الگ الگ ملتے رہتے تھے۔ ایک دن میر نور محمد نے میرے ایک رشتے دار ہیرا نند کو، جو اس وقت میر کے ماتحت ایک اہم اور بااثر عہدے پر مقرر تھا، کہا کہ سیٹھ کو کسی دن ہمارے پاس لے آؤ۔ میں نے انکار کیا، لیکن وہ مجھے پندرہ دن تک مسلسل اس بارے میں کہتا رہا۔ اس نے کہا، 'آپ کو میروں سے محبت نہ ہو گی لیکن سندھ ابھی تک ان کے تابع ہے۔ آپ کے کئی عزیز ان کی ملازمت میں ہیں۔ اگر آپ میروں کے پاس نہ چلیں گے تو ہم ایک رات بھی سکھ سے نہ سو سکیں گے۔ اس پر میں نے کرنل پاٹنجر سے بات کی اور ان سے مشورہ کیا۔ انھوں نے مجھے مشورہ دیا کہ بہتر یہ ہے کہ میروں کے کام میں دلچسپی نہ لو۔ میں نے انھیں سمجھایا کہ اس کی وجہ سے میرے عامل رشتے داروں کو نقصان پہنچے گا۔ انھوں نے غور کر کے آخر مجھے ان سے ملنے کی اجازت دے دی۔ ایک رات میں حیدرآباد جا کر اپنے رشتے دار دیوان ہیرا نند کے پاس رہا۔ دوسرے دن انگریزوں کی چھاؤنی سے لوٹتے ہوئے میں قلعے میں میر نور محمد کے بنگلے میں داخل ہوا۔ دروازے پر جو پہرے دار تھا، اس نے جا کر اندر میر کو بتایا اور مجھے اندر بلا لیا گیا۔ میں اندر داخل ہوا تو میر نور محمد مجھ سے ملنے کے لیے اٹھے اور ہاتھ پکڑ کر ایک پلنگڑی پر بٹھایا۔ اس وقت میر نصیر خاں بھی حاضر تھے اور اپنے بھائی کے ساتھ ایک ہی پلنگ پر بیٹھے تھے۔ روایتی مزاج پرسی کے بعد نور محمد نے میری طرف مخاطب ہو کر کہا کہ سیٹھ

ماؤں مل، باپ کا انتقام اچھی طرح لے لیا! اب تو خوش ہو گئے؟ میں نے جواب دیا کہ سائیں، ایسا کیوں کہہ رہے ہیں؟ ایسے الفاظ کیوں ادا کر رہے ہیں؟ یہ کہہ کر میں خاموش ہو گیا اور پھر جلد ہی اجازت لے کر رخصت ہو گیا۔ میں نے کرنل پاٹنگر کو سارا احوال سنایا۔ انھوں نے جواب میں کہا، تم نے اچھا کیا، کوئی فکر نہ کرو۔

پانچ دن کے بعد پتا چلا کہ فوج شکارپور سے کابل کو روانہ ہو گئی۔ میں کرنل پاٹنگر کے ساتھ کراچی لوٹ آیا۔ یہ اپریل کا مہینا تھا۔ کراچی میں پتا چلا کہ میرے بھائی نے یہاں انگریزوں کی فوج کی اچھی خدمت کی تھی۔ یہ بات سن کر کرنل پاٹنگر بہت خوش ہوئے۔ اس کے بعد کرنل پاٹنگر بمبئی جانے کی تیاری کرنے لگے اور مجھے ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ میں نے انھیں بتایا کہ جن دنوں میں بمبئی شیدیوں کے ماتحت تھی، اس وقت سے ہماری بمبئی میں کوٹھی ہے لیکن ہم میں سے کوئی بھی وہاں نہیں گیا ہے۔ لیکن اگر آپ کی مرضی ہے تو مجھے چلنے میں کوئی اعتراض نہیں۔ اس پر انھوں نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا کہ خُود جا کر تمھیں وہاں بلاؤں گا۔

کراچی میں باقی ماندہ فوج کا سالار کرنل اسپلر کو مقرر کیا گیا۔ وہ شادی شدہ آدمی تھے اور بال بچے ان کے ساتھ تھے۔ میں روز صبح نو بجے چھاؤنی میں جاتا تھا اور سارا دن اپنے خیمے میں (جو کرنل اسپلر کے خیمے کے قریب تھا) گزار کر شام چھ بجے گھر لوٹ آتا تھا۔ کرنل اسپلر ایک نیک، صاف دل اور شریف الطبع آدمی تھے۔ ایک دن شام پانچ بجے کیپٹن باونڈ گھوڑے پر چڑھ کر سواری کے لیے منگھوپیر کی طرف پہاڑیوں میں نکل گئے، جہاں کچھ بدمعاشوں نے انھیں قتل کر دیا۔ سات بج گئے مگر وہ چھاؤنی میں نہ لوٹے۔ کرنل اسپلر نے انھیں تلاش کرنے کے لیے کچھ سپاہی پہاڑیوں میں بھیجے۔ انھوں نے جلد ہی لوٹ کر اطلاع دی کہ لاش ایک گڑھے میں پڑی ہے۔ رات کو دس بجے کرنل اسپلر نے مجھے بلایا اور میں کچھ سپاہیوں کے ساتھ، جو اس وقت موجود تھے، چھاؤنی کی طرف گیا۔ کرنل اسپلر نے مجھے کیپٹن کے بارے میں ایسی اطلاع سے آگاہ کیا۔ میں نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ کھوجی (قدم شناس) لے کر فوراً جا کر قاتلوں کا پتا چلاؤ۔ میں نے ان سے کہا کہ جب تک تم لوگ نہ لوٹو گے، اس وقت تک میں چھاؤنی سے باہر نہ نکلوں گا۔ وہ تین چار گھنٹوں کے بعد لوٹ آئے اور بتایا کہ یہ بزدلوں والا کام شاہ بلاول کے خلیفہ جاکر نے جھٹو اور بدیجا قوموں کے پچاس آدمیوں کی مدد سے کیا ہے۔ یہ خبر ملنے پر، کرنل اسپلر نے سیدھے کرنل پاٹنگر کے نائب لیفٹیننٹ لیکی کو لکھا کہ میروں سے خلیفہ جاکر کو کراچی میں ہمارے حوالے کرنے کا مطالبہ کریں۔ میں نے شہر میں واپس آ کر معلوم کروایا کہ جھٹو اور بدیجا قوموں کے کچھ لوگ آس پاس میں ہی ہیں اور آخر آٹھ آدمی ڈھونڈ ڈھانڈ کے پکڑ کر مضبوط پہرے میں انگریزوں کی چھاؤنی کی طرف بھیج دیے گئے۔ انھوں نے کرنل اسپلر کے پاس اعتراف کیا کہ واقعی ہم شاہ بلاول والے خلیفہ جاکر کے مرید ہیں اور یہ قتل واقعی خلیفہ جاکر نے اس کی مدد سے کیا تھا۔ میر نے بندی خدمت گار کو شاہ بلاول بھیجا کہ خلیفہ جاکر کو پکڑ کر کراچی میں انگریزوں کی چھاؤنی میں حاضر کرے۔ چھاؤنی میں اس پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا۔ الزام ثابت

ہو گیا اور فیصلہ ہوا کہ اسے اسی جگہ پھانسی دی جائے، جہاں کیپٹن لاوڈ کو قتل کیا گیا تھا۔ فوجی عدالت، کرنل اسپلر، میجر ڈولوسی اور محمد (ماوں مل) پر مشتمل تھی۔

اس موقعے پر میری خدمات کا تفصیلی احوال کرنل اسپلر نے کرنل پاٹنجر کو لکھ بھیجا، جنھوں نے مجھے شکریے کا خط لکھا۔

شاہ شجاول اور انگریز سرکار کی مشترکہ فوج قندھار، غزنی، کابل اور جلال آباد پر قبضے کے بعد دیگرے آسانی سے قبضہ کرتی گئی۔ شاہ شجاول دوبارہ کابل کے تخت پر براجمان ہوئے۔ امیر دوست محمد اور ان کے ساتھیوں نے پہاڑ پھلانگ کر جا کر بخارا میں پناہ لی۔ فوج کا ایک حصہ کابل سے قلات روہی لوٹ آیا۔ محراب خان نے، جو اس وقت قلات کا حاکم تھا، انگریزوں سے دوستانہ سلوک نہیں کیا۔ انگریزوں کا قندھار جانے والا سامان قلات میں سے گزرتے ہوئے لوٹا گیا۔ اس پر خان سے اختلافات ہوئے، جنھوں نے آخر جنگ کی صورت اختیار کی۔ محراب خان لڑائی میں مارا گیا اور اس کا کم سن بیٹا نصیر خان اپنے اہل وعیال کے ساتھ ملک چھوڑ کر بھاگ گیا۔ انگریز معاہدہ کر کے محراب خان کے چچازاد شاہ نواز خان کو برسرِاقتدار لائے۔ کرنل جیمز آوٹرام اس وقت قلات میں انگریزی فوج کے ساتھ تھے۔ حکومت کے ردوبدل کے بعد، وہ جلد ہی بمبئی سرکار کو رپورٹ دینے کے لیے روانہ ہو گئے۔ جنگلوں کے سردار رحیم خان کو جب یہ خبر ملی تو اس نے پانچ سو سوار اور پیادے لے کر ان کا تعاقب کیا۔ کرنل آوٹرام اونٹ پر تھے اور جت کے سوا دوسرا کوئی بھی ان کے ساتھ نہ تھا۔ انھیں یہ پتا چلا کہ ان کا تعاقب ہو رہا ہے تو تیز تیز جا کر سون میانی پہنچے، جہاں پہنچتے ہی انھوں نے میرے گماشتوں، نوکروں اور منشیوں کا پوچھا۔ میرے کئی آدمیوں نے انھیں اپنی خدمات پیش کیں۔ وہ ان سے کہنے لگے کہ ایک بیڑی کرائے پر لے دو جو مجھے راتوں رات کراچی پہنچا دے۔ وہ اس وقت تک اونٹ سے نہ اترے جب تک بیڑی کرائے پر لے کر سامان سے بھر کر انھیں لا نہ دی گئی۔ اس کے بعد وہ فوراً کراچی روانہ ہو گئے۔ میرے کارندے اس وقت تک ساحل پر کھڑے رہے جب تک بیڑی روانہ ہو کر نظر سے غائب ہو گئی۔ اس کے بعد وہ کوٹھی پر لوٹ آئے۔ سون میانی سے کرنل آوٹرام کے روانہ ہو جانے کے دو تین گھنٹے بعد رحیم خان جنگل شہر میں آیا اور پوچھا کہ کوئی یورپی آدمی یہاں آیا تھا؟ انھوں نے کہا کہ ہاں، ایک یورپی آیا تھا، لیکن اس وقت ایک بیڑی تیار کھڑی تھی، اس میں چڑھ کر سیدھا کراچی روانہ ہو گیا۔ اس پر وہ ناامید ہو کر لوٹ گیا۔ میرے کارندوں نے یہ خبر قاصدوں کے ہاتھ میرے بھائی کو کراچی بھیجی۔ یہ رقعہ کرنل آوٹرام کو پڑھ کر سنایا گیا، جنھوں نے اس غیبی نجات کے لیے شکرانہ ادا کیا۔ میں اس وقت کرنل پاٹنجر کی دعوت پر بھوج میں تھا، اور مجھے یہ خبر خط کے ذریعے بھیجی گئی تھی۔ میں نے کرنل پاٹنجر کو اطلاع دی اور انھوں نے بھی مجھے کرنل آوٹرام کا اسی مفہوم والا خط پڑھ کر سنایا۔ کرنل آوٹرام دو دن کراچی میں رہ کر بمبئی روانہ ہو گئے۔

بھوج میں مجھے کرنل پاٹنجر نے بتایا کہ بمبئی سرکار نے کرنل آوٹرام کو سندھ میں پولیٹیکل ریزیڈنٹ مقرر کیا ہے اور بھوج کے پولیٹیکل ایجنٹ کے عہدے کے لیے مسٹر میلول کو نامزد کیا گیا

ہے، اس لیے کرنل پاٹنگر بمبئی جانے کی تیاری کرنے لگے۔ انھوں نے ایک دن شام کو سفارت خانے کے منشی مسٹر پیتامبر کی زبانی مجھے کہلوایا کہ سرکار نے اس کی اجازت دی ہے کہ سندھ سے متعلق آپ جو بھی منصوبے پیش کریں گے۔ منظور کیے جائیں گے۔ اگر آپ کی مرضی ہو تو کرنل آپ کی گوناگوں اور اہم خدمات کے پیش نظر مستقل طور پر کوئی نقد رقم دلانے کے لیے سفارش کریں یا اگر آپ چاہیں تو آپ کو خصوصی امتیاز دینے کے لیے بمبئی کی قانون ساز کاونسل میں نشست کے لیے سفارش کریں۔ میں نے مسٹر پیتامبر کو جواب دیا کہ میں کل خود کرنل سے مل کر انھیں اپنے خیالات سے آگاہ کروں گا۔ دوسرے دن میں کرنل پاٹنگر سے ملا۔ انھوں نے مجھ سے اسی موضوع پر بات کی۔ میں نے ان سے کہا کہ جہاں تک نقد امداد کا سوال ہے، مجھے پیسے کی پروا نہیں۔ ہمارا بڑا مسئلہ کہ خاندان ہے، انعام کی رقم کتنی بھی بڑی ہو، وہ کب تک چلے گی؟ دنیا ناپائیدار اور فانی ہے۔ دوسرے منصوبے کے بارے میں میں نے ان سے کہا کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ بمبئی میں گورنر کی کاونسل کے لیے نامزدگی سے مجھے کون سا دنیوی فائدہ ہوگا؟ خصوصاً جب کہ میرا وہاں جانے کا کوئی بھی امکان نہیں ہے۔ ہمارے خاندان کی، شیدی حکمرانوں کے زمانے سے بمبئی میں تجارتی کوٹھی رہی ہے لیکن ہم میں سے کوئی بھی بذات خود کوٹھی دیکھنے نہیں گیا۔ اس کے علاوہ سندھ ابھی ٹالپروں کے ماتحت ہے اور انگریزوں کا صوبہ نہیں ہوا۔ میں نے عرض کیا کہ ہمیں اپنی خدمتوں کے عوض انگریز سرکار کی دوستی اور کرم کی عنایت کافی ہے اور امید ہے کہ ہمارا سرکار سے ہمیشہ یہی ربط رہے گا۔ اس پر انھوں نے میرے روبرو ایک کاغذ لے کر اس کے چاروں اطراف پر کیے، اس کے علاوہ اس دستاویز کی دو نقلیں اپنے ہاتھ سے تیار کر کے، ان میں سے ایک لفافے میں ڈال کر میرے حوالے کی۔ دوسری دونوں نقول کے بارے میں بتایا کہ ان میں سے ایک بمبئی سرکار کو بھیجوں گا اور دوسری سندھ کے دربار میں انگریزی سفیر کے سرکاری دفتر کے لیے کرنل آؤٹرام کو بھیجوں گا۔ انھوں نے وہ خط مجھے پڑھ کر سنایا۔ اس میں میرے لیے پرزور الفاظ میں سرکار کی شفقت کے لیے سفارش کی گئی تھی اور مزید لکھا گیا تھا کہ جب انگریزوں کی فوج شاہ شجاع کو تخت نشین کرانے کے لیے کابل جارہی تھی تو سندھ سے حفاظت اور آرام سے فوج کو لے جانے کا کٹھن کام مجھے سونپا گیا تھا اور میں نے یہ کام خوشی سے سرانجام دیا تھا۔ انھوں نے اس بات کا بھی اقرار کیا کہ میری مدد اور تعاون کے بغیر وہ یہ کام شاید پورا نہ کر پاتے۔ انھوں نے مزید لکھا کہ سیٹھ ناؤں مل میرے بازو اور ٹانگوں کی طرح تھے، جو میرے جسم کو تھامے کھڑے تھے۔ ان کی مدد کے بغیر فوج سرجان کین کی قیادت میں ماسی کوٹ سے شکارپور تک آسانی سے نہیں پہنچ سکتی تھی۔ الغرض خط میں اسی قسم کی اور بھی بہت سی باتیں لکھی تھیں۔ صد افسوس کہ اصل خط میرے پاس سے چوری ہو گیا۔ اس کے علاوہ جلد ہی کرنل آؤٹرام نے آ کر کرنل پاٹنگر کی جگہ عہدہ سنبھال لیا۔

سندھ کی سفارت کے لیے کرنل آؤٹرام کی نامزدگی پر میں بے حد خوش ہوا، لیکن کرنل پاٹنگر کی جدائی میرے لیے بڑے دکھ کا باعث تھی۔ اس کے بعد جلد ہی میں کرنل آؤٹرام کے ساتھ بھوج سے

لکھپت آیا جہاں میں پھر اپنے والد سیٹھ سوت چند سے ملا۔ وہ بھی کرنل آؤٹرام سے ملے۔ لکھپت میں میں نے کافی برہمنوں، فقیروں اور غریبوں کو کھلایا اور دان دیا۔ اس کے بعد میں چار دن وہاں رہا۔ اس دوران میں کرنل آؤٹرام حیدر آباد گئے، جہاں میں بھی کچھ عرصے کے بعد ان سے جاملا۔ دن کو میں انگریزوں کی چھاؤنی میں اپنے خیمے میں (جو کرنل آؤٹرام کے خیمے کے ساتھ تھا) رہتا تھا اور رات کو روزانہ ان کی ہدایت کے مطابق، سیاسی معلومات حاصل کرنے کے لیے، شہر جاکر اپنے عزیزوں کے پاس رہتا تھا۔ صبح کو چھاؤنی کی طرف لوٹتے ہوئے میں اکثر نواب احمد خان لغاری کے پاس ٹھہرتا تھا، وہ اس وقت چوٹی کے سرداروں میں سے تھے اور ان کے خاندان سے میرے بزرگوں کا تعلق ان کے دادا، ولی محمد لغاری کے زمانے سے تھا۔ نواب احمد خان بھی، ہفتے میں ایک بار مجھ سے ملنے آتے تھے اور میں انھیں اکثر کرنل آؤٹرام کے پاس لے جاتا تھا۔ ان سے اکثر اچھی خبریں ملتی تھیں لیکن مجھے زیادہ معلومات ان کے دیوان فتح چند سیوھانی سے ملتی تھیں جو روز صبح میرے ساتھ ناشتا کرتے تھے، کرنل آؤٹرام بھی سفارت خانے کے منشی مسٹر علی اکبر کے توسط سے خبریں حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ بھی کرنل کے مشورے سے رات کا وقت حیدر آباد شہر میں گزارتا تھا۔ میں اسے جو خبریں سناتا تھا، وہ انھیں غور سے سن کر، ان میں سے اہم خبریں اپنے پاس یادداشت کے لیے لکھ رکھتا تھا۔ میں نے حیدر آباد میں کرنل آؤٹرام کی کافی چھوٹی موٹی خدمتیں کیں۔ ان کی فہرست اتنی طویل ہے کہ یہاں ان کے ذکر کی گنجائش نہیں۔

اگست ۱۸۴۱ میں اپنے گھر والوں کے ساتھ کراچی لوٹ آیا۔ کراچی کی آب وہوا مجھے راس آئی اور فائدہ ہوتا گیا۔ میں کراچی سے مسلسل دو برس تک غیر حاضر رہا تھا، جس میں سے چھ مہینے بھُوج میں کرنل پاٹنجر کے ساتھ اور باقی وقت حیدر آباد کے قریب انگریزوں کی چھاؤنی میں کرنل آؤٹرام کے ساتھ رہا تھا۔ اس تمام مُدت میں میں نے ان کی بلامعاوضہ خدمت کی تھی اور اپنے ذاتی خرچ پر اپنی مقامی حیثیت اور مرتبے کے مطابق رہتا اور سفر کرتا رہا۔ جب میں کراچی لوٹا تو یہ دیکھ کر بے حد خوش ہوا کہ میرے بھائیوں نے یہاں انگریز فوجوں اور بحریہ کی مدد جاری رکھی تھی اور حالات ویسے ہی تھے جیسے میرے کراچی سے بھُوج جاتے وقت تھے۔ میں انگریزی فوج کے سالاروں سے ملا اور ان کی صحبت میں بے حد خوش رہا۔ میرا خیمہ حسب سابق جنرل کے خیمے کے سامنے لگا تھا اور میں روزانہ صبح دس بجے چھاؤنی جاتا تھا اور شام پانچ بجے کے بعد گھر لوٹ آتا تھا۔ دو تین مہینوں کے بعد مسٹر ای بی ایسٹوک، جو شکارپور میں اسسٹنٹ پولیٹیکل ریزیڈنٹ تھے، حیدر آباد سے آئے۔ میں ان سے ملاقات کے لیے گیا تو انھوں نے بتایا کہ ہندوستان کے گورنر جنرل نے میرے لیے ستائیس پارچہ خلعت بھیجی ہے، انھوں نے مجھے اسے وصول کرنے کو کہا۔ میں نے شکریے کے ساتھ یہ عطیہ قبول کیا۔ مہینے بھر بعد، بنگال سروس کے مسٹر کیسڈلی سندھ میں پولیٹیکل ریزیڈنٹ مقرر ہوئے۔ میں ان سے ملنے گیا تو انھوں نے مجھے اطلاع دی کہ گورنر جنرل ہندوستان نے سو روپے ماہانہ سیاسی پنشن میرے لیے مقرر کی ہے، جس کے بدلے حکومت مجھ

سے توقع رکھتی ہے کہ میں متعلقہ معاملات پر انھیں صلاح مشورہ دوں۔ میں نے رابطے کے لیے ان کا اور حکومت کا شکریہ ادا کیا۔ سندھ کا سیاسی ادارہ فقط تین ماہ مزید برقرار رہا، اس کے جاتے کے ساتھ ہی میرا پنشن کا وظیفہ بھی بند ہو گیا۔

تاہم، میں نے انگریزوں کی چھاؤنی میں باقاعدہ جانے کا معمول برقرار رکھا۔ ایک دن کیپٹن ہنری پریڈی، جو کراچی محکمہ رسد کے اعلیٰ افسر تھے اور بازار نگران (چھاؤنی میسجسٹریٹ) کے فرائض بھی ادا کرتے تھے، مجھے افواج کے سالار کے پاس لے گئے اور ان کی موجودگی میں مجھے بتایا، ہم نے صدر بازار کی بہتری کے لیے بہت جتن کیے ہیں اور ابھی بھی بھرپور کوشش کی ہے۔ ہم نے میروں سے صدر بازار میں فروخت کے لیے آنے والی تمام اشیا کو محصول کا استثنیٰ دلوایا ہے، لیکن اس سب کے باوجود کوئی مقامی شخص صدر میں دکان کھولنے پر آمادہ نہیں۔ ہمیں پتا چلا ہے کہ ٹالپر حکومت کے اہلکار تاجروں کو منع کرتے اور دھمکاتے ہیں، اس لیے کوئی بھی تاجر چھاؤنی کی حدود میں سامان بیچنے کی ہمت نہیں کر پاتا۔ اس لیے انھوں نے مجھ سے صدر میں تجارت کی ترقی کے لیے مدد اور تعاون کے لیے اصرار کیا۔ میں نے انھیں جواب دیا کہ میں ان کے حکم پر کوئی بھی کام کرنے یہاں تک کہ ٹالپر حکومت کی ناراضی مول لینے کی قربانی کے لیے تیار ہوں۔ مجھے بخوبی معلوم تھا کہ مقامی اہل کار تاجروں کی صدر میں دکانیں کھولنے کی حوصلہ شکنی کرتے تھے لیکن چوں کہ انھوں نے میرے تعاون اور مدد کی خواہش ظاہر کی ہے، میں بازار میں مختلف اشیا کی فروخت کے لیے دکانیں کھولنے کے لیے جو کچھ کر سکتا ہوں خوشی کروں گا۔ دوسرے ہی دن میں نے اپنے خرچ پر کئی عمارتیں بنانے کا حکم دیا، چھاؤنی میں اپنے ادارے کی شاخ کھولی اور متعدد تاجروں کو چھاؤنی کے لوگوں کی سہولت کی خاطر اناج، پارچہ جات اور دیگر اشیا کی دکانیں کھولنے پر آمادہ کیا۔ میں نے احمد آباد کے نرسنگ داس کو منیم مقرر کیا۔ وہ سپاہیوں کے لیے بہت کارآمد ثابت ہوا، کیوں کہ وہ انھیں خاص ہندوستان اور بھارت کے دیگر حصوں میں ان کے خاندانوں کے لیے ہنڈیاں دے دیا کرتا تھا۔ جب صدر میں بیوپار ترقی کرنے لگا تو ٹالپروں کی حکومت کے اہل کاروں نے، جو کراچی میں تھے، مل کر میرے خلاف حیدرآباد کے دربار میں شکایت کی کہ ماؤں مل نے کراچی کے بیوپار کو متاثر کر کے حکومت کی آمدنی کو نقصان پہنچایا ہے۔ اس پر میر نصیر خاں طیش میں آ گیا اور انھوں نے مجھے گرفتار کرنے کے لیے تیس سوار کراچی بھیجے۔ یہ خبر مجھے حیدرآباد دربار سے تعلق رکھنے والے میرے عزیزوں نے بھیجی تھی۔ جیسے ہی مجھے خط ملا، میں نے فوراً جا کر کیپٹن پریڈی اور برطانوی فوج کے سالار کو اطلاع دی۔ انھوں نے براہ راست نائب سیاسی اہل کار لیفٹیننٹ میلی کو مطلع کرنے کے لیے لکھا اور ان سے اس کے خلاف احتجاج کرنے کی درخواست کی۔ یہ خط ایک تیز رفتار قاصد کے ہاتھ بھیجا گیا اور جوں ہی لیفٹیننٹ میلی کو خط ملا، وہ بذات خود میر نصیر خاں کے پاس گئے تاکہ معلوم کریں کہ ان کی سنی ہوئی اطلاع درست ہے یا نہیں۔ میر نصیر خاں نے غصے میں کہا، ہاں، میں نے احکام دیے ہیں۔ اس نے کراچی کو تباہ کر دیا ہے اور ہمیں محصول میں لاکھوں کا نقصان پہنچایا ہے اور اب وہ میرے قابو میں آیا

ہے۔ میں اسے گرفتار کر کے رہوں گا۔ لیفٹیننٹ میلی نے بھی اسی غصے سے جواب دیا کہ انہیں ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ میں (ماؤں مل) برطانوی حکومت کی سرپرستی میں رہتا ہوں اور مجھے ہندوستان کے گورنر جنرل کا تحفظ حاصل ہے۔ لہذا لیفٹیننٹ نے میر کو تنبیہہ کی کہ ایسا کوئی اقدام نہ کریں جو میرے لیے نقصان دہ ثابت ہو۔ یہ کہہ کر لیفٹیننٹ رخصت ہو گئے اور اس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ میر نصیر خان نے خاموشی سے اپنا حکم واپس لے لیا اور کوئی ٹالپر سوار کراچی نہ آیا۔

۱۸۴۲ میں سر چارلس نیپیئر سندھ میں برطانوی افواج کے سالارِ اعلیٰ مقرر ہو کر کراچی پہنچے، جہاں سے جلد ہی وہ حیدر آباد کے لیے رخصت ہوئے۔ ۱۸۴۳ کے شروع میں خیرپور کے دو میر برادران ــــ میر رستم اور علی مراد ــــ کے درمیان تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا اور دونوں نے جنگ کے لیے اپنے آدمی جمع کر لیے۔ موخرالذکر کی سر چارلس نیپیئر سے خط و کتابت تھی اور انھوں نے اپنے بھائی کے خلاف ان کی مدد طلب کی۔ سر چارلس نیپیئر نے فوری طور پر آمادگی ظاہر کی اور میر رستم فرار ہو گئے اور حیدر آباد کے میروں کے پاس جا کر پناہ لی، جہاں سر چارلس نیپیئر نے ان کا پیچھا کیا۔ حیدر آباد کی حکومت غصب ناک ہو گئی اور مخالفت کا سوچنے لگی۔ اسی سوانگ کی ابتدا میں بلوچیوں نے مقامی سفارت خانے پر اچانک حملہ کیا۔ کرنل آؤٹرام نہایت دلیری سے شدید مخالفت کے باوجود دو تین گھنٹے دفاع کرتے رہے، تاہم بعد میں دریائے سندھ میں ایک سرکاری اسٹیمر پر چڑھ کر نکل گئے۔ ٹالپر، لوگوں کو جمع کر کے تیس ہزار سپاہیوں کے ساتھ سر چارلس نیپیئر کو پکڑنے کے لیے (جو اس وقت مالاتک پہنچ گئے تھے) حیدر آباد سے چار کوس کے فاصلے پر، میانی کی طرف بڑھے۔ سر چارلس کے ساتھ اس وقت ڈھائی ہزار جنگجو سپاہی تھے، دوسری طرف میروں کا لشکر، تازہ بھرتی کیا ہوا، بلکہ ناآزمودہ کار بلوچیوں کا ایک ہجوم تھا۔ ان کے سالار بے ہنر تھے، جنہیں فنِ حرب سے کوئی واقفیت نہ تھی۔ میانی کے قریب جنگ ہوئی، جس میں ٹالپروں کا لشکر شکست کھا کر بھاگ گیا۔ بلوچوں نے خاصا مقابلہ کیا اور انھوں نے نہایت دلیری سے تلواروں سے کام لیا، لیکن وہ یکسر غیر تربیت یافتہ تھے۔ میروں نے خود بھی لشکر کے ساتھ بھاگ کر حیدر آباد کے قلعے میں پناہ لی۔ فاتح سر چارلس نیپیئر نے ان کا پیچھا کر کے، میر خان کے ٹنڈو میں آ کر ڈیرا جمایا۔ میروں کے آل عیال پھلیلی کے پار چلے گئے اور سر چارلس نیپیئر نے قلعے پر قبضہ کر لیا۔

میانی کی جنگ سے پہلے، جب بلوچوں نے حماقت کر کے حیدر آباد میں سفارت خانے پر حملہ کیا تھا، تب میروں نے ملیر کے جام مہر علی جوکھیو، ملک احمد نومڑیو اور ملک ابراہیم خان کرمتی کو لکھا تھا کہ آپ لوگ حیدر آباد آ کر بلوچیوں کے لشکر میں شامل ہونے کے بجائے، اکٹھے ہو کر اپنی متحدہ فوج کے ساتھ کراچی میں انگریزوں کی چھاؤنی پر اچانک یلغار کر کے، لوٹ مار کر کے جلا کر بھسم کر دیں اور سارے سپاہیوں کو مار ڈالیں، چاہے وہ انگریز ہوں، یوروپی ہوں یا دیسی۔ کوئی انگریز کتا زندہ نہ چھوڑیں اور جس کا بھی انگریزوں کی فوج سے، ان کے گروہ سے کوئی تعلق ہو اسے قتل کر ڈالیں۔ میروں نے کراچی میں اپنے

افسروں کو اس بات سے آگاہ کر دیا تھا اور انھیں ہدایت کر دی تھی کہ ان سرداروں کی پیسے اور عملے سے ہر ممکن امداد کریں تاکہ وہ ان کے احکام کی تعمیل آسانی سے کر سکیں۔

ان تینوں سرداروں نے کراچی میں انگریزوں کی چھاؤنی پر یلغار کرنے کے لیے اپنے لوگ مجتمع کیے لیکن ان کی یہ مرضی نہ تھی کہ اس انہدادحسد قتل اور غارت گری میں کسی مسلمان کو کوئی نقصان پہنچے، اس لیے انھوں نے کچھ مسلمانوں کو یہ صلاح دی تھی کہ ہم جس وقت کراچی کے آس پاس کے گاؤوں میں لوٹ مار شروع کریں تو تم لوگ کراچی سے جلد از جلد نکل جانا۔ یہ خبر مسلمانوں میں پھیلتی پھیلتی شہر کے ہندوؤں اور دوسرے لوگوں کے کان میں پڑ گئی۔ خبر سنتے ہی سب میں ہراس پھیل گیا۔ ۱۶ فروری ۱۸۴۳ کی شام کو میں انگریزوں کی چھاؤنی سے لوٹا تو شہر کا حلیہ بدلا ہوا نظر آیا۔ ساری دکانیں اور دروازے بند تھے۔ صبح کو شہر لوگوں کی چہل پہل سے بارونق تھا، شام کو ویران ہو گیا تھا۔ میں گھر پہنچا تو دیکھا کہ حیرت انگیز طور پر میرا اسارا خاندان ایک جگہ بیٹھا بے چینی سے میری آمد کا منتظر تھا۔ اس دوران میں نے اپنے آدمی بھیجے کہ پتا کر کے آو، معاملہ کیا ہے۔ انھیں باوثوق ذرائع سے پتا چلا کہ ٹالپیروں نے اپنے افسروں کو کیا لکھا تھا اور کیسے انھوں نے یہ خفیہ خبر خیر خواہی کر کے اپنے عزیزوں اور ہندو بیوپاری دوستوں کو پہنچائی تھی، جنھوں نے دوسرے دن بندرگاہ پر کھڑے جہازوں اور بیڑیوں میں پناہ لینے کی تیاری کر لی تھی۔ فکر کے مارے مجھے نیند نہیں آئی۔ صبح ہوتی تو میں سوار ہو کر انگریزوں کی چھاؤنی میں چلا گیا اور سیدھا کیپٹن پریڈی کے گھر کے دروازے پر جا کھڑا ہوا۔ ایک جمعدار باہر سو رہا تھا، اس نے اٹھ کر دروازہ کھٹکھٹایا اور کیپٹن پریڈی دروازہ کھول کر مجھے اندر لے گئے۔ میں نے جو کچھ سنا تھا، انھیں اس کی اطلاع دی اور بتایا کہ شہر میں اس خبر کی وجہ سے بے حد ہراس پھیل گیا ہے اور لوگ بھاگ نکلنے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ میرے اہل خاندان خود مجھ سے بار بار اس میں اور کہتے ہیں کہ ہمیں جلد باہر نکالو، لیکن میں نے انھیں کہا ہے کہ میں اپنے دوستوں سے صلاح کرنے سے پہلے تم لوگوں کو شہر سے باہر نہیں بھیجوں گا۔ تب میں نے کیپٹن پریڈی سے عرض کیا کہ مجھے اجازت دے دیں کہ میں اپنے اہل خانہ کو ایک جہاز پر چڑھا دوں، میں خود چھاؤنی میں انگریزی سپاہیوں کے ساتھ رہوں گا اور ان کے ساتھ دکھ سکھ میں شریک رہوں گا۔ یہ آزمائش کا وقت ہے، چستی اور ہمت درکار ہے۔ چھاؤنی میں انگریزوں کے زیادہ سے زیادہ فقط دو تین سو سپاہی موجود ہیں۔ کیپٹن پریڈی نے کہا کہ کئی دن گزر گئے ہیں، اب تک سر چارلس نیپیئر کی چھاؤنی سے کوئی ڈاک نہیں آئی۔ ہمیں معلوم نہیں کہ ان کے حیدرآباد سے روانہ ہو جانے کے بعد کیا کچھ ہو چکا ہے اور نہ ہی یہ خبر ہے کہ وہ اس وقت کہاں ہیں۔ میں گھوڑے پر چڑھ کر تیز رفتاری سے گھر کی طرف چلا۔ رام باغ تالاب کے پاس سڑک کے کنارے مجھے ایک فقیر ملا جو تقریباً ننگا تھا۔ فقط ایک چیتھڑا اس کی کمر اور لنگوٹی پر لپٹا ہوا تھا۔ وہ سندھی نہیں تھا، ترک لگتا تھا۔ اس نے پاگلوں کی طرح ہندوستانی میں کہا کہ انگریزوں کی فتح ہوئی ہے اور انھوں نے سندھ حاصل کر لیا ہے۔ میرے دل نے ہمیشہ کے لیے سندھ گنوا دیا۔ اس آدمی کو میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔

میں شہر کی دہشت زدہ گلیوں سے گزر کر گھر پہنچا۔ اندر سرائے میں کوئی پچاس ساٹھ افراد، میرے خاندان کے سب مرد، ایسے کارندوں اور ملازموں کے ہم راہ میری واپسی اور ہدایات کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ہم اسباب باندھ کر چلنے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ مجھے سخت پیاس لگی ہوئی تھی۔ میں نے ان سے کہا کہ پہلے مجھے پیاس بجھا لینے دو، پھر میں تم لوگوں کو بتاؤں گا کہ کیا کرنا چاہیے۔ میں اندر گھر کے گیا، جہاں میری دادی نے ایک بار پھر کہا کہ ہماری جانیں بچاؤ اور جانے دو۔ میں لباس تبدیل کر کے کھانا کھانے بیٹھا۔ ابھی دو تین لقمے ہی کھائے تھے کہ نوکر نے آ کر بتایا کہ کیپٹن پریڈی باہر کھڑے ہیں اور آپ کو بلا رہے ہیں۔ میں فوراً ان سے ملنے باہر گیا۔ وہ کہنے لگے کہ میرے آگے چلو۔ میں نے کپڑے پہن کر ان کے آگے چلنا شروع کیا۔ جب ہم فلیگ اسٹاف کے پاس پہنچے، جہاں ٹالپر حکومت کے تین اہل کار بیٹھے تھے، تو کیپٹن پریڈی نے مجھ سے خواہش ظاہر کی کہ ان سے نیچے اتر آنے کے لیے کہوں۔ یہ تینوں اجارہ دار فوراً اپنی نشستوں سے اٹھ کر کیپٹن پریڈی کے سامنے آ کھڑے ہوئے، جنھوں نے انھیں آگے چلنے کے لیے کہا۔ انھوں نے حکم کی تعمیل کی اور آگے چلتے رہے، یہاں تک کہ ہم اس جگہ پہنچ گئے جسے اب جوڑیا بازار کہتے ہیں۔ وہاں میرے ملازمین سواری کے لیے تیار ایک گھوڑا اور ایک اونٹ لیے کھڑے تھے۔ کیپٹن پریڈی مجھ سے ان اجارہ داروں کا خیال رکھنے کو کہہ کر گھوڑا دوڑا کر کچھ فاصلے پر چلے گئے۔ اجارہ دار ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر میری طرف تعجب سے دیکھنے لگے، اور پوچھا کہ معاملہ کیا ہے؟ میں نے ان سے کہا کہ میں بھی تم لوگوں کی طرح بالکل کورا ہوں۔

کیپٹن پریڈی پانچ چھ منٹ کے بعد لوٹ آئے۔ ان کے پیچھے توپ خانہ اور سپاہی تھے۔ ہم دوبارہ شہر کی طرف چلے۔ میروں کے اہلکار ہمارے آگے چل رہے تھے، میں اور کیپٹن پریڈی توپ خانے اور سپاہیوں کے ساتھ پیچھے تھے۔ جمعدار کے پاس چار پانچ سپاہی ایک چبوترے پر بیٹھے تھے۔ کیپٹن پریڈی نے انھیں اتر آنے کا حکم دیا۔ وہ جب نیچے آئے تو ان سے ہتھیار چھین کر انگریزوں کی پلٹن کے سپاہی متعین کیے گئے۔ پھر ہم چاوڑی (ٹاؤن ہال) کی طرف گئے، جہاں ٹالپروں کا پرچم ہوا میں لہرا رہا تھا۔ کیپٹن پریڈی کے حکم کے موجب وہ پرچم، جس میں یکے بعد دیگرے چھ سات سرخ اور سفید پٹیاں تھیں، گرا کر اس کی جگہ یونین جیک لگایا گیا۔ چاوڑی میں جو سامان تھا (کاغذ اور کھاتے وغیرہ) وہ ایک کمرے میں رکھ کر اس پر مہر لگائی گئی اور وہ جگہ میرے حوالے کی گئی۔ ہم سارے شہر کی تلاشی لیتے شہر کے اس طرف کھارادر تک گئے۔ کارروائی کی گئی۔ کچھ قلعے پر ترتیب سے سپاہی ایستادہ کر کے توپیں رکھی گئیں۔ غرض یہ کہ ہر بات کا اچھی طرح لحاظ رکھا گیا۔ ہم پھر چاوڑی پر آئے، جہاں اعلان کیا گیا کہ کراچی اب انگریزوں کے قبضے میں آ چکا ہے اور سیٹھ کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ اعلان کی نقلیں چاوڑی کی دیواروں اور دونوں دروازوں پر لگائی گئیں اور شہر میں اس کا ڈھنڈورا بھی پیٹا گیا۔ اس کے بعد لوگوں کو اطمینان ہو گیا اور شہر میں دکانیں اور کوٹھیاں کھولی گئیں اور دوبارہ وہی چہل پہل شروع ہو گئی۔ حکومت کی تبدیلی نہایت خاموشی سے کی گئی۔ کسی بھی قسم کا نقصان نہیں ہوا اور کسی کو بھی کوئی زخم نہیں لگا۔ شہر میں

چوکیوں کی نگہداری کے لیے فوج کے ایک یورپی سارجنٹ کو مقرر کیا گیا اور میرے گھر اور سرائے پر سپاہیوں کا پہرا بٹھایا گیا۔ ٹالپروں کی حکومت کے اہل کاروں کو چھاؤنی میں، حوالات میں رکھا گیا۔

میں نے جوکھیوں، کرمتیوں اور نومڑیوں کی نقل و حرکت کا جائزہ لینے کے لیے آدمی بھیجے تھے۔ انھوں نے لوٹ کر بتایا کہ ڈاکو انگریزوں کی چھاؤنی سے دو تین میلوں کے فاصلے پر پہنچ گئے تھے اور ساتھ والے گاؤں میں انھوں نے لوٹ مار اور آتش زنی کی تھی۔ لیکن پھر جب انھیں پتا چلا کہ انگریزوں کو ان کے ارادوں کا علم ہو گیا ہے اور اسی دوران ٹالپروں کے اہل کاروں کو گرفتار کر کے کراچی پر قبضہ کر لیا ہے، تو ان کا جی بیٹھ گیا اور انھیں کراچی پر حملہ کرنے کی ہمت نہ پڑی۔ میں نے یہ خبر کیپٹن پریڈی کو سنائی، جنھوں نے بروقت مزید مناسب حفاظتی بندوبست کر لیا۔

کراچی کے آس پاس کرمتیوں، نومڑیوں اور جوکھیوں کے چھاپوں نے سراسیمگی پیدا کر دی تھی اور بیرونی دنیا سے آمدورفت اور خط و کتابت کا سلسلہ بھی ختم ہو چکا تھا۔ کیپٹن پریڈی اور کرنل مائلو نے ایک دن مجھ سے مشورہ طلب کیا کہ بلوچوں کی حرکتیں بند کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ چھٹا قوم کا سردار، شاہ بلاول والا صاحب خان میرا دوست تھا۔ وہ ۱۸۳۹ میں کیپٹن باونڈ کے قتل کی تفتیش کے سلسلے میں کراچی آیا تھا کیوں کہ اس قتل میں جلیبہ جا کر کے ساتھ اُس کی قوم کے کچھ لوگوں کا بھی ہاتھ تھا۔ میں نے اس وقت اس کی اچھی طرح خاطر داری کی تھی اور اس خدمت کے بدلے اس نے مجھ سے قسم کھا کر وعدہ کیا تھا کہ میری خدمت کی جب بھی تمھیں ضرورت پڑے گی تو میں حاضر ہوں گا۔ میں پہاڑی آدمی ہوں۔ میرا قول پتھر پر لکیر ہے۔ میں اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر بھی تمھاری خدمت کروں گا۔ کیپٹن پریڈی اور کرنل مائلو نے مجھ سے کہا کہ جب تک ہمیں بمبئی سے مدد پہنچے تب تک ہمیں آدمیوں کی مدد چاہیے۔ میں نے صاحب خان چھٹا کو ایک رہنمائی سوار کے ہاتھ خط بھیجا، جس میں میں نے اسے لکھا کہ تم نے کچھ برس قبل مجھ سے وعدہ کیا تھا، جو تمھیں یاد ہوگا۔ اب مجھے تمھارے آدمیوں کی مدد کی ضرورت ہے۔ کام اتنا ضروری ہے کہ اگر تمھارے سر میں ملتانی مٹی بھی لگی ہو تو اسے دھونے کے لیے نہ رکو، بلکہ فوراً کراچی پہنچ جاؤ۔ اس نے جب ندی پر پہنچ کر، اپنی آمد کی پیشگی اطلاع بھیجی۔ اس کے بعد اس نے جلد ہی آ کر باغیچوں کے برابر ڈیرا جمایا۔ میں اس کے آدمیوں کے لیے کھانے پینے کا بندوبست کر کے اس سے ملنے گیا۔ پھر اسے، اس کے مسلح آدمیوں سمیت، انگریزوں کی چھاؤنی میں لے گیا اور سردار کا کرنل مائلو اور کیپٹن سے تعارف کرایا۔ وہ بے حد خوش ہوئے۔

صاحب خان نے سارے مویشی اور دوسرا مال، جو ڈاکوؤں کے ٹولوں نے کراچی کے ارد گرد سے لُوٹا تھا، برآمد کر کے حقیقی مالکوں کو لوٹا دیا۔ جب کرمتیوں، نومڑیوں اور جوکھیوں کو پتا چلا کہ صاحب خان مدد کے لیے آیا ہوا ہے تو انھوں نے سمت مار دی۔ اسی دوران بمبئی سے کمک بھی پہنچ گئی اور صاحب خان کو آٹھ دن رہنے کے بعد، لوٹ جانے کی اجازت دی گئی۔ میرے کہنے پر صاحب خان کو اور کچھ دوسرے سرداروں کو، جو اس کے ساتھ آئے تھے، برطانوی افسروں کی طرف سے خلعتیں دی گئیں۔

***

اس کے بعد جلد ہی میرے والد سیٹھ موت چند، جو دو ہفتے سے سمبوڑے کے پاس ہمارے جہاز کوتیہ سریسا پر ٹھہرے ہوئے تھے، ساحل پر آئے۔ ہر طبقے کے ہزاروں افراد، ہندو اور مسلمان، ان کے خیر مقدم کے لیے بندرگاہ پر آ کر جمع ہوئے اور انھیں ایک شان دار جلوس میں گھر تک لے کر آئے۔

بعد میں ٹالپروں کے اہل کار قید سے آزاد کیے گئے۔ میرے بھائی سکھ رام داس کو کسٹم کا کلکٹر مقرر کیا گیا اور میں نے کیپٹن پریڈی کے مشورے اور اجازت سے دیوان مول چند کو پولیس چوکی کا انچارج مقرر کیا۔ اس کے کچھ عرصے بعد سر چارلس نیپیر سندھ کے گورنر نامزد کیے گئے اور انھوں نے کیپٹن پریڈی کو کراچی کے کلکٹر کے عہدے کے لیے منتخب کیا۔

میں روزانہ دس بجے صبح چھاؤنی میں جا کر، حیدر آباد اور سندھ کے دوسرے حصوں کے لوگوں کے جذبات سے متعلق خبریں پہنچاتا تھا، جو مجھے مختلف ذرائع سے ملتی تھیں۔ میں جو کچھ سنتا تھا، وہ لکھ لیتا تھا اور پھر وہ کاغذ کیپٹن پریڈی کو پڑھ کر سناتا تھا۔ وہ ان میں سے اہم خبروں کی ایک یادداشت بنا کر سر چارلس نیپیئر کو پہنچاتے تھے۔

میانی کی جنگ کے ڈیڑھ مہینے بعد منتشر بلوچ، شیر محمد کے پرچم تلے مجتمع ہو گئے اور اس نے ان کی مدد سے حیدر آباد سے آٹھ میل دور، ٹنڈو الہ یار والے راستے پر دباری (دابو) گاؤں کے پاس سر چارلس نیپیر کا مقابلہ کیا۔ بلوچیوں کو دوبارہ شکست ہوئی اور شیر محمد، دودومری کے علاقے کے پہاڑی دروں کی طرف بھاگ گیا۔ اس کے بھائی میر شاہ محمد نے سپاہی بھرتی کرنے کے ارادے سے جانڈ کی اور کاچھی کی سمت لی۔ سر چارلس کو اُس کے ارادوں سے آگاہ کیا گیا، انھوں نے اس کے پیچھے ایک فوجی دستہ روانہ کیا جو اسے جھانگار کے پاس پہنچ کر قید کر کے لے آیا۔ اس کے بعد سر چارلس نیپیئر نے حیدر آباد اور خیرپور کے سب میروں کو، شاہ محمد سمیت، سیاسی قیدی بنا کر بمبئی بھیج دیا۔

**

اگلے صفحات میں جان برنٹن (John Brunton) کی یادداشتوں پر مشتمل کتاب کے منتخب حصوں سے ترتیب دیا گیا متن پیش کیا جا رہا ہے۔ برنٹن (۱۸۱۲ - ۱۸۹۹) نے ۱۸۵۶ میں ریلوے انجینیر کے طور پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت اختیار کی، ۱۸۵۷ کی بغاوت کے بعض واقعات کا مشاہدہ کیا اور سندھ اور پنجاب کے علاقوں میں ریلوے لائن کی تعمیر کے کام میں اہم حصہ لیا۔ برنٹن کی یادداشتوں پر مشتمل کتاب کیمبرج سے ۱۹۳۹ میں درجِ ذیل عنوان اور ذیلی عنوان کے ساتھ شائع ہوئی

John Brunton's Book Being the Memories of John Brunton Engineer from a manuscript in his own hand written for his grandchildren and now first printed

اپنی سرگرم زندگی کے تجربات اور مشاہدات برنٹن نے ڈائری کے طور پر اپنے پوتوں پوتیوں کے لیے، اور ان سے مخاطب ہو کر، لکھے تھے (چناں چہ کتاب میں مصنف کا ذکر متعدد مقامات پر "ہمارے پیارے دادا جان" کے الفاظ میں آتا ہے)، تاہم ان یادداشتوں میں کراچی اور سندھ کی تاریخ سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے بھی بہت سی اہم چیزیں موجود ہیں۔ اس کتاب میں ۱۸۵۷ میں کراچی میں تعینات بنگالی رجمنٹوں پر مشتمل اکیسویں نیٹو رجمنٹ کی بغاوت کا حال ملتا ہے؛ اس کے علاوہ کراچی کی بندرگاہ کو ریلوے لائن کے ذریعے سندھ اور پنجاب کے زرعی علاقوں سے منسلک کرنے کے اہم اقدام کے بارے میں بھی معلوم ہوتا ہے۔ ریلوے لائن کی تعمیر نے، جس کی منصوبہ بندی ۱۸۵۷ سے پہلے شروع کی جا چکی تھی، بندرگاہ اور شہر کے طبعی اور معاشرتی خدوخال متعین کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ کراچی کے جدید شہر کو انگریزوں نے زرعی اجناس، خصوصاً غلے، کی برآمد کے اہم ترین راستے کے طور پر ترقی دی، اور ایک وقت میں اس بندرگاہ نے ہندوستان سے زرعی اجناس کی برآمد کے سلسلے میں ممتاز مقام حاصل کر لیا۔ اس متعینہ کردار کے باعث کراچی صنعتی ترقی کے بغیر ایک جدید اور بڑا شہر بن گیا اور یہاں کی معاشی سرگرمیاں بیشتر تجارت پر مشتمل رہیں۔ شہر کے اس مخصوص کردار ہی کی بدولت ہندوستان اور بیرون ملک سے مختلف مذہبی، لسانی اور نسلی پس منظر رکھنے والے لوگ یہاں آ کر آباد ہوئے اور شہر کی زندگی نے کاسموپولیٹن رنگ اختیار کیا۔

کراچی میں ایک چھوٹی سی سڑک برنٹن کے نام سے منسوب ہے۔ یہ سڑک فریئر ہال کے سامنے امریکی کونسلیٹ اور میریٹ ہوٹل کے درمیان سے نکلتی ہے اور وکٹوریہ روڈ (عبداللہ ہارون روڈ) اور ڈاکٹر ضیاالدین احمد روڈ کو ملاتی ہے۔

جان برنٹن

انگریزی سے ترجمہ اور تدوین عطا صدیقی

جان برنٹن کی کتاب

جنگی سازوسامان کے ٹھکانے لگانے میں کوئی چار ماہ لگ گئے۔ ۱۸۵۶ کا مارچ ختم ہونے کو آ گیا۔ جن دنوں یہ کام جاری تھا میرے پاس ہندوستان میں ملازمت کی تجاویز آنے لگیں۔ ایک تجویز جزیرہ سیلون میں ریل کی پٹریاں بچھانے کی نگرانی، تو دوسری ایسٹ انڈیا ریلوے کمپنی کے لیے مسٹر جارج ٹرنل کی سربراہی میں بنائے جانے والے آہنی پلوں کے کام کی نگرانی تھی۔ اور تیسری تجویز یہ تھی کہ میں دریائے سندھ پر کراچی اور کوٹری کے درمیان سندھ ریلوے کا چیف انجینئر بن کر چلا جاؤں۔ تمام پیشکشیں کافی دل خوش کرنے والی تھیں۔ درست انتخاب کے لیے میں نے اوپر والے کی طرف سے مناسب رہنمائی کی خاطر دل سے دعائیں مانگیں۔ قرعہ فال آخرالذکر کا نکلا اور سات جون ۱۸۵۶ کو مجھے سندھ ریلوے کے چیف انجینئر کا اور تمہارے پیارے والد کو اسسٹنٹ انجینئر کا تقرر نامہ ملا۔

جون میں ہم کو ہندوستان روانہ ہونا تھا اور اس دوران میرا کام یہ تھا کہ کراچی میں قائم کی جانے والی ایک ٹرمینس بنانے اور مرمت کرنے والی شاپ کے لیے درکار عمارات اور مشینری کے نقشہ جات تیار کروں۔ مسٹر اینڈریو (حال سر ولیم پیٹرک اینڈریو) نے ایسٹ انڈیا ریلوے کے لیے کراچی سے دہلی تک کے لیے ریل کی پٹریاں ڈالنے کی ایک اسکیم بنا رکھی تھی۔ ان دنوں پنجاب سیکشن پر ملتان سے لاہور اور امرتسر تک کام جاری تھا اور میرے بھائی بحیثیت چیف انجینئر وہاں تھے۔ میں بہت مصروف رہا۔ میں انگلستان کے ریل انجن تیار کرنے والے بڑے بڑے اداروں میں بار بار گیا اور نقشے حاصل کیے جنہیں پسند کیا گیا اور منظور کر لیا گیا۔ جولائی میں میں نے تمہاری پیاری دادی، تمہارے والد اور اپنے لیے پی اینڈ او کے ایک جہاز پر، جو کہ مارسیلز سے الیگزینڈریا اور سوئز سے بمبئی تک جاتا تھا، ٹکٹ حاصل کیے۔ چند دن بعد ہی ہندوستان میں بغاوت کی حیرت ناک خبر آئی۔ جتنے افسران چھٹیوں پر انگلستان آئے ہوئے تھے سب کو واپس اپنی رجمنٹوں میں پہنچنے کا حکم ملا۔ مجھے اس پرائیویٹ کیبن کی طرف سے فکر ہو گئی جو جہاز والوں نے میرے اور تمہاری دادی کے لیے بک کیا تھا۔ میں وہاں معلوم کرنے گیا تو انھوں نے مجھے یقین دلایا کہ جنگ کی مانگ کے باوجود جو کیبن میرے نام اس جہاز کے آنے سے پہلے بک کر دیا گیا تھا مجھ کو ہی

ملے گا۔
اگست ۱۸۵۶ کے آخری دنوں میں ہم مارسیلز کے لیے روانہ ہوئے اور وہاں سے جہاز پر سوار ہوئے۔ سر میورور (حال لارڈ سٹریتھ بیرن) اور کرنل وڈہم بھی مسافروں میں تھے۔ میں نے دونوں سے شناسائی پیدا کر لی۔ الیگزینڈریا تک ہمارا سفر خوشگوار رہا۔ راستے میں ہم مالٹا میں رکے جہاں ہمیں سینٹ جان کے کیتھیڈرل جانے کا موقع ملا۔ پھر ہم الیگزینڈریا پہنچے۔ ان دنوں سویز تک جانے کے لیے ریلوے لائن نہیں تھی اور ہمیں پرانے کارواں راستے پر سفر کرنا پڑا۔ یہ سفر ایک صندوق نما پہیوں کی گاڑی پر کیا گیا جس میں چھ افراد بیٹھ سکتے تھے اور جسے چار خچر کھینچ رہے تھے۔ یہ سواری خطرناک حد تک دقیانوسی اور تکلیف دہ تھی۔ سویز جانے والوں میں ہماری سواری سب سے آخری تھی جو کوئی ایک بجے رات کو پہنچی۔
ہوٹل، جس کا مالک پرتگالی تھا، بھرا ہوا تھا بلکہ ضرورت سے زیادہ ہی بھرا ہوا تھا۔ بڑی مشکل سے میں تمہاری دادی کو ایک کمرے میں پہنچا سکا جہاں فرش خواتین سے پٹا ہوا تھا، جنھوں نے بڑی دقت سے تمہاری دادی کے لیے اپنے اور اپنے بچوں کے درمیاں لیٹنے کی جگہ بنائی۔ بات یہ تھی کہ اسی وقت بمبئی سے ان عورتوں اور بچوں سے بھرا ہوا جہاز آ گیا تھا جو ہندوستان کے غدر سے جان بچا کر بھاگے تھے۔ وہ عورتیں اپنے ساتھ دیسی باشندوں کے ظلم و ستم کی، جو وہ ہندوستان میں برپا کیے ہوئے تھے، بڑی ہولناک داستانیں لائی تھیں۔ مجھے اور تمہارے پیارے والد کو رات اس بی میں ایسے ایسے تھیلوں کو تکیہ بنا کر سونا پڑا۔ اگلے دن ہم جہاز پر سوار ہو گئے۔ گرمی بہت ڈرانے والی تھی۔
ہم ہوا کی رفتار کے ساتھ ساتھ بحر احمر میں روانہ ہوئے۔ جہاز کی چمنی کا دھواں ہمارے سروں پر شامیانے کی طرح تنا ہوا تھا، اور ہم سب نے رات عرشے پر گزاری کہ ہمارے کیبن بالکل ناقابلِ برداشت تھے۔ جب ہم عدن پہنچے تو ہم نے خدا کا بہت بہت شکر ادا کیا اور کوئلہ لینے کے بعد ہم نے بحر احمر کو کہیں پیچھے چھوڑ دیا۔ بمبئی کے قریب پہنچ کر جہاز کے کپتان (کپتان ررس) کو یہ معلوم کرنے کے لیے کہ بندرگاہ میں داخل ہونے کے لیے وہاں کے حالات پرسکون اور ٹھیک ٹھاک ہیں، سگنل دینا پڑا۔ ہم ڈرے ہوئے تھے کہ کہیں بمبئی باغیوں کے ہاتھ میں نہ ہو۔ خاطر خواہ جواب آنے پر ہم ایک اتنی شاندار بندرگاہ میں داخل ہوئے جس کا تم تصور کر سکتے ہو۔
ہم اترے اور ہوٹلوں میں جگہ تلاش کرنے لگے۔ ہر جگہ لبالب بھری پڑی تھی۔ مون سون ابھی ختم نہیں ہوئی تھی اور بارش کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ آخر کار ہمیں ایک ہوٹل کے کمپاؤنڈ کے سرے پر ایک ایسی عمارت میں پناہ لینا پڑی جو کہ طویلے سے کسی طرح بہتر نہ تھی۔ یہاں ہمارے ساتھ کچھ دیر کے لیے سر ہیو بھی رہے، پھر جیسے ہی بمبئی کے گورنر کو ان کی آمد کا علم ہوا انھیں اعلیٰ مقام پر بلا لیا گیا۔ ہم کیا کرتے؟ آخر کار مجھے اپنے ایک پرانے شناسا مسٹر جیمس برکلے یاد آئے جو گریٹ انڈین پینسولا ریلوے میں چیف انجینئر تھے اور بمبئی میں مقیم تھے۔ میں نے ان کے نام پنسل سے ہی ایک رقعہ لکھا اور اپنی

جانب ر ستانی تو کہیں کوئی رہائش حاصل کرنے کے لیے مشورہ طلب کیا۔ میرا قاصد فوراً ہی ان کا بڑا نوازش نامہ جواب لے کر لوٹا کہ میں فوراً اپنا مال و اسباب لے کر ان کے بنگلے پر پہنچ جاؤں۔ ہم نے اس دعوت کو رد نہیں کیا۔ بارش ہو رہی تھی اس لیے ہم نے بگھیاں منگائیں اور جلد ہی اس مہمان نواز گھر میں جا پہنچے۔

مسٹر اور مسز برکلے بہت مہربانی سے پیش آئے۔ اگلے دن میں بمبئی کے گورنر لارڈ الفنسٹن کی خدمت میں حاضر ہوا جنھوں نے مجھے فی الحال کراچی جانے سے منع کر دیا۔ میں یوروپین لوگوں کے چہروں پر چھائی ہوئی زردی اور اڑتی ہوئی ہوائیاں کبھی نہیں بھول سکتا۔ کانپور کے قتل عام اور دیگر مقامات پر ہونے والی جانوں کی بربادی نے سارے ہندوستان میں دہشت پھیلا رکھی تھی۔ بمبئی اندرون ملک سے آنے والے پناہ گزینوں سے بھر پڑا تھا کیوں کہ اندرون ملک کی زیادہ تر فوج دہلی کے محاصرے میں مدد دینے کے لیے بھیج دی گئی تھی جو کہ باغیوں کا صدر مقام تھا، اور بمبئی کے غنڈے، جو کہ بدمعاش کہلاتے تھے، صرف دہلی میں باغیوں کی کامیابی کی خبر آنے کے منتظر تھے کہ خبر آئے اور وہ بمبئی کے یوروپین لوگوں کو لوٹیں اور مار ڈالیں۔

بمبئی کے قیام کے دوران ایک رات میں اور برکلے کافی دیر تک گپ شپ کرتے رہے اور تمھاری دادی سونے چلی گئیں۔ جب میں اپنے کمرے میں گیا تو وہ سو چکی تھیں۔ مچھر دانی بستر کے چاروں طرف اڑسی ہوئی تھی۔ لیٹنے کے لیے میں نے آہستگی سے ایک طرف کا کونا اٹھایا اور سونے کے لیے لیٹ گیا اور پردے کو خوب دبا دیا۔ ابھی آنکھ لگی ہی تھی کہ مجھے محسوس ہوا کوئی میرے سر کے بال چھو رہا ہے (ان دنوں کچھ تھوڑے بہت بال تھے میرے سر پر۔) میں چپ چاپ پڑا دوبارہ اس احساس کا منتظر رہا۔ جلد ہی وہ پھر واقع ہوا اور میں نے فوراً ہاتھ مارا کہ جو کوئی بھی ہو اس کو پکڑوں اور اٹھ کر اس کو تلاش کرنے لگا تو میں نے ایک کھوس چوہے کو بھاگتے دیکھا۔ یہ جانتے ہوئے کہ مچھر دانی کے پردے اس رات بن بلائے مہمان کو آسانی سے نکل جانے نہیں دیں گے، میں نے تمھاری دادی کو جگایا اور چاروں طرف پردے کا پیچھا کرنے لگا۔ روشنی کی وجہ سے، جو بتی کہلاتی ہے اور ہندوستان میں تمام رات جس کے روشن رکھنے کا رواج ہے، ہم اس کو صاف طور پر دیکھ سکتے تھے۔ چند ایک ناکامیوں کے بعد آخرکار میں نے اس بدمعاش کو چادر کے پلے میں دبوچ لیا۔ جب وہ اچھی طرح میرے قابو میں آ گیا تو میں نے ایسے جھٹکے اور بل دیے کہ اس کی ریڑھ ٹوٹ گئی۔ وہ مر گیا اور میں نے اس کو باہر فرش پر اس ارادے سے پھینک دیا کہ صبح اس کی ناپ لوں گا۔

پھر ہم سو گئے۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ وہ جانور بھاگ رہا ہے۔ میں اٹھ بیٹھا اور میں نے باہر دیکھا وہ اسی جگہ پڑا تھا جہاں پھینکا گیا تھا۔ گھڑی دیکھی تو معلوم ہوا کہ وہ دو گھنٹے سے وہیں پڑا تھا۔ مگر صبح کو وہ غائب تھا۔ ناشتے پر مسٹر برکلے کو یہ واقعہ سنایا تو انھوں نے بتایا کہ بے شک اس کے اپنے ساتھی اسے گھسیٹ کر اپنے بل میں لے گئے ہوں گے اور اسے چٹ کر گئے ہوں گے۔ یہ چوہے بہت بڑے بڑے

اور تباہ کن ہوتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ میرے شکار کے کان میرے انگوٹھے جتنے بڑے تو ہوں گے ہی۔

جس ہوٹل کے شیڈ میں ہم نے مسٹر رکلے کی مہمان نوازی سے قبل بہت تکلیف میں وقت گزارا تھا اُس کی مالکہ کی سفارش پر ہم نے ایک دیسی آدمی کو ملازم رکھ لیا جسے ہمارے بٹلر کی حیثیت سے اور گھر کی دیکھ بھال کے لیے کام کرنا تھا۔ اس کے کاغذات کافی تسلی بخش تھے، اس لیے میں نے ایسا سامان اس کے سپرد کر دیا۔ دو دن بعد میرے ایک صندوق میں سے سات ساورن غائب تھے۔ میں نے اس کو علیحدہ کر دیا اور مسٹر رکلے کی مدد سے میں ایک گوانی کی خدمات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ لوگ گوا کے رہنے والے ہیں جو ہندوستان میں پرتگال کا علاقہ ہے۔ وہ بہت ہی کالا تھا، عام دیسی ہندوستانیوں سے کہیں زیادہ کالا، مگر وہ رومن کیتھولک تھا اس لیے عیسائی تھا۔ میں یہ اس لیے بتا رہا ہوں کہ وہ ایک بہت ہی وفادار ملازم ثابت ہوا اور ہندوستان میں ہمارے پورے قیام کے دوران ہمارا بٹلر رہا۔ آگے آگے تم اس کے بارے میں اور بہت کچھ سنو گے۔

بمبئی کے گورنر کو وہاں موجود یورپی لوگوں کے حوصلے بلند رکھنے کی بڑی فکر تھی چنانچہ انھوں نے گورنمنٹ ہاؤس میں ہفتے میں دو ڈنر پارٹیاں جاری رکھی ہوئی تھیں۔ بمبئی میں کوئی پندرہ دن گزرے تھے کہ ہم سب (تمھاری پیاری دادی، تمھارے پیارے والد اور میں) ایک ایسی ہی تقریب میں موجود تھے۔ ہر مہمان کی کرسی کے پیچھے ایک ایک وردی پوش دیسی ملازم کھڑا تھا۔ ادھر کچھ دنوں سے یہ دیکھنے میں آرہا تھا کہ دیسی ملازم کچھ اکھڑے اکھڑے رہتے تھے اور حکم عدولی پر مائل تھے۔ بے شک وہ اس امید میں تھے کہ ہم باغیوں کے گرد دہلی کے محاصرے اور حملے میں ناکام ہو جائیں گے کہ باغی ان لوگوں کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرانے کے دعوے دار تھے۔ ڈنر کے درمیان ہی گورنر کے ہاتھ میں ایک ٹیلیگرام پیش کیا گیا جسے کھول کر انھوں نے پڑھا اور کھڑے ہو کر جوش سے کہا، ”بیبیو، خواتین و حضرات! دہلی کا سقوط ہو گیا ہے اور وہ اب ہمارے قبضے میں ہے!“ میں دیکھے بغیر نہ رہ سکا کہ اس خبر کے اعلان کے ساتھ ہی دیسی ملازموں کے چہروں پر عجیب طرح کا اثر ہوا، جیسے کہ چھلنیاں اچانک بند کر دی گئی ہوں۔

وہاں موجود سب لوگ کھڑے ہو گئے اور دیر تک بہ آواز بلند خوشی کے نعرے لگاتے رہے۔ خواتین رومال لہراتی رہیں اور خوشی اور شکرانے کے آنسوؤں کے رخساروں پر بہتے رہے۔ ظاہر ہے کہ پھر کچھ کھایا نہ گیا۔ مزید شیمپین منگائی گئی اور زوروشور کے تحسینی نعروں کے ساتھ لارنس کے جام صحت لنڈھائے گئے۔

غدر کی کمر توڑی جا چکی تھی۔ جب میں غالی جناب گورنر سے رخصت لینے گیا تو انھوں نے فرمایا، ”رسٹن، اب تم جتنی جلدی تمھارا جی چاہے کراچی روانہ ہو سکتے ہو۔“

یہ خبر بہت ہی تسلی بخش اور حوصلہ افزا تھی۔ اگلے دن میں نے کراچی جانے والے جہاز پر راہداری

ہم نے آرٹلری بیرکس کے قریب ایک بنگلے میں قیام کیا اور میں نے سندھ ریلوے کے چیف انجینیر کا عہدہ سنبھالا۔

تمام انجینیرنگ اسٹاف کا جائزہ لینے اور ان تمام منصوبوں کا جو میرے پیش رو مسٹر ویلر نے بنائے تھے، معائنہ کر لینے کے بعد میرا پہلا کام یہ تھا کہ میں بھائی کسی پٹریوں کے ساتھ ساتھ سفر کروں تاکہ جہاں انہیں ممکن ہو اصلاح کروں۔

موسم چونکہ سردیوں کا تھا اس لیے میں نے فوراً سفر کی تیاری کا حکم دیا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ خیمے خریدے جائیں اور کیمپ کی ضروریات مہیا کی جائیں۔ میں سندوستانی طور طریقوں سے بالکل ناواقف تھا اس لیے مجھے ایسے سفر پر، جس کا ذکر کر رہا تھا، زیادہ خرچ کرنا پڑا۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ اس قسم کے سفر کے لیے کتنی تیاری اور انتظام کرنا پڑتا ہے۔ مجھے ۱۲ خیمہ لگانے والوں کی ضرورت تھی۔ مجھے ایک ایسا بلوچی مل گیا جس کے پاس بہت عمدہ اسناد تھیں۔ میں نے اس کو خیمہ برداروں اور اونٹ والوں وغیرہ کے ٹنڈل کی حیثیت سے ملازم رکھ لیا۔ اس نے بیس بلوچی میرے سامنے پیش کیے کہ میں ان میں سے خیمہ بردار منتخب کر لوں۔ اتنے عمدہ آدمی میں نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ وہ سب کے سب سفید لباس میں تھے اور ان میں سے کوئی بھی چھ فٹ ایک انچ سے کم لمبا نہ تھا، بعض تو چھ فٹ چار انچ تک تھے۔ تمام بلوچی اپنے بال لمبے رکھتے ہیں۔ یہ بال بالکل سیاہ اور بہت لمبے ہوتے ہیں اور ان کو بہت احتیاط سے دھو کر، تیل لگا کر، سرخ کپڑے کے ساتھ گوندھ کر، چوٹی کو سر کے چاروں طرف لپیٹ دیا جاتا ہے۔ اس طرح یہ دھوپ اور گرمی سے بچنے کے لیے ایک نوع کی پگڑی بن جاتی ہے۔ یہ اپنے آپ کو گم شدہ دس اسرائیلی قبیلوں میں سے ایک بتاتے ہیں، مگر اب مسلمان ہیں۔

پھر اونٹ حاصل کرنا تھے، ایک میری سواری کے لیے اور باقی سازوسامان کی بار برداری کے لیے۔ جب سب تیاری مکمل ہو گئی تو میں اپنے پیاروں کو کراچی چھوڑ کر سفر پر روانہ ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ میں تم کو جنگل میں ایسی مہم پر لے چلوں، میں تمھیں کراچی میں یوروپین لوگوں کے باغیوں کے ہاتھوں بال بال بچ جانے کا قصہ ضرور سنا دوں۔

سر بارٹل فریئر سندھ کے کمشنر تھے اور جنرل اسکاٹ کراچی میں مقیم فوج کے کمانڈر تھے۔ جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں، یعنی میرے وہاں پہنچنے سے پندرہ دن پہلے، اس فوج میں سیکنڈ یوروپین رجمنٹ کی دو کمزور کمپنیاں، چودھویں نیٹو رجمنٹ، اکیسویں بنگال نیٹو رجمنٹ اور آرٹلری کی ایک بیٹری موجود تھیں۔ ان دونوں دیسی رجمنٹوں میں بغاوت کے کوئی آثار نمایاں نہیں تھے اور ہر طرف امن وسکون تھا۔

ایک سنیچر کو سر بارٹل اور جنرل اسکاٹ اتوار گزارنے کے لیے پانچ میل دور کلفٹن نامی مقام پر اپنے اپنے مضافاتی بنگلوں پر چلے گئے تھے اور چھاؤنی کا فوجی انتظام بریگیڈیر لاؤتھ کے سپرد کر گئے تھے۔

رات کو کوئی گیارہ بجے ایک صوبیدار بریگیڈیر کے بنگلے پر آیا اور پہرے والے گارڈ سے بریگیڈیر سے ملاقات کے لیے کہا۔ سنتری نے بتایا کہ وہ سو رہے ہیں اور ان کو بے آرام نہیں کیا جا سکتا۔ صوبیدار اڑا ہوا تھا کہ بریگیڈیر سے ملنا ہے۔ آخر کار سنتری نے بریگیڈیر کے ایک ملازم کو بلایا اور کہا کہ سرکار کو اطلاع دو کہ صوبیدار کوئی ضروری بات کرنا چاہتا ہے۔

بریگیڈیر نے کہا کہ صوبیدار سے کہو کہ صبح آئے۔ مگر جب صوبیدار کو یہ بتایا گیا تو وہ بہت زیادہ ضد کرنے لگا۔ لہذا بریگیڈیر کو پھر اطلاع دی گئی تو وہ ڈریسنگ گاؤن پہن کر باہر آئے کہ دیکھیں کیا ماجرا ہے۔ صوبیدار نے کہا وہ اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہے۔ تب اس نے بریگیڈیر کو بتایا "بریگیڈیر صاحب، آپ نے کئی مرتبہ مجھ پر مہربانیاں کی ہیں اس لیے میں آپ کو بتانے آیا ہوں کہ اکیسویں رجمنٹ رات بارہ بجے بغاوت کرنے والی ہے۔ چھاونی کا نقشہ تیار کر لیا گیا ہے اور لوگوں کے مقام مقرر کر دیے گئے ہیں جو ایک ایک یوروپی کو قتل کر دیں گے اور بنگلے لوٹ لیں گے۔" بڑی چونکا دینے والی خبر تھی۔ فوراً ہی بریگیڈیر نے یوروپین رجمنٹ کی دونوں کمپنیوں کو بغیر بگل اور ڈرم کے ایک دم مسلح ہو جانے کا حکم بھیجا۔ ایسا ہی حکم چودھویں بیٹور رجمنٹ کو بھیجا گیا جس کے بارے میں صوبیدار نے بتایا تھا کہ وہ کسی طرح بھی اکیسویں رجمنٹ کی سازش میں شریک نہیں ہیں۔ ان سے کہا گیا کہ وہ سب جائیں اور فوراً اکیسویں رجمنٹ کی بیرکس کا سامنا کرتی ہوئی مختلف پوزیشنیں سنبھال لیں۔ آرٹلری کی بیٹری کو تیار رہنے کا حکم دے دیا گیا کہ وہ راکٹ دغنے پر اشارہ پاتے ہی مخصوص مقامات پر پوزیشن لے لیں۔ سب کام کمال کی پھرتی سے ہو گیا۔ بارہ بجنے میں پانچ منٹ تھے کہ بریگیڈیر نے فوج کی کمان کرتے ہوئے اکیسویں رجمنٹ کو باہر نکل آنے کا حکم دیا۔ شروع میں انھوں نے حکم ماننے سے انکار کر دیا حالاں کہ ان کے یوروپین افسروں نے ان کے پاس جا کر احساسِ فرض پیدا کرنے کی بہت کوشش کی۔ بہرحال کچھ نے باہر دیکھا تو انھیں بیرکس کے سامنے توپیں کھڑی نظر آئیں جن کے فلیتے حملے کے لیے تیار جل رہے تھے۔ بریگیڈیر نے اپنی گھڑی نکالی اور انھیں خبردار کیا کہ اگر پانچ منٹ کے اندر اندر وہ باہر نکل کر حاضر نہ ہوئے تو ان پر حملہ کر دیا جائے گا۔ وہ بادلِ ناخواستہ نکلے اور بیرک کے میدان میں صف بند ہو گئے۔ انھیں ہتھیار ڈالنے کا حکم دیا گیا جس پر عمل کیا گیا۔ پھر ریٹائر کا حکم دیا گیا اور فوراً ہی سیکنڈ یوروپین نے جا کر تمام ہتھیاروں پر قبضہ کیا اور منگائی گئی گاڑیوں میں لاد کر اسلحہ خانے بھجوا دیا۔ اکیسویں رجمنٹ کی حاضری لی گئی تو پتا چلا کہ ۲۷ افراد لاپتا ہیں۔ وہ نکل بھاگے تھے اور روپوش ہو گئے تھے۔

صبح ہوتے ہی پولیس کے "پگرر" (وہ لوگ جو قدموں کے نشان سے مفرور کی کھوج لگاتے ہیں) ان کے پیچھے لگا دیے گئے اور میں تمھیں بتاؤں کہ کوئی تین ہفتے کے اندر اندر ستائیس کے ستائیس باغی پکڑ کر کراچی لے آئے گئے۔ ان سب کا کورٹ مارشل ہوا اور ان سب کو توپوں سے اڑا دیا گیا۔ صوبیدار نے جس طرح بریگیڈیر کو بتایا تھا بالکل اسی کے مطابق نشان لگا ہوا چھاونی کا نقشہ برآمد ہوا تھا۔

کیا یہ بچ جانا معجزہ نہیں تھا؟ اکیسویں رجمنٹ توڑ دی گئی اور اس کے بعد اس نمبر کی

رجمنٹ کسی کھڑی نہیں کی گئی۔
اس کے تمام سپاہی اونچی ذات کے بنگالی برہمن تھے۔ چودھویں رجمنٹ میں ہر ذات کے لوگ بھرتی کیے گئے تھے۔ ان کی وفاداری کے خلاف کبھی کوئی بات نہیں سنی گئی۔

اب میں اندرون ملک کوٹری اور حیدر آباد کی طرف رواں دواں ہوں۔ چوں کہ ہم اوسطاً دن بھر میں ۱۰ میل سے زیادہ کا سفر نہیں کر سکتے کیوں کہ ہمارے ملازموں کو ہمارے ساتھ پیدل چلنا ہوتا ہے۔ رات ہی کو دن کے خیمے آگے روانہ کر دیے جاتے تاکہ صبح صاحب کی آمد کے وقت تک لگا کر تیار کر دیے جائیں۔ رات کو سونے والے خیمے دن کو آگے روانہ ہوتے ہیں۔ ہم چند یوروپین جب سفر کرتے تھے تو مسلح ہوتے تھے، کیوں کہ ہم دیسی لوگوں میں گھرے ہوتے تھے اور اُن دنوں ان پر زیادہ بھروسا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بھرے ہوئے ریوالور میری بیلٹ سے بندھے ہوتے اور کمر کی ایک جانب تلوار لٹکتی رہتی۔ یہ تلوار میں نے اس وقت خریدی تھی جب کراچی سے روانہ ہونے سے قبل میں والنٹیئر کور میں بحیثیت افسر شامل ہوا تھا جو کہ فوری قائم کی گئی تھی۔
کراچی سے روانہ ہونے کے پانچ دن بعد صبح کو میں اور میری جماعت اپنے کیمپ کے قریب پہنچے جو کہ گارا نامی گاؤں کے قریب قائم کر دیا گیا تھا تو دیکھا کہ مقامی لوگوں کا ایک بے چین گروہ لمبی لمبی لاٹھیاں لہرا لہرا کر شور مچا رہا تھا۔ اس بات کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہوئے میں نے اپنے منشی (مقامی ترجمان) کو آگے بھیجا کہ جا کر اس گڑبڑ کا سبب معلوم کرے۔ اس نے فوراً ہی واپس آ کر بتایا کہ ہمارے دو آدمیوں کو جنگلی بھیڑیے نے کاٹ لیا ہے۔ ہم فوراً ہی بڑھ کر اس طرف گئے۔ وہاں دیکھا کہ زخمیوں میں ایک تو ہمارا دھوبی تھا اور دوسرا ہمارے خیمہ برداروں میں سے ایک۔
انھوں نے بتایا کہ وہ شکر کے ساتھ گاؤں سودا سلف لینے گئے تھے واپسی میں دھوبی کے ہاتھ میں دودھ کی ٹین کی بالٹی تھی اور وہ گاؤں کی گلی میں آ رہے تھے کہ لکڑیوں کی ٹال کے پاس سے بھیڑیا ان پر کودا اور دھوبی کے بالٹی والے ہاتھ پر حملہ کر دیا، بالٹی گھل دی اور اس غریب کا ہاتھ بری طرح بھنبھوڑ ڈالا۔ خیمہ بردار کو صرف ٹکر مار کر گرایا تھا، کاٹا نہیں تھا۔ میں نے فوراً ہی دھوبی کے ہاتھ کے اوپری حصے پر خوب کس کر پٹی باندھی اور اس کا ہاتھ گرم پانی کے برتن میں ڈال دیا تاکہ خون رواں رہے۔ پھر میں اپنے خیمے میں گیا اور بیلٹ کھول کر میں نے ہتھیار رکھ دیے۔ میری نظر اپنے سائیس پر پڑی جو میرے خیمے اور جنگل کے سرے کے درمیاں والے ریتیلے میداں کے پار ایک پیڑ کے سائے میں میرے گھوڑے کی مالش کر رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ میں بھی جا کر اپنے رہوار پر ایک نظر ڈال لوں۔ ابھی میں نے آدھا میداں ہی پار کیا تھا کہ میں نے جنگل کی طرف سے ایک بھیانک چیخ سنی اور فوراً ہی بھیڑیے کو نکل کر گھوڑے کی طرف لپکتے دیکھا۔ سائیس نے بھی اس کو آتے دیکھ لیا تھا۔ اس نے پوری طاقت سے اپنا کھریرا دے مارا جو بھیڑیے کے سر پر لگا۔ چوٹ سے پھر کر وہ وحشی درندہ تیزی سے میری طرف لپکا۔

میرے پاس اپنے بچاؤ کے لیے کچھ بھی نہیں تھا، نہ خشک ریت میں کوئی پتھر تھا اور نہ سائیس کی طرح کوئی کھرپا ہی تھا۔ میں نے کیمپ والوں کو پکار کر کہا کہ ان دو کتوں کو چھوڑ دیں جو میرے ایک ملازم کے پاس تھے۔ میں نے اپنی رنگی سی سن ٹوپی ہلانا شروع کر دی اور زور زور سے دھتکارنے لگا۔ درندے کو شاید یہ باتیں پسند نہیں آئیں۔ اس نے تھوڑا پہلو بدلا اور مجھ سے پانچ یا چھ گز پرے ہو کر نکلا اور کیمپ کی طرف بڑھتا چلا گیا جہاں اس کی مڈبھیڑ دونوں کتوں سے ہوئی جن میں سے ایک کم سے کم ۲۵ پونڈ وزن کا تھا۔ اس کتے کو اس نے پیٹھ سے دبوچا اور زوردار جھٹکے دے کر اس کے شانے کو بری طرح نوچتے ہوئے پٹخا اور اپنی راہ پر لگا رہا۔ وہ کیمپ میں سے گزرتا ہوا جنگل کی راہ پر نکل گیا۔ خوش قسمتی سے اس نے کسی کو کاٹا نہیں۔ شور پڑ گیا کہ ہتھیار بند ہو کر سوار ہو اور اس کا پیچھا کرو۔ چند لوگوں نے ایسا ہی کیا۔ میں نے دریافت کیا کہ وہ چیخ کیسی تھی جو میں نے میدان میں سنی تھی، تو معلوم ہوا وہ ہمارے ہی ایک آدمی کی تھی جو جنگل میں لکڑیاں اکٹھی کرنے گیا تھا اور جس کا منہ اس نے اس بری طرح نوچا تھا کہ ایک آنکھ تقریباً ضائع ہو گئی تھی۔

کریمیا کی جنگ کے دوران ہسپتالوں میں رہ کر میں نے تھوڑی بہت طبی امداد سیکھ رکھی تھی، مگر یہ کیس میرے بس کا نہیں تھا چنانچہ میں نے دو ایک اونٹ تیار کرنے کا حکم دیا اور دھوبی اور دوسرے زخمی کو فوراً کراچی کے ہسپتال بھجوا دیا۔ یہاں میں تمہیں بتاؤں کہ دھوبی تو ٹھیک ٹھاک ہو گیا اور واپس ملازمت پر آ گیا اور میرے پاس کافی عرصہ رہا مگر دوسرا غریب زخم ٹھیک ہو جانے کے باوجود چار ماہ بعد سرطان سے مر گیا۔

یہ بات ظاہر ہے کہ اس موقعے پر میں بال بال بچا۔ مشیت کی مہربانی میری نگرانی کر رہی تھی۔ میں اس وقت بھی اس کا شکر گزار تھا اور اب بھی جب کبھی وہ دل ہلا دینے والا واقعہ یاد آتا ہے تو میں اس کا شکر ادا کرتا ہوں۔

ہندوستان میں وحشی درندوں اور سانپوں وغیرہ کے حملوں کا ریکارڈ رکھا جاتا ہے۔ اس موقعے پر معلوم ہوا کہ بارہ افراد پر حملہ کیا گیا تھا جن میں سے دس جاں بحق ہوئے اور بہت سے مویشی بھی شکار ہوئے۔ میری اور اس کی مڈبھیڑ کے اگلے دن مقامی لوگوں نے اس کا پیچھا کر کے اسے مار ڈالا۔

یہ میری کیمپ کی زندگی کی کوئی خوشگوار ابتدا نہیں تھی۔

دو دن کی مسافت کے بعد میں حسب عادت اتوار کو ایک مقام پر ٹھہرا ہوا تھا کہ سہ پہر کے وقت مجھے کیمپ کی طرف ایک تیز رفتار گھوڑا آتا سنائی دیا۔ میں نے معلوم کروایا کہ کیا ماجرا ہے۔ میرا منشی اپنے ساتھ ایک سہمے ہوئے آدمی کو لے کر آیا جس نے بتایا کہ کراچی میں بغاوت پھوٹ پڑی ہے۔ تمام یوروپی قتل کر دیے گئے ہیں، بس وہ بچ نکلا ہے اور حیدر آباد کی طرف جا رہا ہے۔

وہ شخص یوریشین تھا اور بہت معمولی انگریزی بول سکتا تھا، اس لیے میں نے اس پر جرح کرنا شروع کر دی۔ وہ بہت سی اہم باتوں میں خود اپنی ہی تردید کرتا رہا اس لیے اس خبر سے ہوشیار ہونے کے

باوجود مجھے یقین ہوا کہ صورت حال اتنی مخدوش نہیں جتنی اس نے اول اول بتائی تھی۔ تم کو یاد ہوگا کہ میں تمھارے پیارے والد اور ان کی والدہ کو کراچی میں چھوڑ آیا تھا۔ اگر اس کی خبر آدھی بھی درست ہوئی تو ان پر کیا گزری؟ میں نے فوراً اپنے سواری کے اونٹ کو تیار کرنے کا حکم دیا اور جب سورج غروب ہو رہا تھا میں راتوں رات اپنے اور ان کے درمیان واقع ۵۶ میل کے فاصلے کو پاٹنے کے لیے چل کھڑا ہوا۔ حقیقت حال جانے بغیر میں بھلا نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ میں سوار ہوا اور پھر ساری رات ہم نے چھ میل فی گھنٹا کی رفتار سے، نیم درجا کی حالت میں دعائیں مانگتے، تھکا دینے والا سفر جاری رکھا۔ آرام اور کھانے پینے کے لیے رکے بغیر ہم دن نکلتے نکلتے بنگلے پر پہنچے اور عزیز مکینوں کو حیرت زدہ کر دیا۔

اونٹ، اونٹ والا اور میں تھک کر بالکل چُور ہو چکے تھے لیکن تمھاری پیاری اماں اور تمھارے والد کو صحیح سلامت دیکھ کر ساری کلفت دور ہو گئی۔ پوچھنے پر مجھے معلوم ہوا کہ خطرے کی خبر ہوائی تھی مگر تحقیق کرنے پر بے بنیاد ثابت ہوئی۔ تمھاری دادی یہ خبر سن کر سہم گئی تھیں لیکن جب وہ سونے لیٹیں اور پڑوس میں واقع آرٹلری اسٹیبلشمنٹ کے میس میں بلیرڈ کی گیندوں کی کھٹ کھٹ سنی تو ان کا ڈر کم ہوگیا۔ جوں ہی میرے اونٹ اور اونٹ بان نے کافی آرام کر لیا، میں اپنے کیمپ کی طرف لوٹ گیا اور بغیر کسی چونکا دینے والے واقعے کے ہم کوٹڑی اور حیدرآباد پہنچے اور پہلی مرتبہ مشہور دریائے سندھ دیکھا جس کے درمیان سفر کے لیے اپنے انجینئرنگ چارج میں اسٹیمروں کا ایک بیڑا کھڑا کرنے میں مجھے مصروف ہونا تھا۔

اس سفر میں میں نے ریلوے لائن کے راستے میں بہت سے مقامات نشان زد کیے جہاں اصلاح کی جا سکتی تھی۔ کراچی واپسی پر دوبارہ معائنہ کرنے سے اس کی تصدیق ہو گئی۔ میں نے فوراً ریلوے لائن کو مختلف ڈسٹرکٹوں اور ڈویژنوں میں تقسیم کیا اور ہر ایک پر اپنے اسٹاف میں سے ایک ایک انجینئر تعینات کر دیا اور انھیں لیول لینے اور سروے کرنے کے کام پر لگا دیا۔

سندھ ریلوے کے منتخب کیے ہوئے ٹھیکیدار برے نے ۱۸۵۸-۵۹ کے موسم سرما میں ریلوے لائن بچھانے کا کام شروع کیا۔ اس کام کی نگرانی کرنے اور برے کو راہ راست پر رکھنے کے لیے مجھے اور میرے اسٹاف کو بہت کام کرنا پڑا۔ بارہ ماہ کے کام کے بعد برے اپنے کارندوں کو ادائیگی کرنے میں ناکام ہو کر فرار ہوگیا اور تقریباً ۱۲۰۰۰ افراد کو بغیر کچھ ادا کیے پیچھے چھوڑ گیا۔

ان لوگوں میں صرف سندھی ہی نہیں تھے بلکہ زیادہ تر وسطی ایشیا سے آئے تھے اور بہت ہی سر پھرے تھے۔ بنیوں نے انھیں خوردنی اشیا ادھار دینا بند کر دیں اور لائن پر یہاں سے وہاں تک اُدھم مچ گیا۔ مال واسباب کی حفاظت کے لیے فوج بلانا پڑی کہ بحران بہت سنگین تھا۔ میں فوراً ہی اپنے عزیز دوست سر بارٹل فریئر سے مدد اور مشورہ کی خاطر جا کر ملا۔ معاہدے کی ایک شق کی رو سے میں نے برے کے پلانٹ پر قبضہ کر لیا۔ لوگوں کے بقایاجات کی ادائیگی کرنا ایک اہم مسئلہ تھا۔ بقایاجات کی کل رقم کوئی چودہ ہزار پاؤنڈ بنتی تھی۔ میں نے سر بارٹل کو بتایا کہ اگر وہ سرکاری خزانے سے یہ رقم مجھے ادا کروا

دیں تو میں سختی مقرر کر کے فسادیوں کو مطمئن کر دوں۔ اس بات پر وہ فوراً راضی ہو گئے۔ میں لائن پر آگے جا کر ان دھکیاروں سے ملا جو واقعی بھوکے مر رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر وہ خاموش ہو جائیں تو میں ان کے تمام بقایاجات ایک ہفتے کے اندر اندر ادا کر دوں گا۔ اس اعلان کی وجہ سے مقامی دکانداروں سے ان کو پھر ادھار ملنے لگا اور شور شرابا ختم ہو گیا۔ میں نے رنے کے ایجنٹ سے بے شیٹ حاصل کیں اور اپنے اسٹاف کے انجینئروں کو سختی سا کر ایک ہفتے کے اندر اندر سب لوگوں کی ادائیگی کروا دی۔ اب سوال پیدا ہوا کہ بقایا کام کیسے پورا کیا جائے؟ کافی بحث مباحثے کے بعد یہ طے کیا گیا کہ میں محکمہ جاتی طور پر اس کام کو مکمل کروں، یعنی باقی ماندہ کام کو اپنے انجینئروں اور مائنوں کی مدد سے میں مکمل کرواؤں جس کے لیے رقم مجھے مہیا کی جاتی رہے۔ اب کام کی نوعیت پہلے کی بہ نسبت زیادہ مشکل ہو گئی تھی مگر میری بلائی ہوئی ایک میٹنگ میں میرے تمام انجینئروں نے خوش دلی سے اس امید اور توقع پر کہ کمپنی بونس دے کر یا کسی اور طرح ان کی خدمات کو سراہے گی، اس کام کا بیڑا اٹھا لیا۔

مجھے معلوم ہوا کہ رنے اپنے کارندوں کو روزانہ کے حساب سے اجرت دیتا تھا۔ یہ میں نے یکدم موقوف کر دیا اور ہر ایک کے لیے جتنا کام اتنے دام کا حساب رکھا، یعنی جتنا کام ہر آدمی یا ٹولی مکمل کرے اتنی ہی اجرت اس کو دی جائے۔ اس میں کام چوری کی کوئی چھوٹ نہیں تھی۔ شروع شروع میں لوگوں نے اس کی مزاحمت کی لیکن جب دیکھا کہ میں جما ہوا ہوں تو رفتہ رفتہ میرے راستے پر آ گئے اور کام تیز رفتاری سے ہونے لگا۔ تمہارے پیارے والد کو میں نے ماسروں کے پل کی تعمیر کی نگرانی سونپی جو مسٹر ٹیلر وارن کے ڈسٹرکٹ میں واقع تھا۔ یہ پتھروں کی چنائی کا بڑا بھاری کام تھا جس کو مسلسل دیکھ بھال اور نگرانی کی ضرورت تھی اور جو انھوں نے پوری توجہ سے کی۔ آس پاس یہ پیشین گوئیاں ہو رہی تھیں کہ پہلے ہی سیلابی ریلے میں یہ بہہ جائے گا، لیکن کئی برس گزرنے کو آئے اب تک تو اس کا ایک پتھر بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔

لائن پر ایک مقام تھا دو براجی جہاں پر اسٹیشن ہونا ضروری تھا۔ جب بھی اس ڈسٹرکٹ کے انجینئر اس مقام پر قیام کرتے تو وہ اور ان کے مقامی خدمتگار باری کے بخار میں مبتلا ہو جاتے تھے۔ لائن پر دیگر اسٹیشنوں پر صحت کا مسئلہ نہیں تھا اس لیے یہ بات کافی تشویشناک تھی جس وجہ میں خاص طور پر وہاں گیا کہ اس کا سبب معلوم کروں۔ وہاں پہنچ کر میں نے کیمپ کے بہشتی سے وہ جگہ دکھانے کو کہا جہاں سے وہ کیمپ کے لیے پانی لاتا تھا۔ وہ مجھے کوئی آدھ میل جنگل میں لے گیا اور پانی کا ایک چھوٹا سا جوہڑ دکھایا جو کائی کیچڑ اور گند سے بھرا تھا کیوں کہ جنگل میں چرنے والی بھینسیں اور دوسرے جانور پانی یہیں پیتے تھے۔ اس کے علاوہ آس پاس پانی کہیں نہیں تھا۔ میرے خیال میں ساری خرابی کی جڑ یہیں تھی۔ میں نے فوراً ہی دو براجی کے آس پاس کے علاقے کا رسمی سروے کیا اور طے کیا کہ ایک مقام پر، جو جوہڑ کی طرح دور نہ ہو، ایک کنواں کھدوا جائے تو پانی مل جائے گا۔

کنویں کی کھدائی ایک دم شروع کر دی گئی اور چالیس فٹ کی گہرائی پر پانی کا ایک عمدہ چشمہ نکل

آیا۔ میں نے کنویں کی دیواروں پر پتھروں کی چنائی کروا کر مقامی لوگوں کی رہاں میں پکا کنواں بنوا دیا۔ کنویں کے اوپر میں نے ایک رہٹ سا بنوا دیا اور چرخی اور ڈول لگوا دیے اور انہیں اس جگہ کس کر بندھوا دیا کہ کوئی چُرا نہ لے جائے اور حکم دیا کہ کیمپ کے لیے تمام پانی اب اسی کنویں سے لایا جائے۔ کاہل مقامی اتنی گہرائی سے پانی کھینچنے سے جان چراتے تھے اس لیے میں نے خود جا کر اس جوہڑ کا پانی نکلوا کر اس کو پٹوا دیا تاکہ پانی وہاں سے نہ آئے۔ اس سے بھینسوں اور مویشیوں کو تو تکلیف ہوئی لیکن اپنے کارندوں کے لیے صاف ستھرا پانی حاصل کرنا ضروری تھا۔ اس کے بعد دو راجی بھی لائن پر موجود دیگر اسٹیشنوں کی طرح صحت کے لیے محفوظ ہو گیا۔ یہ اس بات کا واضح ثبوت تھا کہ وہ گندا پانی ہی ملیریا کا سبب تھا جس کا شکار ہندوستان میں بہت سارے دیسی اور یوروپین لوگ ہوتے ہیں۔

لائن پر بار بار لگاتار دوروں کے درمیان میں کراچی میں اپنا بنگلہ اپنے قابل بھروسا وفادار ملازموں میں سے ایک کے سپرد کر جاتا تھا۔ دو سال کے دوران واپسی پر ہمیں کبھی بھی بنگلے سے کوئی چیز گم نہیں ملی۔ بس ایک دفعہ واپسی پر میری چھڑی گم تھی جو مجھ کو بہت عزیز تھی کیوں کہ یہ مجھے میرے بہنوئی نے نور بیو سے بھیجی تھی جہاں ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ میں نے فوراً اس ملازم کو بلوایا جس کے سپرد گھر کیا گیا تھا اور اس سے چھڑی کی بابت پوچھا۔ وہ بھو بچکا رہ گیا اور مجھے یقین دلایا کہ اس کو کوئی علم نہیں۔ ہر طرح تلاش کیا گیا مگر وہ نہ ملی۔ مجھے غصہ بھی آیا، پریشان بھی ہوا؛ مگر اس کے تلاش کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ نو مہینے بعد میں اور تمہاری پیاری دادی ایسے ہی ایک سفر پر رواں تھے کہ کراچی سے ۷۰ میل کے فاصلے پر ہم ایک دیسی آدمی کے پاس سے گزرے جو جنگل میں پیدل چلا جا رہا تھا۔ حسب عادت میں نے اس سے صاحب سلامت کی اور پوچھا وہ کون ہے اور کہاں جا رہا ہے۔ میرے مخاطب ہونے پر جب وہ میرے گھوڑے کی طرف بڑھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میری گم شدہ چھڑی اس کے ہاتھ میں تھی۔ میں نے کہا، چھڑی تو تمہاری بہت عمدہ ہے۔ اس نے چھڑی دیکھنے کے لیے میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا، جی صاحب بڑی بڑھیا ہے۔

بدمعاش، تو تم ہو جس نے یہ چھڑی چرائی ہے؟ کیوں کہ یہ میری ہے اور کراچی میں میرے بنگلے سے چرائی گئی تھی۔ وہ فوراً میرے قدموں میں گر گیا اور گڑگڑانے لگا اور بتانے لگا کہ اس نے یہ کراچی کے بازار سے ایک روپے میں خریدی تھی۔ ممکن ہے بلکہ اغلب ہے کہ یہی حقیقت ہو۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کہاں رہتا ہے اور اس کی ولدیت کیا ہے وغیرہ وغیرہ، اور گرفتاری اور سزا کی دھمکی دی جو کہیں یہ معلوم ہوا کہ اس نے غلط بیانی سے کام لیا تھا۔ اتنی غیر معمولی اور غیر متوقع طور پر چھڑی جو میرے ہاتھ لگی تو ظاہر ہے میں خوشی خوشی اسے لے آیا۔ اس دن سے وہ پھر گم نہیں ہوئی۔ اب وہ ڈیوڑھی والے چھتری اسٹینڈ میں رکھی ہوئی ہے اور ایک دن جیک کو مل جائے گی اگر وہ اس کی حفاظت کرنے اور کبھی کبھی اس پر گزری ہوئی واردات کو یاد کر لینے کا وعدہ کرے۔

کراچی سے چند میل کے فاصلے پر ایک عجیب و غریب مقام 'مگر پیر' ہے۔ یہ تاڑوں اور جھاڑیوں

سے گھرا ہوا ایک چھوٹا سا تالاب ہے۔ میرے البم میں اس کی دو تصویروں میں سے کسی ایک پر بھی نظر ڈالو گے تو تم مجھ سے اتفاق کرو گے کہ ایک خوبصورت مقام ہے۔ یہ تصویریں میرے بھائی رابرٹ نے کھینچی تھیں۔ تم فوراً حیرت سے پوچھو گے کہ یہ عجیب سی چیزیں کیا ہیں جو پانی میں اور کناروں پر نظر آتی ہیں؟

یہ مگرمچھ ہیں جو اس تالاب میں رہتے ہیں۔ دیسی لوگوں کا ایک مخصوص طبقہ ان کو متبرک جانتا ہے۔ اس تالاب کے قریب ہی کچھ پیر رہتے ہیں جو مختلف روگوں میں مبتلا عرض مندوں کے لائے ہوئے نذرانے ان جانوروں کو کھلاتے ہیں۔ یہ رسمی نذرانے عام طور پر زندہ بکریاں ہوتی ہیں جو وہاں پر لائی جاتی ہیں۔ پیر ان کو تالاب کے کنارے ذبح کر کے اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر لیتے ہیں۔ جب یہ کام ہو جاتا ہے تو وہ زور زور سے پکارتا ہے "آؤ، آؤ!" تالاب سے مگر نکلتے ہیں اور کنارے آ کر اپنے بڑے بڑے منہ کھولے ایک قطار سی بنا لیتے ہیں۔ پیر ہر ایک کے پاس جاتا ہے اور باری باری ہر ایک کے منہ میں ایک ایک ٹکڑا پھینکتا جاتا ہے جو فوراً ہی ان طاقتور جبڑوں میں چبا کر کھا لیا جاتا ہے، اور ہر ایک واپس تالاب میں جا کر لیٹ جاتا ہے۔

میں نے دیکھا کہ بکری کا سر سینگوں سمیت ایک مگر کے منہ میں پھینکا گیا اور منہ مارتے ہی پورا سر اور سینگ سب چُور چُور ہو گئے۔ تالاب کے ان باسیوں کا پُرکھا ان سب سے الگ ایک دیوار بند باڑے میں رکھا جاتا ہے۔ اس کو مگرمچھوں کا بادشاہ کہا جاتا ہے اور اس کی حیثیت کے مطابق اس کو جدا الگ دی جاتی ہے۔ اس پر گلال چھڑک کر لال کر دیا جاتا ہے۔ وہ جسامت میں بھی ان سے بڑا ہے اور خاص طور پر متبرک مانا جاتا ہے۔ ضعیف الاعتقادی اور جہالت کی انتہا ہے! بحس میں آنے والوں کو خاص طور پر جانوروں کو کسی بھی طرح تنگ نہ کرنے کو کہا جاتا ہے۔ ایک دن دو شوخ نوجوان افسر دو بھری ہوئی سوڈا واٹر کی بوتلیں دو گز رسی کے دونوں سروں پر باندھ کر وہاں لے گئے۔ جس وقت پیر نے قطار میں موجود جانوروں کو ایک طرف سے گوشت کھلانا شروع کیا تو دوسرے سرے پر ان لوگوں نے یہ بوتلیں باری باری دو مگرمچھوں کے منہ میں پھینک دیں۔ منہ بند ہوتے ہی بوتلیں دھماکے سے پھٹیں اور دونوں مگرمچھ ایسا انعام دبائے غڑاپ سے پانی کے اندر۔ اب جو ہر ایک اسے ہڑپ کرنے کی کوشش کرتا ہے تو رسی سے بندھے ہونے کی وجہ سے اس کا دوسرا ساتھی رکاوٹ پیدا کرتا ہے اور یوں پانی کے اندر ایک زبردست مل جل سی مچ جاتی ہے اور شریر افسر اپنی اس تکلیف دہ حرکت سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ پیروں نے حاکموں سے شکایت کی تو سخت ڈانٹ پڑی اور میرے خیال سے جرمانہ بھی ہوا۔ میرا خیال ہے کہ تمہارا فیصلہ بھی یہی ہو گا کہ وہ اسی سزا کے مستحق تھے۔

لوٹ کر دیکھیں کہ ریلوے کا کام کتنا ہو گیا۔ جس وقت انگلستان سے پہلا لوکوموٹو انجن آیا ہے تو میں سپیئر مول کے کنارے کنارے کیماڑی سے کراچی شہر تک پٹریاں بچھوا چکا تھا۔ ہمارے پیارے

دوست سر بارٹل فریئر جو سندھ کے کمشنر تھے تبدیل ہو کر میرے خیال میں سپریم کاؤنسل کے ممبر کی حیثیت سے کلکتے جا رہے تھے۔ وہ بہت مدت تک یہاں کے کمشنر رہے تھے اس لیے یہاں تمام لوگوں میں، کیا مقامی اور کیا یورپین، عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے اور بہت ہر دل عزیز تھے۔ ایک خاص دن اُن کو کیماڑی سے روانہ ہونا تھا۔ ہم نے بہت جاں فشانی سے کوشش کی کہ لوکوموٹو انجن اس وقت تک تیار ہو جائے تاکہ ہم ان کو وہاں تک لے جائیں اور اس طرح سے ان کے ہاتھوں اس ریلوے کی نقاب کشائی بھی ہو جائے جس میں انھوں نے بہت دلچسپی لی تھی۔

سندھ کے لوگوں نے لوکوموٹو انجن کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بس سن رکھا تھا کہ وہ کسی انجانی پوشیدہ قوت سے پٹریوں پر بھاری بھاری سامان بھی کھینچ لیتا ہے، اس لیے وہ اس سے خوف زدہ تھے اور سمجھتے تھے کہ شیطان اسے کھینچتا ہو گا۔ غدر کے دنوں میں باغیوں نے ایسٹ انڈیا ریلوے کے ایک لائن سیکشن پر قبضہ کر لیا تھا جہاں کئی انجن موجود تھے۔ ان کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ ان کے قریب جائیں۔ بس دور ہی دور سے ان پر پتھراؤ کرتے رہے!

جس وقت میں نے آزمائش کے لیے انجن نکالا تو کراچی کے مقامی لوگ دیکھ کر دنگ رہ گئے۔

اس وقت ہمارے پاس مسافر ڈبے نہیں تھے چنانچہ سر بارٹل فریئر اور ان کی لیڈی کو کیماڑی تک لے جانے کے لیے مجبوراً مجھے تمام مال گاڑی کو لکڑی کی سیٹیں لگوا کر اور شامیانہ اور پردے لٹکا کر ان کی سواری کے لیے تیار کروانا پڑا۔ ان کی روانگی کا دن آ گیا۔ ان کو رخصت کرنے اور اپنے دلی رنج کے اظہار کے لیے پوری ڈسٹرکٹ کی خلقت وہاں جمع تھی۔ مجمع جو ساٹھ ستر ہزار سے کسی طرح کم نہیں تھا پورے تین میل راستے پر ریلوے لائن کے کنارے کنارے جمع ہو گیا تھا۔

انجن خود میں نے ہی چلایا اور ظاہر ہے بہت دھیمے دھیمے چلایا کہ ریلوے لائن کے کنارے بھیڑ لگی ہوئی تھی اور مجھے ڈر تھا کہ کوئی حادثہ نہ ہو جائے۔ آخرکار میں نے سوچا ذرا ان کو ڈرایا جائے اور میں نے زور زور سے انجن کی سیٹی بجائی۔ فوراً ہی وہ سب اس شیطان سے ڈر کر پیچھے ہٹے اور ایک دوسرے پر گرنے لگے اور ہم خوب لطف اندوز ہوئے۔ میں سوائے اس کے کوئی تشبیہ نہیں دے سکتا کہ جیسے لہلہاتی فصل پر سے درانتی گزر جائے۔ آخرکار ہم کیماڑی پہنچ گئے۔ سر بارٹل کی الوداع کا منظر بہت ہی رقت آمیز تھا۔ دیسی لوگوں میں زیادہ تر سجدہ ریز ہو کر آہ و بکا کر رہے تھے، اور یوں وہ شخص رخصت کیا گیا جس نے اپنی رحم دلی، انصاف اور اپنی رعایا کی خوشحالی کے لیے جدوجہد کر کے ان کے دلوں میں گھر کر لیا تھا۔

میرے فرائض اور ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی تھیں کیوں کہ مجھے اس دُخانی بحری بیڑے کا انجینئرنگ چارج بھی سونپ دیا گیا تھا جو ریلوے کمپنی دریائے سندھ میں، ہمارے ریلوے ٹرمنس کوٹری سے ملتان تک، چلانا چاہتی تھی جو دریا دریا ۷۰۰ میل کے فاصلے پر تھا۔ جن دنوں میں اس کام میں مصروف تھا، پٹری بچھانے کا کام زوروں سے جاری تھا اور جہاں جہاں کام ہو گیا تھا آمد و رفت شروع ہو گئی تھی۔ ریلوے کمپنی کے مقرر کیے ہوئے پہلے ٹریفک مینیجر کا سفر کے دوران انتقال ہو گیا تو انگلستان

سے دوسرے سکے آنے تک مجھ کو ٹریفک مینیجر کا کام بھی سنبھالنا پڑا۔

شروع شروع میں یہ خیال تھا کہ ذات پات کی عصبیت کی وجہ سے دیسی لوگوں کو ایک ساتھ ایک ہی ڈبے میں سفر کروانا بہت مشکل ہوگا مگر یہ خیال خام ثابت ہوا۔ سفر شروع ہونے سے ایک گھنٹا پہلے ہی سے دیسی ٹکٹ گھر کے گرد جمع ہو جاتے تھے اور ٹکٹ کے لیے شور مچانے لگتے تھے۔ ابتدائی دنوں میں تو ان کو ڈبے تک محدود رکھنا مشکل تھا۔ وہ چھتوں پر چڑھ جاتے تھے اور مجھے چھت پر جا کر چابک کے ذریعے ان کو اتارنا پڑتا تھا۔ عورتوں کو مردوں کے ساتھ سفر کرنے کی اجازت نہیں تھی، ان کے لیے الگ ڈبا مقرر کیا جاتا تھا، اور یقین کرو کہ ان کی باتوں اور چیخ چیخ کر بولنے کے شور سے ان کے لیے مخصوص ڈبے کو شناخت کر لینا بہت آسان تھا۔ ہر مسافر کے پاس ایک بندھا ہوا بستر ضرور ہوتا تھا اور وہ سب سیٹوں پر آلتی پالتی مار کر بیٹھتے تھے اس لیے میں نے تھرڈ کلاس کے ڈبوں میں سے سیٹیں نکلوا دیں اور یوں ان کے فرش پر اپنے اپنے بستروں پر بیٹھنے سے گنجائش بھی نکل آئی۔ یہ لوگ ریل کے سفر کے بڑے شوقین ہیں۔ ایک دن میرا ایک بیٹھا والا میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ اس کی خواہش اپنے وطن جانے کی ہے اور اس کی تنخواہ جو اس نے میرے پاس جمع کرا رکھی تھی میں اس کو دے دوں۔ وہ ایک بھلا آدمی تھا اس لیے اس کو چھوڑتے ہوئے مجھے بہت افسوس ہوا۔

کتنے دن کے لیے جا رہے ہو؟ میں نے پوچھا۔

تین مہینے کے لیے، وہ بولا۔ میں نے اس کی تمام تنخواہ اس کو دے دی اور وہ بہت سے سلام کرتا ہوا رخصت ہو گیا۔

پندرہ دن بعد وہ پھر میرے سامنے کھڑا تھا کہ اس کو دوبارہ ملازمت میں لے لیا جائے۔ میں اس کو دیکھ کر حیران رہ گیا کیوں کہ مجھے معلوم تھا کہ اس کا وطن کافی دور ہے، وہ اتنی جلدی وہاں جا کر واپس نہیں آ سکتا تھا۔

کیا بات ہے؟ میں نے کہا۔ تم اپنے وطن تو گئے نہیں۔

وہ سٹپٹا گیا۔ میں نے اس سے کہا کہ سچ سچ بتا دے۔ تھوڑے تذبذب کے بعد اس نے بتایا کہ اس نے اپنی تمام رقم اس لائن پر بار بار سفر کر کے خرچ کر ڈالی۔ اس کی اس حرکت پر میں ہنسی ضبط نہ کر سکا اور اس کو دوبارہ ملازم رکھ لیا۔

**

کیول رام رتن مل ملکانی (K R Malkani) کی کتاب *The Sindh Story* کے چند ابواب کی تلخیص پر مشتمل متن، جسے آپ اگلے صفحات میں ملاحظہ کریں گے، سندھ اور کراچی کی تاریخ کے اس اہم دور پر روشنی ڈالتا ہے جب یہاں کے معاشرے میں جدید مغربی تعلیم کے زیراثر بیداری پیدا ہونی شروع ہوئی۔ کراچی قابلِ فہم طور پر اس سرگرمی کا ایک اہم مرکز تھا۔ ملکانی تقسیمِ ہند کے وقت حیدرآباد سے ہجرت کر کے ہندوستان گئے تھے، سیاسی اور سماجی طور پر سرگرم ہیں اور آج کل بھارتیہ جنتا پارٹی (BJP) سے وابستہ ہیں۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۸۴ میں نئی دہلی سے شائع ہوئی۔ یہ سندھ میں بحالیِ جمہوریت کی تحریک (MRD) کا زمانہ تھا، اس تحریک نے رفتہ رفتہ سندھی قوم پرست تحریک کی صورت اختیار کرلی تھی اور بعض سیاسی مبصروں کا خیال تھا کہ اس کا انجام سندھ کی پاکستان سے علیحدگی پر ہوگا۔ ملکانی کا بھی یہی خیال تھا، اور اب ایک عشرے سے زیادہ مدت گزر جانے کے بعد یہ کتاب پڑھنے پر پاکستان کے سیاسی حالات سے متعلق ملکانی کا تجزیہ خاصا کمزور نظر آتا ہے۔

تاہم اس مخصوص موقف سے قطعِ نظر، ملکانی کی کتاب میں سندھ کی ۱۹۴۷ سے پہلے کی سیاسی اور سماجی صورتِ حال بہت خوبی کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ جیسا کہ برصغیر کے متعدد دوسرے علاقوں کے ساتھ ہوا، سندھ میں جدید تعلیم اور سماجی بیداری بنگال کی نشاۃِ ثانیہ کے زیراثر آئی اور اس میں سندھ کے ہندوؤں نے مسلمانوں سے کہیں زیادہ سرگرمی سے حصہ لیا۔ اس صورتِ حال کے معروضی اسباب موجود تھے، جن کی نشان دہی سندھ کی تاریخ پر بحث کرنے والے مورخوں نے جابجا کی ہے، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۴۷ تک سندھ کا مقامی تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ غالب طور پر ہندوؤں پر مشتمل تھا۔ سندھ کی مسلمان اور ہندو آبادی کے درمیان تناؤ سیٹھ ناؤں مل کے آباواجداد کے دنوں سے موجود تھا اور تحریکِ آزادی کے زمانے میں اس بڑھتے ہوئے تناؤ پر ہندوؤں کا نقطۂ نظر ملکانی کی کتاب میں ملتا ہے، اگرچہ فوری سیاسی محرکات نے اسے قدرے تبدیل کر دیا ہے۔

ملکانی نے سندھ سے ہجرت کر کے جانے والے ہندوؤں کی تقسیم کے بعد کی زندگی کی بھی تفصیل بیان کی ہے۔ یہ بھی کراچی کی کہانی کا ایک حصہ ہے، کیوں کہ ان میں سے بہت سے لوگوں نے اس شہر کی زندگی پر پائیدار نقوش چھوڑے ہیں۔

کیول رام رتن مل ملکانی

انگریزی سے ترجمہ، تلخیص اور تدوین اجمل کمال

سندھ کی کہانی

کلہوڑوں کے بعد میروں (امیروں) کے ٹالپر خاندان کے پاس اقتدار آیا۔ مگر اقتدار کو طویل عرصے تک، یا خوش سلیقگی سے، سنبھالنا ان کے مقدر میں نہ تھا۔ یہ لوگ موروثی طور پر گلہ بان اور پیشے کے اعتبار سے جنگجو تھے، سو انھوں نے آبپاشی اور زراعت کو نظر انداز کیا۔ انھوں نے بڑے بڑے قابلِ کاشت رقبے شکار کے لیے مخصوص کر لیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۴۳ میں جس وقت ٹالپروں نے سندھ انگریزوں کے حوالے کیا تب یہاں کی آبادی جو کلہوڑوں کے دور میں تیس لاکھ تھی، گھٹ کر اس سے آدھی رہ گئی تھی۔ مگر غذائی اجناس کی برآمد کچھ، کاٹھیاواڑ، مکران اور حتیٰ کہ عرب کو جاری رہی۔

برطانوی ایلچی پوٹنگر نے سندھ میں جبری لوٹ (extortion)، جہالت اور ظلم و تعدی کا ایسا راج پایا جس کی مثال شاید دنیا میں کہیں نہ مل سکتی تھی۔ مگر میروں کو بعض دوسرے معاملات میں نسبتاً کامیابی ہوئی۔ انھوں نے امرکوٹ کو جودھ پور سے واپس لے لیا۔ علاوہ ازیں وہ اُس وقت کی چھوٹی سی سمندری بندرگاہ کراچی کا قبضہ خان قلات سے واپس لینے میں کامیاب رہے، جس میں انھیں کراچی کے نگر سیٹھ ناؤں مل کی امداد حاصل رہی۔ ایسٹوک کو 'لاہور دربار میں سال بھر میں جتنا جُرم دکھائی دیا اتنا ٹالپروں کے ساٹھ برس میں نہیں ہوا تھا۔ کیسمرک نے لکھا دریائے سندھ سے دریائے فرات تک کسی بھی ریاست کے مقابلے میں سندھ کو تہذیبی طور پر خاصا ترقی یافتہ کہا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر برنس کے الفاظ میں، وزیرِ اعظم ولی محمد خان لغاری کی ذات میں ایک نشاۃ ثانیہ کے ہونے کا متنوع جینیئس موجود تھا۔ لیکن یہ سب کچھ انگریزوں کی پیش قدمی کے راستے میں حائل نہ ہو سکا۔

ٹھٹے میں انگریزوں کا خاصا منافع بخش کاروبار جاری تھا۔ انھیں رپورٹیں موصول ہوئی تھیں کہ سندھ ایک شاندار ملک ہے۔ انگریز حریف کے طور پر فرانسیسیوں سے ہمیشہ خائف رہے تھے۔ اب انھیں روسیوں کا بھی خوف ہو گیا تھا جو ہندوستان کے شمال مغرب میں وسطی ایشیا میں پیش قدمی کر رہے تھے۔

جب ۱۸۰۷ میں تِلست (Tilsit) میں فرانس اور روس کے درمیان اتحاد کا معاہدہ ہوا تو انگریزوں کو بے حد تشویش ہوئی۔ گورنر جنرل لارڈ ایلن برونے نوٹ کیا: [کمپنی کے] ڈائرکٹر حضرات روس سے سخت خائف ہیں، اور میں بھی مجھے پورا یقین ہے کہ ہمیں دریائے سندھ پر روس سے مقابلہ کرنا پڑے گا۔

برطانیہ نے فوراً سندھ، کابل، ایران اور خود پنجاب اپنے ایلچی بھیجے۔ ۱۸۱۹ میں انھوں نے کچھ پر قبضہ کر لیا۔ وہ میروں کو ایک کے بعد ایک غیر مساویانہ معاہدے تسلیم کرنے پر مجبور کرتے رہے اور میروں میں اُن کی مزاحمت کی طاقت نہ تھی۔ ۱۸۲۰ کے معاہدے کے ذریعے انھوں نے میروں کو پابند کیا کہ وہ دیگر یوروپیوں اور امریکیوں کو سندھ میں داخل نہ ہونے دیں۔ انھوں نے دریائے سندھ میں جہازرانی کے حقوق جبراً حاصل کیے، اور اس کا جواز اسے بنایا کہ مہاراجا رنجیت سنگھ کے لیے برطانوی شاہی تحائف، رتھ اور گھوڑے، خشکی کے راستے لاہور نہیں بھیجے جاسکتے۔ میروں نے سکھوں کو قائل کرنے کی کوشش کی کہ جہاز کے ذریعے دراصل سید احمد بریلوی کے لیے، جو اُن سے برسرِ پیکار تھا، سونا بھیجا جارہا ہے، مگر رنجیت سنگھ قائل نہ ہوا۔ اُس نے اپنے فرانسیسی عسکری مشیر ونتورا کو سندھ کی سرحدوں پر فوجی میں شروع کرنے کی ہدایت کی، جس سے میر سخت خوف زدہ ہو گئے۔ اس موقعے پر انگریزوں نے دریائے سندھ کے دونوں کناروں پر ٹالپروں کے اقتدار کا تحفظ کرنے کا وعدہ کیا۔ مگر جب واٹرلو کے فاتح ڈیوک آف ولنگٹن نے فیصلہ کیا کہ عسکری اہمیت کا دریائی جزیرہ بکھر انگریزوں کے قبضے میں ہونا چاہیے تو انھوں نے بڑی سہولت سے یہ دلیل دی کہ دریا کے بیچ میں واقع ہونے کے باعث اس جزیرے پر انگریزی قبضے سے دریا کے دونوں کناروں پر میروں کے اقتدار کی حفاظت کے معاہدے کی خلاف ورزی نہیں ہوتی!

مہاراجا رنجیت سنگھ بھی سندھ پر قبضہ کرنے کا خواہشمند تھا۔ اب افغانستان کے شاہ شجاع نے شکارپور سکھوں کے حوالے کر دیا تھا کیوں کہ وہ کابل کو سکھوں سے واپس حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ایران نے افغانستان کے شہر ہرات پر قبضہ کر لیا تھا۔ انگریز روس سے دوستی کا دم بھر رہے تھے۔ انھوں نے سکھوں کو راضی کر لیا کہ پندرہ لاکھ روپے کے عوض شکارپور سندھ کے حکمرانوں کو واپس کر دیں۔ اس تمام صورتِ حال میں انگریزوں کا اثرورسوخ شمال مغرب میں خاصا بڑھ گیا۔

مزید برآں، گورنر جنرل آکلینڈ نے فیصلہ کیا کہ سندھ کے مختلف حصوں پر حکمراں مختلف میروں کے ساتھ آزاد حکمرانوں کے طور پر برتاؤ کیا جائے۔ یہ ٹالپروں پر کاری ضرب تھی۔ ٹالپر گھرانا ذرا سی مدّت میں حریف گروہوں میں بٹ گیا۔ یہ "لڑاؤ اور راج کرو" کی پالیسی کی قبیح ترین مثال تھی۔

اب انگریزوں نے حیدرآباد کے دربار میں اپنا سفیر مقرر کرنے پر اصرار کیا۔ میروں کا احتجاج بے کار گیا کہ انھیں کسی معاہدے، کسی اتحاد کی خواہش نہیں، اور وہ دربار میں سفیر مقرر کرنے کی عزت افزائی کی بھی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ بہرکیف، انھوں نے کہا، کہ اگر کوئی افسر دربار میں مقرر کیا

ہی جاتا ہے، تو وہ کوئی ڈاکٹر ہونا چاہیے۔ اس تعیش پسند دربار میں طبیبوں کا ہمیشہ خیر مقدم کیا جاتا تھا۔ (انگریزوں نے نوٹ کیا تھا کہ میر حضرات اس قدر فربہ تھے کہ عام ناپ کی کسی کرسی میں نہ بیٹھ سکتے تھے۔) مگر میر یہ سادہ سی بات سمجھنے میں ناکام رہے کہ برطانوی ڈاکٹر بھی درحقیقت برطانوی ایجنٹ ہی ہوگا۔ میروں کا ایلچی گوپال داس، ۲۶ سالہ ڈاکٹر جیمز برنس کو بڑے تزک و احتشام سے لے کر کچھ سے حیدرآباد پہنچا۔ سندھیوں کو اس انگریز کو قریب سے دیکھنے کا اس قدر تجسس تھا کہ ہر دوسرا شخص بیمار بن گیا اور ڈاکٹر کو بلاؤ کی دہائی دینے لگا۔ (ایسا ہی ایک منظر سندھ میں تقسیم ملک کے بعد دوبارہ نظر آیا۔ جب اعلان کیا گیا کہ حاملہ عورتوں کو ہندوستان جانے کے لیے پرمٹوں کے اجرا میں ترجیح دی جائے گی تو ہندوستانی ہائی کمشنر سری پرکاش کو پتا چلا کہ کراچی کے گھرانوں میں حاملہ عورتوں کی بھرمار ہے جنھوں نے اپنے لباس میں بے تحاشا کپڑے ٹھونس رکھے تھے تاکہ حاملہ نظر آسکیں!) ڈاکٹر برنس کو حیدرآباد کا دربار پک وک اور الف لیلہ کا عجیب و غریب آمیزہ محسوس ہوا۔ جب کبھی وہ کسی ٹالپر کو کسی دوا کی گولی دیتا تو خود اُسے بھی ایک گولی کھانی پڑتی، تاکہ یہ یقین ہو جائے کہ اس میں زہر نہیں ہے۔ اس نے نوٹ کیا کہ سندھ انگریز رعایا کے لیے ایک عمدہ میدان ثابت ہو سکتا ہے۔

اوّلیں انگریزوں کے تاثرات کے مطابق سندھی کشتی بان یہودیوں یا روسیوں سے بڑھ کر دھوکے باز تھے۔ انھوں نے سندھی باشندوں کو اتنی اونچی آواز میں بولتے ہوئے پایا جیسے چار آدمی بیک وقت بول رہے ہوں۔ صورتِ حال ایسی عجیب و غریب تھی کہ، ایسٹوک نے لکھا، اگر چارلس (ڈکنز) یہاں ہوتا تو تمام دنیا بہت جلد سندھ کے بارے میں ڈکنز کے تاثرات پڑھ رہی ہوتی۔

ہندو دوسرے درجے کے شہری تھے، چناں چہ، برنس نے نوٹ کیا کہ حیدرآباد کے میدانوں پر برطانوی پرچم کو لہراتا دیکھنے کا خواہش مند کوئی اس قدر نہ تھا جتنے ہندو امرا۔ یہ بات کراچی کے سیٹھ ناؤں مل ہوت چند بھوجوانی کے بارے میں سب سے بڑھ کر درست تھی، جو کچھ سے قندہار اور قندہار سے عراق تک پانچ سو تجارتی کوٹھیوں کا مالک تھا اور جن کے باپ کو زبردستی مسلمان بنایا گیا تھا۔ ناؤں مل، آؤٹرام کے الفاظ میں، پہلی افغان جنگ کے دنوں میں کراچی سے قندہار تک انگریزوں کا سب سے سچا دوست" بن گیا۔ اس نے افغانستان جانے کے لیے انگریز فوجیوں کی سواری کا بندوبست کیا، اور شکارپور کے بنیوں ـــ جیت سنگھ اور چھترومل ـــ کے ساتھ مل کر نقد رقم اور قرض کا انتظام کیا۔ پوٹنجر کے لکھنے کے مطابق ناؤں مل نے سندھ میں برطانوی فوجوں کے ہاتھوں اور پیروں کی سی اہمیت اختیار کر لی۔ میروں نے اُسے بلوا کر کہا: اچھا تو تم نے اپنے باپ کی بے عزتی کا بدلہ چکا کر لے لیا! مگر اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کر سکے۔

میروں کو یہ دیکھ کر شدید صدمہ ہوا کہ ڈاکٹر برنس کے پاس سندھ کے تفصیلی نقشے موجود ہیں۔ انھوں نے کہا، 'بات بگڑ چکی ہے۔ تم نے ہمارا ملک دیکھ لیا۔ فرنگی نے سب کچھ جان لیا۔ برطانوی جہازوں سیٹلائٹ اور پلانیٹ' پر رنجیت سنگھ کے لیے لے جائے جانے والے گھوڑے بیچ بیچ ٹروجن

گھوڑے ثابت ہوے تھے۔ اس سفر میں انگریزوں نے دریا کی گہرائی ماپ لی تھی اور دریا کے کناروں کے علاقوں کے نقشے تیار کر لیے تھے۔

تب افغانستان میں انگریزوں کی عبرتناک شکست کا واقعہ پیش آیا۔ ان کے سدھ سے گزر کر افغانستان جانے کے کئی مقاصد تھے: سدھ پر اثر قائم کرنا، سکھوں کی سرحدوں کو گھیرنا، سید احمد بریلوی کو کمک بھیجنا تاکہ وہ پشت پر سے سکھوں پر دباو بڑھا سکے، اور وسطی ایشیا میں بڑھتی ہوئی روسی طاقت کی مزاحمت کرنا۔ اس مہم میں تمام تر برطانوی فوج نیست و نابود ہو گئی۔ صرف ایک ڈاکٹر بروئیڈن گرتا پڑتا ایسٹ آباد واپس پہنچا اور اس نے منتظر بیٹھے والوں کو یہ خبر سنائی۔ اس شکست سے ہندوستان بھر میں انگریزوں کی پوزیشن پر اثر پڑنے کا اندیشہ تھا۔ چناں چہ انھوں نے کسی اَور جگہ فتح حاصل کر کے افغانستان کی شکست کے اثرات کا ازالہ کرنا چاہا۔ اس مشق کے لیے سدھ کا انتخاب ظاہر تھا۔ الفنسٹن نے کہا کہ افغانستان میں شکست کے بعد سدھ پر چڑھائی بالکل اُس زور آور سے مشابہ ہے جو گلی میں مار کھانے کے بعد گھر جائے اور اپنی بیوی کو پیٹ ڈالے۔

نپیئر نپولین جنگوں میں ڈیوک آف ولنگٹن کا پسندیدہ جونیئر افسر رہا تھا۔ اب اسے بمبئی اور بنگال کی فوج کا کمانڈر بنا کر سدھ فتح کرنے کے لیے بھیجا گیا۔ اس کی سدھ میں آمد کا مقصد محض ایک لاکھ روپیہ حاصل کرنا تھا تاکہ اپنی تین بیٹیاں بیاہ سکے۔ لہذا وہ بڑی جلدی میں تھا۔ بیچارے میر زبردستیوں اور زیادتیوں کی شکایت ہی کرتے رہ گئے۔ اور برطانوی پولیٹیکل ایجنٹ آؤٹرام کی صبر کی تلقین بھی بےاثر ثابت ہوئی۔ نپیئر نے کہا "ہمیں سدھ پر قبضہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، مگر ہم ایسا ضرور کریں گے۔ اور یہ ایک بے حد سودمند، کارآمد اور دردمندانہ بدمعاشی ہو گی۔"

ٹالپر میر ایک ایسی جنگ میں ملوث ہو گئے جس میں ان کا جیتنا ناممکن تھا۔ لیکن انھوں نے اپنی بہادری سے ثابت کیا کہ اس جنگ میں لڑنا ناممکن نہیں تھا۔ نپیئر نے ان کے اونٹوں کی پیٹھ پر سوار پاگل پن کے توپ خانے کا مذاق اڑایا تھا، مگر ۱۷ فروری ۱۸۴۳ کو حیدر آباد کے قریب میانی کی لڑائی میں، تھورنسٹن نے رپورٹ دی کہ تلوار اور ڈھال سے مسلح بلوچیوں نے کئی موقعوں پر دھاوا بول کر برطانوی فوجی صفوں کے قدم اکھیڑ کر انھیں پیچھے دھکیلا۔ ایک اَور جینی شاہد ایسٹوک نے لکھا "اس موقعے پر بلوچیوں کی دلیری کی سی مثالیں شاید کمیاب ہوں گی۔ اس لڑائی میں ہمارا نقصان خاصا سنگین تھا ۶۲ ہلاک بشمول ۶ انگریز افسر، اور ۱۹۴ زخمی بشمول ۱۳ انگریز افسر۔ سدھی فوج کے چار سو افراد ہلاک ہوے۔ اس کے بعد دابو (دوآبو) کی لڑائی ہوئی جس کا نتیجہ کچھ زیادہ مختلف نہ تھا۔

سیٹھ ناؤں مل کا باپ ہوت چند، جو کراچی بندر پر اپنے خاندانی جہاز کو تیہ ہر پسا پر کئی ہفتوں سے منتظر بیٹھا تھا، آخر فتح مندانہ بندرگاہ پر اترا اور ہندوؤں اور مسلمانوں نے اس کا دلی خیر مقدم کیا۔ سدھ پر میروں کی حکمرانی کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ انھوں نے اپنی صرف تین یادگاریں چھوڑیں: حیدر آباد میں مقبرے، اپنی مخصوص ٹوپی اور اپنی بھوت۔ اگر سدھ میں کوئی او بچا اُڑنے لگے تو کہا جاتا ہے: "تم خود کو ٹالپر سمجھتے

ہو گیا؟

چارلس نیپیئر نے گورنر جنرل کو فتح کا پیغام بھیجا، "Peccavı"، اس لاطینی لفظ کا انگریزی ترجمہ تھا۔ "I have Sın(ne)d!" پھر وہ خزانے اور محل کو لوٹنے کی غرض سے آگے بڑھا، مگر میروں کا منتظم خزانہ آوت رائے ملکانی اس کے راستے میں آ گیا۔ نیپیئر خزانے کی کنجیاں لینے آوترائے کے گھر گیا مگر اس نے کہلوا دیا کہ وہ میروں کے حکم کے بغیر کنجیاں نہیں دے سکتا۔ نیپیئر نے اسے گولی سے اڑا دینے کی دھمکی دی مگر آوترائے پر کچھ اثر نہ ہوا۔ نیپیئر نے بیل مرام لوٹ آیا۔ بعد میں اس نے آوترائے کو قلعے سے خواتین کو باہر نکالنے کا بندوبست کرنے کی اجازت دے دی کیوں کہ زنان خانے میں اس کے سوا کسی کو رسائی حاصل نہ تھی۔ آوترائے ایک ایک کر کے ڈولیوں میں خزانے اور قیمتی اشیا چھپا کر باہر بھیجتا رہا یہاں تک کہ بارہ ڈولیاں بہ حفاظت نکل گئیں۔ مگر تیرھویں ڈولی کا پردہ ہوا سے کھل گیا اور یہ راز کھل گیا کہ اس میں کوئی سوار نہیں ہے۔ اس کے بعد نیپیئر نے انگریز عورتوں کو اندر بھیجا کہ بیگموں کو باہر نکالیں اور انہیں فی کس تین جوڑے کپڑوں کے سوا کچھ ساتھ نہ لے جانے دیں۔

آوترائے اور شوقی رام آڈوانی (سادھو ہیرانند کے باپ) کی قیادت میں لوگ تلواریں لے کر نکل آئے اور کہا کہ وہ سامان معقول قیمت پر مہیا کرنے کو تیار ہیں مگر کوئی لوٹ مار نہیں ہونی چاہیے۔ اس طرح شہر لٹنے سے بچ گیا۔

بہت سے ہندو میروں کے قرض خواہ تھے۔ لکھی تاراچند اور دوسرے ممتاز ہندوؤں نے نیپیئر سے مطالبہ کیا کہ ان کی رقم ریاست کے قرض کے طور پر لوٹائی جائے۔ نیپیئر نے انکار کر دیا۔ اس پر انھوں نے آپس میں چندا کر کے قرض خواہوں کو جزوی رقم ادا کی۔ نیپیئر کے رویے کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے تاراچند نے برطانوی جاگیر ٹھکرا دی جو حیدرآباد کے اُس علاقے پر مشتمل تھی جو بعد میں ہیرآباد کہلایا۔ نیپیئر آوترائے کی ذہانت اور دیانت سے اس قدر متاثر ہوا کہ اسے ملازمت کی پیش کش کی، مگر اس نے انکار کر دیا۔

نیپیئر نے سندھ فتح کر لیا، مگر اسے فتح کرنے میں جس دھاندلی اور جبرہ دستی سے کام لیا اس نے ہندوستان اور انگلستان میں مقیم بعض مزاج انگریزوں کو سخت صدمہ پہنچایا۔ سندھیوں نے تو جنیر نیپیئر کا نام ہی شیطان کا بھائی رکھ دیا تھا۔ میروں نے اپنے وکیلوں ــــ آخوند حبیب اللہ، دیوان بیٹھارام اور دیوان دریارام ــــ کو لندن (۱۹، پارلے اسٹریٹ) بھیجا۔ بیگموں نے ملکہ وکٹوریہ کو عرض داشت بھیجی۔ ان میں سے کسی کی بات نہ سنی گئی، انہیں مقامی حکام سے رابطہ کرنے کی ہدایت کی گئی۔ مگر جلد ہی انگریزوں کی ناگواری کا کھل کر اظہار ہونے لگا۔ ٹائمز لندن نے (۶ مئی ۱۸۴۳ کی اشاعت میں) ایک اداریہ مضمون شائع کیا جس میں لوٹ مار اور سرسری سرانجام کے ایک سوچے سمجھے منصوبے کی مذمت کی گئی تھی۔ ٹائمز بمبئی نے اسے ایک غیر دانش مندانہ جنگ قرار دیا اور کہا کہ انگریز افسروں نے میروں کی بیگمات پر قبضہ کر لیا ہے۔ جب کراچی میں ہیضے کی وبا سے آٹھ سو سپاہی

ہلاک ہوئے تو ڈیلی گزٹ نے ان کثیر اموات، بے تحاشا اخراجات اور گھٹیا تذلیل کے ایک سلسلے کا ذمے دار سندھ پر غیر منصفانہ قبضے کو ٹھہرایا۔

نیپیئر نے اس تمام تنقید کا جواب اپنے مخصوص طیش کے ذریعے سے دیا۔ اس نے ایک دوست کے نام خط میں لکھا مجھ سے کبھی خوش مزاجی کی توقع مت کرنا اگر مجھے کسی ایڈیٹر کو ہلاک کرنے کا موقع نہ ملا ہو۔ مگر تنقید جاری رہی اور حکومت کی شرمساری اور ندامت میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ لندن سے ایلن برو کو سندھ کی میروں کو واپسی پر بھی غور کرنے کو کہا گیا، خصوصاً اس لیے کہ سندھ میں فوج رکھنے کے اخراجات صوبے سے حاصل ہونے والی آمدنی سے چار گنا زیادہ ہو رہے تھے۔ تاہم ڈیوک آف ولنگٹن نے ایلن برو کو ڈٹے رہنے کی ہدایت کی اور سوال کیا کہ کیا ہماری آئینی انتظامیہ دریائے سندھ کے کنارے سکھوں کے حامی فرانسیسیوں کی نو آبادی دیکھنے کو تیار ہو گی؟ ظاہر ہے کہ اس کا سوال ہی نہ تھا۔ چناں چہ سندھ کو برطانوی ہند میں شامل کر لیا گیا۔ رائے عامہ کو مطمئن کرنے کے لیے ایلن برو کو واپس بلا لیا گیا۔ نیپیئر کی بات بالکل درست تھی کہ حقائق کی نوعیت سندھ کے بطور ایک آزاد حکومت قائم رہنے کے بالکل خلاف ہے۔ اگر یہ جنگ ۱۸۴۳ میں نہ ہوئی ہوتی تو ۱۸۵۳ میں ہو جاتی۔ اس نے کہا کہ بلوچ بھی سندھ میں غیر ملکی تھے۔ اس نے دلیل دی کہ چوں کہ انگریز ہندوستان میں عظیم ترین طاقت ہیں اس لیے سندھ کے لوگ اپنی امیدوں اور امنگوں سمیت ہمارے اپنے ہیں۔

نیپیئر ٹھیک کہتا تھا۔ ہندوستان کی سالمیت ناقابلِ تقسیم ہے۔

***

۲

جب میانی اور دابو کی لڑائیوں کی گرد بیٹھ گئی تو وزیر اعظم برطانیہ پیل اور قائد حزب اختلاف لارڈ جان رسل نے مل کر برطانوی پارلیمنٹ میں نیپیئر کے لیے شکریے کی قرارداد اتفاق رائے سے منظور کرائی۔ نیپیئر خود بھی ستر ہزار پاؤنڈ کا نقد انعام وصول کرنے کے لیے موجود تھا۔ اس کے بعد وہ سندھ میں پانچ سال کے لیے متعین ہو گیا تاکہ ایلن برو کی خواہش کو عمل میں لا سکے جس نے کہا تھا کہ ہمیں سندھ میں مستقل کے لیے ہر کام کرنا چاہیے تاکہ ایک اور مصر کی بنیاد رکھی جا سکے۔ نیپیئر کے خیالات یہ تھے "کسی بھی مہذب آدمی سے پوچھا جائے کہ اگر وہ سندھ کا حکمراں ہو تو کیا اقدامات کرے گا، تو اس کا جواب ہو گا کہ میں دریائی سفر پر محصول ختم کر دوں گا، کراچی کو ایک آزاد بندرگاہ بناؤں گا، سکھر کو دریائے سندھ پر ایک تجارتی مقام کے طور پر ترقی دوں گا، دریا کے کناروں کے ساتھ سڑکیں تعمیر کروں

گا اور دُھائی کشتیاں حاصل کروں گا۔ اور اس نے دریائی محصول ختم کر کے اسی منصوبے پر عمل شروع کر دیا۔

اس نے بلوچی جاگیرداروں کو طلب کیا، ان کی تلواریں انھیں واپس کیں اور ان کی جاگیروں کو مستقل کر دیا۔ ان میں بعض کو خصوصی اعزار کے طور پر ملکہ وکٹوریہ کی تصویر کو سلامی دینے کی اجازت دی گئی جسے عامیوں کی نگاہ سے بچانے کے لیے پردے میں ملفوف رکھا جاتا تھا۔ نیپیئر نے ان سے کہا میری اطاعت کرو! اس کے علاوہ جو تمہارا جی چاہے کرو ـــــ لوٹ مار، قتل، کسی جبیر یا سدی نہیں ـــــ جب تک میں منع نہ کردوں۔ اور انھوں نے یہی کیا انگریز کی اطاعت، اور باقی معاملات میں من مانی۔

عام سندھی بھی جلد ہی مطیع ہوگئے۔ ان کے لیے لاٹ صاحب اور لیڈی صاحب مطلق اقتدار کے مالک تھے۔ جب انھیں طلب کیا جاتا تو وہ اپنے جوتے باہر اتار کر آتے۔ انگریز آنے والے سے پہلا سوال یہ کرتا کیا تم بدمعاش ہو؟ اور آنے والا، اپنی اطاعت اور بدمعاشی دونوں کو تسلیم کرتے ہوئے جواب دیتا حضور، سرکاری بدمعاش ہیں۔ وڈیرا، میاں، پیر اور (گورا یا کالا) صاحب ـــــ یہ چار کردار سندھ میں اقتدار کے چار ستون بن گئے۔

نیپیئر نے پہلے دریائے سندھ کا پانی مشرقی نارا نہر کے ذریعے ہندو علاقے کچھ میں لے جانے کا ارادہ کیا، مگر پھر اسے ناممکن پا کر پرانی نہروں کو بہتر بنانے اور نئی نہریں کھودنے کے لیے محکمۂ انہار کی بنیاد رکھی۔ ہندوؤں کو متاثر کرنے کے لیے عربی کی جامع مسجد کا بڑا دروازہ اکھاڑ کر لایا گیا کہ یہ سومناتھ کا لوٹا ہوا دروازہ ہے، مگر ہندو ماہرین نے جلد ہی اعلان کر دیا کہ یہ وہ دروازہ نہیں ہے۔ نیپیئر نے کاشتکاروں کے ۱۸۴۳ سے پہلے کے تمام قرضے معاف کر دیے۔ اس نے سندھ پولیس قائم کی جس نے بعد میں ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے لیے نمونے کا کام دیا۔ نیپیئر نے انصاف قائم کرنے پر بھی بہت توجہ دی۔

سندھ کے دو غیر مطمئن طبقے ٹالپیروں اور ان کے ہندو (کائستھ) عاملوں کے تھے ٹالپیروں نے اقتدار کھویا تھا اور عاملوں نے اونچے انتظامی عہدے جو اب انگریزوں کے پاس تھے۔ لیکن ٹالپیر جلد ہی اپنی جاگیروں اور وثیقوں میں مگن ہو گئے اور جب معیشت اور انتظامیہ میں توسیع ہوئی تو عاملوں کو پہلے سے بھی بڑھ کر مواقع ملے۔ (تقسیم ہند کے بعد سندھ کے ایک سابق کمشنر سر پیٹرک کیڈل نے پاکستان کے وزیر اطلاعات و نشریات پیر علی محمد راشدی کو لکھا کہ اس کے خیال میں سندھ کے عامل بہترین منتظم ہیں جنھوں نے ہر میدان میں اعلیٰ کارکردگی دکھائی۔ یہ تعجب کا مقام نہیں کہ آئی سی ایس میں کامیاب ہونے والے ۱۴ سندھیوں میں سے ـــــ جو تمام ہندو تھے ـــــ ۱۲ عامل تھے۔)

اس تمام ترقی سے پنجاب کو مرعوب کرنا مقصود تھا (اور وہ بلاشبہ مرعوب ہوا) جو اُس وقت سکھاشاہی کے اثرات کے تحت شکست و ریخت کا شکار تھا اور انگریزوں کی گود میں گرنے ہی والا تھا۔ لیکن اپنے تمام سلطنت سازی کے مزاج اور بصیرت کے باوجود نیپیئر منتظم سے زیادہ جنگ جو تھا۔ اس کے

رخصت ہونے کے بعد، جب سندھ کو بمبئی پریذیڈنسی کا حصہ بنا دیا گیا اور سر بارٹل فریئر سندھ کا پہلا کمشنر بن کر آیا تو اُسے یہ دیکھ کر صدمہ ہوا کہ سندھ میں 'ایک میل کی پکی سڑک نہیں ہے، ایک بھی پکا پُل نہیں ہے، پانچ میل کی ہموار کچی سڑک نہیں ہے، اور نہ کوئی ڈاک بنگلا، سرائے، دھرم شالا، ضلع کچہری، عدالت، حوالات، پولیس تھانا یا کسی قسم کے دفتر کی عمارت موجود ہے، ضلعوں کی حد بندیاں یہاں تک کہ دیہات کی کوئی لسٹ یا کسی قسم کا سروے بھی نہیں ہے۔'

اگرچہ سندھ میں آمد کے وقت فریئر کی عمر صرف ۳۵ برس تھی، وہ برطانوی حکومت کی پوری صدی کا بہترین منتظم ثابت ہوا۔ ۱۸۵۰ سے ۱۸۵۹ تک، یعنی صرف نو برس کی مدت میں، اس نے سندھ کی صورت بدل کر رکھ دی۔ ۱۸۵۳ میں سندھ میں پہلا انگریزی اسکول قائم ہوا۔ ۱۸۵۸ میں سندھ ریلوے کمپنی نے کراچی سے حیدرآباد تک کی ریل کی پٹری پر کام شروع کیا۔ اس نے آبپاشی کے سلسلے میں ایک منصوبہ تیار کرایا جو بعد میں سکھر بیراج کی شکل میں سامنے آیا' اس بیراج کے نتیجے میں سندھ فاضل آمدنی والا صوبہ بن گیا۔ اس نے کراچی میں ایک تجارتی میلا منعقد کرایا جس نے نہ صرف پورے ہندوستان کو بلکہ وسطی ایشیا کو بھی متوجہ کر لیا۔ فریئر نے وائسرائے کو اس بات پر قائل کیا کہ انگلستان سے آنے والے جہاز بمبئی پہنچنے سے پہلے کراچی کی بندرگاہ پر ٹھہریں، حالاں کہ یہ تجویز ایسٹ انڈیا کمپنی نے مسترد کر دی تھی۔ اس اقدام کے نتیجے میں کراچی، جسے نیپیئر نے ملکۂ مشرق قرار دیا تھا، دنیا کے ایک بڑے شہری مرکز کے طور پر پھلنے پھولنے لگا۔ فریئر نے سندھی زبان کا رسم الخط طے کیا، اور اسے نچلی سطحوں پر سرکاری انتظامیہ کی زبان کے طور پر رائج کیا۔ ۱۸۵۲ میں اس نے سندھ ڈسٹرکٹ ڈاک کے نام سے ہندوستان بھر کا پہلا ٹکٹ جاری کیا۔

۱۸۵۷ کی عظیم بغاوت میں میرپور خاص کے شیر محمد خاں نے انگریزوں کا اچھا مقابلہ کیا، جس کی پاداش میں اسے رام باغ میں توپ دم کیا گیا۔ دریا خاں کھوسو کھرانی کو، جسے نیپیئر نے جاگیر دے کر اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی تھی، اس بغاوت میں حصہ لینے کے جرم میں جلاوطن کر کے عدن بھیج دیا گیا۔ مگر مجموعی طور پر سندھ میں اس بغاوت کے دوران اس قدر امن و امان رہا کہ فریئر نے تمام انگریزی فوج کو کمک کے طور پر شمالی علاقوں کی طرف بھیج دیا۔

بعد میں فریئر بمبئی کے گورنر اور پھر وائسرائے کی ایگزیکٹو کاؤنسل کے رکن کے عہدوں تک پہنچا۔ تمام انگریز کمشنر فریئر کی سی اہلیت نہ رکھتے تھے۔ ان میں سے ایک، جی اے تھامس، تو اس قدر مغرور تھا کہ سندھ آبزرور نے اس پر "God Almighty" Thomas کی پھبتی کسی۔ مگر انگریزوں کے انتظام کی بنیاد شخصیات پر نہیں بلکہ اداروں پر تھی، اور اس کی متعین سمت کے بارے میں کسی شبے کی گنجائش نہ تھی۔ اپنے سو سالہ دور میں انگریزوں نے سندھ کو سڑکیں، ریلوے، نہریں اور پُل، اسکول اور اسپتال، اور ایسے خیالات اور آدرش دیے جنھوں نے صوبے کو دورِ وسطیٰ سے نکال کر جدید زمانے میں لا کھڑا کیا۔ نیپیئر نے واپس آنے اور کراچی کی عظمت و شان کا مشاہدہ کرنے کی خواہش کا اظہار

کیا تھا؛ اگر وہ پچاس برس بعد کراچی لوٹتا تو اس کو واقعی مسرت ہوتی۔ سندھ کا پہلا کالج ـــ ڈی جے سندھ کالج ـــ کراچی میں قائم کیا گیا (گوکہ زیادہ تر طلبا حیدر آباد سے آئے) کیوں کہ رِشی ڈیارام کا کہنا تھا کراچی کی اہمیت سندھ سے زیادہ ہے۔

اپنے تمام نقائص کے باوجود، انگریزی حکومت نے سندھ کو یہاں تک خوش حال کر دیا کہ حیدر آباد اور شکار پور کے بیوپاری ہر سال ڈھائی کروڑ روپے کما کر صوبے میں لانے لگے، جب کہ صوبے کا سالانہ بجٹ کُل پانچ کروڑ روپے کا تھا۔ پیر علی محمد راشدی کے الفاظ میں "اگر ناؤں مل نے غداری نہ کی ہوتی تو سندھی مسلمان اب تک گھوڑوں اور اونٹوں پر اور سندھی ہندو گدھوں اور خچروں پر سفر کر رہے ہوتے۔" سندھ کو انگریزوں کے عظیم ترین تحائف میں جدید تعلیم اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں برابری کی پالیسی شامل تھی۔ مسلمانوں کی حکومت میں ہندوؤں کو گھوڑے پر سوار ہونے، زمین کی ملکیت رکھنے اور فوج میں شامل ہونے کی ممانعت تھی۔ ۱۸۴۳ میں، جب ہندوؤں کی آبادی ۲۵ فیصد تھی، ان کی ملکیت میں ایک ایکڑ بھی زمین نہ تھی، جب کہ ۱۹۴۷ میں وہ ۴۰ فیصد اراضی کے مالک تھے۔ لیکن یہ تمام نتائج محض برطانوی نظام کی برکت سے نہ تھے؛ اس میں مقامی آبادی کے عملی ذوق و شوق کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ مسلمانوں میں آغا خان اور محمد علی جناح نے، جو سندھ میں پیدا ہوئے تھے، سیاست میں شہرت حاصل کی۔ مرزا قلیچ بیگ نے تعلیم، ایڈمنسٹریشن اور ادب کے میدانوں میں نمایاں مقام پایا۔ حسن علی آفندی نے کراچی کا سندھ مدرسہ قائم کیا جس نے سندھی مسلمانوں کی ـــ ہرچند کہ بے حد قلیل ـــ مڈل کلاس کو جنم دیا۔ غلام محمد بھرگڑی پہلے سندھی بیرسٹر تھے۔

ہندوؤں نے ملاشہ، گدڑومل، آوت رائے اور ناؤں مل کی روایت میں، بے شمار عظیم شخصیات پیدا کیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کراچی سے سمندر کے راستے بمبئی پہنچنے میں چار ہفتے لگتے تھے۔ میٹرک تک پہنچنے والے پہلے چار طالب علموں ـــ چوہڑمل پسحانی، نول رائے آڈوانی، ڈیارام جیٹھ مل اور کوڑومل کھلنانی ـــ کو یہ امتحان اس قدر سخت محسوس ہوا کہ ان میں سے صرف اول الذکر کامیاب ہو سکا۔ مگر انگریزوں نے اتنی فہم سے کام لیا کہ میٹرک پاس نہ کر پانے والوں کی بھی، ملازمت دے کر حوصلہ افزائی کی، اور انھوں نے شاندار مقام حاصل کیا۔ ڈیارام جیٹھ مل ایک نمایاں وکیل بنے اور انھوں نے ڈی جے سندھ کالج (جس کا نام اُنھیں کے نام پر رکھا گیا) کے قیام کے لیے رقم جمع کرنے میں حصہ لیا؛ بہت سے ہندوؤں نے اپنی مہینے بھر کی تنخواہ اس چندے میں دی۔ نول رائے نے ایک عظیم اسکول، این ایچ اکیڈمی، قائم کیا جس کا نام ان کے اور ان کے بھائی ہیرا نند کے نام پر پڑا۔ کوڑومل نے سامی کے اشلوک دریافت کیے جنھوں نے سامی کو شاہ لطیف اور سچل سرمست کے ساتھ سندھ کے عظیم ترین شاعروں میں شامل کر دیا۔

چوہڑمل پہلے سندھی گریجویٹ تھے اور تاراچند پہلے سندھی ڈاکٹر۔ سادھو ہیرا نند نے اوّلین سندھی جریدوں، "سندھ ٹائمز" اور "سندھ سُدھار" کی ادارت کی۔ کنول سنگھ نے پہلا سندھی روزنامہ "سندھ واسی" (۱۹۱۴ میں) جاری کیا۔ لیکن برطانوی دور کے سندھ کی عظیم ترین شخصیت ـــ سیاسی

شخصیات سے قطع نظر ۔۔۔ رشی ڈیارام گدومل تھے۔ ڈیارام نے ڈسٹرکٹ اور سیشن جج کے طور پر بلند مقام
حاصل کیا، مگر ان کے اصل کارنامے عدالت سے باہر پیش آئے۔ ڈی جے سندھ کالج کے قیام میں حصہ
لینے کے علاوہ، انھوں نے اپنے بھائی بیٹھارام کو ایک ہزار گز زمین کا عطیہ دینے پر رضامند کیا جس پر
کراچی کا عظیم بیٹھارام ہاسٹل قائم کیا گیا۔ ڈیارام ٹرسٹ نے حیدرآباد میں ڈی جی نیشنل کالج کے قیام کے
لیے ایک لاکھ روپے کا عطیہ دیا۔

ڈیارام کو ۱۱۲۰ روپے ماہانہ ملتے تھے، جس میں سے وہ اپنے اخراجات کے لیے صرف ۱۵۰
روپے رکھ کر باقی سب عطیہ کر دیتے تھے۔ جج کے طور پر بھی ڈیارام کی کارکردگی نہایت شاندار تھی۔ ان کا
فیصل کیا ہوا اہم ترین مقدمہ احمد آباد کی جامع مسجد کا تھا جس کے ٹرسٹی مسجد کی زمین کے حصے فروخت کر
کے اس کی رقم خود ہڑپ کر رہے تھے۔ مسجد کے امام نے عدالت سے رجوع کیا تھا اور یہ مقدمہ ۱۲ سال
سے چل رہا تھا۔ جب ڈیارام ڈسٹرکٹ جج مقرر ہوئے تو انھوں نے مسلسل ۱۲ دن مقدمے کی سماعت
کی، تمام فارسی دستاویزات کا مطالعہ کیا اور ساری زمین مسجد کو واپس کرنے کا حکم دیا۔ انھوں نے اپنا یہ
فیصلہ کاغذ کے بجائے کپڑے پر تحریر کیا تاکہ طویل عرصے تک محفوظ رہ سکے۔ ڈیارام کی عوامی خدمات
سندھ تک محدود نہ تھیں۔ شملہ کے قریب دھرم پورہ کے مقام پر ان کی سو ایکڑ زمین تھی جس پر انھوں
نے ٹی بی سینیٹوریم قائم کیا۔ بمبئی کے علاقے باندرہ میں سیوا سدن بنایا۔ ۱۹۲۵ میں امرتسر میں
شانتی آشرم لائبریری قائم کی اور بعد میں اسے شرومنی گردوارہ پربندھک کمیٹی کے سپرد کر دیا جس نے
اس کا نام بدل کر گرو رام داس لائبریری رکھ دیا۔

یہ وہ شخصیات تھیں جنھوں نے سندھ جیسے چھوٹے سے صوبے کو عظمت عطا کی اور سندھ میں
تہذیبی نشاۃ ثانیہ اور تحریکِ آزادی کے لیے راہ ہموار کی۔

***

۳

۱۸۴۳ میں جب انگریزوں نے سندھ کا نظم و نسق سنبھالا تو دریا کے دونوں کناروں پر ریتیلے
میدانوں کے سوا کچھ نہ تھا جن کے درمیان کہیں کہیں سرسبز زمین تھی۔ کراچی محض ایک چھوٹا سا تجارتی
قصبہ تھا، اور ریاست کے دارالحکومت حیدرآباد تک کے مکانات اس قسم کے تھے کہ انھیں حقیر کٹیاؤں
کے سوا کچھ نہ کہا جاسکتا تھا۔ عظیم یادگاری عمارتیں ناپید تھیں۔ میروں کے محلات تک میں محلوں
جیسی کوئی بات نہ تھی۔ زندگیاں، اگر تکلیف دہ اور پُرتشدد نہ بھی ہوں تو، مفلسانہ اور مختصر تھیں۔

۱۹۴۷ کے سندھ کی بات ہی کچھ دوسری تھی۔ یہ وہ سندھ تھا جسے پرانے لوگ ـــ ہندو، مسلم اور انگریز ـــ اب تک نوسٹیلجیا کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔ یہ سب محض عظیم افراد کے کارناموں کا نتیجہ نہ تھا بلکہ تبدیلی کی اُن ہواؤں کا مجموعی نتیجہ تھا جو ہر سمت سے چل رہی تھیں۔

بدقسمتی یہ ہوئی کہ سندھی مسلمانوں کو ان موافق ہواؤں سے کچھ فائدہ نہ ہوا ـــ یا انھوں نے کچھ فائدہ نہ اٹھایا۔ سندھ کے مسلم اکثریتی صوبے کو بمبئی پریزیڈنسی میں شامل کر دیا گیا جہاں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ بمبئی کے اہلکاروں نے سندھ کے ساتھ شکار گاہ کا سا برتاؤ کیا جہاں وہ موسمِ سرما میں شکار کھیلنے آیا کرتے۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہندوستان میں برٹش حکومت بہت مقبول تھی اور وائسرائے لارڈ رپن خاص طور پر مقبول تھا۔ سارس پیچھے پر اس کی گاڑی کاشی کے پنڈتوں نے خود کھینچی تھی۔ پورے ملک میں معزز شخصیات اسے پیش کرنے کے لیے سپاسناموں پر دستخط کر رہی تھیں۔ ۱۸۸۴ میں سندھ سبھا نے بھی کراچی میں ایک اجلاس کیا تاکہ لارڈ رپن کی خدمات کے اعتراف میں ایک سپاسنامہ تیار کر کے بھیجا جائے۔ اجلاس میں خان بہادر حسن علی آفندی نے اس تجویز کی مخالفت کی اور کہا کہ محض ایک خط ارسال کرنا مناسب ہو گا۔ ڈیارام نے کہا کہ اگر ملک کے باقی حصوں کے برخلاف سندھ نے لارڈ رپن کی خدمات کا اعتراف نہ کیا تو یہ ایک لعنت ہو گی۔ آفندی غصے میں آ کر لعنت! لعنت! بڑبڑاتے ہوئے اجلاس سے اٹھ گئے۔ سندھ سبھا نے جلسۂ عام میں لارڈ رپن کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے ایک وفد بھیجا، لیکن آفندی اس میں شامل نہ ہوئے۔ انھوں نے اگلے ہی سال (۱۸۸۵ میں) مسلمانوں کی تعلیم کے لیے سندھ مدرسہ کی بنیاد رکھ دی۔ اگرچہ یہ مدرسہ انگریز کی اطاعت کے مخالف خدمات کے نتیجے میں قائم ہوا تھا، یہ کسی عام اسکول سے مختلف ثابت نہ ہوا اور نہ اس نے صوبے کی سیاسی یا ادبی زندگی پر کوئی خاص اثر مرتب کیا۔ اس کے زیادہ تر ہیڈماسٹر انگریز رہے۔ مسلمان وڈیروں نے مسلمانوں کی تعلیم کے سلسلے میں مالی امداد کرنے سے انکار کر دیا، کیوں کہ انھیں ڈر تھا کہ اگر ان کے دست نگر لوگوں کے بچے پڑھ لکھ گئے تو ان کی اطاعت کرنا چھوڑ دیں گے! دلچسپ بات یہ ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے بھی سندھ پر زیادہ اثر نہ ڈالا۔ مسلم یونیورسٹی کے واحد گریجویٹ جو لیجسلیٹو اسمبلی کے رکن بنے، محمد امین کھوسو تھے، جو کانگریس میں شامل ہوئے۔

البتہ تحریک خلافت نے سندھ کو بہت متاثر کیا۔ شیخ عبدالمجید سندھی (لیلارام)، شیخ عبدالرحیم (کرپالانی) اور عبیداللہ سندھی (جو پیدائشی سکھ تھے) ریشمی رومال تحریک تک میں شامل ہوئے اور انھوں نے شاہ افغانستان سے استدعا کی کہ وہ آ کر ہندوستان کو آزاد کرائے۔ اس کے بدلے میں انھیں جیل کی طویل سزاؤں کے سوا کچھ نہ ملا۔ ہزاروں سندھی مسلمان تحریک ہجرت میں شامل ہو کر افغانستان گئے؛ انھیں بھی سوائے صعوبتوں کے کچھ حاصل نہ ہوا۔ خلیفہ اور ترکی کے ذکر نے بلاشبہ انھیں مغربی ایشیا کے معاملات سے آشنا کیا، مگر وہ عربوں اور ترکوں کی باہمی عداوت دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ترکی کے نجات دہندہ کے

طور پر کمال پاشا کے عروج نے انھیں جوش دلایا، مگر ملاؤں، عربی زبان اور ترکوں کی روایتی ٹوپی (fez) کے خلاف اس کی جنگ نے ان کا جوش سرد کر دیا۔ یہ اینٹی کلائمکس اس وقت مکمل ہو گیا جب ایران، عرب اور ترکی نے تحریکِ خلافت کا مضحکہ اڑایا اور ہندوستان کی تحریکِ آزادی سے یگانگت ظاہر کی۔ ایک زمانے میں ہندوؤں کے مسلمان ہونے کے واقعات نے سندھی مسلمانوں کو جذباتی سہارا دیا تھا، مگر ہندو نشأۃ ثانیہ اور تحریکِ آزادی کے زور پکڑنے کے ساتھ ساتھ یہ واقعات بند ہو گئے۔

سندھی مسلمانوں نے زمینوں سمیت ہر دوسری چیز کو نظر انداز کر کے اپنی تمام توجہ بمبئی سے سندھ کی علیحدگی پر مرکوز رکھی۔ ابھی اسے علیحدہ ہوئے بمشکل دو سال گزرے تھے کہ دوسری جنگِ عظیم شروع ہو گئی جس کے ساتھ ساتھ کانگریس کی ہندوستان چھوڑ دو تحریک اور مسلم لیگ کے راست اقدام جیسے طوفان برپا ہونے لگے۔ سندھیوں کو سکون سے بیٹھ کر اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ بچار کرنے کا موقع ہی نہ ملا۔ مسلمان کسانوں نے خود کو لیگی [لیگی] قرار دے کر مسلم لیگ کے حق میں ووٹ دیے، مگر لیگ سے ان کی کوئی حقیقی وابستگی نہ تھی۔ بنیادی طور پر وہ اپنے پیر یا وڈیرے ہی سے وابستہ رہے۔ وہ قرض دینے والے بنیے کی یوں حفاظت کرتے جیسے سونے کے انڈے دینے والی مرغی کی کی جاتی ہے، اور عامل دیوان کا اس کی کامرانیوں کی بنا پر احترام کرتے۔ سندھی مسلمان دل کا مضبوط تھا، لیکن تبدیلی کی ہوائیں اُس پر تقریباً بے اثر رہی تھیں، جبکہ ان ہواؤں نے ہندوؤں کی بالکل کایا کلپ کر ڈالی تھی۔

جب سندھ انگریزوں کے قبضے میں آیا، تب ہندوؤں کی حالت خاصی مخدوش تھی۔ انھیں دیوان جیسے اہم عہدے حاصل تھے اور وہ سیٹھوں کے طور پر خاصی دولت بھی کماتے تھے، مگر اعلیٰ ترین دیوان اور مالدار ترین سیٹھ تک کسی میر کی ہوس یا پیر کے فتوے کا نشانہ بن کر تباہ و برباد ہو سکتا تھا۔ ہندومت بیشتر محض ذات پات دھرم کے طور پر باقی تھا، مگر حقیقت یہ تھی کہ انگریزوں کی آمد کے وقت تک ہندو اپنے مندروں میں نہ تو کوئی مورتی رکھ سکتے تھے اور نہ گھنٹیاں بجا سکتے تھے۔ پنجاب میں سکھوں کے عروج نے بلاشبہ سندھی ہندوؤں میں کچھ ولولہ پیدا کیا اور انھوں نے فوراً چند گردوارے قائم کر لیے، مگر اس سے زیادہ کچھ نہ ہوا۔

انگریزوں کی آمد نے نئے امکانات کے دروازے کھول دیے۔ سندھ کے بمبئی میں انضمام نے سندھ کو ہندو ہندوستان کے ساتھ سرکاری طور پر جوڑ دیا۔ گجراتی تاجر اور مراٹھی اور پارسی منتظمین بڑی تعداد میں سندھ پہنچے۔ کراچی کا سب سے بڑا اسکول ــــ این جے گورنمنٹ ہائی اسکول ــــ مہاراشٹر کے ایک ممتاز ماہرِ تعلیم نارائن جگن ناتھ کے نام پر قائم کیا گیا، اور کراچی کی بہترین درس گاہ ــــ شاردا مندر ــــ گجراتیوں کی قائم کی ہوئی تھی۔

تاہم سندھی ہندوؤں کو درپیش سابق چیلنج اپنی جگہ قائم رہے، اور نئے چیلنج سامنے آئے۔ اسلام شروع سے ان میں سے ایک تھا، اور اب عیسائیت بھی ان میں شامل ہو گئی۔ میری والدہ بتاتی تھیں کہ

اس صدی کے شروع میں مشنریوں نے عاملوں کے گھروں میں جا جا کر ان کی کمسن لڑکیوں کو انگریزی سکھانا شروع کر دیا تھا۔ یہ مشنری بے حد شائستہ لوگ تھے، مگر بڑی عمر کے عاملوں نے فیصلہ کیا کہ ان کا اصل مقصد انھیں عیسائی بنانا ہے، چناں چہ لڑکیاں ایسے ان مہربانوں سے بچنے کے لیے چارپائیوں کے پیچھے چھپ جایا کرتیں۔ ایک ممتاز سندھی، اور انگریزی سندھی اور سندھی انگریزی لغات کے مرتب، پرمانند میوارام نے سچ مچ عیسائی مذہب اختیار بھی کر لیا تھا۔

اس سے بھی زیادہ سنگین چیلنج جدیدیت کے تھے۔ بمبئی، کلکتہ اور لندن کے ساتھ روابط نے ظاہر کر دیا تھا کہ سندھ کی حیثیت کھڑے ہوئے پانی کے تال سے زیادہ نہیں ہے۔ اس زمانے میں سندھی عورتیں پردے میں رہتی تھیں، بارہ بارہ برس کی مائیں عام دکھائی دیتی تھیں۔ نوجوان لڑکے تعلیم سے بے پیار گلیوں میں گھوما کرتے تھے۔ ہولی کے تیوہار پر بے تحاشا شراب پی جاتی اور جنم اشٹمی پر جوئے کھیلا جاتا، اور بدعادات کا زور تمام سال قائم رہتا تھا۔

سکھ مذہب، جو مسلمانوں کے دورِ حکومت کے آخری دنوں میں سندھی ہندوؤں کا سہارا رہا تھا، ان چیلنجوں کا سامنا نہ کر سکا۔ اس کی مقبولیت قائم رہی، تاہم یہ نئے چیلنجوں کا جواب نہ تھا۔ اور جواب پیدا کرنا ضروری تھا، کیوں کہ اس کے بغیر بقا اور ترقی ناممکن تھی۔

ان چیلنجوں کے جواب میں اُبھرنے والی سب سے ممتاز شخصیت حیدر آباد کے مکھی شوقی رام سدی رام آڈوانی کے بیٹے نول رائے (۹۳-۱۸۴۳) کی تھی۔ اپنی قابلیت، دیانت اور لگن کی بدولت انھوں نے کلرک کے منصب سے ڈپٹی کلکٹر کے عہدے تک ترقی کی جو اُس زمانے میں کسی ہندوستانی کے لیے اعلیٰ ترین عہدہ تھا۔ نول رائے نے گرونانک سے عقیدت رکھنے والے ہندوؤں کے ساتھ مل کر سکھ سبھا قائم کی۔ ۲۶ سال کی عمر میں انھوں نے کسی کو بتائے بغیر کلکتے جا کر کیشب چندر سین سے ملاقات کی۔ کلکتے کے مشاہدات، کیشب چندر کی گفتگو اور برہمو کمسوں کے مرکز بھارت آشرم کے تجربات میں سندھ کی تعمیرِ نو کے بارے میں نول رائے کے سب سوالوں کا جواب مل گیا۔ وہ سندھ میں ایک نئی بصیرت کے ساتھ واپس آئے اور یہاں ان کی کوششوں کا نتیجہ، رشی ڈیارام کے الفاظ میں، جدید سندھ کے معجزے کی صورت میں برآمد ہوا۔

نول رائے اور ان کے دوستوں نے سکھ سبھا کا نام بدل کر سندھ سبھا رکھ دیا، اور پورے جوش و خروش کے ساتھ لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم پر توجہ مرکوز کر دی۔ وہ برہمو تحریک سے وابستہ لوگوں کی زندگی اور تعلیمات سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ انھوں نے اپنے خرچ سے حیدر آباد میں شاندار برہمو مندر قائم کیا۔ انھوں نے اپنے چھوٹے بھائی ہیرانند (۹۳-۱۸۶۳) کو کلکتے بھجوا دیا جہاں وہ کیشب چندر کے گھر کے فرد کے طور پر رہے۔ وہاں ہیرانند کو شری رام کرشن پرم ہنس کی صحبت نصیب ہوئی۔

ہیرانند اپنی تعلیم مکمل کر کے ۱۸۸۳ میں کلکتے سے سندھ لوٹے۔ دونوں بھائیوں، نول رائے اور ہیرانند، نے سندھ میں ایک نئی روح پھونک دی۔ انھوں نے حیدر آباد میں یونین اکیڈمی قائم کی جو بعد

میں ان دونوں کے نام پر این ایچ اکیڈمی کے طور پر مشہور ہوئی۔ انھوں نے لڑکیوں کے لیے پہلا اسکول قائم کیا اور لکھنؤ سے دو گھوش بہنوں کو وہاں پڑھانے کے لیے بلوایا۔ ہیرانند نے اپنی دو بیٹیوں کو بانکی پور (بہار) شریمتی اگھور کامنی پرکاش رائے کی زیرِ نگرانی تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجا۔ سندھ میں سنسکرت کی تدریس پر خاص توجہ دی گئی۔ ان دونوں بھائیوں نے کراچی میں جذامیوں کا اسپتال اور شکارپور میں یتیم خانہ قائم کیا۔

انھوں نے کم عمری کی شادی، شراب نوشی، قمار بازی اور غلیظ زبان کے استعمال کے خلاف زبردست مہم چلائی جس نے سندھ کے معاشرے پر گہرے اثرات چھوڑے۔ بدقسمتی سے دونوں بھائی زیادہ دیر زندہ نہ رہے اور ۱۸۹۳ میں چند مہینوں کے عرصے میں چل بسے۔ لیکن انھوں نے معاشرے میں ایک نئی امید جگا دی تھی، اور ایسے نمونے قائم کر دیے تھے جن سے رہنمائی حاصل کی جا سکتی تھی۔

تاہم سندھ میں برہمو سماج کی مقبولیت نولرائے اور ہیرانند کی زندگی میں بھی مکمل نہ تھی۔ عموماً یہ اعتراض کیا جاتا تھا کہ برہمو دراصل نصف عیسائی ہیں۔ اس تاثر کو اس وقت تقویت بھی ملی جب ۱۸۹۲ میں اکیڈمی کے سنسکرت کے استاد بھوانی چرن سرجی نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا۔ اس سے پہلے ۱۸۷۵ میں سادھو نولرائے کے کشیر مذہبی موسیقی کے جلوس میں اللہ اکبر کے نعرے لگنے پر بھی اعتراض کیے جا چکے تھے۔ برہمو تحریک کے کئی حصوں، مثلاً پرارتھنا سماج، سادھارن سماج وغیرہ، میں تقسیم ہو جانے سے بھی نقصان پہنچا۔ لیکن اس سے بھی بڑا عنصر ہندوؤں کے مسلمان ہونے کے واقعات کی روک تھام اور ہندو دھرم کی عظمت کے پرچار میں تحریک کی ناکامی تھی، جس نے آزادی حاصل ہونے سے بہت پہلے ہی برہمو تحریک کی اہمیت میں خاصی کمی کر دی۔

برہمو سماج کے ان نقائص کا مداوا آریا سماج کے قیام میں دریافت کیا گیا۔ ۱۸۹۳ میں، جب کئی ممتاز عامل ہندو مسلمان ہونے کا ارادہ کر رہے تھے، ڈیارام کی قیادت میں متعدد ہندو رہنماؤں نے لاہور میں سوامی شردھانند کو بے تابانہ درخواستیں بھیجیں۔ پنجاب کے آریا سماج نے فوراً پنڈت لیکھرام آریا مسافر اور پنڈت پورنانند کو سندھ کے دورے پر بھیجا۔ ان دونوں مبلغوں نے ہندومت کے دفاع پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ اسلام اور عیسائیت کے بارے میں بے شمار اور ہر قسم کے ناخوشگوار سوالات اٹھانے شروع کر دیے۔ مولوی ان بین المذہبی مناظروں کے عادی نہ تھے۔ انھوں نے غصے میں آ کر لیکھرام کو قتل کرا دیا۔ بعد میں کچھ اور قتل بھی ہوئے۔ بہت سے ہندوؤں کو جو مسلمان ہو گئے تھے ___ جن میں سموگیوں کی پوری برادری شامل تھی ___ ان کے آبائی مذہب پر واپس لایا گیا۔ اس عمل کے دوران کئی مسلمان لڑکیوں نے بھی ہندو مذہب اختیار کر کے ہندوؤں سے شادی کر لی۔

اس نئے ماحول میں ہم جنس پرستی کی قدیم اور قبیح عادت کو بھی چیلنج کیا گیا۔ حیدرآباد کے ایک مقامی پیر ابوالحسن کا دل سگو نامی ایک نوعمر ہندو لڑکے پر آ گیا جو ڈراموں وغیرہ میں لڑکیوں کا پارٹ کیا کرتا تھا۔ ایک بار اس کی ریہرسل دیکھتے ہوئے پیر صاحب اپنی کھڑکی سے سگو! سگو! پکارتے ہوئے

نیچے گر پڑے۔ پیر کے ہلاک ہونے پر مقامی مسلمانوں کو اس قدر طیش آیا کہ انھوں نے مئی ۱۹۲۹ کے ایک دن بارہ بور کی بندوق سے دس ہندوؤں کو ٹھکانے لگا دیا۔ سندھ میں اس قسم کا واقعہ پہلے کبھی پیش نہیں آیا تھا۔ کئی دن بازار بند رہے۔ ایک پارسی انٹیلیجنس افسر سکھیا کو اس واقعے کی تحقیقات پر مامور کیا گیا۔ (سندھ میں جب کبھی کوئی ہندو مسلم تنازعہ پیدا ہوتا تو اسے نمٹانے کے لیے غیر جانبداری کے نقطۂ نظر سے کسی انگریز یا پارسی کو مقرر کیا جاتا۔) سکھیا نے بڑے جاگیرداروں اور مولویوں کی سازش کا پتا چلا لیا۔ لیکن ان کے خلاف کوئی اقدام نہ کیا گیا۔ ان کے بجائے کچھ جعلی ملزموں پر مقدمہ چلایا گیا، جو آخر بری ہو گئے۔ اصل قاتلوں کو کبھی پکڑا نہیں گیا۔

بالائی سندھ میں متعدد مسلمان ہریجن عورتوں کے گھروں پر جاتے اور انھیں قرض وغیرہ دے کر مسلمان ہونے پر راغب کر لیتے تھے۔ آریا سماجیوں کو ایک ترکیب سُوجھی انھوں نے ان ہریجن خاندانوں کو سوّر تحفے میں دے دیے۔ سوّروں کو دیکھ کر مسلمان وہاں سے دور رہتے اور سوروں سے ہونے والی آمدنی سے ہریجن قرض خواہوں کے محتاج ہونے سے بچ جاتے۔

جیسے کو تیسا کی حد تک تو آریا سماج نے سندھ میں ایسا مفید کردار ضرور ادا کیا۔ انھوں نے کوئی کالج یا بڑی تعداد میں اسکول نہیں کھولے، تاہم کئی جمنازیم اور کنیا پاٹھ شالائیں ضرور قائم کیں۔ برہماسماج کے برخلاف انھوں نے اونچے طبقوں کو متاثر نہیں کیا، البتہ عام سندھی ہندوؤں پر خاصا اثر ڈالا۔

دریں اثنا، برہمو سماج کے زوال کے بعد، ایک نئی تحریک نے سندھی ہندوؤں کے اونچے طبقے کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ یہ تھیوسوفیکل سوسائٹی تھی۔ اس نے بنیادی ہندو خیالات کو بین الاقوامی محاورے میں پیش کیا۔ تعلیم یافتہ ہندوؤں نے، جو اپنے مذہب کی قدر کرتے تھے مگر بین الاقوامیت کو بھی کم نہ سمجھنا چاہتے تھے، اس کا خاص طور پر خیر مقدم کیا۔ جیٹھ مل پرسرام اور جمشید مہتا جیسی ممتاز ہستیاں سندھ میں تھیوسوفی کے ستون بن گئیں۔ تھیوسوفیکل لاجوں نے دانشورانہ اور ثقافتی سرگرمی کے مرکزوں کی حیثیت اختیار کر لی۔ کراچی کی تھیوسوفیکل سوسائٹی کو دنیا بھر میں سب سے زیادہ سرگرم شاخ قرار دیا گیا۔ تھیوسوفی کی عالمگیر اپیل نے نہ صرف جمشید اور کوتوال جیسے ممتاز پارسیوں کو متوجہ کیا بلکہ مسلم دانشوروں، مثلاً جی ایم سید، حیدر بخش جتوئی اور اے کے بروہی، کو بھی اپنی طرف راغب کیا۔

تھیوسوفسٹوں نے ہندوؤں کے ساتھ مل کر عیسائیت کی راہ روکنے کا بھی کام کیا۔ دیوان ڈیارام نے عیسائیت کے نقائص پر پندرہ عالمانہ لیکچر دیے۔ ڈاکٹر اینی بیسنٹ نے سندھیوں سے اپیل کی کہ اپنے عقائد پر قائم رہیں۔ ہندومت چھوڑ کر عیسائی ہو جانے والے ریاسد کی ماں نے، بظاہر کسی کے اکسانے پر، سوال کیا: آپ ہندوؤں کو عیسائی مذہب اختیار نہ کرنے کی نصیحت کرتی ہیں، آپ نے خود عیسائیت چھوڑ کر ہندومت کیوں اختیار کیا؟ ڈاکٹر بیسنٹ نے برجستہ جواب دیا: کیوں کہ پچھلے جنم میں میں برہمن تھی۔

اس کے بعد کسی نے تبدیلیِ مذہب کا ذکر نہ سنا۔

روحانی احیا کی ایک اہم تحریک کی قیادت سادھو ٹی ایل واسوانی (۱۹۶۶ - ۱۸۷۹) نے کی۔ وہ ایک عظیم اسکالر تھے اور ڈی جے کالج (کراچی) اور ودیاساگر کالج (کلکتہ) میں استاد رہے۔ بعد میں وہ دیال سنگھ کالج (لاہور) وکٹوریہ کالج (کوچ بہار) اور مہندر کالج (پٹیالہ) کے پرنسپل رہے۔ مگر اسکالر سے زیادہ وہ ایک سنت تھے۔ انھوں نے ۱۹۱۰ میں برلن میں ہونے والے مذاہب کی عالمی کانگریس میں ہندوستان کی نمائندگی کی۔ جب انھوں نے دنیا ترک کرنے کا ارادہ کیا تو ان کی ماں نے مزاحمت کی۔ جب ۱۹۱۸ میں ان کی ماں کی وفات ہوئی تو انھوں نے اپنے ریشمی لباس چھوڑ کر سفید کھادی پہن لی اور پٹیالے کی ریاستی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ اب وہ دس روپے ماہانہ آمدنی پر گزر بسر کرنے اور ممتاز لوگوں کی محفلوں میں مذہبی موضوعات پر لیکچر دینے لگے۔ واسوانی نے دسرہ دوں کے قریب راج پور میں شکتی آشرم اور حیدر آباد میں لڑکوں کے لیے شکتی اسکول اور لڑکیوں کے لیے میرا اسکول قائم کیا۔

جب تقسیم ملک کا وقت قریب آیا تو سادھو واسوانی نے شاہ عبداللطیف کی درگاہ پر حاضری دی۔ انھوں نے کہا سندھ میں اس ریگستانی بھٹ (ٹیلے) سے زیادہ متبرک کوئی مقام نہیں۔ تقسیم ملک کے بعد کچھ مسلمان بھی دادا درویش سمجھ کر ان کا احترام کرنے لگے، مگر دوسرے مسلمانوں کو پاکستان میں ہندوؤں کے مذہبی مرکز کی موجودگی پسند نہ آئی۔ قائد اعظم جناح کی وفات پر سادھو واسوانی نے خصوصی عبادت کی اور اس کے بعد معمول کے مطابق گرنتھ پرشاد بانٹا، جس پر مسلمان جنونیوں نے مشہور کر دیا کہ انھوں نے قائد اعظم کے مرنے پر خوشی منائی ہے۔ حیدر آباد کے ہمدرد مسلمان کلکٹر نے کہا کہ ان کی زندگی اتنی قیمتی ہے کہ اسے کسی مسلمان مذہبی جنونی کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ ۱۰ نومبر ۱۹۴۸ کو وہ سندھ سے رخصت ہو گئے۔ کچھ ہی عرصے بعد انھوں نے پونا میں میرا اسکول اور کالج قائم کیا۔

انیس سو تیس کی دہائی کے آخری برسوں میں جس غیر معمولی تحریک نے پورے ہندوستان میں — بلکہ جاپان میں بھی — شہرت حاصل کی وہ اوم منڈلی تھی جسے برہماکماریوں کی تنظیم بھی کہا جاتا تھا۔ یہ سماجی مذہبی تنظیم دادا لیکھراج کرپالانی (۱۹۶۹ - ۱۸۷۶) نے قائم کی تھی جو اس سے پہلے کلکتے میں سنار کا کام کرتے تھے۔ اوم منڈلی کی طرف راغب ہونے والوں میں بیشتر عورتیں تھیں، اور وہ بھی صرف حیدر آباد کی بھائی بند ہندو تاجر برادری کی عورتیں۔ ان میں جو غیر شادی شدہ تھیں انھوں نے شادی سے انکار کر دیا، اور جو شادی شدہ تھیں انھوں نے اپنے شوہروں کو دوسری شادی کی تحریری اجازت دے دی۔ اوم منڈلی کے بارے میں بسر رم سے لے کر عیش و عشرت تک کی بے شمار کہانیاں گردش کرنے لگیں۔ کانگریس اور آریاسماج نے یہ کہہ کر اوم منڈلی کی مذمت کی کہ اس سے گھروں کا سکون برباد ہو رہا ہے۔ آخر ہندو رائے عامہ کے سخت دباؤ پر حکومت سندھ نے ہچکچاتے ہوئے اوم منڈلی پر پابندی لگا دی جس نے عدالت سے رجوع کر کے اس حکم کو غیر موثر کرا دیا۔ وقت نے ثابت کیا ہے کہ اوم منڈلی

ایک حقیقی سماجی اور مذہبی تحریک تھی۔ بھائی بند برادری کی عورتیں بظاہر ایسی گہری مذہبیت کی بنا پر اس کی طرف راغب ہوئیں۔ لیکن ایک عنصر یہ بھی تھا کہ اُن کے مرد چھ مہینے حیدر آباد میں گزار کر کاروبار کے سلسلے میں تین برس کے لیے ہانگ کانگ سے ہونولولو تک دنیا بھر میں نکل جاتے تھے۔ اوم منڈلی نے ان کی زندگیوں کے اس خلا کو پُر کیا۔

سندھ اب ایک باقاعدہ باغ بن چکا تھا جس میں قسم قسم کے پرندے اپنے نغمے بکھیر رہے تھے۔ لیکن جس تحریک نے سندھ میں بیچ بیچ طوفان برپا کر دیا وہ راشٹریہ سویم سیوک سنگھ (RSS) تھی۔ اسے سیالکوٹ کے راجپال پوری (۱۹۱۷-۷۷) نے سندھ میں قائم کیا جنھیں احتراماً شری جی کہا جانے لگا تھا۔ آر ایس ایس کے قیام سے پہلے سندھ میں سنگھ، سنگٹھن اور سنسکرتی کے لفظ بالکل اجنبی تھے۔ بہت سے سندھی پہلے پہل سنگھ کو سنگ کہا کرتے تھے۔ بہرحال، ۱۹۴۲ تک آر ایس ایس صوبے کے کونے کونے میں پہنچ چکی تھی۔

آر ایس ایس کے بانی ڈاکٹر ہیڈگےوار نے شہری مرد آبادی کے تین فیصد، اور دیہی مرد آبادی کے ایک فیصد، کو تنظیم میں شامل کرنے کا ہدف مقرر کیا تھا۔ سندھ واحد صوبہ تھا جس نے یہ ہدف پورا کیا۔ ۱۹۴۳ سے ۱۹۴۷ تک کے عرصے میں شری گروجی کا سالانہ دورۂ سندھ صوبے کی عوامی زندگی کے بڑے واقعات میں شمار ہونے لگا۔ ہر دورے میں وہ مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی ممتاز شخصیات سے ملاقات کیا کرتے جن میں سادھو واسوانی اور رنگا ناتھ آنند جیسے مذہبی رہنما، ڈاکٹر چوئتھ رام، پروفیسر گھنشیام اور پروفیسر ملکانی جیسے کانگریسی لیڈر، لالجی مہروترا، شورتن موہٹا، بھائی پرتاپ جیسے عوامی زندگی میں سرگرم تاجر، ہیچل داس وریرانی، ڈاکٹر ہیمنداس وادھوانی اور لکھمی گوبندرام جیسے وررا کے علاوہ ممتاز وکلا اور ماہرینِ تعلیم شامل تھے۔

آر ایس ایس نے عاملوں اور بھائی بندوں، حیدر آبادیوں اور غیر حیدر آبادیوں، شہریوں، نیم شہریوں اور دیہاتیوں، ساتمیوں، برہموسماجیوں اور آریاسماجیوں کے مابین تمام فاصلے مٹا دیے۔ کانگریسی اور مہاسبھائی دونوں خیالات کے حامل گھرانوں کے لڑکے ساتھ کھیلتے اور بھگوا دھواج کو سلامی دیتے دیکھے جانے لگے۔ آر ایس ایس نے سندھی ہندوؤں کو اور زیادہ ہندو بنا دیا۔ پہلے ۹۰ فیصد لڑکے فارسی کا مضمون لیا کرتے تھے، آر ایس ایس کی آمد کے بعد ۹۵ فیصد طلبا سنسکرت کا انتخاب کرنے لگے۔ بہت سوں نے سندھی کی جگہ ہندی پڑھنی شروع کر دی، کیوں کہ ان کا کہنا تھا کہ سندھی تو وہ جانتے ہی ہیں۔ آر ایس ایس نے سندھ کے ہندو نوجوانوں میں سیاسی اور انقلابی تحرک پیدا کیا۔ بھارتیہ سندھو سبھا کے صدر جے ٹی وادھوانی اور بمبئی کی وویکا نند ایجوکیشن سوسائٹی کے بانی جشو آڈوانی نے اپنی عوامی زندگی آر ایس ایس ہی سے شروع کی۔ بھارتیہ مزدور سنگھ کے صدر منہر مہتا بھی سندھ آر ایس ایس کی پیداوار ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر لعل کرشن آڈوانی جیسا جوہر بھارتی سیاست کو سندھ آر ایس ایس کا تحفہ ہے۔

رہموسماج سے آرایس ایس تک، ان تمام تحریکوں نے سندھ کو ایک حقیر گوشے سے منقلب کر کے ایک چھوٹے مگر اہم صوبے کی حیثیت عطا کر دی۔ اور انھیں تحریکوں نے تحریکِ آزادی کا جوش اور ولولہ پیدا کیا۔

***

۴

نادرشاہ نے تو ملک کو ایک بار لوٹا تھا۔ مگر انگریز ہمیں ہر روز لوٹتے ہیں۔ ہر سال پینتالیس لاکھ ڈالر کے مساوی رقم ہمارا خون چوس کر ملک سے باہر بھیج دی جاتی ہے۔ انگلستان کو ہندوستان سے فوراً نکل جانا چاہیے۔ یہ عبارت ۲۰ مارچ ۱۸۸۴ کے سندھ ٹائمز، کراچی، میں شائع ہوئی ـــ انڈین نیشنل کانگریس کے قیام سے ایک برس اور گاندھی جی کو ہندوستان چھوڑدو تحریک کا خیال آنے سے پورے ۵۸ سال پہلے!

تقسیمِ بنگال اور اس کے زیرِ اثر شروع ہونے والی سودیشی تحریک نے سندھ میں آزادی کی ہلچل کو بہت بڑھا دیا۔ ۱۹۰۸ میں جب کھدی رام بوس کو پھانسی ہوئی تو تمام محبِ وطن گھرانوں میں اس کی تصویر لگائی گئی۔ اسی سال سکھر اور حیدرآباد میں سودیشی اسٹور کھلے اور سکھر میں آل سندھ پولیٹیکل کانفرنس منعقد ہوئی۔

۱۹۰۷ میں ڈی جے کالج کراچی کے پرنسپل جیکس نے کہا "تم ہندوستانی جھوٹ بولتے ہو!" تو چند ممتاز طالبعلموں جیوت، جواہر اور مارائن نے احتجاجاً کالج چھوڑ دیا اور بڑودا اور بنارس ہجرت کر گئے۔ بعد میں یہ تینوں آچاریہ جے بی کرپالانی، سوامی گووندانند اور پروفیسر ایس آر ملکانی کے طور پر مشہور ہوئے۔ شکارپور کی پریتم دھرم سبھا کا شائع کردہ لٹریچر اس درجہ انقلابی پایا گیا کہ ۱۹۰۹ میں سیٹھ چیتومل، ویرومل بیگراج اور گووند شرما کو پانچ سال قید بامشقت کی سزا سنائی گئی۔ جج لوئیڈ نے اپنے حکم میں کہا "یہ نوجوان ایک مذہبی تنظیم کے رکن ہیں، جہاں جہاں عوام پر ان کا اثر بہت زیادہ ہے۔ ان کی تحریریں اور سرگرمیاں اس قدر باغیانہ ہیں کہ انھیں سزائے موت دی جانی چاہیے۔ لیکن ان کی کم عمری کو دیکھتے ہوئے میں انھیں ہلکی سزا دے رہا ہوں۔"

۱۹۱۰ میں حیدرآباد میں برہمچاریہ آشرم قائم کیا گیا جس کا مقصد نہ صرف موسیقی، ڈرامے اور جسمانی تربیت کے ذریعے سے محبِ وطن نوجوان پیدا کرنا تھا بلکہ روپوش انقلابی کارکنوں کو پناہ دینا بھی تھا۔ ڈاکٹر چوئتھرام، سوامی حلارام، پنڈت دین دیال وجیستی اور سوامی ستیہ دیو نے پورے سندھ کا دورہ

کیا اور گنور کھشا کے نام پر پٹیل صاحب کو گرو سلام گاگا کر رسماچاریہ آشرم کے لیے تین ہزار روپے چندا جمع کیا۔

بابا گردت سنگھ کے سر پر چالیس ہزار روپے کا انعام تھا۔ انھوں نے کینیڈا کو اجتماعی ہجرت کرنے کے لیے جاپانی جہاز کوماگاتامارو کرائے پر حاصل کیا تھا مگر وہاں لنگرانداز ہونے کی اجازت نہ ملنے پر جہاز واپسی کا سفر کر کے کلکتے بھیجا۔ کلکتے میں بھی مسافروں کو اترنے کی اجازت نہ دی گئی جس پر فائرنگ کا واقعہ پیش آیا تھا جس میں کئی افراد ہلاک ہوئے تھے۔ گردت سنگھ کو تین سال تک سندھ میں بہ حفاظت روپوش رکھا گیا۔ اسی جہاز کے معاملے میں گووِند آنند کو پانچ سال قید بامشقت کی سزا ملی۔

۱۹۱۴ کی ایک نصف شب کو ایک بے حال مسلمان، پیٹ کے درد سے کراہتا، ریل گاڑی میں سوار کوٹری سے حیدر آباد کے لوک رام شرما کے مکان پر پہنچا۔ اس کے مکان کے اندر پہنچنے کے بعد سب پر انکشاف ہوا کہ یہ کوئی اَور نہیں، مشہور انقلابی رش بہاری بوس ہیں جنھوں نے ۱۹۱۲ میں چاندنی چوک دہلی میں لارڈ ہارڈنگ پر بم پھینکا تھا۔ اُس روز رش بہاری بوس، لوک رام شرما اور ان کے بھائی وِشنو شرما دہلی کے ایک ہی مکان میں رہے تھے۔ ڈاکٹر چوئتھ رام نے کچھ رقم کا بندوبست کیا تاکہ رش بہاری امرتسر جا سکیں اور وہاں سے افغانستان ہوتے ہوئے جاپان پہنچ سکیں۔

اس سے پہلے جنوبی افریقا میں گاندھی جی کی تحریک کے سلسلے میں شکارپور سے دس ہزار روپے کا عطیہ بھیجا گیا تھا۔ سندھ سے مادام کاما کے لیے بھی برابر مالی امداد بھیجی جاتی رہی جو پیرس میں رہ کر ہندوستان کی آزادی کے لیے کام کر رہی تھیں۔

جب مسز اینی بیسنٹ کانگریس کی صدر بنیں تو انھوں نے ممتاز قوم پرست مسلمان غلام محمد بھرگڑی کو پارٹی کا سیکرٹری مقرر کیا۔ ۱۹۱۹ میں محبِ وطن رائے عامہ کو ابھارنے کے لیے سندھ سے روزنامہ ہندو کی اشاعت شروع ہوئی۔

پہلی جنگ عظیم کے دنوں میں جب گاندھی جی بھرتی کے میلوں سے خطاب کر رہے تھے، نواب شاہ کے ڈاکٹر تلجارام کھلنانی نے جنگی قرضے کے بانڈ کے خلاف عوامی مہم چلائی۔

جب گاندھی جی نے رولٹ ایکٹ کے خلاف تحریک چلانے کی کال دی تو جیٹھمل پرسرام نے، جو باقاعدہ تھیوسوفسٹ تھے، لوگوں سے صعوبت اور قربانی کی راہ اختیار کرنے کو کہا، جس پر انھیں دو سال قید بامشقت کی سزا دی گئی۔ ۱۷ مارچ ۱۹۲۲ کو جب پرنس آف ویلز نے کراچی کا دورہ کیا تو کوئی شخص خیرمقدم کرنے کے لیے نہ گیا۔ پورے شہر میں دکانیں بند تھیں، کہیں سگریٹ یا چائے کی پیالی بھی نہ مل سکتی تھی۔ کراچی نے اُس وقت بھی تاریخ ساز کردار ادا کیا جب بھارتی کرشن تیرتھ پر مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور سیف الدین کچلو کے ساتھ ۲۶ ستمبر ۱۹۲۱ سے ۴ نومبر ۱۹۲۲ تک کراچی سازش کے سلسلے میں خالق ڈِنا ہال میں مقدمہ چلایا گیا۔

۳۲- ۱۹۳۰ کی ستیہ گرہ تحریک بھی سدھ میں بہت کامیاب رہی۔ ہر قصبے میں لوگ گھوم پھر کر بدیسی کپڑے جمع کرتے، انھیں گدھوں پر لادتے اور پھر ان کے ڈھیر کو آگ لگا دیتے، جس سے جوش میں آ کر کئی لوگ اپنے ہیٹ بھی آگ میں اچھال دیتے۔ جیکب آباد کے ایک مسلماں کساں کے پاس چندے میں دینے کو اپنی لاٹھی کے سوا کچھ نہ تھا ـــ اس لاٹھی کو نیلام کیا گیا، اور اس سے ڈھائی سو روپے ملے۔

پہلی بار سدھ کی عورتیں اپنے گھروں کی چہاردیواری سے نکل کر جلوسوں اور دھرنوں میں شریک ہوئیں۔ جلد ہی کراچی اور حیدر آباد نے بمبئی پریذیڈنسی میں تحریک کے اہم ترین مراکز کی شکل اختیار کر لی۔ اُس وقت سدھ کی آبادی چالیس لاکھ سے کم تھی جس میں ہندوؤں کا تناسب ۳۰ فیصد تھا، اور صرف وہی اس تحریک میں حصہ لے رہے تھے۔ اس کے باوجود ۱۹۳۰ میں جیل جانے والوں کی تعداد ۷۲۴ تھی۔

اپنے گم کردہ راہ جوش میں سدھ کانگریس نے ۱۹۳۱ کی مردم شماری کے کام کا بائیکاٹ کرنے تک کا فیصلہ کر ڈالا۔ صرف امید ہی کی جا سکتی ہے کہ زیادہ لوگوں نے اس بائیکاٹ کی پیروی نہیں کی ہو گی۔

کراچی میں ہونے والی فائرنگ میں دتاتریہ مانے اور میگھراج ریواچند ہلاک ہوئے اور جے رام داس دولت رام کی ران میں گولی لگی۔ گاندھی جی نے ۳۰ اپریل ۱۹۳۰ کو اپنے تار میں کہا: جیرامداس خوش قسمت ہیں۔ زخمی ران جیل سے بہتر ہے۔ زخمی دل اس سے بھی بہتر ہے۔ جیل میں ہفتہ وار معائنے کے دوران جیرامداس جیسے شخص سے بھی توقع کی جاتی تھی کہ لنگوٹی پہن کر سامنے آئے اور جھک کر سرکار، سلام! کہے۔ انھوں نے ایسا کرنے سے انکار کیا، جس کے نتیجے میں انھیں بیڑیاں ڈال کر قیدِ تنہائی میں رکھا گیا۔ جیرامداس کے زخمی ہونے کے واقعے نے برطانوی پارلیمنٹ میں بھی گونج پیدا کی۔ ایک ممبر نے سوال کیا کہ عاملوں جیسی برادری جو سرکاری ملازمت میں اس قدر وفاداری سے خدمات انجام دے رہی ہے، اُس کے ایک ممتاز رکن کس باعث تحریکِ آزادی میں شامل ہوئے۔ سیکرٹری ہند نے نہایت افسوس کے ساتھ کہا کہ اسے اس پر تعجب ہے۔ اُس کا تعجب اس وقت اَور بڑھ گیا ہو گا جب ایچ بی شِودا سانی، آئی سی ایس، نے قومی تحریک کی حمایت میں اپنی اعلیٰ ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔

۱۹۳۰ کی ستیہ گرہ تحریک کا اختتام گاندھی اروِن معاہدے پر ہوا جس کے بعد مارچ ۱۹۳۱ میں کانگریس کا کراچی سیشن منعقد ہوا۔ اس کا بندوبست محض تین ہفتوں کی مدت اور نوے ہزار روپے کے خرچ سے کیا گیا۔ یہ اجلاس اُس ٹکری (پہاڑی) پر منعقد کیا گیا جہاں آج جناح کا مزار ہے۔ اجلاس کے انتظامات کی مہادیو دیسائی اور گاندھی جی نے بے حد تعریف کی۔

لیکن دو المناک واقعات نے اس اجلاس کو اداس کر دیا۔ اجلاس سے ذرا پہلے انگریزوں نے اپنی قوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بھگت سنگھ کو پھانسی دے دی۔ جٹ کا پور کے مسلمانوں نے بھگت سنگھ کی

شہادت کے احترام میں دکانیں بند کرنے سے انکار کیا تو وہاں تشدد کے واقعات پیش آئے اور ان ہنگاموں میں یوپی کی صوبائی کانگریس کے صدر اور روزنامہ "پرتاپ" کے ایڈیٹر کی جان ضائع ہوئی۔ ان واقعات کے باعث گاندھی جی کا کراچی کے سفر کے دوران ہر اسٹیشن پر کالے جھنڈوں اور "واپس جاؤ" کے نعروں سے استقبال کیا گیا۔ درحقیقت انہیں ڈرگ روڈ کے اسٹیشن پر ٹرین سے اتار لیا گیا تاکہ کراچی شہر میں غضبناک ہجوم انہیں نقصان نہ پہنچا دیں۔ انہوں نے ہجوم سے خطاب کرتے ہوئے اپیل کی کہ کانگریس کے اجلاس میں رخنہ نہ ڈالیں اور سندھ کے کارکنوں کے کیے ہوئے شاندار کام کو ضائع نہ ہونے دیں۔ اس کے بعد کانگریس کا کراچی سیشن پُرامن طور پر مکمل ہوا۔ اس اجلاس کی ایک خاص بات یہ تھی کہ اس میں سرحد کے سرخ پوشوں نے خان عبدالغفار خان کی سرکردگی میں پہلی بار شرکت کی۔

۳۲-۱۹۳۰ کی تحریک کے نتیجے میں کانگریس نے ۱۹۳۷ کے انتخابات میں ۶۰ میں سے سات نشستیں حاصل کیں۔

۱۹۴۲ کی تحریک میں سندھ کی کارکردگی پنجاب سے بہتر رہی۔ اس میں دو نوجوان زندگیاں ضائع ہوئیں۔ ایک ہیموں کالانی، جسے ریل کی پٹریاں اکھاڑتے ہوئے پکڑا گیا اور دوسرا ہرل جیوتانی، شاعر، جسے کوڑے لگائے گئے اور وہ جلد ہی چل بسا۔ وزیراعظم اللہ بخش کانگریس سے بہت قریب تھے، اور اس کی سرگرمیوں میں شریک ہونے کے باعث انہیں برطرف کر دیا گیا اور جلد ہی وہ پُراسرار حالات میں قتل کر دیے گئے۔ سندھ اس المیے سے کبھی سنبھل نہ سکا، اور اس واقعے سے تقسیمِ ملک کی راہ ہموار ہوئی حالانکہ ۱۹۴۶ کے انتخابات میں کانگریس نے ۲۲ نشستیں حاصل کی تھیں۔

یہ سندھ میں تحریک آزادی کا مختصر سا خاکہ تھا۔ اس تحریک کے دوران سندھ سے بےحد اہم رہنما سامنے آئے۔ آچاریہ کرپالانی (۱۹۸۲-۱۸۸۸) نے ساٹھ سالہ تاریخی دور میں نمایاں کردار ادا کیا۔ جیرامداس دولت رام عالمچندانی (۱۹۷۸-۱۸۹۱) سندھ کے کانگریسیوں میں گاندھی کے سب سے نمایاں پیروکار تھے۔ انہوں نے کچھ عرصے "ہندوستان ٹائمز" کے ایڈیٹر کے طور پر کام کیا اور بعد میں کانگریس کے جنرل سیکرٹری بنے۔ آزادی کے بعد جیرامداس نے گورنر بہار، مرکزی وزیرِ خوراک اور گورنر آسام کی حیثیتوں میں خدمات انجام دیں اور گاندھی کی تحریروں کی کلیات مرتب کی۔

ڈاکٹر چوئتھرام (۱۹۵۷-۱۸۸۹) نے جواہر لعل نہرو کو اس بات پر قائل کیا کہ پاکستان سے آنے والے مہاجروں کو ان کے نقصانات کا معاوضہ ادا کیا جائے۔ ان کے علاوہ آچاریہ اے ٹی گڈوانی، پروفیسر گھنشیام شِوداسانی، ہرچندرائے وشنداس ہروانی، جمشید مہتا (جو کانگریس کے رکن نہ تھے مگر ۱۹۳۷ کے انتخابات میں کانگریس کے ٹکٹ پر دادو کی نشست پر کامیاب ہوئے، انہیں جدید کراچی کا معمار کہا جاتا ہے) اور ایس آر ملکانی بھی کانگریس کی اہم شخصیات میں شامل تھے۔ خواتین میں آچاریہ گڈوانی کی اہلیہ گنگا بہن، آچاریہ کرپالانی کی ہمشیرہ لیکی بہن، کوڑومل کی بہو اسی کھلنانی اور کماری جیٹھی سپاہیملانی نے سندھ کی عوامی زندگی میں اہم کردار ادا کیا۔

۵

سندھ میں مسلمان حکمرانوں کے دورِ حکومت میں ہندوؤں کی بقا کا ایک اہم عنصر پنجاب میں سکھ مذہب کا عروج تھا۔ مسلمانوں کی طویل حکمرانی کے دوران سناتن دھرم فرسودہ اور کمزور ہو چکا تھا؛ سکھ مذہب سندھ کے ماحول میں تازہ ہوا کا جھونکا بن کر آیا۔ کہا جاتا ہے کہ گرو نانک نے اپنے طول طویل سفر کے دوران شکارپور کا بھی دورہ کیا تھا۔ سندھ کا ایک شخص کنہیالال مغلوں کے خلاف لڑائی میں گرو گوبند سنگھ کے ساتھ شریک تھا جنھوں نے اسے میدانِ جنگ میں زخمیوں کو پانی پلانے پر مامور کیا تھا۔

مہاراجا رنجیت سنگھ نے نانک سنگھ نامی ایک شخص کے ہاتھ گرو گرنتھ صاحب کا ایک نسخہ ہاتھی کی پیٹھ پر رکھوا کر حیدرآباد بھیجا تھا۔ میروں نے عمارت کے لیے جگہ فراہم کی اور یوں حیدرآباد کا مشہور اکال بُنگا گردوارہ وجود میں آیا۔

برطانوی حکومت کے قیام کے ساتھ مسلمانوں سے کیا جانے والا ترجیحی سلوک ختم ہو گیا اور ہندوؤں کو بھی برابر کے مواقع ملنے لگے۔ ان موقعوں سے ہندوؤں نے مسلمانوں کی نسبت زیادہ فائدہ اٹھایا کیوں کہ ان کا مزاج تعلیم اور تجارت کے لیے پہلے ہی سے سازگار تھا۔ جلد ہی وہ ملازمتوں، پیشوں، تجارت اور صنعت پر چھا گئے۔ سندھی ہندو شروع ہی سے غیرملکوں کے ساتھ تجارت کیا کرتے تھے۔ شاہ لطیف نے اپنی شاعری کا ایک خوب صورت حصہ سُر سامونڈی لنکا، جاوا اور چین کو جانے والے سالانہ تجارتی قافلوں کے ذکر کے لیے وقف کیا ہے۔ ۱۸۶۹ میں نہر سویز کے کھلنے سے اس تجارت کو زبردست فروغ ملا۔

جس وقت انگریزوں نے سندھ پر قبضہ کیا، تب ہندوؤں کے پاس زمین کی ملکیت نہ تھی۔ انگریزوں نے ریٹائر ہونے والے سرکاری ملازموں کو زمینیں دیں، جن میں بیشتر ہندو تھے۔ دولت مند کاروباری ہندوؤں نے بازار کے نرخ پر زمینیں خریدیں۔ خستہ حال ہوتے ہوئے مسلمان زمیندار ہندوؤں کے پاس زمینیں رہن رکھواتے، اور قرض ادا نہ ہونے کی صورت میں زمینیں قرض خواہوں [illegible] برطانوی حکومت کے سو برس میں ہندوؤں نے سندھ کی تقریباً ۴۰ فیصد زمینوں کی ملکیت حاصل کر لی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے علاوہ ۲۰ فیصد زمینیں ان کے پاس گروی تھیں۔ کچھ مسلم لیگی لیڈروں، خصوصاً سر عبداللہ ہارون، نے اسے ایک بڑا مسئلہ بنا کر پیش کیا۔ سائیکلوں کی مرمت سے عملی زندگی کا آغاز کر کے کروڑپتی کی حیثیت تک پہنچنے والے ان صاحب کو سندھ کی ۳۰ فیصد آبادی (ہندوؤں) کے ۴۰ فیصد زمین کا مالک ہونے پر اعتراض تھا۔ انھیں وہ ناانصافی دکھائی نہ دیتی تھی جب مسلمانوں کے دورِ حکومت میں ان ۳۰ فیصد لوگوں کے پاس ایک ایکڑ بھی زمین نہ تھی۔ بہرکیف، بعض دوسرے مسلمان رہنماؤں کے خیال میں ہاری، مسلمان زمینداروں کے مقابلے میں ہندو زمینداروں سے خوش تھے، اور مسلمان زمیندار

خاص طور پر تعلیم کے خلاف تھے کیوں کہ انھیں خطرہ تھا کہ تعلیم یافتہ ہاریوں کی اگلی نسل اپنے حقوق کا مطالبہ کرے گی۔

زمین کی ملکیت کے ہندوؤں کی جانب منتقل ہونے کے دو بڑے سبب تھے۔ ایک تو یہ کہ صدیوں زمین کی ملکیت سے محروم رہنے والے ہندوؤں میں زمین کے لیے ایک قدرتی چاہ تھی، اور جب انھیں موقع ملا تو انھوں نے بڑھ چڑھ کر زمینیں حاصل کیں۔ دوسرے یہ کہ مسلمانوں کی فضول خرچی کی عادت ہندوؤں کی کفایت شعاری کے بالکل متضاد تھی۔ مسلمان اپنی حیثیت سے بڑھ کر خرچ کرنے پر آمادہ رہتے تھے، ہندو بچانے اور سرمایہ کاری کرنے کے عادی تھے۔ ایک مقبول کہاوت تھی کہ جب ہندو کے پاس دولت آتی ہے تو وہ ایک کے بعد ایک مکان خریدتا ہے، اور مسلمان دولت مند ہوتا ہے تو ایک کے بعد ایک حور حاصل کرتا ہے۔

تجارت کے معاملے میں مسلمان روایتی طور پر پس ماندہ تھے۔ مغل اور انگریز دونوں نے تجارت کے شعبے میں ہندوؤں کی برتری کا اعتراف کیا ہے۔ کچھ مسلمان لیڈروں نے مسلمانوں کے حالات میں بہتری لانے کی کوشش کی۔ جی ایم سید نے انھیں شادی کی تقریبات پر فضول خرچی سے باز رہنے اور شلوار اور پگڑی کو بھی بیس گز سے کم کر کے تین چار گز پر لانے کی تلقین کی۔ انھوں نے مسلمانوں سے سال میں صرف ایک بار نہانے کی عادت بدلنے کی بھی استدعا کی۔ سندھ صوبائی مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے انھوں نے مسلمانوں کو تجارت کی طرف راغب کرنے کے لیے باقاعدہ تحریک چلائی۔ لیکن ان عادتوں کے بدلنے میں وقت لگتا ہے۔ جیسا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کا کہنا ہے، ٹھیک طرح جوتا پہننا سیکھنے میں پوری ایک نسل کا عرصہ لگتا ہے۔

پیر حسام الدین راشدی نے مسلمان معاشرے میں پاکیزگی اور عیاشی دونوں معاملوں میں انتہاپسندی کا خوب مضحکہ اڑایا ہے۔ ایک جانب تو پردے کی اس قدر سختی کہ حاملہ عورت کو زنانے میں داخل نہ ہونے دیا جاتا، کہ مبادا اس کے پیٹ میں لڑکا ہو اور اُس کی نظر پردہ نشیں بیبیوں پر پڑ جائے۔ اور دوسری طرف ان بیبیوں کے مردوں کو کوئی حسین عورت دکھائی دے جائے تو وہ ایک ہاتھ سے اپنی مونچھوں پر تاؤ دے کر دوسرے ہاتھ سے اپنے اعضا سہلانے لگیں!

مسلمان معاشرے کی پسماندگی کا ایک بڑا سبب ملاؤں کا طبقہ تھا۔ ان میں سے اکثر بے علم اور جنونی تھے۔ مذہب سے بے خبر ہونے کے باعث وہ بیشتر وقت غیر اہم مسئلوں میں اُلجھے رہتے۔ ایک ملا حقے کو غیر اسلامی قرار دیتا تو دوسرا نسوار کو عین اسلامی بتلاتا۔ ان کے درمیان ان موضوعات پر طویل بحثیں ہوا کرتیں کہ داڑھی رنگنے کے لیے سرخ رنگ جائز ہے یا سیاہ، نماز ہاتھ باندھ کر پڑھی جائے یا ہاتھ کھول کر، اور اگر ہاتھ باندھے جائیں تو انھیں ناف سے اوپر رکھا جائے یا نیچے۔ پروفیسر ہوتچند گربخشانی نے شاہ کے کلام کا ایک شاندار ایڈیشن مرتب کیا جسے آج تک کلاسیک کا درجہ حاصل ہے۔ مگر مولانا عطائی نے اسے اس بنا پر مسترد کر دیا کہ بھلا کوئی ہندو (تکثیر پرست) ایک مسلمان (توحید پرست) کی روح کو کیوں کر

سمجھ سکتا ہے!

برطانوی دورِ حکومت میں ہندوؤں نے ڈرامائی ترقی کی۔ شروع ہی سے ہندوؤں کی تعلیم یافتہ ذاتیں — برہمن، بنیے اور کائستھ — ہندو مذہب پر قائم رہی تھیں اور صرف زمینداروں، کاشتکاروں، کاریگروں اور سپاہیوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ جہاں جہاں ذات کا فرق مذہبی فرق کے باعث اور بڑھ گیا۔ اس امر نے کہ اونچی ذات اور اونچے طبقے کے ہندو شہری (urban) بھی تھے، اس خلیج میں اور اضافہ کر دیا۔ یہ بات بہت سے مسلمانوں کے لیے تشویش کا باعث بنی۔ محمد ایوب کھوڑو نے کہا آج ہم مسلمان عورتوں کو ہندوؤں کے گھروں میں برتن مانجھتے دیکھتے ہیں۔ میں اُس دن کا منتظر ہوں جب ہندو عورتیں مسلمانوں کے گھروں میں برتن مانجھ رہی ہوں گی۔ لیکن جی ایم سید نے، جو مسلم لیگ کے ساتھ اپنے تلخ تجربے کے باعث رنجیدہ مگر زیادہ دانشمند ہو گئے تھے، کہا مسلمانوں کی پسماندگی کے لیے ہندوؤں کو ذمے دار کیوں ٹھہرایا جائے؟ ہر صبح جب ہندو لڑکے نہا دھو کر اسکول جا رہے ہوتے ہیں، غلیظ مسلمان لڑکے گلیوں میں گولیاں کھیلتے دکھائی دیتے ہیں۔

سندھ میں ہندو مسلمان، شیعہ سنی امن سے رہا کرتے تھے۔ سکھر ضلعے کے سوا فرقہ وارانہ تشدد کا کہیں نشان نہ تھا۔ پورے ہندوستان کو لپیٹ میں لے لینے والے طوفان کے نتیجے میں سندھ پاکستان کا حصہ بن گیا اور بیشتر ہندوؤں کو سندھ سے نکلنا پڑا۔ اس کے باوجود یہ امر اطمینان کا باعث ہے کہ ان میں مخالفانہ جذبات پیدا نہ ہوئے۔ بہت سے سندھی مہاجرین اپنے ساتھ سندھو جل اور سندھ کی تھوڑی سی مٹی تبرک کے طور پر لائے۔ ممتاز سندھی صحافی پیر حسام الدین راشدی لکھتے ہیں درحقیقت سندھ کو بنانے والے، اسے سجانے سنوارنے والے ہندو ہی تھے۔ انھوں نے دنیا کے کونے کونے سے دولت کما کر سندھ کو مالامال کیا۔ انھوں نے بڑے بڑے مکان بنائے۔ آج ہم ان مکانوں کی ٹھیک سے دیکھ بھال تک نہیں کر پاتے۔ آگے چل کر لکھتے ہیں سندھ کے اصل مالک ہندو تھے۔ تعلیم، ملازمتیں، بیوپار، زمینیں، سب انھیں کی تھیں۔ انھیں شکایت ہے کہ ہندوؤں نے مسلمانوں کے ساتھ مہربان بڑے بھائی کا سا برتاؤ نہیں کیا۔ ممکن ہے وہ ٹھیک کہتے ہوں، شاید ہندوؤں کو مسلمانوں کے لیے اور زیادہ کام کرنا چاہیے تھا۔ مگر ہندوؤں کے قائم کیے ہوئے اسکول، کالج، اسپتال اور دوسرے ادارے مسلمانوں کے لیے کھلے ہوئے تھے۔ اس کے برعکس، مسلمان دولت مند زمینداروں نے کبھی کسی کے لیے کچھ نہ کیا — نہ ہندوؤں کے لیے اور نہ مسلمانوں کے لیے۔

***

۶

تقسیم کے فوراً بعد سندھیوں کی بڑی تعداد جودھپور اور اجمیر میں جمع ہو گئی، ان کا خیال تھا کہ پاکستان جیسی غیر فطری تجربہ زیادہ عرصے تک قائم نہ رہ سکے گی اور وہ راجستھان سے سندھ واپس چلے جائیں گے۔ بمبئی کو بہت بڑا، بہت مہنگا اور بہت دور سمجھا جاتا تھا۔ لیکن جوں جوں تقسیم کی منسوخی کا امکان دور ہونے لگا، سندھیوں نے متبادل کی تلاش شروع کر دی۔ ایک متبادل کانڈلا کی بندرگاہ تھی جہاں سندھو ری سیٹلمنٹ کارپوریشن کو گاندھی دھام بسانے کے لیے زمین دی گئی تھی۔ مگر جیسا کہ روم ایک دن میں تعمیر نہیں ہوا تھا، گاندھی دھام بھی ایک دن، ایک برس یا چند برسوں میں نہیں بن سکتا تھا۔ اور مالی طور پر بدحال سندھی مہاجرین کے پاس وقت کم تھا، وہ برسوں تک انتظار نہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے رفتہ رفتہ بمبئی کا رخ کرنا شروع کیا۔ وہاں کلیان کیمپ — جسے دوسری جنگ عظیم کے دنوں میں اطالوی قیدیوں کے رکھے جانے کے لیے تعمیر کیا گیا تھا اور جس کا نام اب اُلہاس نگر ہے — آسانی سے دستیاب تھا۔ مہاجرین یہاں کم خرچ میں رہ سکتے تھے اور بمبئی میں پیسا کما سکتے تھے۔

ایسی زندگی کو نئے سرے سے شروع کرنے کی شدید مشقت کئیوں کے لیے مہلک ثابت ہوئی۔ مگر بہت جلد ان کا زندہ رہنے اور اپنی حالت کو بہتر بنانے کا عزم غالب آیا۔ چیلنج بہت بڑا تھا، مگر ان کا جواب اس سے بھی بھاری نکلا۔ سندھ میں ہم نے گنتی کی چند کمپنیوں کا نام سنا تھا، مگر آج سندھی تاجروں نے بے شمار بڑی بڑی کمپنیاں قائم کر کے نئی زمینیں اور نئی چوٹیاں سر کی ہیں۔ تقسیم سے پہلے سندھی کروڑپتیوں کے نام ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے، آج صرف اُلہاس نگر میں چالیس سے زیادہ کروڑپتی موجود ہیں۔ اگرچہ بمبئی کو ہندوستان میں سندھیوں کا مرکز کہا جاتا ہے، تاہم وہ ملک کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ہندوستان کا مشکل کوئی ایسا قصبہ ہو گا جہاں چند سندھی خاندان موجود نہ ہوں۔ فیض آباد (ایودھیا) جیسے دوراُفتادہ مقام پر بھی سندھی اتنی تعداد میں، اور اتنے خوش حال، ہیں کہ پورا شہر ان کے جھولے لعل کے سالانہ جلوس کا شوق سے انتظار کرتا ہے۔ فرانس سے انگلستان آنے والے پروٹسٹنٹ مہاجروں (Huguenots) کی طرح، سندھیوں نے ہندوستان کے بہت سے علاقوں کی اقتصادی ترقی میں تحرک پیدا کرنے والے عنصر کا کام کیا ہے۔ غیر ملکوں میں سندھیوں کے کاروباری ادارے ہمیشہ سے ممتاز رہے ہیں، آج وہ پہلے سے کہیں زیادہ نمایاں ہیں۔

تقسیمِ ملک کے تباہ کن سانحے کے بعد سندھیوں — اور پنجابیوں — کی ڈرامائی کامیابی کا کیا سبب ہے؟ سبب وہی ہے جو دوسری جنگ عظیم میں شکست کھانے کے بعد جاپان اور جرمنی کی تعمیر نو کا تھا۔ یعنی لوگوں کی ذہنی صلاحیت۔ سندھی کامیابی حاصل کرنے کو اپنے بنیادی حقوق میں شامل سمجھتے ہیں۔ اور اس ذہنی رجحان کے ساتھ انسان مٹی کو بھی سونا بنا سکتا ہے۔

لیکن ایسا نہیں ہے کہ انھوں نے خود کو صرف دولت کمانے تک محدود رکھا ہو۔ انھوں نے ممبئی اور دوسری جگہوں پر بہترین ادارے قائم کیے ہیں۔ وٹومل انسٹیٹیوٹ آف کمپیوٹر ٹیکنولوجی اینڈ انجینئرنگ میں دو کروڑ روپے کے مشینی آلات موجود ہیں۔ موتیچند گوپال داس اور خوشی کند مانی کے طفیل، سندھیوں نے ممبئی میں درجن بھر کالج نہ صرف قائم کیے بلکہ ان کے قائم کیے ہوئے جے ہند کالج اور کے سی کالج ہندوستان کے اس نمایاں ترین شہر کے بہترین کالجوں میں شمار ہوتے ہیں۔ جسلوک اسپتال ہندوستان بھر میں شہرت رکھتا ہے۔ تعلیم کے میدان میں وویکا نند ایجوکیشن سوسائٹی، ممبئی، اور میرا ایجوکیشن سوسائٹی، پونا، سندھیوں کی اہم ترین خدمات میں شامل ہیں۔

ممبئی میں مالکانہ حقوق کے ساتھ فلیٹوں کا تصور سندھیوں کی اختراع ہے۔ صرف راہیجا برادرز نے شہر میں اس قسم کی ایک ہزار سے زائد عمارتیں بنائی ہیں۔ اور ناریمن، چیمبور اور ممبئی سنٹرل میں جیٹھی سیامیملانی کی قائم کردہ نوجیون ہاؤسنگ کالونیاں ہاؤسنگ کے میدان میں امداد باہمی کے اصول کی بہترین مثالیں ہیں۔ تعمیرات کے شعبے میں سب سے بڑا نام بھائی پرتاپ کا ہے جنھوں نے کانڈلا کی بندرگاہ پر جڑواں شہر آدی پور (رہائشی) اور گاندھی دھام (تجارتی) تعمیر کیے۔

سندھیوں نے انفرادی طور پر بھی زندگی کے بہت سے شعبوں میں نام پیدا کیا، مثلاً ڈاکٹر بینڈا نے انڈین میڈیکل ایسوسی ایشن، پروفیسر جی آر ملکانی نے انڈین فیلوسوفیکل کانگریس اور رام جیٹھملانی نے انڈین بار کاؤنسل کی کئی برس تک قیادت کی۔ فلم کے میدان میں ہدایتکار گووند نہالانی، راج سپی، رمیش سپی اور کمار شاہانی، اور اداکاروں میں سُدھیر، مچھ موہن، راج کرن (ماستانی)، اسرانی، شیلا رامانی، سیتا اور سادھنا مشہور ہیں۔ سندھی ادیبوں، کلیان آڈوانی، ایم یو ملکانی، لیکھراج عزیز، تیرتھ بسنت، رام پنجوانی، سُرُوسدارنگانی، پوپٹی ہیرانندانی، گوبند مالھی، نارائن شیام وغیرہ نے ساہتیہ اکادمی کے اعزاز حاصل کیے۔ کرشن کرپالانی ساہتیہ اکادمی کے سربراہ رہ چکے ہیں اور اب نیشنل بک ٹرسٹ کے رہنما ہیں۔

**

آئندہ صفحات میں پیش کیا جانے والا متن پیر علی محمد راشدی کی یادداشتوں پر مشتمل سندھی کتاب "اُہے ڈینہن اُہے شینہن" (وہ دن وہ شیر) کے منتخب اقتباسات سے ترتیب دیا گیا ہے۔ راشدی ۱۹۴۷ سے پہلے سندھ کی مسلم لیگی سیاست میں بہت سرگرم تھے اور سکھر کی منزل گاہ کے قضیے میں انھوں نے بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔ پاکستان کے قیام کے بعد بھی وہ ملکی سیاست میں حصہ لیتے رہے۔ اُن کی کتاب کی پہلی جلد سندھی ادبی بورڈ، حیدرآباد، نے ۱۹۶۶ میں اور دوسری جلد ۱۹۸۰ میں شائع کی۔

راشدی کی کتاب جدید سندھی ادب کی اہم کتابوں میں سے ہے۔ اس کی جلد دوم کے تقریباً پانچ سو صفحات میں سے ۳۷۲ صفحات کراچی شہر اور یہاں کی ممتاز شخصیات کے تذکرے پر مشتمل ہیں۔ راشدی کا اسلوبِ تحریر اس قدر عمدہ ہے کہ کتاب میں سے اقتباسات کو منتخب کرنا خاصا دشوار مرحلہ ثابت ہوا۔ یہ پوری کتاب، اور خصوصاً کراچی سے متعلق حصہ، یقیناً اس لائق ہے کہ اسے اردو میں منتقل کیا جائے۔ اس کے علاوہ جلد اول میں سے سندھ کی سیاست اور ہندو مسلم تنازعے کے بارے میں کچھ اقتباسات اس متن میں شامل کیے گئے ہیں تاکہ اس موضوع پر سندھ کی مسلمان رائے عامہ کا نقطۂ نظر سامنے آ سکے۔

راشدی نے کراچی شہر کی تہذیبی زندگی اور یہاں کی نامور اور گمنام ہستیوں کی نہایت عمدہ اور مؤثر تصویر کھینچی ہے اور تقسیمِ ہند سے پہلے کے کراچی سے واقف ہونے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

پیر علی محمد راشدی

سندھی سے ترجمہ، تلخیص اور تدوین اجمل کمال

وہ دن، وہ لوگ

جو کراچی ہم نے آ کے دیکھا تھا اُس کا اب نام نشان باقی نہیں رہا ہے، سوائے چند پرانی عمارتوں کے، جن کی کھڑکیوں میں دھوئے ہوئے گندے میلے کپڑے دھوپ میں سوکھنے کے لیے لٹکے رہتے ہیں۔

کیا حال سناؤں پرانے کراچی کا؟ لفظوں کے لباس میں اُس ماحول کو سامنے نہیں لا سکتا۔ وہ کراچی شہر نہ تھا، گلشن تھا، گلستاں تھا۔ آبادی ڈھائی تین لاکھ کی تھی۔ صفائی میں پورے برصغیر میں پہلے نمبر پر۔ وہ تین لاکھ کی آبادی خوش حال، صاف ستھری اور عمدہ تھی جسے اپنے شہر کی شان کا پورا احساس تھا۔ لوگ سڑکوں پر نرمی سے قدم رکھتے تھے جیسے پیروں کے نیچے پھول بچھے ہوں۔ یعنی سڑکوں تک کا احترام ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ بڑی بات یہ کہ نہ جیب کتروں کا خوف تھا نہ چھُرا ماروں کا، نہ لٹیروں کا نہ مسجدوں سے جوتیاں چُرانے والوں کا، نہ مکھیوں کا نہ مچھروں کا۔ اس قسم کے لوگوں یا کیڑے مکوڑوں کو جرأت ہی نہ ہوتی تھی کہ کراچی کا قصد کریں۔ پورے شہر میں دو سٹی مجسٹریٹ ہوتے تھے ــــ رچرڈسن اور تلاتھی پارسی ــــ جو زیادہ تر ٹریفک، سڑک کی رکاوٹوں یا جانوروں کے ساتھ بےرحمی کے متعلق معمولی مقدمے چلایا کرتے۔ جانوروں کا ذکر آیا ہے تو یہ بھی سن لیجیے کہ کراچی کے جانوروں کے حقوق کا بھی احترام کیا جاتا تھا۔ کسی گاڑی والے کی مجال نہ تھی کہ مقررہ تعداد سے زیادہ سواریاں بٹھائے یا لنگڑا یا زخمی جانور گاڑی میں جوتے۔ جانوروں کے ساتھ بےرحمی کے واقعات روکنے کے لیے باقاعدہ سوسائٹیاں ہوتی تھیں اور اس کے عہدے دار اور آنریری مجسٹریٹ روز شہر میں گھومتے تھے۔ زخمی جانوروں کے علاج کے لیے ایک بڑا اسپتال تھا اور ان کی پیاس بجھانے کے لیے ہر چوک پر ایک فوارہ بنوایا گیا تھا جس سے رات دن ٹھنڈا پانی نکلا کرتا۔ یہ فوارے زیادہ تر مالدار پارسیوں نے اپنے مرحوم بزرگوں کی یاد قائم رکھنے کے لیے بنوائے تھے۔ ہندوؤں نے گئوشالا کھول رکھی تھی جس میں بیمار یا ریٹائرڈ گائیں، بیل اور بھینسیں رہتی، کھاتی پیتی اور زندگی کے باقی ماندہ دن پورے کرتی تھیں۔ دو واقعات کراچی والوں کی انسانیت اور رحم دلی کی مثال کے طور پر سناتا ہوں۔ مسٹر جمشید مہتا کراچی میونسپلٹی کے صدر تھے اور سالہاسال بلامقابلہ اس عہدے پر منتخب ہوتے رہے۔ ۱۹۳۰ کے آس پاس میں صدر روڈ سے گزر رہا تھا۔ دیکھا کہ جمشید مہتا پیدل ایک

زخمی گدھے کو لے کر اسپتال کی طرف جا رہے ہیں۔ ان کی موٹر ان کا ڈرائیور پیچھے پیچھے چلاتا آ رہا تھا۔ تماشا دیکھنے کے لیے میں بھی اسپتال کے برآمدے میں جا کھڑا ہوا۔ جمشید نے اپنے سامنے گدھے کی مرہم پٹی کرائی اور ڈاکٹر سے بار بار کہتے رہے کہ زخم کو آہستہ صاف کرے تاکہ بے زبان کو ایذا نہ پہنچے۔ مرہم پٹی ختم ہوئی تو ڈاکٹر کو ہدایت کی کہ گدھے کو ان کے ذاتی خرچ پر اسپتال میں رکھا جائے، اور دانے گھاس کے لیے کچھ رقم بھی اسپتال میں جمع کرا دی۔ دوسری طرف گدھے کے مالک سے بھی کہا کہ جب تک گدھے کا علاج پورا نہ ہو جائے اور وہ کام کرنے کے قابل نہ ہو جائے، تب تک وہ اپنی مزدوری کا حساب اُن سے لے لیا کرے، اور یہ کہتے ہوئے کچھ نوٹ پیشگی ہی سے دے دیے۔

دوسری بار میں نے ایک اور سربرآوردہ پارسی جہانگیر پیٹنکی کو دیکھا کہ وہ الفنسٹن اسٹریٹ پر ایک کرائے کی وکٹوریا گاڑی کو پولیس کی مدد سے روکے کھڑے ہیں اور کوچوان سے بحث کر رہے ہیں۔ بحث کا موضوع یہ تھا کہ گھوڑا بہت لاغر اور بیمار ہے، اس لیے مناسب ہے کہ گھوڑے کو گاڑی سے الگ کر کے دو چار دن اس کا علاج کرایا جائے اور دانہ گھاس کھلا کر اسے کام کے قابل بنایا جائے۔

کوچوان کہیں باہر سے آیا ہوا تھا۔ اسے کراچی کا دستور معلوم نہ تھا، اس لیے وہ پیٹنکی کی بات سمجھ نہ سکا، ان سے تکرار کرتا رہا اور آخر غصے میں آ کر چابک مار کر گاڑی آگے بڑھانے لگا۔ پیٹنکی فرسٹ کلاس مجسٹریٹ بھی تھے۔ انھوں نے پولیس سے کوچوان کو گرفتار کرا کے جیل بھجوایا، گھوڑے کو اسپتال بھیجا اور گاڑی کو دھکیلوا کر صدر پولیس تھانے کے احاطے میں کھڑا کرا دیا۔

یہ واقعات بیان کرنے کا مقصد یہ دکھانا ہے کہ کراچی کے حیوانوں کی بھی عزت اور شان تھی، ان کے بھی قانونی حقوق تھے جن کا احترام کیا جاتا تھا۔

کراچی سے میرا تعارف پہلی بار شاید ۱۹۱۷ کے لگ بھگ ہوا تھا۔ پہلی عالمی جنگ جاری تھی، مگر ہمیں فقط لولے لنگڑے اخباروں کے وسیلے سے خبر پہنچتی تھی کہ ایسی کوئی جنگ ہو رہی ہے، ورنہ روزمرہ کی زندگی پر اس کا کوئی اثر نہیں تھا، انگریز نے ایسا اچھا بندوبست کر رکھا تھا۔

آج کل تو سواری کے تیز ذریعوں نے پوری دنیا کو سکیڑ دیا ہے، مگر اُن دنوں کراچی کا سفر بھی بڑا سفر سمجھا جاتا تھا۔ لوگ بہت پہلے سے تیاریاں کرتے، یار دوستوں کو اطلاع دیتے کہ آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے کراچی کے سفر کا قصد ہے۔ کراچی کو انگریزی داں "کراچی" کہتے تھے اور عام گنوار لوگ "کاراچی"۔ کراچی ابھی "کرانچی" نہیں بنا تھا۔

اس سفر کے لیے موزوں موسم مئی، جون، جولائی کا ہوتا تھا جب بالائی سندھ میں گرمیاں اور مچھر لوگوں کی جان عذاب میں کر دیتے تھے۔ روپوں کی ریل پیل تب چھوٹے موٹے زمینداروں کے پاس بھی نہ ہوتی تھی۔ اُس زمانے میں وڈیرے کراچی تبھی جا سکتے تھے جب ربیع کی فصل اترے۔ جس کے بعد بیوپاری دھوتی کے پلو سے نوٹوں کی گڈی اور گنیوں (شاہ ایڈورڈ ہفتم کی شبیہ والے سکوں) کی تھیلی برآمد کر

کے رقم ان کے حوالے کرے۔ بیوپاری بھی اُستاد ہوتے تھے، انھیں خبر تھی کہ جب سب گھٹن ہوگی اور پھر وڈیرے کی نیند حرام کر دیں گے، اُس وقت وڈیرا کراچی جانے کے لیے بے تاب ہو کر جنس اونے پونے داموں ٹھکانے لگا کر بھاگ جائے گا۔ ان دو تین ہفتوں میں وڈیرے اور بیپے کے درمیان دلچسپ کھینچاتانی چلتی رہتی۔ آخر وڈیرا تنگ آ کر سستے داموں اناج بیچ کر کراچی جانے کے لیے کمر کس لیتا۔

صدر کے علاقے میں انگریز رہتے تھے، اس لیے بے ادبی کے ڈر سے وہ صدر [کینٹ] اسٹیشن پر نہ اُترتا، سیدھا سٹی اسٹیشن پر جا کر سامان اتارتا۔ دو آنے قلی کو دے کر بستر بند میں لپٹی رلی اور لوہے کا صندوق باہر نکلواتا اور آٹھ آنے کرایے پر وکٹوریا گاڑی کر کے بندر روڈ پر مولو (مولے ڈنا) مسافر خانے میں جا اترتا۔ وہاں خاص کمرہ لے تو آٹھ آنے کرایہ اور عام کمرہ لے تو نامِ مولا مفت۔ سخت گرمی سے نکل کر ٹھنڈی آب و ہوا میں آنے کی وجہ سے پہلے دو چار دن تو نزلے زکام میں الجھ کر وہیں پڑا رہتا۔ ہمت کرتا تو گھسٹتا ہوا مولانا حکیم فتح محمد سیوہانی مرحوم کے دواخانے تک چلا جاتا۔ وہاں زکام کی پھیکی گولیاں پہلے سے موجود ہوتیں۔ حکیم صاحب ہاتھ بھر کر گولیاں دیتے اور ہدایت کرتے کہ جب تک زکام ختم نہ ہو جائے باہر نہ نکلے، مبادا نمونیا ہو جائے۔

غرض یہ تھا کہ اُن حالات کا جن کے تحت سندھ کے دیہات کے لوگ کراچی کی زیارت یا سیاحت کے لیے آتے تھے۔

خوش قسمتی سے ان حالات کا اطلاق ہمارے گھر پر نہ ہوتا تھا۔ کراچی کے بڑے بڑے بیوپاری اور مالدار میمن ہمارے بزرگوں کے مرید تھے۔ گرمیوں کا زمانہ آتا تو وہ خود پہلے سے سارا بندوبست کر لیا کرتے۔ فقط ہمارے پہنچنے کی دیر ہوتی۔ کراچی پہنچنے پر رہنے کے لیے محل ماڑیاں، سواری کے لیے دو گھوڑوں والی گاڑیاں (بعد میں موٹریں) اور کھانے پینے کے لیے سر زور سر کھانے پر ساتھ غذائیں تیار۔ کھاؤ پیو، گھومو پھرو، خدا کا احسان مانو اور بڑوں کے کیے کمائے کے لیے ان پر صلوٰۃ و سلام بھیجو۔

ہماری روانگی گاؤں کے ریلوے اسٹیشن نصرت سے شام کے وقت ہوتی۔ کراچی کے تصور میں دل اُچھلتا کہ ابھی جنگل کے جہنم سے نکل کر کراچی کی جنت میں پہنچے جاتے ہیں۔ بارہ گھنٹے کا سفر ہوتا تھا۔ سیکنڈ کلاس کے ڈبے اکثر ہمارے اسٹیشن سے خالی گزرتے تھے اور فقط لاڑکانے پہنچنے پر دوسرے مسافر ان میں سوار ہوتے۔ (فرسٹ کلاس میں سوار ہونے کا سوال ہی نہ تھا، کیوں کہ اس میں انگریز افسر سفر کرتے تھے اور ان کے ساتھ سفر کرنے میں بے ادبی کا پہلو پیدا ہوتا تھا۔)

جھنگ شاہی سے آگے نکلتے تو ٹھنڈی ہوا کے جھونکے جسم کو چومنا شروع کر دیتے۔ دابے جی پہنچنے تک جلد سے دانے، خارش کے نشان اور مچھر کے کاٹے کی تمام شہادتیں مٹ چکی ہوتیں۔ بدن میں تازگی اور توانائی محسوس ہونے لگتی۔ پوری دنیا گھوم کر دیکھ لی، ایسی صاف، خوشبودار اور میٹھی ہوا سے پھر کہیں سابقہ نہ پڑا۔ پرانے کراچی کی یہ ٹھنڈی ہوا کیا تھی، اس کا اندازہ لگانا آج کل کے حالات میں ناممکن ہے۔

تمام ماحول موافق تھا، آسمان میں چھوٹے چھوٹے بادل، ہلکی ہلکی پھوار، بیچ میں کبھی کبھی بارش کا چھڑکاؤ، اور اس پر اس میٹھی ہوا کی سرسراہٹ! اس میں غیر صحت بخش اجزا کی ملاوٹ کا سوال ہی نہ تھا۔ پورا شہر صاف ستھرا تھا، نہ گندگی نہ کوڑا کرکٹ، نہ سڑے تالاب نہ گندے پانی کے جوہڑ، نہ کھلے ہوئے گٹر نہ گٹروں کے ڈھکن چرائے ہوئے، نہ کچی بستیوں کا وجود نہ سڑکوں پر بول و براز کی آزادی، نہ موٹروں، بسوں اور رکشاؤں کا دھواں نہ پچاس لاکھ لوگوں کی تحلیلِ ریاح کا مسئلہ، نہ سڑکوں پر سگریٹ کے ٹکڑے نہ دیواروں پر پان کی پیکیں۔ پھر کراچی کی ہوا صاف کیوں نہ رہتی؟

صدر ریلوے اسٹیشن کے قریب پہنچتے پر داہنے ہاتھ دور ہی سے وائرلیس کے کھمبے دکھائی دینے لگتے۔ اُس زمانے میں لوگوں کی سمجھ ہی میں نہ آتا تھا کہ بغیر تار کے پیغام کیوں کر آجا سکتے ہیں۔ گاڑی پلیٹ فارم پر رکتی تو سیکنڈ کلاس کے ڈبوں میں قلی داخل ہوجاتے۔ وہ ایک آنہ مزدوری لے کر سامان باہر کھڑی وکٹوریا گاڑیوں میں رکھ دیتے۔ گاڑیاں زیادہ ہوتیں، مسافر کم۔ کسی دھکم پیل کے بغیر آرام سے گاڑی میں بیٹھ کر فریئر ہال کی سڑک سے صدر کی طرف جایا جاتا۔ پہلے کارلٹن ہوٹل آتا، جس کے کھنڈر آج بھی نظر آتے ہیں، مگر اُس زمانے میں وہ صرف انگریزوں کے رہنے کے لیے مخصوص تھا۔ بہت برس گزرنے کے بعد اس میں فیس یسل دیسیوں کو بھی رہنے کی اجازت ملی، یا جرات ہوئی۔ کارلٹن کے سامنے والی سڑک کے بائیں ہاتھ پر بھی کوئی مکانات نہیں بنے تھے، خالی میدان پڑا تھا۔ صرف بیچ میں ایک چھوٹی سی مارکیٹ ہوتی تھی جہاں سے آس پاس کے بنگلوں میں رہنے والے سبزی ترکاری لیا کرتے۔

آگے بڑھتے تو فریئر ہال کے پاس سے گزر ہوتا۔ چاروں طرف وسیع باغ، ملکہ اور بادشاہ کے بُت اور خود عمارت کا عجیب طرز دیکھ کر لوگ دانتوں میں انگلیاں داب لیتے۔ (آزادی کے بعد یہ مجسمے ہماری بت شکنی کی نذر ہوگئے یا کہیں چھپا دیے گئے!) اس کے بعد فلیگ اسٹاف ہاؤس آتا جس میں فوج کا کمانڈنگ آفیسر رہتا تھا۔ دروازے کے باہر سڑک پر دو توپیں کھڑی تھیں۔ توپوں میں سے جان تو نکل چکی تھی، صرف نمائش کے لیے رکھی ہوئی تھیں، پھر بھی گاڑی والے کو ہدایت کی جاتی کہ توپوں سے ذرا ہٹ کر چلے، کیا پتا!

الفنسٹن اسٹریٹ کی چھاپیں (shops) دیکھ کر لوگوں میں احساسِ کمتری پیدا ہوتا تھا۔ میمنوں کی دو چار دکانوں کے سوا باقی سب دکانیں انگریزوں، پارسیوں اور ہندو عاملوں کی تھیں، مگر صدر کی دکانوں کا سردار تب بھی میمن حاجی ڈوسل ہوتا تھا۔ سب سے بڑی دکان، ہر قسم کا سامان، عمدہ دھاگے سے لے کر اعلیٰ درجے کی بندوقوں تک، اس ایک ہی دکان سے مل جاتا تھا۔ البتہ دکان میں داخل ہونے سے پہلے بوٹ صاف کرائے جاتے، کوٹ کے بٹن بند کیے جاتے اور داڑھی مونچھوں کو ہاتھ پھیر کر درست کیا جاتا، کیوں کہ اندیشہ ہوتا کہ اندر داخل ہونے پر کسی انگریز افسر سے سامنا نہ ہوجائے۔ سندھیوں کو ایسے سے اونچے لوگوں کے ادب کے تقاضے ہر وقت اور ہر جگہ یاد رہتے ہیں۔

ڈوسل کی دکان ایک ادارہ تھی۔ سندھ کے تقریباً تمام وڈیرے، میر اور پیر اس دکان کے مخصوص

ہوتے تھے اور فصل کٹنے پر سال بھر کی کمائی کا بڑا حصہ انھیں ڈوسل کا اُدھار چکانے میں صرف کرنا پڑتا تھا۔ ان لوگوں کی بار سدوقوں، کارتوسوں، ولایتی بسکٹوں اور خوشبودار صابن پر ہوتی تھی، اور ان چیزوں کی ڈوسل کے پاس کوئی کمی نہ تھی۔ دکان میں رکھا ہوا دوسرا سامان اکثر ان کی سمجھ ہی میں نہ آتا تھا، اس لیے اس کے قریب نہ پھٹکتے۔ کچھ چیدہ بڑے آدمی شام کے وقت ڈوسل کی دکان کے باہر محراب دار چبوترے پر بید کی کرسیاں ڈال کر بیٹھ جاتے کہ کوئی افسر یا اس کی میم گزرے تو اٹھ کر اسے سلام کریں۔ ایک لحاظ سے ڈوسل کی دکان کے سامنے بیٹھنا خود عزت کی نشانی سمجھا جاتا تھا۔

ہور نامی ایک انگریز درزی کی دکان، اسی الفنسٹن اسٹریٹ پر، نئے فیشن کے دلدادہ وڈیروں کی دل جیسی کا مرکز ہوتی تھی۔ سندھی پڑھے ہوئے لوگ فقط قمیص میں نوٹائی لگانے پر اکتفا کرتے، انگریزی کے دو چار درجے پڑھے ہوئے ہوتے تو ہور سے سوٹ سلوا کر پہنتے، مگر انگریز اہلکاروں کے پاس اکثر سوٹ پہن کر نہ جاتے مبادا صاحب کو خیال گزرے کہ وڈیرا انگریزوں کی ہمسری کر رہا ہے۔ اس سے کچھ آگے جے بلس کی دکان تھی جہاں انگریزی دواؤں کے علاوہ اعلیٰ ترین ولایتی سینٹ، صابن وغیرہ مل سکتے تھے۔ فیشن ایبل لوگ وہاں کا بھی چکر لگاتے۔ دکان کے باہر بڑے بڑے شیشے لگے ہوئے تھے۔ زیادہ تر لوگ باہر کھڑے ہو کر شیشے میں سے اندر کا نظارہ کرتے اور کہتے واہ رے انگریز واہ! دکان یوروپی طرز میں آراستہ کی گئی تھی۔ ایک بار سندھ کے ایک بزرگ کوئی جیپر لینے اس دکان میں داخل ہوئے۔ مریدوں کو معلوم ہوا تو وہ لاٹھیاں لے کر آ پہنچے اور بلس کی دکان کے شیشے توڑ کر اس کے ٹکڑے تبرک کے طور پر اپنے ساتھ لے گئے۔ بزرگ نے بلس کو اس نقصان کا معاوضہ دیا (مبادا بلس، جو انگریز تھا، سندھ کے کمشنر صاحب سے جا کر شکایت کر دے) اور شاید یہ وعدہ بھی کیا کہ آئندہ اس دکان میں داخل نہیں ہوں گے۔ اسی طرح کی ایک دکان اسپنجلی نامی انگریز کی بھی تھی۔ وہاں بھی دوائیں اور خوشبو کا سامان ملتا تھا۔

اسپنجلی کے سامنے حاجی ابوبکر اینڈ سنز کی دکان تھی۔ یہ زنانہ اور مردانہ کپڑے کی سب سے بڑی دکان تھی جس میں میموں کی ضرورت کا تمام سامان ولایت سے منگایا ہوا فراہم رہتا تھا۔ دکان کے مالک مرحوم اسماعیل سیٹھ میمن تھے جو میرے مرحوم دادا کے دوست تھے۔ ہم اُنھیں کی دکان کی بالائی منزل کے ایک حصے میں رہتے تھے۔ یہ لوگ مہمان نوازی کی حد کر دیتے تھے۔ کشادہ دل لوگ تھے، ان کے دسترخوان پر ہر وقت آٹھ دس قسم کے طعام ہوتے تھے۔ کھانا خاص میمنی قسم کا تھا، میمنی کھانے کا ذائقہ نرالا ہوتا تھا، اور جو کچھ ہم آج کل کھاتے ہیں اس سے بالکل مختلف۔ ہمارے آج کل کے شہری یا ہوٹل کے پکے کھانوں میں زیادہ تر دہلی اور یوپی کا اثر ہے۔ شامی کباب کا نام میں نے پہلی بار ۱۹۲۴ میں پڑھا تھا، اور کھایا اس وقت تک نہیں جب تک دہلی جانے کا اتفاق نہ ہوا۔ ابوبکر کی دکان میں سارے دن انگریز مردوں اور عورتوں کی آرجار رہتی تھی۔ میں ایک کونے میں چھوٹی کرسی ڈال کر بیٹھا خاموشی سے یہ نظارہ دیکھا کرتا۔

میمنوں کی دوسری مشہور دکان عدن والا کی تھی جس کا بورڈ آج تک لگا ہوا ہے۔ پتا نہیں اندر کون

رہتا ہے، میمن یا کوئی اَور۔ بہر حال عدن والا قسم قسم کے سگریٹ اور چرٹ پیتا تھا۔

الفنسٹن اسٹریٹ کے کونے پر، سڑک کے دوسری طرف، جہاں اب گلزار ہوٹل ہے، حاجی احمد کریم محمد میمن کی دکان تھی۔ وہ انگریزی گرم کپڑے کا کاروبار کرتے تھے۔ مالک مرحوم عبدالستار سیٹھ دروازے کے باہر برآمدے میں کاٹھ کا پلنگ ڈالے اس پر بیٹھے رہتے اور آنے جانے والوں سے بات چیت کیا کرتے۔

میمنوں کے علاوہ الفنسٹن اسٹریٹ میں پارسیوں کی بھی دکانیں تھیں، مثلاً جال جائی فوٹو گرافر، اور سیٹھ نسروانجی مہتا۔ نسروانجی، جمشید مہتا کے والد تھے اور ان کا کاروبار ولایتی شراب کا تھا۔ آخری زمانے میں حیدرآباد کے کچھ عاملوں نے بھی آکر کتابوں اور ولایتی پودوں کی دکانیں کھول لی تھیں۔

۱۹۳۰ میں عالمگیر اقتصادی بحران آیا جس کے دوران میمنوں کو بیوپار میں اس قدر نقصان پہنچا کہ وہ قریب قریب برباد ہو گئے اور ان کی جگہیں ہندوؤں نے لے لیں۔ ایک عبداللہ ہاروں مرحوم اپنے پیروں پر کھڑے رہے۔ خود سیٹھ عبداللہ نے مجھے ۱۹۳۹ میں میمنوں کی اس بربادی کا یہ سبب بتایا کہ پہلی عالمی جنگ کے موقعے پر میمنوں نے بہت نفع اندوزی کی تھی جس کی خدا نے انھیں یہ سزا دی۔ جب ۱۹۳۹ میں دوسری عالمی جنگ چھڑی تو سیٹھ عبداللہ نے عجلت میں اپنا شکر کا کارخانہ، جو موتی پور صوبہ بہار میں تھا، اونے پونے بیچ کر اپنی جان چھڑائی۔ وجہ یہ بتائی کہ جنگ کے دوران شکر کی قلت ہو جائے گی اور بلیک مارکیٹ کا رواج ہو گا۔ زندگی کا کچھ بھروسا نہیں، کیا پتا اس بیچ میں میں مر جاؤں اور میری اولاد لالچ میں آکر شکر کی بلیک مارکیٹنگ کرے اور یوں خدا کی گرفت میں آکر برباد ہو جائے۔

صدر سے کیماڑی تک ٹرام چلتی تھی۔ پورا سفر ایک ٹکے میں طے ہو جاتا۔ ٹرام بوہری بازار سے ایک طرف صدر ریلوے اسٹیشن کی سمت جاتی اور دوسری طرف بندر روڈ سے ہوتی ہوئی کیماڑی تک۔ حقیقت آرام سے سفر کرتی تھی، نہ ٹرام میں دھکم پیل اور نہ مسافروں لے کرنے کا مسئلہ۔ ٹرام کے علاوہ گھوڑا گاڑیاں بھی مروج تھیں۔ موٹریں اور بسیں بالکل نہ تھیں۔ رکشا میں کسی نے دیکھی تھیں نہ سنی تھیں۔ مالدار لوگ سواری کے لیے گھر کی وکٹوریا گاڑیاں رکھتے تھے۔ پہلی موٹر کار ایک میمن سیٹھ عبدالرحیم صالح محمد نے منگوائی، جو ہمبر (Humber) تھی۔ اس کی چھت کھلی تھی۔ سڑک پر نکلتی تو لوگ باادب ہو کر ایک کنارے پر کھڑے ہو جاتے۔ انگریز زیادہ تر گھوڑوں پر گھومتے تھے۔ شام کو ہوا خوری کے لیے کلفٹن تک جاتے۔ یہ سڑک ابھی پکی نہیں ہوئی تھی۔ سر ہنری لارنس، کمشنر سندھ، کو میں نے تقریباً ہر شام اسی سڑک پر، میم کے ساتھ، گھوڑوں پر سوار کلفٹن جاتے دیکھا ہے۔ صرف میاں بیوی، نہ چوکیدار نہ باڈی گارڈ۔ ملک میں بےحد سلامتی اور امن امان تھا۔ کلفٹن پر سر جہانگیر کوٹھاری نے اپنے نام کی پریڈ (Parade) یا سیرگاہ بنوائی تھی۔

اُدھر بندر روڈ پر بھی چہل پہل ہوتی تھی۔ ہولے ڈے کا مسافر خانہ، غلام حسین خالق ڈینا ہال، ڈینسو ہال،

میری ویدر ٹاور، اسمال کازز کورٹ، کسٹم ہاؤس، پورٹ ٹرسٹ بلڈنگ اس شہر کے سنگِ میل تھے۔ ڈینسو ہال کے پاس دائیں اور بائیں ہاتھ سڑکیں نکلتی تھیں۔ بائیں ہاتھ والی سڑک نئی چالی محلے سے (جہاں الوحید اخبار کا دفتر تھا) گزر کر میکلوڈ روڈ پر پہنچتی تھی۔ دائیں ہاتھ دو سڑکیں تھیں، ایک میریٹ روڈ جس پر کاروبار کی کھولیاں اور دکانیں تھیں، اور دوسری نیپیئر روڈ جس کے شروع میں میمن بیوپاریوں کے دفتر تھے (سر حاجی عبداللہ ہارون کا دفتر اور بعد میں صوبائی مسلم لیگ کا دفتر اسی سڑک پر تھا)، اور اس سے آگے چکلا تھا۔ چکلے کے علاقے میں کسبیاں اور گانے والیاں تو رہتی ہی تھیں مگر جن لوگوں کا ان پیشوں سے تعلق نہ تھا اور بڑے درجے کے صاحب تھے وہ بھی یہاں مکان بنا کر رہتے تھے۔ مثلاً سندھ کے کمشنر کا میر منشی بھی اسی محلے میں رہتا تھا۔ شریف، باکردار اور روزے نماز کا پابند شخص تھا، شام کو مکان کی گیلری میں کرسیاں ڈال کر بیٹھ جاتا اور آنے جانے والوں کو دیکھا کرتا۔ پیشہ ور طوائفوں کو اپنے پاس بلوا کر یا ساتھ لے جا کر گانا سننے میں کوئی قباحت نہ سمجھی جاتی تھی۔ اشرافوں اور پیشہ وروں کے درمیان حدِ فاصل واضح تھی۔ اچھے اور بُرے فن کو اپنی اپنی حد کے اندر رکھا جاتا تھا۔ معاشرے میں منافقت کا دور ابھی نہیں آیا تھا۔

حکومت کی باگ ڈور سندھ کے کمشنر کے ہاتھ میں تھی۔ سندھ کا موجودہ علاقہ بمبئی صوبے میں شامل تھا۔ بمبئی کی گورنری سے سندھ کے فاصلے کے سبب مقامی انتظام چلانے کے تمام اختیارات کمشنر کے سپرد کر دیے گئے تھے۔ کمشنر بھی بڑے بڑے انگریز مقرر ہوتے تھے۔ مرد آدمی، منتظم، بااصول، بے داغ۔ یوں نہ ہوتا تھا کہ کمشنر دوسری طرف گردن پھیرے تو خلقِ خدا اس کے کردار پر نکتہ چینی شروع کر دے کہ فلاں معاملے میں نامراد اتنی رقم کھا گیا، اسمگلنگ کرنے والوں سے حصہ وصول کرتا ہے، اتنے ٹکے سوا لیتے ہیں، رشوت اور تعلقات کی بنیاد پر نوکریاں اور ٹھیکے بانٹتا ہے، اپنے ضمیر، ایمان اور انصاف کے اصولوں کو ترک کر کے اپنے بالادستوں کے اشارے پر غلط کام کرتا ہے اور جھوٹی رپورٹیں بھیجتا ہے۔ کمشنر کی مدد کے لیے ایک گورا آئی سی ایس افسر بطور اسسٹنٹ کمشنر اور تین دیسی ڈپٹی کلکٹر مقرر ہوتے تھے۔ ان میں سے ایک کو ہیڈ اسسٹنٹ کمشنر کہا جاتا تھا۔ اس کا رابطہ پبلک سے ہوتا تھا۔ کمشنر کے سائے میں رہنے کی بدولت اس کی بھی بڑی دھاک ہوتی تھی۔ زمیندار تو اس کے دروازے پر دھکے کھایا کرتے تھے۔ خان بہادر نبی بخش محمد حسین مرحوم، جو بعد میں کئی اونچے عہدوں سے ہوتے ہوئے آخر بہاولپور ریاست کے وزیرِ اعظم بنے، نامور ہیڈ اسسٹنٹ کمشنر تھے۔ خلافت تحریک کے زمانے میں انہوں نے انگریزوں سے وفاداری کا ثبوت دیا اور اس کے نتیجے میں انگریز کمشنر کی ناک کا بال بن گئے۔ سندھ کے وڈیروں کے معاملے میں سفید و سیاہ کا اختیار انہیں کے پاس تھا۔ کسی کو کھل، کسی کو ڈمر، کسی کو خطاب دلواتے، کسی کو کمشنر کے دربار میں کرسی مرحمت فرماتے۔ فریئر ہال کے پاس ان کا بنگلا تھا۔ وڈیروں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے رہا کرتے۔ ان کا رہن سہن اور طرزِ تعلق انگریزی نمونے کا تھا اور کسی کو خواہ مخواہ

ایسے سے بے تکلف نہ ہونے دیتے۔

کراچی کے کلکٹر بھی سینیئر آئی سی ایس انگریز ہوتے۔ کیا شان تھی، کیا آن بان تھی! سب سے پرے رہتے۔ جسے اچھا سمجھتے اس کی عزت کرتے، مگر اس طریقے سے کہ وہ ان سے قربت کا ناجائز فائدہ نہ اٹھا سکے۔ جاڑوں میں شہر سے نکل کر ضلعے کا گشت کرتے۔ سامان اونٹوں پر، صاحب خود گھوڑے پر، ایسا خرچ، ایسا کھانا پینا، نہ ٹھک ٹک نہ جھک جھک۔ ان کے سر رشتہ دار، کارندے اور بیٹھے والے البتہ مختیار کاروں اور تپے داروں سے رسائی (مہمانی) وصول کیا کرتے مگر اس کی مقدار ایسی کمر توڑ نہ ہوتی تھی۔ دودھ، گھی، سیر دو سیر آٹا اور چاول، اور ایک آدھ مرغی یا میمنا وغیرہ۔ اگر صاحب کے باورچی خانے کے لیے کسی چیز کی ضرورت پڑتی تو صاحب اس کا بل اپنی جیب سے ادا کرتے۔

سیاسی اعتبار سے کراچی میں سندھ کے بزرگوں کی بڑی تعداد تھی۔ ایک ہی وقت میں بڑے بڑے لوگ وہاں پیدا ہوتے رہے۔ سندھ کی سیاست کے تمام عروج و زوال وہیں پیش آتے۔ کس کس کا نام لیا جائے؟ مسلمان، ہندو، پارسی لیڈر، سب باوقار، اعلیٰ اخلاق کے صاحبان اور اعلیٰ اصول رکھنے والے۔ سیٹھ ہرچند رائے وشنداس، جمشید مہتا، سر حاجی عبداللہ ہارون، غلام علی چھاگلا، سیٹھ غلام حسین قاسم، خواجہ فقیر محمد درا خان، میر ایوب خان، طیب علی علوی، حاتم علوی، خان بہادر بابا، خان بہادر ولی محمد حسن علی، بابا میر محمد بلوچ، حکیم فتح محمد سیوہانی، مولانا محمد صادق کھڈے والے، مولانا عبدالکریم درس اور ان کے فرزند اور جانشین مولانا ظہور الحسن درس، شیخ عبدالمجید سندھی، جہانگیر پنتھکی، سر جہانگیر کوٹھاری، سر کاوس جی جہانگیر، سر مونٹیگو ویب، اے ایل پرائس، خان صاحب بابو فضل الٰہی، محمد ہاشم گزدر، بی ٹی ٹھکر، روپ چند بیلارام، موتی رام عیدن مل، قاضی خدا بخش، قاضی عبدالرحمن اور دوسرے۔

۱۹۲۴ء کے لگ بھگ سندھ کے دیہات کے کئی سر برآوردہ بزرگوں نے بھی کراچی میں بنگلے بنوا کر زیادہ تر وہیں رہنا شروع کر دیا، مثلاً سر شاہنواز خان بھٹو، خان بہادر محمد ایوب کھوڑو اور جی ایم سید۔ ان کے کراچی میں رہنے کی بدولت سندھ کے مرکزی شہر کراچی اور سندھ کے دیہات کی سوچ بچار میں خاصی ہم آہنگی اور موافقت نظر آنے لگی۔

جب تک اس پائے کے بزرگوں کے ہاتھ میں سندھ کی سیاست رہی، سندھ کی شان اور بان ہی کچھ اور تھا۔ خود ان لوگوں کا ذاتی کلچر اور بزرگی کا انداز پدرانہ اور مشفقانہ تھا۔ وہ صوبے کے تمام ماحول پر اثر انداز رہے۔ کس کی مجال تھی کہ اخلاق سے گری ہوئی بات کرے یا سیاست میں بد اخلاقی کا مظاہرہ کرے۔ غرض یہ لوگ سندھ کے جملہ معاشرے کے ستون تھے۔ میں یہ فرق بخوبی محسوس کر رہا ہوں۔ ان کی آنکھیں بند ہونے سے سندھ یتیم ہو گیا ہے؛ نہ کوئی روکنے ٹوکنے والا رہا نہ ہمت کر کے حق بات کہنے والا۔ اندھے کی جورو، اللہ کی اماں میں!

کراچی کو انہیں لوگوں نے سجایا۔ سندھ کو انہیں لوگوں نے سنوارا۔ آج تک لاکھوں لوگ براہِ

است یا بالواسطہ طور پر ان کے عملِ صالح کا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ یہ الگ بات کہ اب ان کا نام لینے والا بھی کوئی نہیں رہا۔

کراچی دو تین اَور باتوں میں بھی مرکزی حیثیت رکھتا ہے ــــ یعنی سندھ کی اخباری دنیا اور تعلیمی معاملے میں۔

اخبارات کم تھے مگر اخبار نویس لالچی اور بیوپاری مزاج رکھنے والے اور سازشی نہ تھے۔ اخبارات کچھ اصولوں پر کاربند رہتے تھے۔ مثلاً انگریزی اخباروں میں سِنْدھ آبزرور، جو سادھو واسوانی کی نگرانی میں نکلتا تھا، ہندوستان کی آزادی اور انگریز کی مخالفت کے لیے وقف تھا۔ ۱۹۲۴ کے آس پاس سیاسی تحریک میں وقتی طور پر سکون آیا تو یہ اخبار بند ہو گیا۔ انگریز حکومت کا نقطۂ نگاہ پیش کرنے کے لیے ڈیلی گزٹ تھا جس کے نامور ایڈیٹر سر مونٹیگو ویب تھے۔ ہندوؤں کے مفاد کو آگے بڑھانے کے لیے سندھ آبزرور میدان میں آیا۔ اس کے ایڈیٹر، آخری زمانے میں، ایک کٹّر مدراسی ہندو کے پُنیا تھے۔ اس اخبار کا اصول تھا کہ انگریز کو نکال کر ملک میں ہندوراج مسلط کیا جائے۔

شروع میں مسلمانوں کے پاس ایسا کوئی اخبار نہ تھا۔ سب سے پہلے روزنامہ الوحید، خلافت تحریک کے زمانے میں حاجی عبداللہ ہاروں کی ہمت افزائی اور شیخ عبدالمجید سندھی اور ان کے چند سرفروش ساتھیوں کی محنت سے نکلا اور پورے انقلابی دور میں، یعنی ۱۹۱۹ سے ۱۹۵۴ تک، مسلمانوں کی وکالت کرتا رہا۔ شیخ صاحب کی بھی جوانی تھی اور سندھ کے مسلمانوں کی امیدوں کا آغاز۔ الوحید حکومت کا مخالف تھا، آمدنی کا ذریعہ صرف غریبوں کی جانب سے ملنے والا چندا، کبھی کبھی قیدو بند کی صعوبتیں، ضمانتیں، ضبطیاں، قرض کی قرقیاں تو روزمرہ کا معاملہ تھیں، کبھی کاغذ نہیں ہے تو کبھی ڈاک کے ٹکٹ خریدنے کے لیے پیسے نہیں۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب سرکار نے الوحید کے ایڈیٹروں کو جیل بھیجنے کا سلسلہ شروع کیا، ایک کے بعد ایک ایڈیٹر گرفتار ہو کر جیل جاتا رہا۔ آخر سرکار خود تنگ گئی، لیکن الوحید کے ایڈیٹر ختم نہ ہوئے۔ اس دور میں کتنے ہی بہادر لوگ میدان میں نکلے، مثلاً مولانا دین محمد وفائی، میاں دین محمد علیگ، عبدالسلام، اللہ بخش ٹالپر، رئیس حاجی علی محمد مری، مولانا عبدالکریم چشتی، قاضی عبدالرحمٰن وغیرہ۔ یہ لوگ اصول پرستی، سرفروشی اور راست گوئی کا ایک بڑا ورثہ چھوڑ گئے جسے بر باد کرنے میں بھی بعد والوں کو بیس سال سے زیادہ کا عرصہ لگا۔

۱۹۲۴ کے لگ بھگ سندھ کے ہندوؤں میں تنگ دلی پیدا ہوئی۔ وہ آزادی کے بہانے سندھ کے مسلمانوں سے مخالف سمت میں قدم اٹھانے لگے۔ اس کام کے لیے انھوں نے متعدد اخبار سندھی زبان میں بھی نکالے۔ ہندو، ماترِ بھومی، سنسار سماچار وغیرہ۔ ان کی کوشش تھی کہ سندھ کی صحافتی زبان میں ہندی اور سنسکرت کے الفاظ کثرت سے شامل کر کے پہلے سندھ کی روایتی زبان پر اور پھر سندھ کے کلچر پر حاوی ہو جائیں۔ الوحید تنہا ان سب کا مقابلہ کرتا رہا۔

تعلیم کے شعبے میں سندھی مسلمانوں کا ادارہ صرف سندھ مدرستہ الاسلام تھا جہاں سے ایسے وقت کے اکابر پڑھ کر نکلے۔ قائداعظم نے بھی شروع میں یہیں تعلیم پائی۔ مرحوم خان بہادر حسن علی آفندی نے یہ مدرسہ قائم کر کے سندھ کے مسلمانوں پر بہت بڑا احسان کیا۔ اگر یہ مدرسہ نہ ہوتا تو سندھ کے مسلمانوں میں تعلیم نہ آتی، تعلیم نہ آتی تو ان میں سیاسی شعور پیدا نہ ہوتا، سیاسی شعور پیدا نہ ہوتا تو سندھ بمبئی سے علیحدگی کی تحریک نہ چلتی، اور سندھ بمبئی سے علیحدہ نہ ہوتا تو پاکستان بھی نہ بنتا۔ بات سے بات نکلتی ہے۔

مقابلتاً ہندوؤں کے تعلیمی ادارے البتہ تعداد میں زیادہ اور مضبوط تھے۔ ڈیارام جیٹھمل کالج، این جے وی ہائی اسکول اور لا کالج، سندھ میں ہندو قوم کو بنانے اور آگے بڑھانے میں ان اداروں کا خاصا حصہ رہا۔ ان کے پرنسپل میں ایسے دور کے بڑے بڑے استاد تھے۔ پرنسپل شاہانی، ڈاکٹر گربخشانی (جنہوں نے شاہ جو رسالو بڑی محنت سے مرتب کر کے تین جلدوں میں شائع کیا اور سندھ پر بڑا احسان کیا)، پرنسپل شاہانی، اور دوسرے کئی پروفیسر جن کی زندگی تعلیمی ماحول میں گزری اور وہ اس سے باہر نہ نکلے۔

سندھ مدرسے کے پرنسپل بھی شروع میں تو غیر مسلم مقرر ہوتے رہے، آخر میں شمس العلماء ڈاکٹر داؤد پوتو مرحوم آئے۔

اس میں شک نہیں کہ اُس زمانے میں سندھ کی سیاست کا رخ آزادی کی طرف موڑنے میں ہندو عنصر کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ وہ تعلیم میں مسلمانوں سے آگے تھے۔ ان کی مڈل کلاس طاقتور تھی۔ بیرونی دنیا سے وہ زیادہ واقف تھے۔ کانگریس کی تحریک سے متاثر ہو چکے تھے۔ انگریز کا رعب اُن پر سے ختم ہو چکا تھا، کسی بھی چھوٹی بڑی بات پر مقابلہ کرنے کو تیار ہو جاتے تھے۔ ستیہ گرہ، سول نافرمانی، عدم تعاون، لاٹھی چارج، آنسو گیس، گولیاں، جیل وغیرہ کی منزلیں طے کر آئے تھے۔ البتہ مسلمانوں سے ان کی نہ بنتی تھی۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ آخر کار ملک میں اپنا راج قائم کریں۔ مگر اس کے باوجود یہ ماننا پڑتا ہے کہ ان کے نکل جانے کے بعد کسی حد تک سندھ کی صوبائی سیاست سے خودداری، آزاد خیالی اور قربانی کے اجزا گم ہو گئے۔ سندھ کے بمبئی سے الگ ہونے کے بعد (۱۹۳۷ میں) سندھ کے دیہات کے بعض ناخواندہ اور اہلکاروں کے سکھائے پڑھائے وڈیروں نے، اپنی عددی برتری کی بنیاد پر اسمبلی میں داخل ہو کر، سیاست کو آلودہ کر دیا اور سندھ کی علیحدگی کے حقیقی مقصد کو نظرانداز کر کے خود انہیں ہندوؤں کے ہاتھوں میں کھیلنے لگے۔ اس صورت حال نے مجموعی صوبائی سیاست کو کتوں کی نقے سا دیا۔ اس میں کچھ جان نہ رہی۔ صرف جوڑ توڑ، دروغ گوئی، ضمیر فروشی، بے اصولی اور ابھرتے سورج کی پوجا کرنے کی عادتیں اور قباحتیں رواج پا گئیں۔

مگر اس کا مطلب یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اس عام ماحول میں خود کراچی میں بھی قحط الرجال پیدا ہو گیا۔ وقتاً فوقتاً وہاں چند مسلمان قومی رہنما ایسے ضرور ابھرتے رہے جو سیاسی شعور، آزاد خیالی، عزتِ نفس،

سختیاں اٹھانے کی اہلیت اور اصولوں پر جان دینے میں سندھیوں سے کسی بھی طرح پیچھے نہ تھے۔ یہ لوگ کارکنوں کی پیروی کرنے والے نہ تھے۔ مثلاً شیخ عبدالمجید، مولانا محمد صادق کھڈے والے، مولانا عبدالکریم درس، مولوی محمد صدیق، ماسٹر محمد خان (جو اصل میں بنگال کے تھے مگر کراچی میں آبسے تھے)، بابا میر محمد بلوچ، محمد ہاشم گذدر، مولوی عبدالحق حقانی، ظہورالحسن درس، حافظ شریف حسین، قاضی خدابخش اور الوحید میں کام کرنے والے پورے گروپ نے سندھ کے مسلمانوں کی سیاست کے ترقی پسند اور انقلابی پہلو کو نمایاں رکھا۔ ان میں اکثر غریب لوگ تھے، لیکن غربت میں انسانیت کا شرف برقرار رکھنا کوئی ان سے سیکھ سکتا تھا۔ مولانا عبدالکریم درس کی مثال لیجیے۔ خلافت تحریک کے ابتدائی دور کے آدمی تھے۔ جن لوگوں نے ان کو سنا ہے ان کا متفقہ فیصلہ ہے کہ شعلہ بیان مقرر تھے۔ جب پہلی عالمی جنگ ختم ہوئی (جس کے دوران مسلمانوں نے انگریزوں کی مدد کی تھی) اور انگریزوں نے جنگ سے جان چھڑا کر ترکی کی طرف تیر سیدھے کرنے شروع کیے اور خلافت ختم کرنے پر کمر بستہ ہوئے تو مولانا درس نے جونا مارکیٹ کے پاس ایک عام جلسے میں تقریر کرتے ہوئے یہ شعر پڑھا

سگت را جونِ دل دادم کہ با من آشنا گردد

رحتِ خود ندانستم کہ او دیوانہ خواہد شد

ایک اور موقعے پر سندھیوں کو مخاطب کرکے یہ بیت پڑھا

روے وفا نہ دید ز یارانِ ہم وطن

شاید کہ درس رو بہ دیارِ دگر کند

مولوی صاحب کو اس صاف گوئی کی پاداش میں کئی بار جیل میں بھی ڈالا گیا مگر وہ مرتے دم تک اپنے اصولوں سے نہ ہٹے۔

اسی طرح مولانا عبدالحق حقانی نے بھی مسلم لیگ کی تحریک کے دوران جواں مردی کے جوہر دکھائے۔ مسلم لیگ کا جب بھی جلسہ ہوتا تو ان سے نظم پڑھوائی جاتی جو وہ بڑی خوش الحانی سے اور موثر انداز میں گا کر سناتے۔ نظم تھی

مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ

باطل پہ اڑے ہیں کانگرسی

کرتے نہیں حق کی دادرسی

کچھ اور ہے ان کے دل میں بسی

وغیرہ۔

بابا میر محمد بلوچ تو آخر بلوچ تھے، سرفروش، بے خوف، انگریزوں کے جانی دشمن، سندھیوں سے بیزار۔ رات دن حکومت کے خلاف ہنگامہ اٹھائے رکھتے۔ بمبئی کاؤنسل کے ممبر منتخب ہوئے۔ انگریزی

نہ جانتے تھے، مگر اس سے اُس سے انگریزی میں سوال لکھوا کر کاؤنسل میں بھیجتے اور یوں حکومت کی جوت پردہ دری کرتے۔ جس سوال کو پوچھتے ہوئے دوسرے ممبر کانپنے لرزنے لگتے (کہ مبادا حکومت خفا ہو جائے) وہ سوال ماما میر محمد ڈنکے کی چوٹ پر پوچھ بیٹھتے۔

پرانے کراچی کی کئی سوغاتیں ناقابلِ فراموش تھیں جیندو حلوائی کا دھندا گیری حلوا، سیفی ہوٹل (الفنسٹن اسٹریٹ) کی مکس پلیٹ، بوتری بازار کے سامنے یوسف پارسی کی چائے، جے بلس کا سینٹ، اسپنگلی دواخانے کا ملسیر، سکوپرا فوٹوگرافر کے فوٹو، حسن علی کے کارخانے کا سوڈا لمنیڈ، اسلامی ہوٹل کی بریانی، محمد صدیق کی دکان کے بوٹ، ماما میر محمد بلوچ کی دکان کی ترکی ٹوپیاں، بولٹن مارکیٹ کے سامنے سدو ماسائی کی دکان کی پکی پلا اور مچھلی، حکیم فتح محمد سیوہانی کی زکام کی گولیاں، حکیم علی محمد قادری کی یاقوتی؛ جونا مارکیٹ کے چوک پر عزیز کے ہوٹل کے نان پائے، حاجی ڈوسل، سلیمان عمر اور حسین بھائی کی بندوقیں اور کارتوس، کیفے گرانڈ کے کیک اور پیسٹریاں۔

کراچی کا پھیلاؤ اُن دنوں اتنا زیادہ نہیں ہوا تھا۔ جھیل کے ارد گرد جنگل میں میں نے تیتروں کا شکار کیا ہے۔ ٹریڈنگ اسٹیٹ کے علاقے میں بھیڑیوں سے ملاقات ہوتی جو منگھوپیر کی سمت سے شہر کی سیر کو آتے۔ لیاری کے کچھ حصوں میں کھڑے پانی کے تالاب تھے جہاں بطخوں کا شکار ہوتا تھا۔ پی ای سی ایچ کے جنگل تو باقاعدہ شکار گاہ تھے۔

سنجیدگی، شائستگی، پروقار صورت، گفتگو کی شیرینی، رندگی کے اصولوں کی پاس داری، ضمیر کی آزادی، خودداری، حکیم فتح محمد سیوہانی ان سب اور بے شمار دوسری خوبیوں کا مجموعہ تھے۔ وہ سیوھن سے اُبھرے، کراچی کے افق پر چمکے اور سالہاسال سندھ کی ثقافتی، علمی اور ادبی محفلوں کو منور کرتے رہے۔ انہیں دیکھ کر اور سن کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ماضی کے سندھ کے شرفا اور خاندانوں کے سلسلے کی تقریباً آخری کڑی تھے۔ جب مجھے ان سے واقفیت کا شرف حاصل ہوا، تب وہ گاڑی کھاتے میں، کچہری روڈ پر رہتے تھے۔ دو منزلہ مکان تھا، نیچے مطب اور محفل گاہ، اوپر کی منزل پر مہمان خانہ۔ ہر وقت ملاقاتیوں میں گھرے رہتے۔ سندھ سے آئے ہوئے میر، پیر، بڑے زمیندار اور جاگیردار تو انہیں نبض دکھا کر اور پوشیدہ امراض خصوصاً کم طاقتی کی شکایات بیان کر کے گولیاں، معجونیں، لیپ اور کشتے لیتے اور رخصت ہو جاتے، مگر غریب قومی ورکر یا ادیب تمام دن انہیں چمٹے رہتے۔ ان کا علاج مفت ہوتا تھا۔ وقت آنے پر کھانا بھی کھلایا جاتا، رات پڑنے پر بستر دے کر سلایا بھی جاتا۔ اکثر واپسی کا کرایہ بھی دے کر، پیشانی پر بل ڈالے بغیر، ہنستے مسکراتے رخصت کیا جاتا۔ دہلی کے حکیم اجمل خان کا دم بھرتے تھے۔ واقعی سندھ کے اجمل خان تھے۔ جیسے طبیب تھے ویسے ہی ادیب، جیسے سیاست کے ماہر ویسے شاعر۔ میلان

کانگریس کی طرف تھا۔ سیوہن کی فضا میں ابتدائی تربیت ہوئی تھی جہاں ہندو مسلمان سب ایسی ایسی جگہ قابلِ قدر تھے۔ فرقہ وارانہ عقیدہ جاواں کی سمجھ ہی میں نہ آتے تھے۔ میروں کی حکومت پر خاص تحقیق کی تھی اور ایسے راج کی خوبیوں کی حسر پا چکے تھے اس لیے انگریزوں سے ان کی ذرا نہ بنتی تھی۔ صاحب لوگوں کی شکل دیکھنے کے روادار نہ تھے۔ کچہری روڈ پر رہتے ہوئے بھی کبھی کچہری (کلکٹر کے دفتر) کا منہ نہ دیکھا۔ عربی فارسی کے عالم تھے، مگر علم یا مذہب کو کبھی آمدنی کا ذریعہ نہ بنایا۔ نہ مذہب کو انسانی خون بہانے کے لیے استعمال کیا نہ علم کو فتنہ جوئی اور شر انگیزی کے لیے۔

کراچی کی آب و ہوا میں مجھے اکثر انفلوئنزا ہو جاتا تھا۔ حکیم صاحب کے پاس اس مرض کی زود اثر گولیاں تھیں۔ گولیوں کی ڈبیا میری جیب میں ڈال کر ہدایت کرتے کہ جب یہ ختم ہو جائے تو دوسری ڈبیا لے جانا۔ میں نہ جا پاتا تو خود گھر آ کر دے جاتے۔ ۱۹۳۹ کے شروع میں مجھے جوڑوں کا درد ہو گیا۔ انھوں نے حکم دیا کہ ملیر میں جا کر رہوں جہاں کی آب و ہوا نسبتاً خشک ہے۔ میں نے کہا، وہاں رہ کر آپ سے کیوں کر علاج کراؤں گا؟ فرمایا، میں خود روز ملیر آ کر دیکھ جایا کروں گا، اور یہی کرتے رہے۔

حکیم صمصام کا پورا اور درست نام تو خدا جانے کیا تھا، مگر یہاں اسی نام سے مشہور تھے۔ کراچی کے میمن سیٹھوں نے انھیں دہلی یا لکھنؤ سے بلوا کر اپنے پاس رکھا تھا۔ اُس زمانے میں میمن سیٹھوں کو کم طاقتی کی خاص شکایت ہوتی تھی۔ بہت بیٹھے رہنے کی وجہ سے مٹاپے کی بیماریاں ہو جاتیں جن کی علامات چھپائے نہ چھپتیں۔ بازار کے اتار چڑھاؤ کے باعث کسی قدر مالیخولیا بھی شاملِ حال رہتا۔ سندھ کے طبیب سستے تھے اس لیے بے کار سمجھے جاتے تھے۔ چناں چہ علاج کے لیے باہر سے مہنگے حکیم بلوائے جاتے۔ مگر حکیم صمصام ان میں سے نہ تھے۔ بے حد سادہ تھے، لمبا کوٹ، سادی قمیص، نیچے علی گڑھی پاجامہ، سر پر کھال کی ٹوپی۔ ہمیشہ پیدل گھومتے تھے۔ کسی سے بات چیت نہ کرتے۔ کوئی کچھ پوچھتا تو دو لفظوں میں جواب دے کر خاموش ہو جاتے۔ کسی سے ایک پیسا نہ لیتے۔ مریض علاج کرانے پر مصر ہوتا تو کاغذ کے پرزے پر نسخہ لکھ دیتے۔ کھانے کے لیے کوئی مقرر جگہ نہ تھی، جہاں بھی مل جائے کھا لیتے، نہ ملے تو نہ سہی۔ عجب لااُبالی اور بے پروا طبیعت کے انسان تھے۔ محفل میں موجود رہتے مگر گفتگو میں حصہ نہ لیتے۔ بحث مباحثہ زور پکڑ جاتا تو اٹھ کر چلے جاتے۔ یاری دوستی سے دور رہتے۔ نہ خود کسی کے قریب جاتے نہ کسی کو قریب آنے دیتے۔ میں نے ایسی زندگی میں ایسی کمال بے نفسی اُنھیں میں دیکھی۔ عمر کے آخری حصے میں کراچی آئے تھے اور انتقال بھی شاید وہیں ہوا۔ سیٹھ لوگ سمجھتے تھے کہ اتنا بے پروا شخص ضرور کیمیا گر ہی ہو سکتا ہے۔ یہ بات ان کے خیال میں نہ آتی تھی کہ جس شخص نے زندگی کی بے ثباتی کو محسوس کر کے اپنی حاجتوں کو محدود کر لیا ہو اس سا کیمیا گر کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

سندھی کے دو ماسٹر تھے جو پاجوج ماجوج کہلاتے تھے۔ جو ہلی کوارٹر کے ایک سندھی اسکول میں

سندھی اور حساب پڑھاتے تھے۔ ایک کا نام قاسم تھا، دوسرے کا نام ذہن سے اتر گیا ہے۔ پڑھائی میں کافی نام پیدا کیا، لیکن اسکول سے باہر پاگل پنے کی حرکتیں کیا کرتے تھے۔ بلیوں سے خاص دوستی تھی۔ پوری تنخواہ انھیں چھیچھڑے کھلانے میں صرف کر دیا کرتے۔ بلیوں نے ایسے محسنوں کو پہچان لیا تھا! گلیوں میں گھومتے تو آگے آگے خود، پیچھے بلیاں میاؤں میاؤں کرتی چلتیں۔

دنیا جہان کے ہر مسئلے پر لوگوں کی رہبری کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے، جہاں چہ ہر سمت میں تاروں اور خطوں کی جھڑی لگائے رکھتے۔ ۱۹۳۷ کے آس پاس ہٹلر نے جنگ پر کمر باندھی تو اسے تار بھیجا کہ یورپ میں خون بہانے کے بجائے ہندوستان آ کر انگریزوں سے جنگ کرو، ورنہ شکست کھاؤ گے۔ یہ تار سنسر ہو گیا اور سی آئی ڈی دونوں ماسٹروں کو کتنے ہی دن گھسیٹے پھری۔ آخر انگریزوں نے فیصلہ کیا کہ دونوں پاگل ہیں۔ دماغ خراب ہے، مگر نیت خراب نہیں۔ اللہ نے بلیوں کی دعائیں سنیں اور ان کی جان چھوٹی۔

ایک پرانے دوست نے ان کے بارے میں ایک قصہ سنایا۔ کہنے لگا ایک بار انھوں نے برطانیہ کے شاہی گھرانے سے بھی ناتا جوڑ لیا تھا۔ ایک شہزادی (احتراماً نام نہیں لکھتا) کی منگنی کا چرچا ہوا اور اخباروں میں اس کی تصویریں نکلیں تو بڑے ماسٹر کا دل آ گیا۔ فوراً شہزادی کے والد کو ارجنٹ تار بھیجا کہ اپنی دختر کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیجیے۔ میری علمی لیاقتیں یہ ہیں، سیاست میں وہ پوزیشن ہے کہ گاندھی جی بھی میرے مشوروں پر چلتے ہیں۔ ہمارے اس رشتے سے ہندوستان کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا اور برطانیہ کے سر کا درد ختم ہو گا۔ لندن سے اس تار کی رسید آ گئی۔ محلات کے سیکرٹری نے عام دستور کے مطابق چھپے ہوئے کاغذ پر رسید بھیج دی۔ رسید کا مضمون وہی تھا جو ہر مراسلے کے جواب میں استعمال کیا جاتا تھا، یعنی آپ کا مراسلہ پہنچا، اس پر غور کیا جائے گا۔ شاید کسی کلرک نے تار پڑھے بغیر یہ فارم بھر کر بھیج دیا تھا۔

بہرحال، رسید ملتے ہی ماسٹر صاحب کو دولہا کی ذمے داریوں کا احساس ہونے لگا۔ کئی مسائل اٹھ کھڑے ہوئے مثلاً، مذہبی قضیے کو کیوں کر طے کیا جائے؟ آپ مسلمان اور شہزادی عیسائی، شہزادی کے مشرف بہ اسلام ہونے کی منزل نکاح سے پہلے آئے گی یا بعد میں؟ نکاح لندن میں ہو گا یا کراچی میں؟ جہیز اور بری کے سلسلے میں کیا طریقہ اختیار کیا جائے گا؟

مجھ پر ان کی خاص مہربانی تھی، رازداری کی باتیں اکثر مجھی سے آ کر کرتے تھے۔ ایک دن میرے گھر آ پہنچے۔ آگے آگے بڑے ماسٹر صاحب، پیچھے پیچھے ان کا بھائی۔ بڑے ماسٹر کے گلے میں پھولوں کا ہار۔ ہنستے مسکراتے نمودار ہوئے۔ چھوٹے بھائی نے مسکراتے ہوئے بتایا کہ بھائی صاحب کو مبارک باد دیجیے! برطانیہ کی فلاں شہزادی سے ان کی شادی ہو رہی ہے۔ یہ کہا اور لندن سے آئی ہوئی تار کی رسید جیب سے نکال کر دکھائی۔

میں نے مشورہ دیا کہ مذہبی معاملات پر شہر کے قاضی صاحب سے صلاح کریں، مگر اس سے پہلے

ضروری ہے کہ کمشنر صاحب سے جا کر ملیں، چوں کہ یہ مراسلت ضرور کمشنر صاحب کے پاس آئی ہو گی۔ اگر انھوں نے سفارش نہ کی تو شاید شادی میں خلل پڑے، اس لیے پہلے ہی ان سے مل کر انھیں اس رشتے کے فوائد سے آگاہ کریں اور اسی طرف مائل کریں تاکہ وہ اوپر اچھی رپورٹ بھیجیں۔ میں نے یہ بھی صلاح دی کہ چوں کہ برطانیہ کے خاندان کتوں بلیوں کے شوقین ہوتے ہیں، اس لیے ماسٹر صاحب اپنی بلیوں کی تصویریں اتروا کر کمشنر صاحب کو دیں تاکہ انھیں بھی خط و کتابت کا حصہ بنایا جائے۔

سندھ کے کمشنر اُس زمانے میں گبس صاحب تھے، جو خود بھی ہنسی مذاق اور کھلنڈرے پن میں خاصے مشہور تھے۔ ماسٹر صاحباں بلیوں کے فوٹو اتروا کر ان کے پاس بھیجے۔ کمشنر صاحب کو لندن سے آئی ہوئی تار کی رسید دکھا کر عرض کی کہ اس رشتے کی سفارش فرمائیں۔ گبس صاحب انھیں پہچانتے تھے۔ ذرا دیر میں معاملے کی تہہ کو پہنچ گئے۔ کہنے لگے اچھا کیا جو پہلے ہی سے میرے پاس چلے آئے۔ یہ خط و کتابت واقعی میرے پاس آئی ہوئی ہے اور میں رپورٹ بھیجنے سے پہلے انکوائری کر رہا ہوں۔ مگر ایک رکاوٹ شاید پیدا ہو۔ دولہا کی عمر پچاس سے زیادہ ہے اور دُلھن کی مشکل سے بیس سال۔ یہ بیل شاید منڈھے نہ چڑھے۔ لہذا گبس صاحب نے ماسٹر صاحباں کے آگے ایک متبادل تجویز رکھی۔ بولے اگر شہزادی والا معاملہ عمر کے فرق کے سبب کامیاب نہ ہو سکے تو اُسی گھرانے کی ایک دوسری شہزادی آج کل میرے پاس مہمان ہے۔ وہ آپ کی ہم عمر ہے، بلیوں کی شوقین ہے اور خاصی دولت مند بھی۔ اگر آپ قبول کریں تو یہ کام فوراً ہو سکتا ہے۔ یہ کہہ کر گبس صاحب نے ایک گوری عورت نہ جانے کہاں سے بلوا کر انھیں دکھلائی۔ معلوم نہیں ان کی اپنی بیوی تھی یا کیپیٹل گرانڈ کی مالکہ۔ (کیپیٹل گرانڈ کی مالکہ اُن دنوں ایک بوڑھی فرنچ عورت تھی جسے لوگ میڈم صاحب پکارتے تھے۔)

'ماسٹر صاحباں اس پر، یوں پر غور کرنے کے لیے مہلت لے کر میرے پاس آئے۔ میں نے کہا: جلدی کرنا مناسب نہیں۔ جب نوجوان شہزادی مل سکتی ہے تو اس بڑھیا سے شادی کرنے کا کیا فائدہ؟ جلدی کا کام شیطان کا۔ کچھ دن بعد لندن میں شہزادی کی شادی ہو گئی اور ماسٹر صاحب کی امیدوں کا سونا سو کھ گیا۔

کراچی کا ہر چھوٹا بڑا اُنھیں پہچانتا تھا۔ ہر ایک کو معلوم تھا کہ جب بھی کوئی آئینی مسئلہ ہندوستان میں، یا وزارتوں کے بننے یا گرنے کا معاملہ سندھ میں، پیدا ہوتا ہے تو ماسٹر صاحباں حسب دستور اپنے مشوروں سے، تاروں اور خطوں کے ذریعے، ہر متعلقہ فریق کو مستفید کرتے ہیں اور اس مراسلت کی نقلیں ہمیشہ اپنی جیبوں میں رکھتے ہیں۔

سندھ کے وزیروں سے ملنے اور ان کی رہبری کرنے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے۔ میں وزیر بنا تو مجھے بھی اپنی ملاقاتوں سے نوازنے لگے۔ ایک دفعہ دفتر میں بیٹھنے والے نے ان کا ملاقاتی کارڈ لا کر دیا۔ چھپے ہوئے کارڈ پر ان دونوں کے ناموں کے نیچے ان کی تعریف یوں لکھی ہوئی تھی

میکر آف پاکستان، میکر آف سندھ علی منسٹری، بیٹر آف اللہ بخش منسٹری، ایمپیرر آف

مٹر، آرکیٹکٹس آف انڈیا پاکستان فریڈم، ویل وشرر آف جمشید مہتا پریذیڈنٹ کراچی میونسپلٹی، کینڈیڈیٹس آف پریذیڈنٹ شپ آف پاکستان، کنٹرولرز آف سندھ منسٹریز، کلور ٹورائل ہاؤس آف ریش، لنگر آف گاؤنز اینڈ گولیئر وغیرہ۔

میں ان کی تعریف پہلے ہی سن چکا تھا۔ کرسی سے اٹھا اور دروازے کے باہر جا کر ان کا استقبال کیا اور اندر لا کر اپنے پاس بٹھایا۔ وہ ہمارے وزیراعلیٰ پیرزادہ عبدالستار سے بےحد ناراض تھے کیوں کہ انھوں نے ان کی قدر نہیں پہچانی تھی اور ملاقات کے وقت گرموشی سے استقبال نہ کیا تھا۔ فرمایا ہم پیرزادہ کو ہٹا کر تمھیں وزیراعلیٰ بنانے آئے ہیں۔ میں نے پوچھا یہ کیوں کر ہوگا۔ بولے سیدھی بات ہے۔ جب پیر موجود ہے تو زادگاں کی کیا ضرورت۔ منطق پڑھے ہو؟ یہ منطق کا مسئلہ ہے۔

مجھے بھی مذاق سوجھا۔ میں نے کہا، پیرزادہ صاحب کو اسمبلی سے بےدخل کریں تب بات ہے۔ بولے ہم تیار ہیں۔ خود جا کر پیرزادہ صاحب کی کرسی پر قبضہ کرلیں گے۔ اتنا کہہ کر میرے پاس سے اٹھے اور اسمبلی ہال میں، وزیروں کی آمدورفت کے درمیان، کسی طرح اندر گھس کر وزیراعلیٰ کی بنچ پر جا بیٹھے۔ پیرزادہ صاحب اور میں اسمبلی میں داخل ہوئے۔ ہم دونوں ایک ہی بنچ پر بیٹھتے تھے۔ پیرزادہ صاحب شگفتہ طبیعت کے انسان تھے، ماسٹر صاحباں کو اپنی بنچ پر بیٹھا دیکھ کر ہنسنے لگے۔ مجھ سے پوچھا، یہ کیا ہے؟ میں نے کہا ان کا دعویٰ ہے کہ یہ میکرز آف پاکستان ہیں، جو چاہیں کرسکتے ہیں۔ جلد یا بدیر انھیں کو آنا ہے۔ اچھا ہوا کہ پہلے ہی اپنی جگہیں حاصل کرلیں، ہمارے آپ کے سر کا درد ٹلا۔ پیرزادہ صاحب نے آگے بڑھ کر انھیں اٹھانے کی کوشش کی تو انھوں نے صاف انکار کردیا۔ بولے ہم پاکستان کے بانی ہیں، اور آج ہم نے تمھیں ڈس مس کرکے وزارت اعلیٰ پر قبضہ کرلیا ہے۔ اسمبلی کی گھنٹی بجنے لگی۔ جب انھوں نے شام کو دفتر میں آکر ملنے اور اس مسئلے پر غور کرنے کی بھی پیش کش قبول نہ کی تو ان دونوں کو اسمبلی کے عملے کے ذریعے زبردستی باہر نکلوایا گیا۔ جاتے جاتے انھوں نے پیرزادہ صاحب کی شان میں کچھ گستاخانہ فقرے بھی کہے اور یہ دھمکی بھی دی کہ ہم ابھی جا کر ملکہ برطانیہ کو تار کے ذریعے رپورٹ وزیراعلیٰ سندھ کی غیر آئینی روش کی بھیجتے ہیں۔ (پاکستان ان دنوں برٹش ڈومینین تھا، ری پبلک نہیں بنا تھا۔)

ماسٹر صاحباں کا نام پاجوج ماجوج کیوں کر پڑا، اس کے بارے میں فقط اتنا معلوم ہو سکا کہ ان کا اٹھنا بیٹھنا بیشتر گاڑھی کھاتے کے محلے میں تھا۔ جب کوئی بلی بیمار ہو جاتی تو ماسٹر اسے گاڑھی کھاتے کی مسجد میں دھکیل کر بیرونی دروازہ بند کر جاتے۔ مسجد کے امام صاحب زیادہ تر گھر پر رہتے تھے اور صرف نماز کے وقت مسجد میں آتے تھے، اس لیے انھوں نے مسجد کو محفوظ جگہ خیال کرکے وہاں بلیوں کو ٹھہرانے کا بندوبست کرلیا تھا۔ امام صاحب سے پوچھا گیا کہ مسجد میں بیمار بلیاں کیوں رکھی جاتی ہیں، تو انھوں نے فرمایا کہ یہ بلیاں یاجوج ماجوج مسجد میں چھوڑ جاتے ہیں۔ اس دن سے ماسٹر صاحباں کا نام یاجوج ماجوج پڑ گیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

خان بہادر اللہ بخش گبول کراچی کے کلبوں اور سیاسی اور سوشل محفلوں کی رونق تھے۔ قدم رکھتے تھے تو محفل کا موڈ باغ و بہار ہو جاتا تھا۔ قد آور، بڑے ڈیل ڈول کے آدمی، رنگ ضرورت سے کچھ کم صاف، پیٹ ضرورت سے کچھ زیادہ برکت بھرا۔ انگریزی تراش کا سوٹ، سر پر پھندے والی ترکی ٹوپی۔ خوش پوش، خوش نوش، خوش مزاج، خوش مذاق، زندگی کا سفر ہنسی خوشی پورا کیا، کسی غم کو کبھی پاس نہ پھٹکنے دیا۔ انگریزوں کے پیارے، دیسی دوستوں کے سہارے تھے۔ سر غلام حسین سے خاص محبت اور سر عبداللہ ہارون سے خاص رقابت تھی۔ ۱۹۳۷ کے انتخابات میں لیاری کے حلقے سے سر عبداللہ ہارون کو شکست دے کر سندھ اسمبلی کے ممبر بنے۔ اسمبلی میں کم بولتے تھے، مگر جو کچھ بولتے تھے وہ سننے والوں کے غم بھلا دیتا تھا۔ اُن دنوں ممبر ہر وقت پارٹیاں بدل بدل کر عہدے حاصل کیا کرتے تھے۔ گبول مرحوم اس الٹ پھیر کا جواز یوں پیش کرتے کہ سندھی دریائے سندھ کا پانی پیتے ہیں، اس لیے جیسا اتار چڑھاو دریائے سندھ میں ہے ویسا ہی سندھ کی سیاست میں۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ ان کا یہ جملہ کلاسک بن گیا اور سندھ کی سیاست کی تعبیر کے لیے برسوں کوٹ کیا جاتا رہا۔

ایک وقت آیا جب سر غلام حسین کا انتقال ہو گیا اور کچھ دوسرے حالات کے سبب سے سندھ کی سیاست اُجاڑ ہو گئی۔ گبول مرحوم نے اس کے بعد دوسروں کی طرح ملک کے اندر دھکے کھانا مناسب نہ سمجھا۔ ہوا کا رخ سمجھ لیا۔ سیاست چھوڑ کر سیاحت کرنے لگے۔ زیادہ وقت یوروپ میں رہے۔

ایک بار میں نے انھیں جینوا (سوئٹزرلینڈ) میں تالاب کے کنارے بیٹھے دیکھا۔ ان کے ارد گرد یوروپین خواتین کا حلقہ تھا۔ خود بھی ہنس رہے تھے اور انھیں بھی ہنسا رہے تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اگلے زمانے کی طرح کراچی کلب میں بیٹھے ہیں اور ان کی باغ و بہار باتیں سننے کے لیے لوگوں کے ٹھٹ لگے ہیں۔

وہ سندھ کے واحد سیاست داں تھے جو اپنی مرضی سے سیاسی کھیل کے میدان سے نکل گئے اور پھیکے گنے چوسنے سے احتراز کیا۔

کارِ دنیا کسے تمام نہ کرد
ہر چہ گیرید مختصر گیرید

رئیس غلام محمد بھرگڑی مرحوم اور سرگباشی سیٹھ ہرچند رائے وشنداس کو میں نے ظاہری آنکھوں سے نہیں دیکھا، مگر دل کی آنکھوں سے ان کا دیدار کیا ہے۔ اپنے دور میں سندھ کی سیاست کے آفتاب اور ماہتاب تھے۔ تھے دونوں پیدائشی وڈیرے، بلکہ وڈوڈیرے۔ (رئیس غلام محمد میرپور خاص ضلعے کے بڑے زمیندار اور امیر کبیر تھے اور سیٹھ ہرچند رائے باکھو ضلع دادو والے سیٹھ وشنداس کے فرزند)، مگر سندھ کے وڈیروں کو راستا دکھا گئے کہ وڈیرا ہوتے ہوئے بھی آدمی کیوں کر عزت اور آزادی، شرافت اور انسانیت کی زندگی گزار سکتا ہے اور خلق کی خدمت کر کے سندھ کا حق ادا کر سکتا ہے۔ ان کا دور وہ تھا

جب وڈیرے صاحب لوگوں کو سلام کرنے کے لیے حاضر ہوتے تو صاحب کا چپراسی دروازے کے باہر ان کی جوتیاں اتروا کر انھیں ننگے پیر اندر لے جاتا تھا۔ لیو کس صاحب کمشنر انھیں خفیف کرنے کے لیے پوچھتا تھا کہ بدمعاش ہو یا نہیں؟ (کچھ اور کھردرے لفظوں کی بھی آمیزش ہوتی تھی مگر انھیں لکھا نہیں جا سکتا)۔ وڈیرے جواب دیتے تھے قبلہ و کعبہ! باپ دادا کے وقت سے سرکار کے بدمعاش ہیں۔ اندیشہ ہوتا تھا نہ انکار کیا تو صاحب غصے میں آکر سچ مچ بدمعاشی کی کارروائی نہ شروع کر دے۔

رئیس غلام محمد اور سیٹھ ہرچندرائے پہلے سر برآوردہ سندھی تھے جنھوں نے گوری یا گندمی نوکرشاہی کے سامنے نعرہ لگایا کہ سندھ کی شہریت ایک شان دار شے ہے نہ کہ آبرو باختگی کی نشانی۔ انھوں نے ہر دم اور ہر قدم حکومت سے مقابلہ کیا۔ آزادی کی ہر تحریک میں پیش پیش رہے۔ جب بھی کاؤنسل یا اسمبلی میں منتخب ہوئے تو سرکار کے خلاف آواز اٹھاتے رہے۔ سیٹھ ہرچندرائے موت کے کنارے پر تھے، چلنے پھرنے اور اٹھنے بیٹھنے سے معذور، اس کے باوجود خود کو کھٹولے پر اٹھوا کر دہلی اسمبلی میں حاضر ہوئے اور سرکار کے خلاف ووٹ دیا۔ رئیس غلام محمد پر نوکرشاہی کا پہلا حملہ ہوا تو وہ لندن جا کر بیرسٹری پاس کر آئے اور پہلے سے زیادہ زور آور ہو گئے۔ دوسرا حملہ ہوا تو وہ اور سیٹھ ہرچندرائے لندن پہنچے اور وزیر ہند کے چودہ طبق روشن کر آئے۔ دونوں حملوں میں نوکرشاہی کو لینے کے دینے پڑ گئے اور سندھیوں کو بھی سبق مل گیا کہ عزت دار سندھی مقابلہ بھی کر سکتے ہیں، محض گائیں بھینسیں نہیں ہیں کہ کوئی بھی گیدڑ ان پر حملہ کر سکے۔

سندھ کو اٹھا کر اپنے پیروں پر کھڑا کرنے اور بمبئی سے الگ کرنے کی تحریک کی شروعات بھی انھیں بزرگوں نے کی۔ تمام فرقوں کے نمائندوں کو جمع کر کے سندھ پیکٹ پر دستخط کرائے جس کے تحت متفقہ مطالبہ کیا گیا کہ سندھ کی الگ شخصیت کو تسلیم کیا جائے اور اسے بمبئی سے علیحدہ کیا جائے۔ ان کے ہوتے ہوئے پورا سندھ اکٹھا تھا، سندو مسلم نفاق کا بیج نہ پڑا تھا۔ وہ زہریلی ہوا جس نے سندھ کو کاٹ کر رکھ دیا، ابھی چلنی شروع نہ ہوئی تھی۔ اس ہوا کا پہلا جھونکا ۱۹۲۵ میں آیا، مگر اس وقت یہ بزرگ رخصت ہو چکے تھے اور سندھ نے یارومددگار رہ گیا تھا۔ ان کی نشانی ان کے تربیت یافتہ دو چار ورکر رہ گئے تھے، مثلاً شیخ عبدالمجید سندھی، جے رام داس دولت رام اور دو ایک اور، جنھیں ہم نے بھی دیکھا۔

ڈاکٹر شانی ڈی جے سندھ کالج کے پرنسپل تھے اور ڈاکٹر گربخشانی اسی کالج میں مشرقی علوم کے پروفیسر۔ ایک سیوھانی عالم، دوسرا حیدرآبادی عالم۔ عملی زندگی میں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے رہے۔ ڈاکٹر شانی صوفیوں کے طالب تھے اور خود انھیں بھی فقیری کا کوئی انگ مل گیا تھا، ان کا چہرہ شانتی اور قلبی اطمینان کا آئینہ تھا، آنکھوں میں ایسی چمک کہ میں نے شاید ہی کسی اور کی آنکھوں میں دیکھی ہو۔ بہت کم بولتے تھے، دھیمی آواز اور رازدارانہ لہجے میں۔ میں نے اُن کی زبان سے کسی شخص کی برائی کبھی نہ سنی۔ تعلیم کے معاملے میں سندھیوں کی پوری ایک پیڑھی کو فیض پہنچایا۔ ان

کی کوئی تصنیف میری نظر سے نہیں گزری، شاید ساری توجہ روحانی معاملوں اور تعلیم کی جانب ہی رکھی۔ ہندوستان کی تقسیم ہوئی تو وہ بمبئی چلے گئے، لیکن بعد میں بھی کبھی کبھار اپنے مرشدوں کی زیارت کے لیے آ نکلتے تھے۔ ایک بات مجھے اچھی طرح یاد ہے ان کی موجودگی میں ہر اہلِ دل سکون محسوس کرتا تھا۔ حلیہ یہ تھا کہ چھریرا بدن، لمبا قد، کلین شیو، بند گلے کا چھوٹا کوٹ اور پتلون، دونوں سادہ کھدر کے، سر ننگا، بالوں میں کنگھی کبھی نہ کی، مگر تیل اکثر لگا ہوتا۔

مقابلتاً ڈاکٹر گربخشانی ظاہری علم میں بہت آگے، دنیاوی معاملات میں زیادہ تیز، گفتار میں جان دار، لباس میں شان دار، چہرے پر اکثر مسکراہٹ، گفتگو ہنسنے کے لائق، کلین شیو، اگر رنگ کا مسئلہ نہ ہوتا تو انگریز لگتے۔ پی ایچ ڈی تھے۔ فارسی اور انگریزی شاعروں کے ہزاروں بول یاد تھے۔ ہر شخص سے اس کے مذاق کے مطابق گفتگو کرتے۔ کسی پڑھے لکھے آدمی سے بات چیت ہوتی تو حافظ، سعدی، قاآنی، خاقانی، خیام، ملٹن، ورڈزورتھ، ٹینی سن کو لاموجود کرتے اور مزے لے لے کر ان کا کلام سناتا اور معنی بیان کیا کرتے۔ ان کے بزرگ حقوق شریف کے طالب رہ چکے تھے۔ خود عملی طور پر صوفی تھے یا نہیں، اس کی تو مجھے خبر نہیں، البتہ تصوف کی تاریخ اور اصولوں کی ایسی واقفیت رکھتے تھے کہ اس معاملے میں ان جیسا کوئی مجھے تو نظر نہ آیا۔

پرنسپل شاہانی سے ان کی نہیں بنتی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ ڈی جے کالج کا پرنسپل بننا ان کا حق تھا اور انھیں کو ملنا چاہیے تھا۔ اس کے علاوہ حیدرآباد کے عامل سیوھن کے عاملوں کو اپنے آگے کچھ نہ سمجھتے تھے اور ان میں آپس میں رقابت رہتی تھی۔ عالم لوگوں پر بشریت غالب رہتی ہے، اپنا ثانی کسی کو نہیں سمجھتے، اپنے علم پر ناز کرتے ہیں۔ ڈاکٹر گربخشانی عالم تھے مگر مہذب۔ لیکن اپنے رقیب شاہانی کے بارے میں کبھی کبھی اُبل پڑتے تھے۔

سندھی زبان اور ادب پر ان کا اتنا بڑا احسان ہے کہ سندھ کے لوگ اس کا بار کبھی اتار نہیں سکتے۔ انھوں نے شاہ عبداللطیف کے رسالے کو چار جلدوں میں مرتب کیا جن میں سے تین جلدیں ان کی زندگی میں شائع ہوئیں۔ چوتھی جلد نہ چھپ سکی اور غائب ہو گئی۔ ڈاکٹر صاحب کی کتابوں کی اشاعت سے پہلے کا زمانہ مجھے یاد ہے۔ یوں تو بھٹائی کی شہرت عام تھی، مگر پڑھے لکھے لوگوں میں ان کے کلام کی مقبولیت ایسی نہ تھی جیسی ڈاکٹر صاحب کی کتابوں کے منظرعام پر آنے کے بعد ہوئی۔ شاہ کا کلام گایا تو ضرور جاتا تھا مگر اس کی گہرائی اور شرح سے واقفیت بہت کم لوگوں کو تھی۔ اکثر محفلوں میں حافظ، جامی اور سعدی کے کلام کا تذکرہ رہتا تھا۔ فارسی کو تب تک علمی زبان سمجھا جاتا تھا، اور خط و کتابت میں بھی فارسی ہی استعمال ہوتی تھی۔ ناقدری کا حال یہ تھا کہ ڈاکٹر گربخشانی کا مرتب کردہ رسالہ شائع ہوا تو اسے خریدنے والا کوئی نہ ملا۔ ڈاکٹر صاحب نے کتاب کی تیاری اور چھپائی پر اپنی گرہ سے خاصا خرچ کیا تھا، نفع تو دور کی بات، یہ خرچ بھی گلے میں پڑ گیا۔ مجبور ہو کر انھوں نے اپنی کتابوں کے نسخے اُن ذاتی دوستوں اور شاگردوں کو بھیجے جو اب سرکاری عہدوں پر تھے، کہ وہ زبردستی انھیں سندھ کے زمینداروں کے سر منڈھیں اور ان

سے قیمت وصول کریں۔ قیمت بھی کچھ ایسی زیادہ نہ تھی، مگر خوشی سے لینے والا کوئی نہ ملا۔ مختیار کاروں اور ڈپٹی کلکٹروں کا زور پڑا تو بہت سے وڈیروں نے کتاب خریدی مگر گھر پہنچتے ہی اسے ایک طرف ڈال دیا۔ کئی زمینداروں کی اوطاقوں میں میں نے اس کتاب لاجواب پر پرندوں کو بیٹ کرتے دیکھا۔ (شاید انھیں مالی مشکلات کے باعث ڈاکٹر صاحب رسالے کی چوتھی جلد شائع نہ کرسکے۔)

مگر جوں جوں وقت گزرتا گیا، اس کتاب کی برکت سے شاہ صاحب کے کلام اور شخصیت سے سندھیوں کی دل چسپی بڑھتی گئی۔ ۱۹۳۰ کے بعد تو یوں محسوس ہونے لگا گویا سندھیوں کو کوئی چھپا ہوا خزانہ دوبارہ ہاتھ لگ گیا ہے۔

اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے سندھی زبان پر (بطور زبان بھی) بہت احسان کیا۔ انھوں نے سندھی تحریر کو ایک نئی طرز عطا کی۔ جو سندھی پہلے لکھی جاتی تھی وہ زیادہ تر بے نمک اور مُلّائیت زدہ ہوتی تھی، اس میں کوئی رنگ تھا نہ رس، نہ تندی نہ تیزی، نہ تازگی نہ شگفتگی، نہ شوکت الفاظ نہ رنگینی عبارت۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ کوئی مردہ، زمانہ قدیم کی زبان ہے جسے لوگ مجبوراً سرمار کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ یہی سبب تھا کہ سندھ کے پڑھے لکھے لوگ سندھی کو نوکروں ماورچیوں کی زبان سمجھ کر گھروں میں بند رکھتے اور باہر کا سب کاروبار اور نوشت و خواند فارسی میں چلاتے تھے۔ مگر ڈاکٹر صاحب نے رسالے کا مقدمہ اور اندر کچھ عشقیہ قصے ایسی نئی طرز میں لکھ کر ایک انقلاب برپا کیا اور ثابت کردیا کہ سندھی ایک مکمل، زندہ، بے حد وسیع اور زوردار زبان ہے جو ہر ضرورت کو پورا کرسکتی ہے۔

آخر آخر کی سیاسی صورت حال اور علمی ماحول نے انھیں بددل اور ناامید کردیا تھا۔ انھوں نے دوستوں سے ملنا جلنا بہت کم کردیا اور لکھنے پڑھنے سے بھی کنارہ کرکے ایک طرف بیٹھ گئے تھے۔ اسی ذہنی کوفت میں دل کی حرکت بند ہونے سے ۱۱ فروری ۱۹۴۷ کو انتقال کرگئے۔

دین محمد علیگ مرحوم شکارپور کے قریب لکھی کے مردم خیز گاؤں میں پیدا ہوئے، مگر زندگی کا بیشتر حصہ کراچی میں رہ کر سندھ کی خدمت میں صرف کیا۔ وہ الوحید اخبار اور پریس کے مینیجر تھے۔ بھوک میں، دکھ تکلیف میں پورے تینتیس برس یہ چرخہ چلایا کیے۔ ہمیشہ پس پردہ رہے، نہ دکھاوے کے قائل نہ مال و زر کی طرف مائل۔ ان کی زندگی کا واحد مقصد الوحید کو زندہ رکھنا تھا اور اسی مقصد کی پاس داری میں انھوں نے اپنی عمر کا خزانہ لٹادیا۔

الوحید کی مینیجری بھی کوئی آسان کام نہ تھا۔ نہ کسی سرمایہ دار کی سرپرستی، نہ سرکاری یا کاروباری اشتہاروں کی آمدنی، نہ پریس کی چھپائی کی کمائی۔ پرچے کی قیمت ایک آنہ تھی، اور اس آنے کے آدھار پر کراچی جیسے مہنگے شہر میں مسلمانوں کا روزانہ اخبار چلانا، اور وہ بھی پورے تینتیس برس تک، اور اس حالت میں چلانا کہ خواہ سرکار سراروں کی ضمانتیں طلب کرے یا ایڈیٹروں کو ایک کے بعد ایک جیل میں ڈالے، نہ اخبار بند ہوگا نہ اخبار کی پالیسی بدلے گی ـــــ یہ میاں دین محمد علیگ ہی کا کمال تھا۔

بظاہر میاں جی کا چہرہ دیکھ کر یوں لگتا جیسے پوری دنیا سے ناراض بیٹھے ہیں یا دو تین دن سے کھانا نہیں ملا، مگر اس صورت کے پیچھے ایک دل آویز سیرت تھی جو ہر ملنے والے کو چند منٹوں میں مسحور کر لیتی تھی۔ میں نے انہیں مسکراتے صرف ایک بار دیکھا۔ کمپازیٹروں کو تنخواہ نہیں دی جا سکی تھی، کمپازیٹر اور پریس مین صبح صبح کام چھوڑ کر پریس کے دروازے پر بھیڑ لگائے کھڑے تھے۔ اس گھڑی میاں دین محمد پریس میں نمودار ہوئے، ادھر اُدھر نظر گھمائی، مسکراتے چہرے کے ساتھ کارکنوں سے پوچھا ارے، تم لوگ کھڑے کیوں ہو؟ ان میں سے ایک ہنس کر بولا صبح کے چائے پانی کے لیے بھی پیسے نہیں ہیں۔ دین محمد ہنس کر بولے بدمعاشی چھوڑو اور جا کر کام کرو۔ کارکنوں نے ایک دوسرے کا منہ دیکھا اور اپنے اپنے کام پر لوٹ گئے۔

کارکنوں کو ان پر بھروسا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ جہاں تک بس چلے گا، دین محمد انہیں کوئی تکلیف نہیں ہونے دیں گے۔ اس وقت لاچار ہو گئے ہوں گے۔ دس بجے ڈاکیے نے آ کر انہیں منی آرڈر کی رقم دی جو انہوں نے فوراً کارکنوں کو بلوا کر ان میں تقسیم کرا دی۔ اپنے پاس فقط دو آنے رکھے جس سے دو پیالی چائے منگوائی۔ ایک میرے سامنے رکھی اور دوسری خود پی۔ اُس زمانے میں چائے والے کیتلیاں اٹھائے سڑک پر گھوما کرتے تھے اور ایک آنے میں ایک پیالی چائے پلاتے تھے۔ غرض دین محمد کی پوری جوانی اسی قلندری کی کیفیت میں گزری۔

نسیم تلوی مرحوم لیاری محلے کے بلوچ اور پیدائشی پہلوان تھے۔ سدا جوان، سدا بہار، آخر تک چہرے سے عمر کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ سیاست کے ڈنک کا شکار تھے۔ صحافت کا پیشہ اختیار کیا، مگر اسے پیشے کے طور پر استعمال نہ کیا۔ اخبار کا نام تھا بلوچستانِ جدید۔ آزادی کے عاشق تھے اور عزتِ نفس کے بغیر جینے کو محال سمجھتے تھے۔ غریب تھے مگر غیرت مند۔ سندھ اور بلوچستان کی آزادی اور سربلندی کے راستے میں جو کوئی حائل ہوتا، اسے میدان سے بھگانے کی کوشش کرتے۔

اپنی سیاست اور صحافت دونوں کو انہوں نے بلوچیت کے سانچے میں ڈھال رکھا تھا۔ بلوچستان اور سندھ کا ہر دشمن ان کا ذاتی دشمن تھا، اور دشمن کا دروازہ تکنا، اس سے ہنس کر ملنا، بات کرنا، اس کا نمک کھانا حرام۔ اُس کا احسان اٹھانا، مثلاً رعایتی پلاٹ لینا، رعایتی نرخ کی سہولتیں حاصل کرنا، کاغذ کے پرمٹ پانا، اس کے خرچ پر بیرونی ملکوں کی سیر کرنا بالکل گویا لحمِ خنزیر۔ یہاں تک کہ اخبار کے لیے حکومت کے اشتہارات بھی قبول نہ کرتے۔ گرہ میں پیسے ہوتے تو پرچہ نکلتا ورنہ ناغہ۔ مگر ناغے کے بعد جب پرچہ آتا تو جیسے موالیوں کے سامنے دو آتشہ آ گئی ہو۔ آگے پیچھے کی سب کسر نکل جاتی۔ اگلے شمارے تک موذیوں کے گھروں میں کہرام مچا رہتا۔

نسیم تلوی مرحوم قلم رانی کے علاوہ دوسرے بھی فن جانتے تھے، مثلاً خنجر چلانا اور ٹکر مارنا۔ ہاتھ میں قلم، کمر میں خنجر۔ آدمی پر کیا پتا کب وار ہو جائے، اس لیے پیشگی دفاعی بندوبست رکھتے تھے۔ ٹکر

مارنے کا مطلب تھا سر سے سر ٹکرا کر مخالف کی پیشانی کی ہڈی توڑ دینا، ورنہ کم سے کم ماتھے کی کھال کو پھاڑ کر لہولہان کر دینا۔ جاپان کے جوڈو کراٹے کا یہ سندھی ملوچی نعم البدل تھا۔ دفعہ ۱۴۴ لگی ہوئی ہو اور لاٹھی وغیرہ لے کر چلنے کی ممانعت ہو تب بھی آدمی ایسا بچاؤ کر سکے۔ کتنے ہی ایڈیٹروں، اہلکاروں اور حریف کارکنوں پر اشتعال کے موقعوں پر تجربہ بھی کر چکے تھے۔

تقسیم سے پہلے ان کی تمنا تھی کہ موقع ملے تو سندھ آبزرور کے متعصب مہاسبھائی ایڈیٹر آن جہانی کوٹھراج پُنیا کا سر پھاڑ دیں۔ پنیا کو سر عبداللہ ہارون مع کالا دل کا کالا کو برا بھلا کہہ چکے تھے۔ رنگ روپ آن جہانی کا واقعی ایسا ہی تھا، قلم بھی کالے ناگ کی طرح زہر اگلا کرتا۔ پنیا کو نسیم کی نیت کی خبر ہو چکی تھی۔ اُن کے سائے سے بھی بچا کرتا۔ کراچی میونسپلٹی کے میئر کی پارٹی تھی۔ میں گیٹ سے اندر داخل ہو رہا تھا کہ پنیا تیز تیز قدم اٹھاتا وہاں سے باہر نکل رہا تھا۔ پارٹی شروع ہونے سے پہلے ہی وہاں سے رخصت ہونے کا سبب بتاتے ہوئے بولا نسیم نامراد پارٹی میں آیا ہوا ہے۔ آنکھیں لال ہیں اور میری طرف دیکھ دیکھ کر دانت پیس رہا ہے۔ ممکن ہے میرے ساتھ کوئی حرکت کر بیٹھے اس لیے جا رہا ہوں۔ تمہارا سندھی بھائی ہے، تم اسے سمجھاؤ کہ صحافی کو تشدد پسند نہیں ہونا چاہیے۔ ہو سکے تو ہمارے درمیان صلح کرا دو۔ مگر میں اس معاملے میں کوئی سرخروئی دکھاتا، اس سے پہلے ہی پنیا خود جوری چھپے ممبئی بھاگ گیا۔ تقسیم ہو جانے کے بعد اس کے قلم کا کھیل ختم ہو گیا تھا۔

تقسیم کے بعد نسیم کے ذہن پر پنیا کے بجائے ایک نووارد دوسرے ایڈیٹر کی صورت مسلط ہو گئی۔ یہ صاحب مسلمان تھے، اور سوائے رنگ روپ کے ان کی کوئی مشابہت یا مناسبت پنیا سے نہ تھی۔ مگر نسیم کا خیال تھا کہ وہ سندھ اور سندھیوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور بلوچستان میں آئینی اصلاحات کے خلاف ہیں کیوں کہ سی حکومت میں ان کی بہت چلتی ہے۔ ایک دن باتوں باتوں میں نسیم نے کہا کہ اس ایڈیٹر سے اتر، قلم یا زبان میں تو مقابلہ مشکل ہے، ارادہ ہے کہ کسی محفل میں اس سے تو تو میں میں کر کے اس پر اپنا مخصوص ٹکر والا نسخہ استعمال کیا جائے۔

میں نے نسیم کو بہت ڈرایا۔ سمجھایا کہ اس ایڈیٹر کے سر پر حکومت کا ہاتھ ہے، اگر اس کے ساتھ کوئی گڑبڑ کی تو جیل کی ہوا کھانی پڑے گی۔ مگر نسیم بے خوف تھے۔ بولے کہ ہتھیار کوئی بھی استعمال نہیں ہوگا، کورٹ انسان کے سر کو ہتھیار یا اوزار سر گز قرار نہیں دے سکتی، اس لیے جیل جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

خوش قسمتی یہ ہوئی کہ دوسرے فریق، یعنی اُن ایڈیٹر صاحب، سے بھی میرے اچھے تعلقات تھے۔ میں نے انہیں پیشگی خبردار کر دیا کہ نسیم کس قسم کے آدمی ہیں اور اُن کی جانب سے ضرر پہنچنے کے کیا کیا امکانات ہو سکتے ہیں۔ اس کے بعد وہ نسیم کی خوب خوشامد کرنے لگے۔ جہاں کہیں نسیم پر نظر پڑتی، خود دوڑ کر آتے، گلے ملتے اور میلومائی ڈیئر مسٹر محمد نسیم خان صاحب کے القاب استعمال کر کے ملاحظہ کھیسیں نکالا کرتے۔

بدقسمتی سے چند سال بعد ایک ایسا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا جس پر میرے اور ان ایڈیٹر صاحب کے درمیان اختلاف پیدا ہوا۔ میرے نقطہ نظر کے خلاف تقریر کرنے کے لیے مخالف فریق نے ان ایڈیٹر صاحب کو تیار کیا اور دھوم دھام سے میٹنگ میں بھیجا۔ میٹنگ کی صدارت ممکھی کو کرنی تھی۔ میں نے انتظام ایسا کیا کہ پہلی قطار میں جس صوفے پر ان ایڈیٹر صاحب کو بیٹھنا تھا اسی صوفے پر نسیم کے لیے بھی نشست رکھی گئی۔ ایڈیٹر صاحب نسیم کو اپنے برابر میں بیٹھا دیکھ کر حوصلہ ہار بیٹھے۔ انھیں یقین ہو گیا کہ منھ سے ایک لفظ بھی نکلا تو نسیم اسے کنگر رسید کریں گے۔ جب انھیں تقریر کی دعوت دی گئی تو وہ دو تین بار صدر صاحب، حضور والا کہہ کر دوبارہ کرسی پر ڈھیر ہو گئے۔ یہ دو لفظ بولتے ہوئے بھی ان کی نگاہیں نسیم پر جمی رہیں۔ آخر دہشت کے مارے بےحال ہو گئے اور تقریر نہ کر سکے۔ جن بزرگوں نے انھیں اتنے اہتمام سے میدان میں اتارا تھا ان کا مقصد خاک میں مل گیا۔

اب نسیم صاحب اور وہ ایڈیٹر صاحب اس جہاں سے رخصت ہو چکے ہیں۔ ان کے حق میں فقط دعائے مغفرت ہی کی جا سکتی ہے۔ دونوں تاریخ ساز تھے، دونوں لاجواب تھے۔

کراچی میں انگریز عملداروں کے علاوہ بیوپاری انگریز بھی رہتے تھے جن کی بڑی بڑی کوٹھیاں تھیں۔ مگر انگریز آپس میں ایک دوسرے کے اتنے قریب ہوتے تھے کہ فرق کرنا مشکل تھا کہ کون سرکاری عملدار ہے اور کون عام آدمی۔ جن نامور غیر عملدار انگریزوں کو میں نے کراچی میں دیکھا ان میں سے ایک سر مونٹیگو ویب تھے۔ دیکھنے میں نہایت شان دار شخصیت تھے۔ فاربس فاربس کیمبل یا میکس میکنری کمپنی کے مقامی مینیجر تھے۔ سیاست میں حصہ لیتے تھے۔ انگریزی روزنامہ 'ڈیلی گزٹ' کے پہلے چیئرمین اور بعد میں خود ہی ایڈیٹر بھی بنے۔ انگریز قوم اور حکومت کا موقف بیان کیا کرتے تھے۔ بمبئی کاؤنسل کے بھی سرکاری نامزد ممبر تھے۔

ایک اور انگریز اے ایل پرائس تھے؛ انھیں بھی حکومت وقت کی پشت پناہی حاصل رہتی تھی۔ سندھ کی علیحدگی کے بارے میں جو سرکاری تحقیقاتی کمیٹیاں بنائی جاتی رہیں، ان میں بھی شامل کیے جاتے تھے۔ انھیں اقتصادیات کا ماہر سمجھا جاتا تھا۔ البتہ خبطی قسم کے آدمی تھے۔ ایک بےحد پرانی فورڈ موٹر تھی جس کے دروازے نکلوا دیے تھے کیوں کہ ان کے خیال میں دروازہ کھولنے میں بھی خواہ مخواہ وقت ضائع ہوتا تھا۔

ڈبلیو رچرڈسن برسوں کراچی کے سٹی مجسٹریٹ رہے۔ علی برادران والے تاریخی مقدمے کی سماعت سے سرکار کے حکم کے باوجود اس لیے انکار کر دیا کہ ان کے خیال میں یہ سیاسی مقدمہ تھا جسے بنانے میں سرکاری اہلکاروں نے ضرور ہاتھ کی صفائی دکھائی ہو گی جس سے چشم پوشی کرنے کو وہ تیار نہ تھے۔ بعد میں یہ مقدمہ ایک دیسی ایڈیشنل سٹی مجسٹریٹ ایس ایم تلاٹی کو چلانے کے لیے دینا پڑا۔

سندھ کے ہندو عاملوں میں ایک خراب رسم پڑ گئی تھی جسے دیتی لیتی [لین دین] کہا جاتا تھا۔ اس رسم کے تحت لڑکی والوں کو شادی کے وقت بڑی رقم اور قیمتی جہیز دینا پڑتا تھا۔ اس لین دین کی شرح مقرر تھی، یعنی لڑکا جس قدر زیادہ تعلیم یافتہ اور خوش حال ہو، اتنی ہی زیادہ رقم دینی پڑتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کتنے ہی والدین ایسی شادی کے قابل لڑکیوں کو رخصت نہ کر پاتے کیوں کہ ان کے پاس اتنی دولت نہ ہوتی تھی کہ وہ لین دین کی رسم پوری کر سکیں۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ بڑی تعداد میں شادی کے قابل لڑکیاں کنوارے پن ہی میں زندگی گزارنے لگیں۔ ہندوؤں نے کوشش کر کے اس رسم کو بند کرانے کے لیے قانون بھی پاس کرائے مگر کچھ فرق نہ پڑا۔

دادا لیکھراج خود حیدر آباد کے ہندو عامل تھے۔ انھیں کنیاؤں کی اس حالت زار پر ترس آیا۔ انھوں نے اوم منڈلی کے نام سے ایک ادارہ کھولا جس میں لین دین کی رسم کی ستائی ہوئی اور شادی سے ناامید لڑکیوں کو پناہ دے کر انھیں باقی عمر گیان دھیان اور گھریلو ہنروں میں مشغول رکھنے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ کم از کم ظاہری طور پر تو منڈلی کے اصول یہی بیان کیے جاتے تھے۔

منڈلی کچھ ہی دنوں میں عورتوں میں بہت مقبول ہو گئی۔ عاملوں کی غیر شادی شدہ عورتیں اپنے گھروں سے بھاگ کر وہاں آرہنے لگیں۔ عاملوں کے معاشرے میں بڑی ہاہاکار مچی۔ ماحول کچھ ایسا بن گیا کہ کسی بھی لڑکی پر ماں باپ کو اعتبار نہ رہا۔ جو اب تک نہیں بھاگ سکی تھیں، ان کے بارے میں بھی یہی سمجھا جاتا کہ وہ آج نہیں تو کل ضرور بھاگ کر اوم منڈلی میں پناہ لیں گی اور گھر والوں کی بدنامی کا سبب بنیں گی۔

حیدر آباد کے عامل بڑے جید ہوتے تھے، علم کے لحاظ سے، اقبال کے لحاظ سے، سیاسی اثر اور بیداری کے لحاظ سے۔ انھوں نے اس مصیبت سے جان چھڑانے کے لیے لیکھراج اور ان کی منڈلی کے خلاف بڑا طوفان برپا کیا۔

جیسا کہ دستور تھا، پہلے ہندو اخبار (جو بیشتر عاملوں کے قبضے میں تھے) میدان میں آئے۔ انھوں نے طرح طرح کے الزام لیکھراج پر لگائے کہ وہ راجا اندر بن بیٹھا ہے، اندر سبھا سجا رکھی ہے، مُرلی کے بل پر گوپیوں کو جمع کرتا ہے، بنگلے کے اندر تالاب بنا رکھا ہے جس میں گوپیوں کو لباس کے بوجھ سے آزاد کر کے اپنے ساتھ تیراتا ہے، سیاسیوں سے طاقت کے کشتے لیتا ہے، وعلیٰ ہذا القیاس۔

دوسرے، انھوں نے انگریز سرکار پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کی کہ وہ اس ادارے کے خلاف قانون بنا کر اسے بند کر دے، مگر اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ انگریز کے اپنے اصول ہوتے تھے۔ سنی سنائی باتوں یا اخباری پروپیگنڈے کی بنیاد پر وہ کسی شہری کی چاردیواری کا احترام مجروح کرنے کو تیار نہ ہوتا تھا۔ جب تک کمشنری راج تھا اور سندھ بمبئی سے الگ نہ ہوا تھا، سرکاری طور پر کوئی قدم نہ اٹھایا گیا۔ دادا لیکھراج بس کاڑھے بیٹھے رہے۔

تنگ آ کر عاملوں نے 'ڈائرکٹ ایکشن' کرنے کا فیصلہ کیا۔

کسرت شالاؤں کا رواج پڑ چکا تھا۔ نوجوان ہندو صبح سویرے وہاں جا کر تیل کی مالش کراتے اور اپنے بدن کو طاقتور بنانے کی کوشش کرتے۔ وہ لاٹھیوں اور ڈنڈوں کے استعمال کی تربیت بھی حاصل کرتے۔ طے ہوا کہ وہ برادری کی خاطر اوم منڈلی پر حملہ کریں اور اس جنڈال چوکڑی کو زبردستی بند کرائیں۔

یہ خبر منڈلی والوں تک بھی جا پہنچی کہ حملے کی تیاری ہو رہی ہے۔ انھوں نے اپنی دفاعی حکمت عملی پہلے ہی سے سوچ لی جو کچھ یوں تھی: دادا صاحب، فوجی جرنیل کی طرح، اپنا کیمپ میدانِ جنگ سے دور کسی بند کمرے میں بنا کر وہاں سے رہنمائی کریں گے۔ میدانِ جنگ میں منڈلی میں رہنے والی عورتیں خود جا کر حملہ آوروں کا مقابلہ کریں گی۔ ہتھیار منڈلی میں پہلے ہی سے موجود تھے، یعنی جھاڑو ہیں، کوڑے سے بھرے جہاز، بوتلوں میں بند بدبودار پانی، کاغذی پڑوں میں بھرا ہوا کچرا، مختلف رنگوں سے بھری پچکاریاں، رسوئی کے چمچے اور دوسرے برتن، پرانی جوتیوں کے تلے وغیرہ۔

شکر ہوا کہ انسان کا خون ابھی مہنگا تھا، چھرے اور چاقو مقبول نہ ہوئے تھے۔ قانون سخت تھا، عدالتوں کی عصمت قائم تھی۔ مجبوراً عدم تشدد کے اصول کو ملحوظ رکھنا ضروری تھا۔

حملے کا دن آیا۔ حملہ ہوا۔ سو پچاس والنٹیئر، جن کے ساتھ چار پانچ اخباری نمائندے بھی تھے، اوم منڈلی کے گیٹ پر پہنچ کر گیٹ کو دھکیلنے اور چیخ پکار کرنے لگے۔ اندر عورتیں بھی ایسے ہتھیاروں سے لیس گیٹ کی طرف رخ کیے بیٹھی تھیں۔ معاملہ شروع ہوا۔ والنٹیئروں نے مکے دکھائے، عورتوں نے جھاڑو ہیں لہرائیں، انھوں نے لیکھراج کے حق میں زبانی غلاظت اچھالی، انھوں نے حقیقی غلاظت ان پر پھینکی، انھوں نے دھمکیاں دیں، انھوں نے مکے دکھلائے، انھوں نے مہاسبھائی لیڈر ویر ساورکر کی جے کے نعرے مارے، انھوں نے دادا لیکھراج کی جے کے آوازے بلند کیے۔ گھڑی سوا گھڑی یہ ہنگامہ چلا۔ اصل خرابی کچرے سے بھرے کاغذی پڑوں نے پیدا کی۔ پڑا آ کر لگا، چہرے یا چھاتی سے ٹکرا، کھادی کے کپڑوں پر غلاظت گری اور جوان بھاگا۔ گیٹ آخر تک نہ کھلا۔ ابھی بوتلوں میں بھرے ہوئے مال کی باری بھی نہ آئی تھی کہ والنٹیئر پسپا ہونے لگے۔ حملہ کامیاب نہ ہوا۔ اصل بات یہ تھی کہ اس زمانے کے غنڈے ابھی اتنے ترقی یافتہ نہ ہوئے تھے، عدم تشدد پر وشواس تھا، زبانی جمع خرچ پر اکتفا کرتے تھے۔

دوسری بار راست اقدام اس افواہ کے باعث نہ کیا جا سکا کہ منڈلی کی عورتوں نے پہلے سے بھی زیادہ بھاری بندوبست کر لیا ہے، مثلاً کپڑے کی چھوٹی چھوٹی تھیلیوں میں بنولے اور کپاس بھر رکھی ہے جسے مقابلے کے وقت گھاسلیٹ میں بھگو کر، تیلی دکھا کر حملہ آوروں پر پھینکا جائے گا۔ جس والنٹیئر پر یہ جلتی ہوئی گٹھڑی گرے گی اس کو آگ پکڑ لے گی۔ بڑے جوکھم کا کام تھا۔

آخر سیٹھوں نے فیصلہ کیا رات کے وقت منڈلی پر پتھروں اور اینٹوں کی برسات کی جائے تاکہ اندر رہنے والوں اور رہنے والیوں کا کچومر نکل جائے۔ منڈلی والوں نے ہندو پوربیے چوکیدار رکھے۔ مگر اتفاقاً کسی نوجوان پوربیے چوکیدار سے کوئی بیچ حرکت ہو گئی، جس کے باعث آئندہ کے لیے دادا لیکھراج کو مرد

ذات پر اعتبار نہ رہا۔
تنگ آ کر انھوں نے منڈلی کو حیدر آباد سے کراچی منتقل کر دیا۔ کلفٹن کی طرف ایک بنگلہ حاصل کر کے اس کے چاروں طرف اونچی دیواریں بنوائیں۔ حیدر آباد کی بلا کراچی کے سر آئی۔ کراچی کے ہندوؤں میں سراسیمگی پھیل گئی۔ خطرے کی گھنٹیاں بج اٹھیں۔ اخباروں نے خاندانوں کو خبردار کیا کہ گھر والوں پر کڑی نظر رکھیں اور مکانوں پر بھاری قفل لگائیں، پاپی لیکھراج آ پہنچا ہے۔
جب تک انگریز اپنی اصل حالت میں رہا، لیکھراج کا بال بیکا نہ ہوا۔ مگر ۱۹۳۷ میں سندھ بمبئی سے الگ ہو گیا۔ ۱۹۳۸ میں اللہ بخش مرحوم کی وزارت بنی جس کا دارومدار ہندو ووٹوں پر تھا۔ ہندوؤں نے اس پر زور دیا کہ اوم منڈلی کو خلاف قانون قرار دے کر حکماً بند کیا جائے۔ گورنر تب بھی انگریز تھا، اس نے ایسی قانونی داد گیری کی اجازت نہ دی۔ وزارت سے کہا کہ پہلے ہائی کورٹ کے جج سے تحقیقات کرا کر اس کی رائے لے، پھر مناسب قدم اٹھائے۔
ہائی کورٹ کا جج بطور ٹریبونل مقرر ہوا۔ اس نے کیا رپورٹ دی، اس کی تو کسی کو کچھ خبر نہ ہوئی، البتہ منڈلی کو بند کرنے کا حکم جاری ہو گیا۔
ہندوؤں کے سر سے بلا ٹلی۔ لیکھراج کا اس کے بعد کیا بنا، اس کی خبر خالق کو۔

مائی جیٹھی سپاہیملانی حیدر آباد کے ایک معزز عامل گھرانے میں پیدا ہوئیں مگر ان کی سیاسی زندگی کراچی میں گزری۔ سندھ کے الگ ہوتے ہی اسمبلی کی ممبر منتخب ہوئیں اور کچھ عرصے بعد ڈپٹی اسپیکر بنیں۔ پڑھی لکھی، ہوشیار اور مہذب، چتر اور چالاک، گویا کھدر کی سفید ساڑھی میں سرتاپا کانگریسی سیاست کا مرمریں مجسمہ تھیں۔ ذاتی اور صفاتی کیریکٹر کے لحاظ سے بالکل بے داغ رہیں۔ نسوانی فطرت کی کشش کو مسکراہٹوں اور میٹھی باتوں تک محدود رکھا۔ سیاست میں کانگریس کی قائل تھیں، مسلم لیگ کے لیے عذاب تھیں۔ اسمبلی میں کانگریس کے نمائندوں کو نکیل ڈال کر کھینچے پھرتیں۔ رہی نیشنلسٹ تھیں۔ سندھ کے کلچر اور پرانے قصوں پر بڑا فخر کرتیں، اور ان کی روشنی میں، موقع ملنے پر، زبانی بحث اور تکرار کرنے سے ذرا نہ گھبراتیں۔
ایک بار میری شامت آ گئی۔ اکتوبر ۱۹۳۸ کے دن تھے۔ ہم سندھ کے کچھ سیاسی ذہن رکھنے والے نوجوان کانگریسیوں سے ناامید اور اُس وقت کے وزیراعلیٰ خان بہادر اللہ بخش سے ناراض ہو کر مسلم لیگ میں شامل ہو گئے تھے۔ کراچی کے عیدگاہ میدان میں مسلم لیگ کی کانفرنس بلائی گئی جس کی صدارت کے لیے قائداعظم تشریف لائے۔ میں اس کانفرنس کی استقبالیہ کمیٹی کا جنرل سیکرٹری تھا۔ میں نے قائداعظم کو ایک ایسے جلوس میں لانے کا بندوبست کیا تھا کہ ویسا جلوس کراچی نے نہ اس سے پہلے دیکھا نہ اس کے بعد۔
جلوس ختم ہونے کے بعد میں واپس آ کر اپنے دفتر میں بیٹھا ہی تھا کہ مائی جیٹھی گرتی پڑتی اندر

داخل ہوئیں۔ نہایت غصے میں تھیں، آنکھیں لال، سر اترا ہوا۔ لگتا تھا کہ کچھ آنسو بھی بہا چکی ہیں۔ انھیں دیکھ کر میں سمجھا کہ ہمارے کسی والنٹیئر نے ان سے کچھ بدسلوکی کی ہے جس کی شکایت لے کر میرے پاس آئی ہیں۔ اُن دنوں ہمارے والنٹیئروں کے دستے بندر روڈ پر گھوما کرتے تھے کیوں کہ افواہ تھی کہ مہاسبھائی ہندوؤں نے مسلم لیگ کے پنڈال میں آگ لگانے کا منصوبہ بنایا ہے۔

میں نے مائی کا استقبال کیا، شربت پانی کو پوچھا، کرسی کھینچ کر پاس بٹھایا۔ وہ کرسی پر بیٹھ تو گئیں لیکن دیر تک زبان سے کچھ نہ کہا۔ غالباً بولنے سے پہلے اپنا غصہ دھیما کرنا چاہتی تھیں۔ آخر بولیں مسٹر راشدی، تم ڈینگیں مارتے پھرتے ہو کہ تم سندھی بھی ہو اور سندھ کی تاریخ سے بھی واقف ہو۔

میں نے کہا، حکم کیجیے۔

بولیں حکم بھاڑ میں گیا۔ میں تمھیں جلانے آئی ہوں۔

اتنے میں پنڈال کے پاس لگے میرے دفتر کے تمبو کے باہر نعرے لگنے لگے جیٹھی زندہ باد! ، مسلم لیگ زندہ باد! ، قائداعظم زندہ باد! ، جیٹھی زندہ باد! یہ نعرے سرحد سے آئے ہوئے پٹھان والنٹیئر لگا رہے تھے۔ یہ بیچارے سندھ کے حالات اور لوگوں سے ناواقف تھے۔ جو بھی شخص میرے تمبو میں آتا باہر بیٹھے بیٹھے اس کے نام کے ساتھ زندہ باد کی ضرب میں لگایا کرتے۔ کسی مقامی شریر نے انھیں بتا دیا تھا کہ جیٹھی اسمبلی ممبر بھی مسلم لیگ میں شامل ہونے کے لیے آ پہنچی ہے۔ انھیں نام سے ہندو مسلمان کا تو کچھ اندازہ نہ ہوا، ان کا کام تھا نعرے لگانا، سو زندہ باد کے نعرے لگانے لگے۔

مائی جیٹھی خفا ہو کر بولیں کہ ان ملعونوں کو چپ کراؤ تاکہ میں تم سے دو لفظ کہہ کر رخصت ہوں۔ میں نے باہر جا کر والنٹیئروں کو نعرے لگانے سے روکا اور واپس آ گیا۔

مائی جیٹھی کی تقریر شروع ہوئی۔ گھنٹا بھر بولتی رہیں۔ بیچ میں ایک لفظ کہنے کا موقع نہ دیا۔ چھٹی امرانی، دودو چنیسر، فیروز شاہ، عیسیٰ ترخان، عبدالنبی کلہوڑو، الیگزنڈر برنس اور دوسروں کے بے شمار قصے سنا ڈالے۔ ان میں سے کچھ مجھے بروقت سمجھ میں آئے، کچھ بعد میں تفصیلی تاریخ پڑھنے پر معلوم ہوئے۔ انھوں نے مجھ سے جواب لینے کی زحمت نہ کی اور اپنی بات پوری کر کے اٹھ کھڑی ہوئیں، ہینڈ بیگ اٹھایا اور تیز تیز قدم رکھتی باہر نکل گئیں۔ اس قدر غصے میں تھیں کہ جاتے ہوئے الوداع تک نہ کہی۔

اس کے بعد سندھ میں مسلم لیگ کی تحریک زور پکڑتی گئی۔ کانگریسیوں، خصوصاً مائی جیٹھی، کے رویے میں کوئی نرمی نہ آئی، نہ ہم نے پیر پیچھے ہٹایا۔ ضدیں بڑھتی گئیں۔ ۱۹۳۸ سے ۱۹۴۷ تک کشمکش تیز ہوتی گئی، اسمبلی میں گھمسان ہوا، ہندو مسلم فسادات ہوئے، مقدمے چلے، ٹربیونل بیٹھے، آخر ہندوستان ٹوٹا، پاکستان بنا۔ دوسرے کانگریسیوں کی طرح مائی جیٹھی بھی سامان اٹھا بمبئی چلی گئیں۔

جن دو تین مسلمان قومی کارکنوں سے اُن کی بالکل نہ بنتی تھی ان میں ایک میں بھی تھا۔ ہم تمام وقت متصادم سیاسی کیمپوں میں رہے، مگر بیس برس کی واقفیت تھی۔ وضع داری کا تقاضا نبھاتے ہوئے

میں انھیں خدا حافظ کہنے گیا۔ انھوں نے فقط تین لفظ کہے، جو اب تک حافظے میں محفوظ ہیں۔

جیسے اُس زمانے کے ہندوستانی راجاؤں میں مہاراجا بیکانیر، ویسے سندھ کے سر برآوردہ مسلمانوں میں میر ایوب خانؒ مرحوم۔ بلند قامت، بھرا بھرا جسم، گوری رنگت، رعب دار مونچھیں، داڑھی صاف، سر پر سُرخ ترکی ٹوپی، سوٹ پہنے ہوں یا شلوار، نوٹائی ضرور لگی ہوتی۔ لس بیلے کے خانوں میں سے تھے، صورت اور سیرت بھی ویسی ہی۔ انھیں دیکھ کر تسلی ہوتی کہ کراچی میں بھی کچھ معزز لوگ رہتے ہیں۔

ولایت سے بیرسٹری پاس کرنے کے بعد آ کر کراچی میں رہنے لگے تھے، مگر پریکٹس نہیں کی۔ انگریزوں میں مردم شناسی بھی اور آدمی کی قدر، انھوں نے میر صاحب کو اول درجے کا آنریری مجسٹریٹ مقرر کیا اور اس عہدے پر وہ آخر تک فائز رہے۔

وقتاً فوقتاً مرحوم نے سیاسی چہل پہل میں بھی حصہ لیا، مگر سندھ محمڈن ایسوسی ایشن، محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس، اوائلی مسلم لیگ، سندھ مدرسۃ الاسلام، کراچی میونسپلٹی، کوئی چھوٹا موٹا ڈیپوٹیشن ــــ اس سے اوپر نہ پرواز کی نہ پرواز کی خواہش رکھی۔ نہ ظاہرداری ہونے کا دعویٰ کیا نہ تابیں بچہ بننے کا عزم۔ سیم ماں صحت جاں۔

سندھ کے خاندانی کلچر کا دلکش نمونہ تھے جس میں مغربی تہذیب اور علمِ جدید کی آمیزش کی بھی خاصی گلکاری تھی۔ وقت کے انگریز ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ لیڈی لارنس نے اپنی کتاب Indian Embers میں ان کی بہت تعریف کی ہے۔

اردو اور فارسی ادب سے دل چسپی رکھتے تھے۔ کراچی میں انجمن ترقی اردو کی پہلی شاخ انھوں نے کھلوائی۔ کسی زمانے میں شعروشاعری کا بھی شغل کرتے تھے۔ مخلوقِ خدا انھیں اچھا انسان سمجھتی تھی۔ مقدور بھر سب کو فائدہ پہنچاتے، دشمنی کسی سے نہ کی۔ سب کی عزت کرتے، سب سے عزت کراتے۔ انھوں نے دنیا سے رحلت کی تو گویا کراچی کی ٹوپی کا پھول گر پڑا اور ٹوپی بے رونق ہو گئی۔ ان کی کمی کوئی شخص پوری نہ کر سکا۔ شہر کی آبرو چند افراد ہی ہوتے ہیں، ورنہ مکھی مچھر، کیڑے مکوڑے تو ہر شہر میں رہتے ہیں۔

محمد ہاشم گزدر، نام محمد ہاشم، سلاوٹی قوم کا گزدر قبیلہ۔ پیشہ انجینیری۔ صاف رنگ، درمیانہ قد، بھاری بدن، خوش پوش، خوش ذوق، خوش لباس، خوش خُلق۔ جوانی ہی میں نوکری چھوڑ کر سیاست سنبھالی۔ مرحوم ماما میر محمد بلوچ کے صحیح جانشیں، سندھ کا مان اور کراچی کی شان ہے۔

ابھی سندھ بمبئی سے الگ نہ ہوا تھا کہ ماما مرحوم کی وفات کے بعد بمبئی کاؤنسل کے ممبر منتخب ہوئے۔ سندھ کی علیحدگی کے بعد متعدد سیاسی عہدوں پر رہے کراچی کے میئر، سندھ اسمبلی کے ممبر، سندھ کے وزیر، مرکزی اسمبلی کے ممبر اور آئین ساز مجلس کے نائب صدر۔

گزدر کی سیاست گز کی طرح سیدھی تھی۔ شروع زندگی سے آخر تک عشق سندھ کے مسلمانوں سے رہا۔ منہ سے کوئی دوسرا بول نہ نکلا۔ سردی ہو یا گرمی، دکھ ہو یا سکھ، آگے بڑھتے رہے۔ سر شیر کی طرح دہاڑتے رہے، کسی سے نہ دبے، کبھی کے آگے نہ کانپے۔

میں ان سے کہا کرتا کہ سیاست میں تم کام پہلے کر ڈالتے ہو، سوچتے بعد میں ہو۔ یہ اندازہ درست تھا۔ کوئی جھگڑا ہونے کی دیر تھی، گزدر ناچتے کودتے اس میں کود پڑتے اور بعد میں پوچھتے کہ جھگڑا کیا تھا۔

کراچی کی سیاسی اور مسلم لیگی زندگی پر سالہا سال چھائے رہے۔ گزدر نہ ہوتے تو کراچی میں، جہاں ہندوؤں کا زور تھا، نہ ۱۹۳۸ کی مسلم لیگ کانفرنس کامیاب ہوتی، نہ ۱۹۴۳ کا آل انڈیا سیشن اور نہ پاکستان کی تحریک۔ سندھ اسمبلی میں تو کانگریسیوں کے حق میں قہر تھے۔ کسی کو چڑانے یا کسی کے ہوش حواس گم کرنے کی ضرورت ہوئی تو گزدر کو آگے کر دیا جاتا۔ ایک دفعہ اسمبلی میں بحث کے دوران گرماگرمی ہو گئی۔ کانگریس پارٹی کے اکیلے مسلمان ممبر، محمد امین کھوسو بحالت جذب و استغراق بیٹھے تھے۔ انھوں نے انھیں ٹائی سے پکڑا اور تھپڑوں پر تھپڑ رسید کرنے شروع کر دیے۔ ایک ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اسپیکر آرڈر آرڈر پکارتا رہا مگر یہ حضرت اپنے کام میں لگے رہے۔ کانگریس کے ممبر، جن کا تشدد میں وشواس نہ تھا، بھاگنے کے لیے دروازوں پر نظریں جمائے بیٹھے تھے۔ مائی جیٹھی سپاہیملانی (ڈپٹی اسپیکر) کو یہ بات نہ بھائی۔ اپنی نفرت کو نسوانی انداز میں ناک سکیڑ کر نوکدار بنا لے، سندھی میں ایسے خیالات کا اظہار کرتی رہیں، زور سے بولنے اور پارلیمانی آداب یاد دلانے کے لیے ماحول سازگار نہ تھا۔

سکھر کی مسجد منزل گاہ کے سلسلے میں مسلم لیگ کی تحریک جاری تھی۔ پولیس اور ستیہ گرہی مسلمانوں کے درمیان مقابلہ ہو رہا تھا۔ پولیس (محکمۂ داخلہ) کے وزیر سر غلام حسین تھے۔ میں نے سکھر سے گزدر کو پیغام بھیجا کہ سر صاحب کے بنگلے کا گھیراؤ کر لو۔ گزدر نے لوگوں کو جمع کیا اور جلوس کی صورت میں جا کر بنگلے کا گھیراؤ کر لیا۔ سر صاحب کو پہلے ہی بھنک پڑ گئی تھی، اس لیے بنگلے سے کھسک گئے تھے۔ انھوں نے نعرے لگا لگا کر گھر والوں کا سکون غارت کر دیا۔ گزدر خود اور ان کے والنٹیئر دھرنا دیے بیٹھے رہے۔ بعد دوپہر خبر پہنچی کہ حکومت نے منزل گاہ سے پولیس ہٹا لی ہے، تب سر صاحب کے دولت خانے سے محاصرہ ہٹا۔

مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کے اس قدر شیدائی تھے کہ سندھ بلکہ ہندوستان کے کسی گوشے میں کوئی میٹنگ یا کانفرنس ہوتی یا کوئی جلوس نکلتا تو گزدر ضرور شامل ہوتے۔ مارچ ۱۹۴۰ میں آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس لاہور میں ہو رہا تھا۔ گزدر صاحب پہلے ہی سے آ پہنچے۔ لاہور کے اجلاس کا بندوبست کرنے کے لیے میں کئی ماہ سے وہاں موجود تھا۔ اجلاس شروع ہونے سے پہلے گزدر نے مجھ سے کہا کہ ان کے بیٹھنے کا کچھ ایسا بندوبست کروں کہ وہ قائداعظم کے قریب رہیں اور خدانخواستہ ان پر کوئی حملہ ہو تو وہ خود کو سامنے کر کے قائد کا کچھ بچاؤ کر سکیں۔ انھیں خبر ملی تھی کہ اس قسم کے حملے کا امکان ہے۔ مگر خدا نے خیر کی اور کوئی حملہ نہ ہوا۔

۱۹۵۴ میں گورنر جنرل غلام محمد نے وزیراعظم محمد علی بوگرا پر دباؤ ڈال کر آئین ساز اسمبلی کو توڑ دیا تھا۔ کھدڑ مرحوم اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر تھے۔ خوف کے مارے اسمبلی کے دوسرے ممبر اور عہدے دار تو بھاگ گئے، مگر کھدڑ صاحب صبح کو حسب دستور بن سنور کر، عمدہ سوٹ پہن، کوٹ میں گلاب کا پھول لگا اسمبلی ہال کے باہر پہنچے اور پولیس کا پہرہ توڑ کر اندر داخل ہونے کی کوشش کرنے لگے۔ پولیس کا ہاتھ سنگین لگی بندوقوں پر اور کھدڑ کا ہاتھ دروازے میں لگے تالے پر۔ کافی دیر کشمکش ہوتی رہی۔ کھدڑ کو قانونی طور پر Cause of Action کا مقدمہ دائر کرنے کا جواز پیدا کرنا تھا جس کی بنیاد پر ہائی کورٹ میں حکومت کے خلاف رٹ داخل کی جا سکے۔ رٹ داخل ہوئی جسے قانون کی تاریخ میں مولوی تمیز الدین خان کیس کی حیثیت حاصل ہوئی۔ مولوی صاحب اسمبلی کے اسپیکر تھے۔ اس واقعے کے ذریعے جمہوریت کا جلوہ دیکھ کر اپنے گھر جا بیٹھے۔ مرتے مر گئے مگر پھر ادھر کا رخ نہ کیا۔

ایوب خان کا دور آیا۔ اس دور میں انہیں ہاشم کھدڑ پر الزام لگا کہ پاکستان کی سالمیت کو ان سے خطرہ ہے۔ کچھ پوچھے گچھے بغیر انہیں جیل میں ڈال دیا گیا۔ پاکستان کے لیے کھدڑ کی برسوں کی قربانیاں اور خدمتیں ایک پل میں رائیگاں ہو گئیں۔ جب ایوب خان سیاستدان بنے تو انہوں نے کنونشن مسلم لیگ قائم کی۔ کراچی شہر سے کھدڑ جیسے مسلم لیگ کے پرانے پہلوان کو شامل کرنے کی شدید ضرورت محسوس ہوئی۔ یک دم پاکستان کی سالمیت کو درپیش خطرہ ٹل گیا؛ کھدڑ رہا ہو گئے۔ امید کی گئی کہ کھدڑ جیل کا سبق سیکھنے کے بعد سیدھے سرکاری مسلم لیگ کا رخ کریں گے۔ مگر کھدڑ جیسے بیٹے بھی دوسری ماؤں نے کیا جنے ہوں گے، جان جانے پر آن نہ جائے۔

جہانگیر پارک میں عام جلسہ ہوا۔ کھدڑ وہاں پہنچ گئے۔ تقریر ایسی کی کہ سالمیت پھر خطرے میں پڑ گئی۔ انہیں دوبارہ جیل میں ڈال دیا گیا۔ اس دفعہ ان کا جرم اور سنگین تھا، اس لیے بغاوت کا مقدمہ بھی قائم کر دیا گیا۔ بہت عرصہ قید کاٹی۔ جب رہا ہوئے تو صحت برباد ہو چکی تھی۔ اچانک دل کا دورہ پڑا اور سندھ کے دوسرے شہیدوں سے جا ملے۔ اب کراچی کے کسی گمنام گوشے میں ابدی آرام کر رہے ہیں۔ ان کے آرام کے خیال سے نہ وہاں میلا لگتا ہے، نہ بچوں کی خواہش مند عورتیں وہاں آ کر ان کے سرہانے ہنگامہ کرتی ہیں، نہ نمائشی سیاست دان قبر کے پاس کھڑے ہو کر فوٹو کھنچواتے ہیں (ہاتھ اٹھے ہوئے، نظریں فوٹوگرافر پر)۔

بوڑھے پوربیے کی پیدائش بھارت کے پوربی حصے میں ہوئی تھی، مگر مزدوری کیماڑی بندر پر کرتا تھا۔ پیشہ بگی، جہازوں میں سے بوریاں اٹھا اٹھا کر نیچے اتارتا اور ریل کے ڈبوں سے سامان اٹھا کر جہاز میں لادتا۔ مزدوری ایک روپیا روز؛ عمر ستر سے اوپر۔ دھرم ہندو۔ لمبا قد، مگر بدن دبلا۔ صاف تنک لمبی داڑھی۔ نیچے لنگوٹی، اوپر کا بدن اکثر ننگا۔ نام اب مجھے یاد نہیں رہا۔

شام کے وقت سڑک کے کنارے ایک میدان میں چٹائی بچھا کر بیٹھ جاتا اور جو غریب لوگ ٹوٹے

ہاتھ پیروں کا علاج اسپتالوں میں کرانے کی سکت نہ رکھتے، یا اسپتالوں سے ناامید ہو چکے ہوتے، اس کے پاس آیا کرتے۔ وہ ان کی ہڈیاں بھی جوڑتا اور تیل کی مالش کر کے پٹیاں بھی باندھتا۔ کسی سے ایک پیسا نہ لیتا تھا۔ تیل اور پٹیوں کا خرچ بھی خود اٹھاتا۔ اپنے فن کا استاد تھا۔ شہرت ایسی تھی کہ جن مریضوں کو اسپتال سے جواب مل جاتا وہ بھی اس کے پاس آتے۔ آخر آخر تو مالدار مریض بھی اسپتالوں کو چھوڑ کر اس سے علاج کرانے آنے لگے۔ مقررہ وقت پر بہت سے مریض جمع ہو جاتے۔ وہ ہر ایک کو باری سے دیکھتا تھا، امیر ہو یا غریب۔

سر گیانشی رائے بہادر موتی چند نواب شاہ کے بڑے زمیندار، بعد میں سندھ اسمبلی کے اہم ممبر، میرے پرانے دوست تھے۔ کسی حادثے میں ان کا ہاتھ ٹوٹ گیا اور ٹانگ مڑ گئی تھی۔ پیسے کی کمی نہ تھی۔ کراچی کے بڑے بڑے انگریز سرجنوں سے علاج کرایا مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ ایکسرے سے معلوم ہوا کہ ہڈیاں ٹوٹنے کے بعد جہاں کی تہاں رکھی ہیں، نہ سیدھی ہوئی ہیں نہ جڑی ہیں۔ انھوں نے کسی کی زبانی کیاماڑی کے بوڑھے پوربیے کا ذکر سنا۔ ایک شام مجھے ساتھ لے کر کیاماڑی پہنچے۔ زمین پر پرانی چٹائیاں بچھی تھیں۔ سو کے قریب مریض سامنے قطاریں بنائے بیٹھے تھے۔ ان میں غریب بھی تھے امیر بھی — پارسی سیٹھ، میمن، بوہری، ہندو، مسلمان، کرسٹان اور دو ایک یوروپی؛ بیش تر مرد، کچھ عورتیں بھی۔ باری باری ایک ایک کو بلاتا، سامنے بٹھا کر دیکھتا، معائنہ کرتا، ہڈی جوڑتا، پٹی باندھتا اور پھر آنا جلی کرے گا کہہ کر رخصت کر دیتا۔ رائے بہادر اور میں آخری صف میں بیٹھے تھے۔ آگے کی قطاریں ختم ہوئیں تو رائے بہادر کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ میں انھیں سہارا دے کر آہستہ آہستہ اس کے پاس لے گیا۔ اس نے رائے بہادر کے بازو اور ٹانگ کی ہڈیاں جوڑ کر پٹی باندھی اور آٹھ دن بعد آنے کا کہہ کر فارغ کر دیا۔

پھر میری طرف دیکھ کر کچھ مسکرایا اور پوچھا "پُتر، کیا ہووت ہے؟"

میں نے کہا، "ہمارا من ٹوٹت ہے۔" اس سے زیادہ پوربی مجھے نہیں آتی تھی۔

جب سب مریض جا چکے تو رائے بہادر اور میں باقی رہ گئے۔ وہ خود بھی فارغ ہو چکا تھا اس لیے خوش گوار موڈ میں تھا۔ پیار بھری باتیں کرنے لگا۔ بہت سی باتیں کیں جن کا خاتمہ ان جملوں پر ہوا "پُتر، سکھی رہو گے اگر یاد رکھو گے کہ جیوں جل میں پترا (کاغد) ہے۔ گلنے والی چیز ہے۔ آج نہیں تو کل گل جائے۔"

رائے بہادر اس کے بعد تین مرتبہ اس کے پاس گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ جا کر درویش کے درشن کرتا رہا۔ رائے بہادر کا بازو اور ٹانگ جڑ کر بالکل ٹھیک ہو گئی۔ پھر جانے کا اتفاق نہ ہوا، زمانے کے اتار چڑھاؤ میں غرق رہا۔ رائے بہادر نے بھی سندھ کو الوداع کہہ کر بمبئی میں بقیہ زندگی بسر کی۔ مگر پوربیے فقیر کی صورت آج بھی آنکھوں کے آگے پھرتی ہے۔ غیر معمولی انسان تھا؛ چند لفظوں میں زندگی کی ماہیت اور معنی سمجھا گیا۔ سائیں سب میں بستا ہے؛ اُس کے مہر کا بیسہ باغوں بیابانوں پر ایک جیسا برستا ہے۔

سندھ میں سخت پردہ ہوتا تھا۔ عورتوں کو شادی بیاہ پر برادری میں جانا پڑتا تو برقع اوڑھ کر پردے لگی گاڑی میں سوار ہوتیں، وہ بھی رات کے وقت۔ راستا چلتے لوگ ایسی گاڑیاں دیکھ کر راستا چھوڑ، گاڑی کی طرف پیٹھ کر کے کھڑے ہو جاتے۔ بڑے گھرانوں کی مستورات کو فاصلے کے سبب ریل کے ذریعے لے جایا جاتا تو اس طرح کہ پورا ڈبّا بک کرایا جاتا اور کھڑکیاں دروازے بند رکھنے کے علاوہ خود ڈبے کو بھی چادروں سے ڈھانپ دیا جاتا کہ کہیں غیروں کی نظر نہ پڑ جائے۔ اُن دنوں تمام کراچی شہر میں بھی کوئی بے پردہ عورت، جوان یا بوڑھی، ہندو یا مسلمان، دیکھنے میں نہ آتی تھی۔ مختلف قومیں یہاں بستی تھیں، مذہب مختلف تھے، ریتیں رسمیں جدا جدا تھیں، مگر کم سے کم ۱۹۳۰ تک پردے کے معاملے میں سب ہم خیال تھے۔ پارسی البتہ کسی قدر آزاد تھے، مگر اُن کی عورتیں بھی منہ ننگا کیے گلیوں میں گھومتی نہ پھرتی تھیں، کبھی کبھی سورج غروب ہونے کے وقت اپنے مردوں اور بچوں کے ساتھ وکٹوریا گاڑی میں سوار ہو کر ہوا بندر یا اُدھر جانے والی سڑک کے کنارے پر گاڑی رکوا کر ٹھنڈی ہوا کھا آتیں، اللہ اللہ خیر سلا۔

۱۹۳۰ تک میں نے دیکھا کہ کراچی میں صرف ایک ایسی پارسی خاتون تھی جو سیبٹ لیو مڈر لگا کر، رنگین ساڑھی باندھ کر، بار سنگھار کر کے شام کو ہوا بندر پر آتی اور وہاں بے حجابانہ چہل قدمی کرتی تھی۔ تھی تو اشراف، اوباش بالکل نہ تھی۔ صدر کے ایک مشہور ڈاکٹر کی بیوی تھی۔ اکثر اپنے شوہر کو بھی ساتھ لے آتی۔ ہوا بندر پر اس کی آمد بلاناغہ ہوتی تھی۔ اتفاق سے اگر کسی روز شوہر کو فرصت نہ ہوتی تو اکیلی چلی آتی، مگر آتی ضرور تھی۔

خود کراچی کے رہنے والے اس خاتون کا کوئی نوٹس نہ لیتے، البتہ دیہات سے آنے والے مالدار لوگوں کے لیے ایک حسین عورت کا یوں بے پردہ اور بے حجابانہ گھومنا نرالی بات تھی۔ وہ بگھیاں کرائے پر لے کر شام کو ہوا بندر آتے اور یہ نظارہ ضرور دیکھتے۔ پرومینیڈ (سیر گاہ) کے دونوں طرف چھتوں اور دیواروں پر چڑھے بیٹھے رہتے۔ جن کی داڑھیاں تھیں وہ ان میں گھونگھر ڈالتے، جن کی مردانگی کی نشانی فقط مونچھیں تھیں وہ بیٹھے انھیں کو بل دیا کرتے۔ مگر وہ عورت نہ داڑھی کے گھونگھروں سے متاثر ہوتی نہ مونچھوں پر کی گئی محنت کی قدر کرتی۔ اپنی آنکھیں سامنے جمائے چہل قدمی میں مصروف رہتی اور اپنے متوالوں کے سینوں پر مونگ دلا کرتی، نہ ادھر دیکھتی نہ اُدھر نظر ڈالتی۔ اس کی اس بے توجہی سے بیزار ہو کر کچھ نوجوانوں نے عین اُسی وقت پرومینیڈ پر ٹہلنے کا وطیرہ اختیار کیا، اور اس طرح کہ ہر پھیرے میں اس کے پاس سے گزرتے، مگر اس کی طرف سے بے نیازی کا رویہ قائم رہا۔ اسی زمانے میں دیہات کے وڈیروں نے موٹریں خریدنی شروع کی تھیں۔ ستائیس سو میں شیورلیٹ اور دو ہزار میں فورڈ کار بکتی تھی۔ کراچی آ کر موٹر خریدنے کے بعد یہ لازم ہوتا کہ موٹر کو ہوا بندر لے جا کر ایسے رخ سے کھڑا کیا جائے کہ جب خاتون سے آمنا سامنا ہو تو اس کی نظر گاڑی اور اس میں بیٹھے لوگوں پر پڑے۔ جب اس پر بھی چشمِ نیم وا کی نوازش نہ ہوئی تو موٹروں کے ہارن ملاحظہ بجائے جانے لگے۔ ہارن ربڑ کی گیند کی طرح کے ہوتے تھے اور

اں سے نکلنے والی آوار گویا ر کدھے کی ریںک! کچھ دں میں یہ تجربہ بھی ناکامیاب ثابت ہوا۔

آخری طریقہ یہ رہ گیا کہ کراچی پہنچتے ہی بیمار پڑجایا جائے اور اُسی ڈاکٹر سے علاج کرایا جائے جس کی یہ بیوی تھی۔ بیماریاں کیا ہوتی تھیں، اس کی تو خبر نہ لگی، مگر اتنا ظاہر تھا کہ سندھ کے نوقیں وڈیرے یا نوجواں لیڈر اس ڈاکٹر کے مطب کے خوب چکر لگایا کرتے۔ قربت حاصل کرنے کی غرض سے وہ اکثر اپنے ساتھ میوے، مٹھائیاں اور سندھ سے شکار کیے ہوئے پرندوں کی ڈالیاں بھی لاتے تھے۔ ان کا یہ ورک کتنا کامیاب رہا، یہ خدا پاک کو خبر۔ جہاں تک میں دیکھ پایا وہ یہ تھا کہ ایسے مریض لال اور ہرے مکسچروں کی بوتلیں ہاتھ میں لیے باہر نکلتے۔ گھر جا کر انھیں پیتے تھے یا گٹر میں لنڈھا دیتے تھے اس کا دارومدار لازماً ان کے مرض کے سچے یا جھوٹے ہونے پر ہوتا۔ البتہ جو مریض ڈالیوں سے مسلح ہو کر آتے ان کے چہرے کبھی کبھی سرخ ہوا کرتے، گماں ہوتا تھا کہ شاید شربتِ دیدار کا گھونٹ بروقت میسر آ گیا۔ فوری علاج یہی ہو سکتا تھا!

گوٹھ واپس جانے کے بعد جب کراچی میں حاصل کی ہوئی فتوحات کا ذکر محفلوں میں ہوتا تو گفتگو کا ایک اہم موضوع اس محاذ کی خبریں بھی ہوا کرتیں۔

کراچی کی بیدمٹموں سے ہمارے وڈیروں کی روح فنا ہوتی تھی، حالاں کہ دیدارِعام یہی ہوتا تھا۔ میدمیں خاصی تعداد میں ہوتیں۔ صبح شام صدر کی دکانوں کی سیر کیا کرتیں۔ ان کی خاص مار الفنسٹن اسٹریٹ پر ہوتی تھی، جہاں ان کی ضرورت کی چیزوں کی دکانیں تھیں۔ دیہات سے آئے ہوئے وڈیرے ان سے بہت خوف کھاتے تھے۔ مبادا کسی میم صاحب سے اچانک سامنا ہو جائے، اس ڈر سے بہت سے تو صدر کا رخ ہی نہ کرتے۔ ان کی سرگرمیاں مولو مسافرخانے، رضیدار ہوٹل، سندھ اسلامیہ ہوٹل، جونا مارکیٹ، بیپسر روڈ، کیماڑی اور زیادہ سے زیادہ بولا سدر تک محدود رہتیں۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ الفنسٹن اسٹریٹ پر جال بھائی پارسی فوٹوگرافر کی دکان میں جیکب آباد کی طرف کے دو تین طرف والے وڈیرے اپنے آدھ درجن نوکروں چاکروں سمیت گھسے کھڑے ہیں۔ خوف سے نیم جاں، منھ اترے ہوئے، آنکھیں وحشت ناک، بال بکھرے ہوئے، ہونٹ خشک، زبانیں تالو سے لگی ہوئی ـــــ جیسے بکریوں کے گلے نے بھیڑیے کی بُو سونگھ لی ہو۔

وہ میرے واقف تھے، فوٹوگرافی کے شوق کے باعث میں بھی جال بھائی کی دکان پر اکثر جایا کرتا تھا۔ مجھے گماں ہوا کہ شاید اپنا گروپ فوٹو کھنچوانے آئے ہیں۔ مگر اسٹوڈیو کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے ان میں سے کوئی نہ کوئی ذرا ذرا دیر بعد دروازے میں سے باہر منھ نکال کر سڑک پر دونوں سمت نظر ڈالتا اور جلدی سے لوٹ آتا۔ یہ روش مجھے کچھ عجیب معلوم ہوئی۔ میں نے جال بھائی کے بیٹے سے پوچھا۔ اس نے بتایا کہ ان بیچاروں نے پاس کی دکانوں میں چند بیدمٹموں کو چڑھتے دیکھ لیا ہے جن سے ڈر کر یہاں آ چھپے ہیں۔ میں نے آگے بڑھ کر بڑے وڈیرے سے پوچھا فوٹو کھنچوانے میں اتنی دیر کیوں لگا رہے ہیں؟

بولے فوٹو جائے جہنم میں، ہماری جان پر بنی ہوئی ہے۔

میں نے کہا خیر تو ہے؟

کہنے لگے خیر کہاں؟ بازار آئے تھے، چمڑے کے صندوق، بیگ اور بستر بند خریدنے تھے۔ اچانک دیکھا کہ میمیں چلی آ رہی ہیں۔ ان کے ڈر سے اس دکان میں آ کر پناہ لی ہے۔ یہ میمیں رخصت ہوں تو ہم یہاں سے نکلیں۔

مگر میڈموں سے آپ کو کیا ڈر ہے؟ وہ آپ کو کیا کہیں گی؟

شاہ صاحب، خبر نہیں کس جورپی (یورپی) عفیسر (آفیسر) کے گھر کی عورتیں ہیں۔ سارے کمشنر، کلکٹر، کمانی اور دوسرے بڑے عفیسروں کے بنگلے پاس کے علاقے میں ہیں۔ اگر ہمارا یوں ٹولی سا کر گھومنا کسی میڈم صاحب کو نہ بھایا تو ہمیں بندھوا کر ریل (جیل) بھجوا سکتی ہیں۔ کراچی گھومنے کے شوق میں خواہ مخواہ قید کاٹنی پڑے، اس لیے شیروں اور بھیڑیوں سے دور رہنا ہی بھلا۔

یہ بات مئی ۱۹۲۴ کی ہے۔ مہینے بھر بعد نئے خطابوں کا اعلان ہوا۔ اس وڈیرے کو خان بہادر کا خطاب ملا۔

لکھنے والے بڑے لوگوں کی بات لکھتے ہیں۔ ان کے اعمال کیسے ہی ہوں، دنیا کو سکھ دیا ہو یا اس پر تباہی لائے ہوں، محض بڑا آدمی ہونا شرط ہے، آدمیت میں نہ سہی، مال و زر میں سہی! چھوٹے لوگوں، چلتے پھرتے غریبوں کو کوئی یاد نہیں کرتا، جیسے ان کی زندگی رائیگاں ہی گزری ہو۔ حالاں کہ اس دنیا کا چرخہ غریبوں اور محنت کشوں کے پسینے ہی سے چل رہا ہے۔

بوستان خان، معمولی پٹے والا تھا، مگر کمشنر صاحب بہادر مالک ممالک سندھ کا پٹے والا تھا، جہاں جہاں اسے چوبدار کہا جاتا تھا۔ سرکار کی طرف کا رہنے والا تھا۔ ساڑھے چھ فٹ قد، گول چہرہ، گورا رنگ، موزوں بدن؛ بازو کھول کر چلتا جیسے پرندہ اڑنے کو پر تولتا ہو۔

کراچی کے اُن دنوں کے گورنمنٹ ہاؤس میں کمشنر صاحب کے دروازے پر غالیچہ بچھائے بیٹھا ہوتا تھا۔ ملاقاتیوں کا استقبال کرنا اور رپورٹ کر کے انھیں کمشنر کے سامنے پیش کرنا اس کے فرائض میں داخل تھا۔ عام طور پر دیکھا جاتا تھا کہ افسروں کے اکثر پٹے والے بدتمیز ہوتے تھے؛ منہ بنائے بیٹھے رہتے، ملاقاتی سلام کرتے تو بیٹھے بیٹھے سر ہلا دیتے۔ صاحب کو رپورٹ کرنے کو کہا جاتا تو یوں لگتا جیسے کسی نے تھپڑ مار دیا ہو۔ بہت منانے اور سمجھانے کے بعد ہی ملاقاتی کے نام کا پُرزہ اندر لے جاتے۔ ملاقات ہو جانے کے بعد البتہ ان کا مزاج یک دم بدل جاتا تھا۔ ملاقاتی سے بخشش لینے کے لیے بھوکے پلے کی طرح باہر تک اس کا پیچھا کرتے۔ جب تک دو تین روپے نہ مل جاتے، تب تک کھیسیں نکالتے اور ملاقاتی کے گھر بار، کتوں اور مرغیوں کی خیر عافیت پوچھا کرتے۔

بوستان خان ہر لحاظ سے ان پٹے والوں سے مختلف تھا۔ ملاقاتیوں پر گورنمنٹ ہاؤس میں پیر رکھتے

ہی رعب چھا جاتا تھا مگر دور ہی سے برآمدے میں بیٹھے بوستان خان کا مسکراتا چہرہ دیکھ کر اس کی جان میں جان آتی۔ چھوٹا آدمی ہو یا بڑا، بوستان خان اسے فوراً آگے بڑھ کر مرحبا کہتا، دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرتا، خاندان کا حال احوال پوچھتا، نام کی پرچی لے کر جلد سے جلد صاحب سے ملوا کر انہیں گاڑی تک پہنچانے آتا۔ موقعے پر کوئی بخشش نہ لیتا، ملاقاتی اسے دعوت دیتا کہ فرصت کے وقت اس سے گھر آ کر ملے۔ نوکری کا وقت پورا ہونے پر جب فرصت ملتی اور مرضی ہوتی تو اس کے پاس چلا جاتا ورنہ خیر۔ لیکن اگر اتفاقاً کسی کی دہلیز پار کرتا تو لوگ آنکھیں بچھا کر اس کا آدر کرتے۔ سچ یہ ہے کہ سندھ کے لوگ کمشنر سے بڑھ کر بوستان خان کا احترام کرتے تھے۔ (سردی کے موسم میں جب کمشنر صاحب سندھ کے گشت پر نکلتے تو سندھ کے معززین بوستان خان کے اعزاز میں الگ دعوتوں کا انتظام کرتے۔) محبت کا جواب محبت سے دیتے۔ کمشنر کا معاملہ زور زبردستی کا تھا، بوستان سے دل کا رشتہ تھا۔ تھا تو معمولی پٹے والا ہی، مگر آدمیت مقام اور مکان کی محتاج نہیں ہوتی۔

سندھ بمبئی سے الگ ہوا تو بوستان بھی پنشن لے کر غائب ہو گیا۔ بوستان خان کو رخصت کرتے ہوئے مناسب ہے کہ پرانے گورنمنٹ ہاؤس پر بھی آخری نگاہ ڈال لی جائے۔

یہ گورنمنٹ ہاؤس سر چارلس نیپیئر کے زمانے میں بنا اور بمبئی سے سندھ کی علیحدگی کے وقت تک قائم رہا۔ سادہ عمارت تھی۔ بیچ کے کمروں کے اوپر فقط تین کمرے بنے ہوئے تھے، ورنہ پوری عمارت یک منزلہ، پانچ چھ فٹ اونچے چبوترے پر بنی ہوئی تھی۔ کمرے بڑے بڑے، چھتیں اونچی، فرش ٹائلوں والا۔ ملاقاتیوں کے بیٹھنے کے لیے برآمدہ تھا، تین طرف سے کھلا ہوا، بہت ہوادار، بیٹھے بیٹھے نیند آجایا کرتی۔ اس برآمدے کے بعد کمرے تھے۔ پہلے (انگریز) اسسٹنٹ کمشنر کا کمرہ، اس سے آگے کمشنر کے دفتر کا بڑا کمرہ، اس کے بعد گھر کے کمرے۔ سامنے میدان میں پھول دار پودے۔ برآمدے میں بیٹھ کر کیاماڑی دکھائی دیتا تھا۔ بیچ میں کوئی اونچی عمارت نہ تھی۔ کل تین چار افراد گورنمنٹ ہاؤس میں بیٹھے نظر آتے۔ کمشنر خود، اسسٹنٹ کمشنر، اور دو تین پٹے والے ___ سکون چھایا رہتا۔ اطمینان سے تمام کاروبار چلا کرتا۔ بالکل محسوس نہ ہوتا کہ پورے سندھ پر اس پُرسکون مختصر سے بنگلے سے راج کیا جاتا ہے۔ نہ افسروں کی ریل پیل، نہ دروازے کھلنے بند ہونے کی آوازیں، نہ لوگوں کا ہجوم، نہ باتیں نہ کونوں کھدروں میں بیٹھ کر لوگوں یا ملک کو ڈھانے اور اٹھانے کی سازشیں۔ ماحول سادہ، صاف، پُرسکون، مگر رعب دار۔ برآمدے میں کٹہرے سے لگی سفید بید کی بنی ہوئی کرسیاں اور بنچیں رکھی ہوتیں۔ سامنے ایک بڑی میز پر لکھنے پڑھنے کا سامان اور ملاقاتیوں کی کتاب رکھی ہوتی۔ اس زمانے میں فاؤنٹین پین ابھی عام نہیں ہوئے تھے، لوگ روشنائی کی دوات میں قلم ڈبو کر ملاقاتیوں کی کتاب میں اپنے نام لکھتے۔ دوات چینی کی بنی ہوتی جس پر گلابی رنگ کے پھول ہوتے۔ ایسی خوب صورت دوات میں نے پھر کبھی نہ دیکھی۔ پیرس، روم اور لندن میں بھی ڈھونڈی مگر کہیں نہ ملی۔

بڑے بڑے انگریز کمشنر اس گورنمنٹ ہاؤس میں رہ چکے تھے جس نے اسی برس تک سندھ کی

تاریخ رقم کی۔ سر بارٹل فریئر ۱۸۵۱ سے ۱۸۵۹ تک کمشنر رہے۔ ان کے دنوں میں انگریزوں کے زمانے کے سندھ کی تعمیر ہوئی، پل، سڑکیں، ریل، تار، ڈاک، اسپتال، اسکول، کالج، تھانے، ضلعوں اور تعلقوں میں سرکاری عمارتیں، سروے، لاء اینڈ آرڈر وغیرہ اُن کے زمانے کی نشانیاں ہیں جن میں سے کئی اب تک ڈھے نہ سکیں (مثلاً صدر کا فریئر ہال)۔ انسانوں کے ہمدرد تھے۔ لیاری میں رہنے والے ایک مسکین میر بحر (ملاح)٭ سے کہیں ان کی واقفیت ہو گئی تھی جس نے آگے چل کر دوستی کا رنگ اختیار کر لیا۔ اس غریب کو نہ صرف برسوں اسی حیثیت سے گزراوقات کے لیے پیسے دیتے رہے، بلکہ اگر وہ یا اس کے گھر کا کوئی فرد بیمار ہو جاتا تو مزاج پُرسی کے لیے کمشنر صاحب خود اکیلے اس کی جھونپڑی میں جایا کرتے۔ انھوں نے ایسی ہمدردی، عدل، انصاف اور حسنِ انتظام کے ذریعے سندھ میں انگریزی راج کے قدم پختہ کر دیے۔ سندھ اور سندھ کے ادب سے گہرا لگاؤ تھا، اسی بیٹی کے مطالعے کے لیے شاہ عبداللطیف کی سوانح عمری سندھی میں لکھوا کر اس کا انگریزی میں ترجمہ کرایا۔

دوسرے مشہور کمشنر سر ایونس جیمز تھے۔ سندھ کی تاریخ اور ادب سے بڑی واقفیت رکھتے تھے۔ انتظام اور انصاف کے معاملے میں ہاری اور جاگیردار میں کوئی فرق روا نہ رکھے۔ کسی آبرو والے کی بگ خواہ مخواہ نہ اتروانے مگر کسی وڈیرے یا پیر کو من مانی کرنے کی جرات نہ ہوتی۔ اسی طرح کمشنر لیوکس نے بھی بڑی شہرت پائی، سندھ میں صد درجہ امن وامان قائم کیا اور ایسی دھاک بٹھائی۔

نامور کمشنروں میں سے آخری سر ہنری لارنس تھے جنھوں نے نئی اٹھنے والی تحریکوں (کانگریس، خلافت، ہجرت وغیرہ) سے متاثر ہو کر کوشش کی کہ سندھ کے مسلمانوں کو سرکاری نوکریوں میں کھپا کر انھیں آزادی کی تحریکوں سے الگ رکھیں۔ اس کوشش میں انھیں کسی حد تک کامیابی بھی ہوئی، مگر اس دوران سیاسی بیداری میں اضافہ ہوتا رہا جس کا جواب انھوں نے سختی سے دینا چاہا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ سندھ کے عمومی مسئلوں کے متعلق سندھ کے بزرگ، ہندو اور مسلمان، مل جل کر قدم اٹھاتے تھے۔ چناں چہ سندھ کے دو ممتاز نمائندے، رئیس غلام محمد بھرگڑی اور سیٹھ ہرچندرائے وشنداس، کمشنر لارنس کی کارروائیوں کے خلاف شکایت بمبئی کے گورنر کے پاس لے گئے۔ انھیں سندھ سے چوری چھپے نکلنا پڑا کیوں کہ لارنس نے ان کی گرفتاری کے احکام جاری کر دیے تھے۔ بمبئی کے گورنر نے ان کی شکایت پر کان نہ دھرے تو وہاں سے ناامید ہو کر دونوں بمبئی ہی سے جہاز میں سوار ہو کر لندن پہنچے۔ وہاں انھوں نے وزیر ہند سے ملاقات کی اور وہاں سے حکم جاری کرایا کہ لارنس کو، جو ان دنوں مختصر رخصت پر لندن میں تھے، ہندوستان لوٹنے پر سندھ کے کمشنر کے عہدے پر نہ رکھا جائے۔ لیڈی لارنس نے Indian Embers نامی کتاب میں یہ پورا قصہ بیان کیا ہے اور اس کے علاوہ سندھ کے بارے میں بہت سے دل چسپ حالات لکھے ہیں۔

لارنس کے بعد سندھ کی کمشنری پر معمولی قسم کے انگریز آنے لگے، کوئی ٹھیلا، کوئی مسخرہ، کوئی کام چور، کوئی چوروں کے اوپر مور۔ دنیا کا دستور ہے کہ رعیت سرکاری اہلکار کا چہرہ دیکھ کر سرکار کے

بارے میں رائے قائم کرتی ہے۔ سندھ کے آخری کمشنروں کے چہرے دیکھ کر سندھ کے سب باشندوں کی بھی یہ رائے ہو گئی کہ سندھ کو بمبئی سے جدا کرا کے کمشنری راج سے جان چھڑائی جائے، اور ہوا بھی یہی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ٹامس جیسے بدھو اور گبس جیسے ہلکی طبیعت کے لوگ کمشنر ہو کر نہ آتے تو شاید سندھ کی علیحدگی کی تحریک اتنا زور نہ پکڑ پاتی۔

سندھ علیحدہ ہوا۔ کمشنر ان سندھ، مالک ممالک سندھ، کا انجام بخیر ہوا۔ پرانا تاریخی گورنمنٹ ہاؤس بھی ڈھے گیا۔ اس کی جگہ پر قافلہ سرائے کے نمونے پر گورنر ہاؤس کے نام سے ایک نئی گزرگاہ تعمیر ہوئی جس میں اب تک پندرہ مسافر ستا کر رخصت ہو چکے ہیں۔

***

سندھ ۱۹۳۷ میں بمبئی سے الگ ہو کر صوبہ بنا۔ ۱۹۳۷ سے ۱۹۴۷ تک اس کی نئی قومی زندگی کی بنیادیں پڑیں، مگر غلط اصولوں پر، جنھوں نے غلط قدروں کو جنم دیا اور آخر خود صوبے ہی کو پامال کر دیا۔

الگ ہونے کے بعد سندھ کے وڈیرا صاحبان اور پیر صاحبان، اپنی دولت، حاکمانہ اثر اور پیری مریدی کے زور پر، سندھ کی سیاسی زندگی پر فوراً چھا گئے۔ انھوں نے نہ کوئی مستقل سیاسی پارٹی بننے دی نہ سیاست کا مدار کسی قسم کے مفید اخلاقی اصولوں پر رکھنے کی اجازت دی۔

جن اصولوں پر الگ ہونے کے بعد سندھ کا کاروبار چلنے لگا، وہ مختصراً یہ ہیں

(۱) وزیر ہر حال میں بننا ہے، اور وزیر بننے کے بعد ہر حال میں بطور وزیر قائم رہنا ہے، خواہ اس مقصد کے حصول کے لیے کتنی ہی پارٹیاں کیوں نہ بدلنی پڑیں اور اپنے وعدوں، قولوں اور اصولوں سے کتنی ہی بار کیوں نہ پھرنا پڑے۔

(۲) جتنے عرصے وزیر رہو، محض خود کو نوازنے اور مضبوط کرنے میں مصروف رہو۔

(۳) سندھ کے عوام کی بھلائی کا کوئی سوال ہی نہ تھا کیوں کہ جس شے کو سیاسی اصطلاح میں عوام سمجھا جاتا ہے، اس شے کے وجود ہی کو تسلیم نہ کیا جاتا تھا۔ ان کے خیال میں سندھ کے لوگ تین حصوں میں منقسم تھے (الف) پیر اور وڈیرے، جن کا پیدائشی حق تھا وزارت اور حکومت کرنا، (ب) سرکاری اہلکار، جن کا ورثہ تھا مسلمانوں کے ٹکٹ پر نوکریاں حاصل کرنا، اور نوکریاں حاصل کرنے کے بعد ایک طرف مزید ترقی کی سعی کرنا اور دوسری طرف اپنے پیٹ کی خدمت کرنا، اور (ج) دیہات کے لاکھوں ننگے بھوکے گنوار، جن کے لیے یہی سعادت کافی تھی کہ ان کے سر پر وڈیروں اور پیروں کا سایہ دائم و قائم رہے۔

(۴) سیاسی پارٹی ہرگز نہ بننے دی جائے، کیوں کہ سیاسی پارٹی بنے گی تو اس کا رخ ہوگا عام لوگوں

کی طرف، اور عام لوگوں نے سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا تو وڈیروں کی اجارہ داری کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ اس لیے ایسی رہبری کو اُگنے ہی نہ دیا جائے۔

(۵) ان اصولوں پر قائم رہتے ہوئے، اور وقتی فائدہ حاصل کرنے کی غرض سے، وقتاً فوقتاً جو طاقت غلبہ حاصل کرے اُس کی پاٹھ پوجا شروع کرنے میں دیر نہ کی جائے، خواہ یہ طاقت ہندوؤں کی کانگریس ہو یا مسلم لیگ، یا کسی خاص شخص کی وقتی مرکزی حیثیت۔ مطلب یہ کہ ہر موقعے کا فائدہ اٹھایا جائے اور جس چشمے میں سیاسی پانی کا کچھ ذخیرہ دکھائی دے اسی میں ہاتھ ڈال دیے جائیں۔

***

حقیقت یہ ہے کہ سندھ کا ہندو ۱۹۲۰ سے پہلے باقی برصغیر کے ہندوؤں سے بہت سی باتوں میں مختلف تھا۔ وہ صوفی منش تھا، مسلمان پیروں فقیروں کا معتقد تھا، فارسی میں اسلامی لٹریچر سے متاثر تھا، قرآن شریف کا اس قدر احترام کرتا کہ اس پر ہاتھ رکھ کر کبھی جھوٹ نہ بولتا۔ بعض ہندو تو باقاعدہ کلام مجید کی تلاوت بھی کیا کرتے۔ ہیرانی کے ایک ہندو سیٹھ کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اسے تین ہزار صحیح حدیثیں یاد تھیں۔ جہاں ابھی اسکول نہ کھلے تھے وہاں ہندو بچے ملاؤں کے مکتبوں میں (جو اکثر مسجدوں میں ہوتے تھے) تعلیم پاتے تھے۔ رات کو مسجدوں میں دیے ہندو عورتیں جلا کر رکھتیں۔ شاہ عبداللطیف کے کلام پر سب سے اہم تحقیق ایک ہندو عالم ڈاکٹر گربخشانی نے کی تھی۔ بہت سے ایسے ہندو تھے جو کسی فرق کے بغیر مسلمانوں کی خدمت اور حاجت روائی کیا کرتے، بیوہ عورتوں کو گزراوقات کے لیے مالی امداد اور یتیم مسلمان بچوں میں تعلیم کے لیے وظیفے تقسیم کیا کرتے۔ آنکھوں کے اسپتال شکارپور کے ہندو سیٹھ اپنے خرچ سے کھلواتے۔ سرکاری کالج کھلنے سے پہلے ہندو اپنے پرائیویٹ کالج قائم کر چکے تھے جن سے مسلمان بھی فائدہ اٹھاتے۔ تھرپارکر ضلعے کے ہندو اپنی لڑکیاں مسلمان خاندانوں میں بیاہ دیتے۔ بینک قائم ہونے سے پہلے سندھ کے مسلمانوں کی تمام کمائی ہندو ساہوکاروں کے پاس امانت کے طور پر رکھی رہا کرتی۔ پوری تاریخ میں ایسی مثال نہیں ملتی کہ کسی ہندو ساہوکار نے مسلمانوں کی امانت میں خیانت کی ہو۔ سندھ کو بمبئی پریزیڈنسی کی ہندو اکثریت سے الگ کر کے الگ صوبہ بنانے کی تحریک سب سے پہلے سیٹھ ہرچندرائے وشنداس نے شروع کی اور اُس زمانے کے دوسرے ہندو بزرگوں نے اس تحریک کی حمایت کی، ان میں سے کسی نے مخالفت میں دو لفظ بھی نہ کہے۔ عام رہن سہن کی حالت یہ تھی کہ ہندو بزرگ داڑھیاں رکھا کرتے، بیچے شلوار پہنتے اور سر پر بڑی پگڑی باندھتے۔ راگ ہندوؤں کی مذہبی زندگی کا ایک اہم جزو ہے، اور سندھ کے ہندوؤں کے راگ سو فیصد مسلمانی طرز کے ہوتے تھے۔ مسلمان بزرگوں کے کلام کے سوا کچھ نہ گاتے بجاتے۔ سندھ کے ہندوؤں کی نصف سے زیادہ تعداد مسلمان صوفی بزرگوں کی درگاہوں کی مرید تھی۔ قلندر لعل شہباز پر جتنا اعتقاد مسلمانوں کو تھا اُتنا ہی ہندوؤں کو بھی تھا۔

درگاہ شریف کی بعض رسوم صرف ہندو بجا لاتے تھے، مثلاً مہندی کی رسم۔ سندھی زباں کی بھی ہندوؤں نے بڑی خدمت کی۔ سندھی کے بہت سے چوٹی کے اہلِ قلم ہندو تھے۔ سندھ کے واحد آرٹس کالج میں فارسی کا پروفیسر ہندو تھا۔ سندھ کی قدیم تاریخ کی تحقیق پہلے پہل ہندوؤں نے شروع کی۔ سندھ کے ہندو سؤر کے گوشت کو چھوتے بھی نہ تھے؛ بکرے کا گوشت بھی جب تک مسلمانوں کا حلال کیا ہوا نہ ہو، نہیں لیتے تھے۔ ان کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے سندھ میں کھلےعام گاؤکشی کبھی نہ ہوتی تھی۔ اونچے طبقے کے مسلمان تو ساری عمر بڑے گوشت کے پاس تک نہ بھٹکتے۔ شادی یا غمی میں ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے اس قدر قریب ہوتے جیسے ایک ہی قوم کے افراد، بلکہ آپس میں عزیز ہوں۔ مسلمانوں کی بڑی زمینداریوں، جاگیروں کی گھریلو آمدنی اور خرچ کا انتظام ہندو کارداروں اور دکان داروں کے سپرد ہوتا تھا۔ وہ دیہی زندگی کا مرکز تھے۔ بعض بڑے مسلمان گھرانوں میں تو پردہ نشیں عورتیں اپنے ہندو کارکنوں سے پردہ بھی نہ کرتیں حالاں کہ عام طور پر وہ پردے کی سخت پابند ہوتیں۔ دیہی زندگی میں برادری کا کوئی بھی فیصلہ اس وقت تک نہ ہوتا جب تک گاؤں کا مکھی پنچ میں بیٹھ کر دو معزز افراد کی بات نہ سن لیتا۔

غرض سندھ کی سماجی زندگی باقی برصغیر کی سماجی زندگی سے بالکل مختلف تھی اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ یہاں ایک مشترک اور متوازن متحدہ کلچر یا معاشرہ اُبھر رہا تھا جس میں باہمی مذہبی اور معاشرتی تضادات سے زیادہ تصورات، معتقدات اور اقدار کا پہلو نمایاں تھا۔ ان حالات کو سامنے رکھتے ہوئے، سوال پیدا ہوتا ہے کہ سندھ کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان یہ نفاق کیوں پیدا ہوا اور کب پیدا ہونا شروع ہوا۔

جواب آسان ہے۔

۱۹۲۰ میں آئینی اصلاحات نافذ ہوئیں اور تب سے ملک کی سیاست نے ایک نیا رخ اختیار کیا۔ اسمبلیوں، میونسپلٹیوں، لوکل بورڈوں اور اسکول بورڈوں کی رکنیت کھلی اور جداگانہ انتخابات کا طریقہ رائج ہوا؛ ہندو ہندوؤں کو چنتے اور مسلمان مسلمانوں کو۔ ہر چلتے پھرتے آدمی میں اقتدار کی نُوید نئی نئی ہوسیں اور امنگیں پیدا ہوئیں جنھوں نے کش مکش کا روپ لے لیا۔ مثلاً مسئلہ پیدا ہوا کہ ایک امیدوار کیوں کر خود کو دوسرے امیدوار کے مقابلے میں اپنی قوم میں مقبول بنا کر الیکشن جیتے اور اپنی ہوس کی تسکین کرے۔ سندھ میں نہ کوئی مستقل سیاسی پارٹی تھی نہ کوئی اقتصادی پروگرام جس کی بنیاد پر امیدوار ووٹروں سے اپیل کر کے ان سے فیصلہ حاصل کرتے۔ لوگوں کا ذاتی اثر و رسوخ بھی زیادہ دور تک نہ جاتا تھا؛ بہت سے ایسے شہری ہندو امیدوار میدان میں آ گئے تھے جنھیں دیہات میں کوئی پہچانتا بھی نہ تھا، اور ووٹ بیشتر دیہات میں تھے۔ اس لیے انھیں ضرورت محسوس ہوئی کہ ملک میں کوئی ایسا ہنگامہ مچایا جائے اور مسئلہ کھڑا کیا جائے جس کی بنیاد پر سیاست کے میدان میں اترنے والے شوریدہ سر نئے ہندو آسانی سے ووٹ حاصل کرنے کے حقدار بن جائیں۔ بدقسمتی سے ۱۹۲۰ کی اصلاحات کے بعد باقی ہندوستان کے ہندوؤں کو بھی اسی قسم کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی جس کے باعث انھوں نے تین چار تحریکیں یکدم شروع کر دی تھیں: شُدھی اور سنگٹھن، آریا سماج اور ہندو مہاسبھا۔ ان سب کی سرتاج وہی پرانی

کانگریس تھی جو بظاہر تو ہندوؤں اور مسلمانوں کی متحدہ پارٹی ہونے کا دعویٰ کرتی تھی مگر حقیقت میں اس کا مقصد بھی (اگرچہ ذرا بالواسطہ طور پر) ہندوؤں کی بالادستی قائم کرنے کا تھا۔ چالاکی یہ تھی کہ جو ہندو ابھی پرانے حجاب کا پردہ اتار کر کٹر ہندو جماعتوں میں شامل ہونے کو تیار نہ تھے، انھیں اس درمیانے پلیٹ فارم پر جمع کر کے اور اپنے ساتھ ملا کر آگے بڑھا جائے۔ سندھ کے ہندوؤں کا وہ گروپ جو ۱۹۲۰ کی اصلاحات کے بعد نئے سرے سے سیاست پر قبضہ کرنا چاہتا تھا، ہندوستان کی ان تحریکوں میں سے ایک نہ ایک میں شامل ہو گیا۔ یہ سب پڑھے لکھے لوگ تھے؛ دنیا کی مختلف تحریکوں کی تاریخ پڑھ چکے تھے۔ انھیں نظر آیا کہ کسی تحریک کو لوگوں میں تیزی سے پھیلانے کے لیے ضروری ہے کہ کسی فریق سے دشمنی پیدا کی جائے اور اُس کے بھُوت سے اپنے لوگوں کو ڈرا کر، اور نفرت کی بنیاد پر انھیں منظم کر کے، مقابلے کے میدان میں اتارا جائے اور ان کی رہنمائی اپنے ہاتھ میں لے لی جائے۔

چناں چہ سندھی ہندو گروپ نے اس نسخے پر عمل کرتے ہوئے بھوت کے طور پر مسلمانوں کو پیش کیا اور ہندوؤں میں ان کے خلاف نفرت کے بیج بونے شروع کیے۔ اس خرابی کے مرکز پہلے لاڑکانہ اور سکھر سے، جہاں سے پیش قدمی شروع ہوئی اور اس کی تائید کراچی، حیدر آباد اور میرپور خاص سے نکلنے والے ہندو اخبارات کرنے لگے اور باقی سندھ کے ہندوؤں میں زہر پھیلانے لگے۔

لازم تھا کہ ہندوؤں کی سیاست کا یہ جارحانہ رخ دیکھ کر مسلمانوں کے بھی کان کھڑے ہوں۔ اُن میں بھی یہ احساس پیدا ہونے لگا کہ ہندوؤں کے اس ایجی ٹیشن کے نتیجے میں ان کے حقوق پر حملہ ہو گا، مثلاً انھیں سرکاری نوکریوں میں پورا حصہ نہ ملے گا اور اقتصادی اور معاشی نظام میں ایسی تبدیلیاں کرائی جائیں گی کہ سندھ کی تجارت تو پہلے ہی تمام کی تمام ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے، اب مسلمانوں کی زمینیں بھی ہندو سودخوروں کے قبضے میں چلی جائیں گی۔ (اعداد و شمار پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہو گا کہ مسلمانوں کی چالیس فیصد زمینیں پہلے ہی ہندوؤں کے قبضے میں جا چکی تھیں، اور اس کے علاوہ بیس سے چالیس فیصد تک ان کے پاس گروی رکھی تھیں اور سندھ کے زرعی پیشے سے منسلک مسلمانوں کو وہ قانونی بچاؤ بھی حاصل نہ تھا جو پنجاب کے زراعت پیشہ لوگوں کو پہلے ہی حاصل ہو چکا تھا۔) اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ دیکھتے ہی دیکھتے ہندوؤں میں سخت غرور پیدا ہو گیا تھا اور وہ مسلمانوں کو وحشی اور ذلیل سمجھنے لگے تھے۔ عام طور پر ہندوؤں نے خود کو باقی سندھ کے معاشرے سے کاٹ کر ایک علیحدہ اور نسبتاً اعلیٰ و ارفع سوسائٹی کے طور پر رہنا اور آگے بڑھنا شروع کر دیا تھا اور اس نئے رجحان نے سندھ کے ہندوؤں سے قریبی تعلقات رکھنے والے مسلمانوں کو بھی سخت دکھ پہنچایا۔ اس خرابی میں اگر اب بھی کچھ کسر رہ گئی تھی تو اسے ہندو اخباروں، ہندو سرکاری اہلکاروں اور ہندو لکھنے والوں نے پورا کیا۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ تمام کارروائی ہندوؤں کی نئی ہوسناک سیاسی پود کی تھی اور اس میں پرانی معاشرت کے ہندو بزرگوں کا کچھ قصور نہ تھا، مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ بزرگ بیازمانہ دیکھ کر سامنے سے ہٹ گئے اور پورا میدان ان ناتجربہ کار، کوتاہ اندیش، فسادی اور کٹر فرقہ پرست لوگوں کے حوالے کر کے

خود عملی سیاست سے کنارہ کش ہو گئے۔ وہ ان نئے لوگوں کا مقابلہ نہ کر سکے اور سندھ کو، اپنے خاندانوں کو، بلکہ اپنی پوری برادری کو مصیبت میں ڈال دیا۔

ہندو مسلم فسادات کی ابتدا لاڑکانے سے ہوئی؛ مارچ ۱۹۲۷ کی ۲۹ تاریخ کو، اور ایک مسلمان عورت کے معاملے پر۔ یہ کریماں نام کی عورت دیہات کے ایک مسلمان کی بیوی تھی جس کے اس سے چار بچے بھی تھے۔ کریماں ایک ہندو کے ساتھ بدراہ ہو کر لاڑکانہ بھاگ گئی اور بچوں سمیت ہندو آریہ سماجیوں کے ہاتھ پر (جنھوں نے شُدھی کی تحریک شروع کر رکھی تھی) مرتد ہو گئی، یعنی بچوں سمیت ہندو دھرم میں داخل ہو گئی۔ شہر کے مسلمانوں نے بچوں کو اپنی تحویل میں لینے کے لیے کورٹ سے رجوع کیا لیکن ان کی شنوائی نہ ہوئی۔ ہندوؤں نے اس بیچ کریماں اور اس کے بچوں کو اپنے پاس چھپا لیا تھا۔ اثرورسوخ رکھنے والے لوگوں سے مل کر مایوس لوٹتے ہوئے وفد کے کچھ مسلمان لڑکوں نے ہندوؤں کے چند سگریٹ کے کھوکھوں کو لوٹ لیا اور ہندو لڑکوں کو پتھر مارے۔ اس کے بعد شہر میں مزید چار پانچ ہندو دکانیں اس فساد سے متاثر ہوئیں۔ مگر یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ مذہبی معاملے پر اشتعال پیدا ہونے کے باوجود ہندوؤں کا کوئی جانی نقصان نہ ہوا، نہ کوئی ہندو مارا گیا اور نہ شدید زخمی ہوا۔ ہندوؤں نے اس مختصر اور وقتی حادثے کا فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کو پست کرنے کے لیے زوردار مہم چلائی۔ ان پر جھوٹے مقدمے بنائے گئے اور ۸۰ سے زیادہ مسلمان جیل میں ڈال دیے گئے۔ لاڑکانے کے نمایاں مسلمان قومی کارکنوں کو خاص طور پر نشانہ بنایا گیا۔ خود خان بہادر محمد ایوب خان کھوڑو کو، جو اس وقت بمبئی کاؤنسل میں مسلمانوں کے منتخب نمائندے تھے، جھوٹے کیس میں پھنسانے کی کوشش کی گئی جبکہ ان کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ مسلمانوں کے ہمدرد تھے اور نئے نئے سیاست میں اُبھر رہے تھے۔ مسلمان ان جھوٹے مقدموں سے بری تو ہو گئے مگر جس مسلمان عورت اور اس کے بچوں کے مرتد ہونے سے یہ قضیہ شروع ہوا تھا وہ ہندوؤں ہی کے قبضے میں رہے۔

جو بھی مسلمان رہنما ہندوؤں کو چلتا پھرتا دکھائی دیا، اُس پر انھوں نے ایک عدد فوجداری مقدمہ داخل کر دیا۔ مقصد یہ نہ تھا کہ انصاف ہو یا جن مسلمانوں نے واقعی جرم کیے ہیں اُنھیں سزا ملے، حقیقی مطلب یہ تھا کہ لاڑکانے کے مسلمان قومی ورکروں کو موقعے کا فائدہ اٹھا کر فوجداری مقدموں کے ذریعے اس قدر بےحال کر دیا جائے کہ ان میں کسی کو پھر ہندوؤں کے مقابلے میں کسی بھی سلسلے میں آواز اٹھانے کی جرأت نہ ہو اور لاڑکانے شہر پر عملاً ہندوؤں کا راج قائم ہو جائے۔ اس طرح انھوں نے ایک ایسے چین ری ایکشن (chain reaction) کی بنیاد ڈال دی جس نے آگے چل کر نہ صرف ہندوؤں کو سندھ بدر کر دیا بلکہ سندھ کی قسمت بھی طوفانی لہروں کی زد میں آ گئی۔

لاڑکانے کے فساد کے بعد فسادات کا سلسلہ ہندوؤں نے روہڑی ڈویژن اور سکھر شہر میں شروع کر دیا۔ یہ فسادات لاڑکانے کے مقدمات ختم ہونے کے تھوڑے وقفے بعد شروع ہوئے اور ۱۹۳۱ تک جاری رہے۔ ان فسادات کے سلسلے میں ہندوؤں نے مسلمانوں کے خلاف جو مقدمات قائم کیے وہ دو تین

رس چلتے رہے اور مسلماں پامال ہوتے رہے۔ اس مصیبت سے جان چھڑانے کے لیے مسلمانوں نے سندھ کو بمبئی سے الگ کرا لیا۔ (سندھ کی علیحدگی کی سندھ کے ہندوؤں نے سخت مخالفت کی کیوں کہ بمبئی پریزیڈنسی میں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔) ۱۹۳۶ میں سندھ الگ ہوا مگر ہندوؤں نے اس کا ثمر مسلمانوں کو پہنچنے نہ دیا۔ جیسا کہ اللہ بخش وزارت کے سلسلے میں دیکھنے میں آیا، وہ مسلماں اراکینِ اسمبلی اور امیدواراں وزارت کو آپس میں لڑا کر ایک نہ ایک فریق کو اپنے اثر میں رکھتے تھے۔

۱۹۳۹ میں سکھر کی مسجد منزل گاہ کے سلسلے میں فسادات ہوئے جو اسی عمومی ہندو مسلم کشمکش کے سلسلے کی ایک کڑی تھے۔

اس پیچیدہ ری ایکشن کی مختلف کڑیاں جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ الگ الگ صورتوں میں ظاہر ہوتی رہیں، ملاحظے اور غور کے قابل ہیں

(۱) لاڑکانے کے فسادات اور مقدموں کے بعد پورے سندھ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین تلخی بڑھتی گئی۔

(۲) طرفین کے اخباروں نے اس تلخی کو بڑھانے کی کوشش کی۔

(۳) سندھ کے دوسرے مقامات پر بھی اسی طرح کے فسادات ہونے لگے۔

(۴) مسلمانوں کو خوف ہونے لگا کہ ہندو انھیں برباد کر کے پورے سندھ پر ایسا سیاسی اور اقتصادی قبضہ قائم کرنا چاہتے ہیں۔

(۵) مسلمانوں نے یہ بھی دیکھا کہ سندھ کے بمبئی پریزیڈنسی سے وابستہ ہونے کے سبب، پریزیڈنسی کی ہندو اکثریت کا فائدہ سندھ کے ہندو بھی اٹھا رہے ہیں، اور اس وابستگی کے باعث، اگرچہ سندھ میں مسلماں اکثریت میں ہیں، مگر عملی طور پر انھیں اکثریت کا کوئی فائدہ نہیں پہنچ رہا۔

(۶) اس وجہ سے مسلمانوں کی جانب سے سندھ کو بمبئی سے الگ کرنے کی تحریک شروع کی گئی جس کی ہندوؤں نے شدت سے مخالفت کی؛ اور جس تناسب سے انھوں نے سندھ کی علیحدگی کی مخالفت کی اُسی تناسب سے مسلمانوں کو یقین ہوتا گیا کہ بمبئی سے تعلق خود اُن کے حق میں واقعی نقصان دہ ہے اور ان کی نجات کا راز اسی میں مضمر ہے کہ سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے صوبہ بنایا جائے۔ اس تحریک کی رہنمائی خان بہادر محمد ایوب کھوڑو نے کی۔

(۷) آگے چل کر سندھ آخر بمبئی سے الگ ہوا۔

(۸) سندھ کے علیحدہ ہونے کے بعد ہندوؤں کی طرف سے یہی کوشش جاری رہی کہ مسلماں اکثریت کو اس علیحدگی کا فائدہ اٹھانے سے روکا جائے۔

(۹) اس مقصد سے ہندوؤں نے اسمبلی میں مسلماں اکثریت کو توڑنے کی خاطر، متحد ہو کر یہ کوشش شروع کر دی کہ مسلماں گروپوں کو کبھی آپس میں مل کر کام کرنے کا موقع نہ دیا جائے اور ان میں سے ہمیشہ کسی ایسے گروپ کو اقتدار میں رکھا جائے جس کا انحصار زیادہ تر مسلماں ووٹوں پر نہیں بلکہ

ہندوؤں کے ووٹوں پر ہو۔

(۱۰) ۱۹۳۷ میں 'الگ یا آزاد سندھ' کے پہلے انتخابات ہوئے۔ کامیاب مسلمان ممبروں کی اکثریت اگرچہ یونائیٹڈ پارٹی میں تھی اور سر غلام حسین کی مسلم پارٹی کو فقط چھ ممبروں کی پشت پناہی حاصل تھی، مگر اس کے باوجود جب گورنر سر لانسلاٹ گراہم نے وزارت عظمیٰ پر سر غلام حسین کو مقرر کیا تو ہندوؤں نے اسی چھ ممبروں والے گروپ کی حمایت کی۔ مقصد یہ تھا کہ چوں کہ سر غلام حسین کو مسلمان ممبروں کی اکثریت کی حمایت حاصل نہیں ہے، اس لیے انھیں بطور وزیرِ اعظم ہر وقت ہندوؤں کا محتاج رہنا پڑے گا۔

(۱۱) اگلے سال، یعنی ۱۹۳۸ میں، ہندو سر غلام حسین سے بھی ناراض ہو گئے، اس لیے انھوں نے ان کی حکومت کو ڈھا کر خان بہادر اللہ بخش کی وزارت قائم کرائی۔ کچھ مہینوں بعد خان بہادر اللہ بخش اور ان کے مسلمان حمایتیوں کے درمیان آبیانے کے معاملے پر اختلاف پیدا ہو گیا اور مسلمان ممبروں کی اکثریت ان سے الگ ہو گئی۔

(۱۲) مسلمان ممبروں کی اکثریت نے الگ ہونے کے بعد ہندوؤں سے تقاضا کیا کہ چوں کہ اللہ بخش وزارت قائم کرتے وقت ان کا (یعنی ہندوؤں کا) معاہدہ ذاتی طور پر اللہ بخش سے نہیں بلکہ پوری پارٹی سے تھا اور یہ پارٹی اللہ بخش کی حمایت سے دست کش ہو گئی ہے، اس لیے ہندو ممبروں کو بھی اکثریتی پارٹی سے ایسا تعلق برقرار رکھتے ہوئے اللہ بخش کا ساتھ چھوڑ دینا چاہیے۔ مگر ہندوؤں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے اللہ بخش کو اقلیت، کمزوری اور محتاجی کی حالت میں دیکھ کر انھیں فوراً اپنی سرپرستی میں لے لیا اور ان سے کچھ ایسے کام کرائے جن کے باعث مسلمانوں کو پہلے سے بھی بڑھ کر یقین ہو گیا کہ ہندوؤں کی نیت محض یہ ہے کہ سندھ پر ہمیشہ ایسی وزارت کو قائم رکھا جائے جس کی زندگی کا دارومدار ان کے ووٹوں پر ہو۔

(۱۳) اس اسٹیج پر تمام ہندو ممبر، کانگریسی اور غیر کانگریسی دونوں قسم کے، مل کر ایک ہو گئے اور پورے زور شور سے اللہ بخش کی پشت پناہی اور حوصلہ افزائی کرنے لگے۔ آل انڈیا کانگریس سے اپیلیں کی جانے لگیں، سردار پٹیل، مولانا ابوالکلام آزاد اور آچاریہ کرپالانی دہلی سے کراچی پہنچے۔ انھوں نے طرفین کا نقطۂ نظر سنا مگر فیصلہ وہی قائم رہا کہ مسلم اکثریت کی مخالفت کے باوجود اللہ بخش کی وزارت کو قائم رکھا جائے۔

(۱۴) ہندوؤں اور کانگریسیوں سے حتمی طور پر ناامید ہو کر متعلقہ مسلمان کارکنوں نے، جن کے رہنما جی ایم سید صاحب تھے، پہلی بار مسلم لیگ کی طرف رخ کیا۔ اس وقت تک سندھ میں مسلم لیگ کا نام و نشان بھی نہ تھا، حالاں کہ ہندوستان کے دوسرے حصوں میں اس سے پہلے ہی، ۱۹۳۵ سے، اس تحریک کا نیا اور آخری دور شروع ہو چکا تھا۔

(۱۵) ۱۹۳۸ کے آخر میں سندھ کی سرزمین پر پہلی بار کراچی شہر میں قائد اعظم کی صدارت میں

مسلم لیگ کی کانفرنس منعقد ہوئی جس کے سلسلے میں ہندوستان کے مختلف صوبوں کے مسلم لیگ کے رہنما سندھ میں آئے۔ کانفرنس بلانے کا فوری مقصد محض یہ تھا کہ اللہ بخش کی وزارت کے خلاف آواز اٹھائی جائے، مگر ایک سیاسی سیلاب کو بند توڑ کر اپنی طرف رخ کرا لینے کے بعد کون روک سکتا تھا! کانفرنس کے نتیجے میں ہندوؤں نے پہلے سے بھی بڑھ کر اللہ بخش کی پشت پناہی شروع کر دی اور کانگریس کے نام پر خود بھی پہلے سے زیادہ مضبوط ہو گئے۔

(۱۶) یہ کانفرنس اتنے عظیم پیمانے پر ہو رہی تھی کہ اسے دیکھ کر ہندوؤں کو فوراً ہوا کے رخ کا اندازہ کر کے محسوس کر لینا چاہیے تھا کہ ان کی شروع کی ہوئی پالیسی ہندو اقلیت اور مسلمان اکثریت کو مستقلاً ایک دوسرے سے جدا کر رہی ہے اور صوبے کی سیاست کو ہمیشہ کے لیے فرقہ وارانہ رنگ دے رہی ہے جس کا نتیجہ جلد یا بدیر اقلیت ہی کے لیے نقصان دہ ثابت ہو گا۔ مگر ہندوؤں نے تدبر اور دور اندیشی کا مظاہرہ کرنے کے بجائے زیادہ شوخی اور ضد کا راستا اختیار کیا۔

(۱۷) آخر اسی کانفرنس میں، سندھ کے ہندوؤں سے ناامید مسلمان ورکروں کی تجویز پر، پاکستان سے متعلق پہلی بار قرارداد منظور کی گئی۔ سندھ مسلم لیگ کانفرنس نے آل انڈیا مسلم لیگ سے استدعا کی کہ چوں کہ ہندو یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ مسلمانوں کے اکثریتی صوبوں میں بھی مسلمانوں کو کوئی فائدہ اٹھانے کا موقع نہ دیا جائے، اس لیے اب آل انڈیا مسلم لیگ کو کوئی ایسی اسکیم تیار کرنی چاہیے جس کے تحت مسلم اکثریت کے صوبے ہندوستان سے الگ ہو کر اپنے طور پر ایک علیحدہ فیڈریشن قائم کر سکیں، جس کی بنیاد پر آگے چل کر پاکستان کا پورا نقشہ تیار کیا گیا۔

(۱۸) اس کے بعد بھی ہندوؤں کو عقل نہ آئی۔ سکھر کے مسلمانوں نے سرکار سے مطالبہ کیا کہ بندر پر ویران حالت میں پڑی منزل گاہ کی عمارتیں چوں کہ اولاً مسجد کے طور پر تعمیر اور استعمال کی گئی تھیں، اس لیے ان کا قبضہ واپس مسلمانوں کے حوالے کیا جائے۔ ہندوؤں نے حسب دستور اس مطالبے کو بھی ایک سیاسی ایشو بنا کر اس مطالبے کی مخالفت شروع کر دی۔ انھوں نے اللہ بخش پر دباؤ ڈالا کہ کسی بھی صورت میں مسلمانوں کی خواہش پوری نہ ہونے دیں۔ جناں چہ اللہ بخش نے انکار کر دیا اور مسلمانوں نے ستیہ گرہ شروع کر دی۔ اللہ بخش نے سختی دکھائی تو ستیہ گرہ نے خوں ریزی کی شکل اختیار کر لی۔ سیکڑوں ہندو مارے گئے، ہزاروں مسلمان گرفتار ہوئے۔ آخر میں مجبور ہو کر ہندوؤں کو اللہ بخش کی وزارت ختم کر کے خود اپنے ووٹوں سے مسلم لیگیوں کو وزارت کی مسند پر بٹھانا پڑا۔ اس دوران میں سر گلاشی بھگت کنور رام بھی، ریل کے سفر کے دوران، رک اسٹیشن پر خواہ مخواہ قتل ہو گیا۔

(۱۹) مگر جب منزل گاہ کا مسئلہ ختم ہوا اور صوبے میں سکون ہونے لگا تو ہندوؤں کو دوبارہ اللہ بخش کی یاد ستانے لگی۔ انھوں نے فوراً لیگ وزارت کو ڈھا کر اللہ بخش کو دوبارہ اقتدار میں پہنچا دیا۔

(۲۰) سندھ کے مسلمان پہلے سے بھی زیادہ جوش سے پاکستان تحریک میں شامل ہو گئے۔ انھوں نے نہ صرف ملک پورے ہندوستان میں، اپنے صوبے کی مثال سامنے رکھ کر، پاکستان کے حق میں کام کر.

شروع کر دیا۔ پورے ہندوستان میں سندھ کی اسمبلی پہلا قانون ساز ادارہ تھا جس نے پاکستان کے حق میں
باقاعدہ قرارداد منظور کی تھی۔

(۲۱) آخر ۱۹۴۷ میں پاکستان قائم ہو گیا اور سندھ کے ہندوؤں کو اپنا وطن چھوڑ کر ہندوستان
جانا پڑا۔

(۲۲) ۱۹۴۸ میں کراچی کو سندھ سے الگ کر دیا گیا۔

(۲۳) ۱۹۵۵ میں سندھ بطور ایک علیحدہ صوبے کے ختم ہو کر مغربی پاکستان کا حصہ بن گیا۔

غور فرمائیے بات شروع ہوئی تھی لاڑکانے سے، ایک مسلمان کی بیوی سے اور دیوان تولچند کے
کٹڑیں سے، اور پھر مختلف مرحلوں سے گزر کر آخر کہاں پہنچی!

**

اگلے تین مضامین کراچی شہر کے مختلف ادوار کے بارے میں ذاتی یادداشتوں پر مشتمل ہیں۔

گیانیندر ناتھ گپتا کا مضمون Dayaram Gidumal ایک مختصر کتابچے کی صورت میں شائع ہوا تھا اور کراچی تھیوسوفیکل سوسائٹی کی لائبریری سے دستیاب ہوا۔ بدقسمتی سے اس کتابچے پر تاریخ اشاعت درج نہیں ہے، اور اس کے مصنف کے بارے میں اس کے سوا کوئی تفصیل معلوم نہیں ہو سکی جو اس کے متن میں شامل ہے یعنی یہ کہ ان کا تعلق بنگال سے تھا اور وہ سندھ سے نکلنے والے ایک انگریزی اخبار کے ادارتی عملے میں شامل ہونے کے لیے کراچی آئے تھے۔ ڈیارام گدومل (۱۸۵۷ - ۱۹۲۷) سندھ کے تعلیم یافتہ اور روشن خیال طبقے کے اہم رکن تھے اور کراچی کی تہذیبی زندگی میں نہایت ممتاز طور پر شامل رہے۔ ان کی شخصیت کے موضوع پر لکھے گئے اس مضمون سے انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل کے کراچی کی کچھ جھلکیاں سامنے آتی ہیں۔

لوک رام ڈوڈیجا کا تعلق شکارپور سے تھا اور وہ ان لوگوں میں شامل تھے جو تقسیم ہند کے بعد سندھ سے ہجرت کر گئے۔ ان کی جس کتاب کے ایک باب کی تلخیص اس حصے کے دوسرے مضمون کے طور پر شامل کی گئی ہے وہ سمھو وطن سمھا ماڻھو (میرا وطن میرے لوگ) کے عنوان سے پہلی بار دیوناگری رسم الخط میں ۱۹۷۸ میں اور دوسری بار، اضافوں کے ساتھ، سندھی رسم الخط میں ۱۹۸۳ میں شائع ہوئی۔ پاکستان میں اس کا ایڈیشن حیدرآباد سے ۱۹۹۳ میں شائع ہوا۔ اس کتاب کے لکھنے کا مقصد، جیسا کہ مصنف نے خود بیان کیا ہے، اپنے بچھڑے ہوئے وطن کی یاد تازہ کرنا اور سندھی ہندوؤں کی نئی نسل کو اپنی یادوں میں شریک کرنا ہے۔ اس کتاب کا جو باب شمولیت کے لیے منتخب کیا گیا ہے وہ کراچی کے تیرتھوں اور دوسرے مقامات کے بارے میں ہے۔

اس حصے کا تیسرا مضمون سہراب کے ایچ کٹرک (Sohrab K H Katrak) کی مختصر کتاب *Karachi that was the Capital of Sind* کی تلخیص پر مشتمل ہے۔ سہراب کٹرک کراچی کی پارسی کمیونٹی سے تعلق رکھتے تھے اور شہر کے میئر بھی رہے۔ ان کے والد سر کاوسجی ہرمزجی کٹرک نے اپنی محنت سے درآمدی کاروبار میں نمایاں مقام حاصل کیا اور کراچی کے ممتاز کٹرک خاندان کی بنیاد رکھی۔ سر کاوسجی کی آمدنی کا بہت بڑا حصہ شہر کی بہبود پر خرچ ہوا اور انھوں نے ہرمزجی کٹرک ہال، سہراب کٹرک لائبریری، سینٹ جان ایمبولینس کی عمارت، محتاج خانے اور اسپتال تعمیر کرائے۔ سہراب کٹرک نے شہر کے بارے میں یہ کتاب ۱۹۵۷ میں بمبئی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے موقعے پر لکھ کر شائع کی تھی۔ اس میں برطانوی عہد کے کراچی کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل ہوتی ہیں اور شہر کی زندگی میں پارسیوں کے نمایاں حصے کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

نگیندر ناتھ گپتا

انگریزی سے ترجمہ میں مرزا

ڈیارام گدڈومل

جب میں اگست ۱۸۸۴ کے اوائل میں کراچی کینٹ کے ریلوے اسٹیشن پر اُترا تو سب سے پہلے میری ملاقات جس شخص سے ہوئی وہ ڈیارام گدڈومل تھے۔ اس وقت تک سندھ میں میری شناسائی صرف میرا سند شوقی رام آڈوانی سے تھی۔ اُن کا زمانہ طالب علمی کلکتے میں گزرا تھا۔ کلکتہ یونیورسٹی سے انھوں نے بی اے کی ڈگری حاصل کی تھی۔ انھیں کے کہنے پر میں نے سندھ ٹائمز کی جوائنٹ ایڈیٹرشپ قبول کی تھی اور اس وقت ملازمت کے لیے کلکتے سے یہاں پہنچا تھا۔ میں چوں کہ اس وقت سندھ میں بالکل نووارد تھا اور پہلی بار کراچی آیا تھا، اس لیے مجھے توقع تھی کہ میرا سند سے اسٹیشن پر ہی ملاقات ہو جائے گی کیوں کہ وہ مجھے لینے کے لیے آئے ہوئے ہوں گے۔ جنگ شاہی کے اسٹیشن پر میں نے میرا سند کو مخالف سمت، یعنی کوٹری کی طرف، جانے والی گاڑی سے اترتے ہوئے دیکھا۔ غالباً اس وقت وہ مجھے ہی تلاش کر رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں اپنی سیٹ سے اٹھ کر کھڑکی تک آتا، گاڑیاں ایک دوسرے کو کراس کر چکی تھیں۔ میرا سند مجھے دیکھ نہیں پائے تھے۔ اس صورتِ حال نے مجھے خاصا پریشان اور بددل کیا۔ یہ میرا سند کے علم میں تھا کہ میں کراچی پہنچ رہا ہوں کیوں کہ میں نے لاہور سے، جہاں میں نے اس سفر کے دوران ایک روز قیام کیا تھا، روانگی سے قبل انھیں اپنی آمد کا ٹیلی گرام بھیج دیا تھا۔ میرا سند اس وقت یقیناً حیدر آباد جا رہے تھے جب کہ میرا رخ کراچی کی طرف تھا۔ جوانی کا زمانہ تھا۔ میری عمر اس وقت بہ مشکل ۲۲ برس کی رہی ہوگی۔ سو اس وقت میں نے ان تمام مشکلات کا تصور کیا جو مجھے میرا سند کی رہائش گاہ تلاش کرنے میں پیش آ سکتی تھیں۔

اور ادھر یہ ہوا کہ جب گاڑی کراچی پہنچی تو ایک خوش رو نوجوان، لانبا قد، چھریرا بدن، عینک لگائے میرے کمپارٹمنٹ میں داخل ہوا اور خوش اخلاقی سے پوچھا، کیا نگیندر ناتھ گپتا صاحب یہاں تشریف رکھتے ہیں؟ میں فوراً اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا اور اپنا تعارف کرایا۔ انھوں نے مجھ سے اترنے کی درخواست کی۔ میرا سامان گاڑی سے اتارا گیا اور ہم ایک وکٹوریہ میں بیٹھے جو خود ڈیارام کی ملکیت تھی۔ راستے میں انھوں نے اپنا تعارف کرایا اور یہ یقین دلایا کہ میرا سند کی عدم موجودگی سے کچھ فرق نہیں پڑے

گا اور مجھے پریشان ہونے کی چنداں ضرورت نہیں کیوں کہ میں دوستوں کے درمیان ہوں۔ یہ سن کر مجھے اطمینان ہوا۔ ہم کار میں کھانے جا رہے۔ ڈیارام نے وہاں چھوٹے سے صحن والا آرام دہ بنگلہ حال ہی میں خریدا تھا۔

گھر میں میرا تعارف دیوان گوڑومل چندن مل سے کرایا گیا۔ ان کی عمر اس وقت چالیس کے لگ بھگ تھی اور وہ ریونیو بورڈ یا ارامنی سندھ کے دفتر میں اسسٹنٹ مینیجر کی حیثیت سے تعینات تھے۔ ان کے علاوہ وہاں ایک اور نوجوان دلیپ کودومل تھا جو گریجویشن کرنے کے بعد برانچ ہائی اسکول میں استاد ہو گیا تھا۔ اس گھر میں کوئی خاتون نہیں تھی۔ یہ ایک طرح سے یاروں کا ڈیرا تھا۔ میرا بستر حیدر آباد سے جلد ہی واپس آ گئے اور ہم لوگ اسے کام میں جٹ گئے۔

ڈیارام مجھے سندھ ٹائمز کے بارے میں تفصیل سے آگاہ کر چکے تھے۔ یہ اخبار ایک سیاسی انجمن سندھ سبھا کا ترجمان تھا جو حال ہی میں کراچی میں قائم ہوئی تھی۔ اس رسالے کی سیاست بے حد معتدل تھی۔ بہت سے سرکاری افسران سندھ سبھا کے رکن تھے۔ دو پارسی تاجر سندھ ٹائمز کے مالک تھے لیکن اخبار کا اداراتی اختیار سندھ سبھا کمیٹی کے ہاتھ میں تھا۔ یہ کمیٹی، جس میں ہندو، مسلمان، پارسی اور عیسائی شامل تھے، صحیح معنوں میں نمائندہ افراد پر مشتمل تھی اور پورے سندھ کی رائے عامہ کی ترجمانی کرتی تھی۔ سبھا کے پہلے صدر سیٹھ آتمارام پریتم داس تھے جو انگریزی نہیں جانتے تھے لیکن کراچی کے مکھی کی حیثیت سے ان کا بے حد احترام کیا جاتا تھا۔ میری کراچی آمد کے ایک یا دو سال بعد سیٹھ آتمارام فوت ہو گئے۔ ان کا بیٹا فتح چند آتمارام ہماری پوری ٹولی کا، بالخصوص میرا، بہت گہرا دوست بن گیا تھا۔ عین عالم جوانی میں اس کا انتقال ہوا۔ اس کے بعد اس کے والد زیادہ دن نہ جی سکے۔

کراچی آنے کے بعد جلد ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ سندھ کی جو تھوڑی بہت سماجی زندگی ہے، جس کا اصل میں اس وقت آغاز ہی ہوا تھا، وہ تقریباً صرف ڈیارام گدومل کی بدولت تھی۔ چند سال پہلے انھوں نے الفنسٹن کالج بمبئی سے آرٹس اور قانون میں گریجویشن کیا تھا۔ وہ مشہور شاعر ورڈزورتھ کے پوتے اور کالج کے نامور پرنسپل ورڈزورتھ صاحب کے پسندیدہ شاگرد تھے۔ ورڈزورتھ صاحب جب تک ہندوستان میں رہے ڈیارام کی ان سے خط و کتابت رہی بلکہ ان کے یہاں سے جانے کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ مجھے کبھی یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ آخر ڈیارام نے وکالت کا پیشہ اختیار کیوں نہیں کیا۔ وہ ایک زیرک اور تیز فہم وکیل، ہمہ وقت مباحثے کے لیے تیار اور حاضر کلام آدمی تھے۔ انھیں فکر معاش کا فوری مسئلہ درپیش نہیں تھا کیوں کہ ان کے بڑے بھائی دیوان مٹھارام گدومل وسیع ذرائع کے مالک تھے۔ وہ ڈیارام سے اولاد جیسی محبت رکھتے تھے اور ان کی پوری آمدنی ان کے چھوٹے بھائی کے اختیار میں تھی۔ مزید برآں ڈیارام اگر حیدر آباد یا کراچی میں وکلا کے بار میں بیٹھنے لگتے تو انھیں کسب معاش کے لیے انتظار بھی نہ کرنا پڑتا۔ اپنی اہلیت، خاندانی وقار اور فطری صلاحیتوں کی بدولت وہ فی الفور ایک کامیاب وکیل بن جاتے اور محض چند برسوں میں ان کا نام اپنے ہم پیشہ افراد میں سرفہرست ہوتا۔

بمبئی یونیورسٹی سے نکلنے کے بعد ڈیارام نے اپنے لیے صدر کورٹ آف سندھ میں رجسٹرار کی حیثیت سے ملازمت کا انتخاب کیا۔ تنخواہ تو معمولی تھی لیکن عہدہ قدرے ممتاز تھا۔ میرا خیال یہ ہے، اور زندگی بھر سرکاری نوکری کے بارے میں شدومد کے ساتھ یہی میری رائے بھی رہی ہے، کہ اگر ڈیارام نے خود کو کسی خودمختار پیشے سے وابستہ کر کے اپنی آزادی کو برقرار رکھا ہوتا تو وہ اس سے کہیں زیادہ حاصل کر سکتے تھے جو انھوں نے زندگی میں حاصل کیا۔ وہ فی الحقیقت بلند نصب العین کے آدمی تھے اور اپنے ملک، اپنے لوگوں اور انسانیت کی خدمت کے آرزومند تھے۔ اپنے دفتری جاہ وجلال کے سحر سے ان کی آنکھیں کبھی چکاچوند نہیں ہوئیں۔ تادم مرگ انھوں نے نہایت سادہ زندگی بسر کی۔ ان کی ضروریات زندگی نہایت محدود تھیں۔ وہ دنیا کی رنگینیوں سے رفتہ رفتہ دور ہوتے چلے گئے تھے۔ یہ سچ ہے کہ اس زمانے میں سیاسی اور دیگر سماجی سرگرمیوں سے رواداری برتی جاتی تھی۔ جب تک ڈیارام سندھ میں رہے تب تک وہ اپنے فلاحی کاموں کے لیے راہ نکال لیتے تھے لیکن پھر ایک وقت آیا، جسے بہرحال آنا ہی تھا، جب ان کی سرگرمیاں محدود سے محدود تر ہوتی چلی گئیں۔ ملک میں تیزی سے بڑھتی ہوئی قوم پرستی سے ان کا تعلق رفتہ رفتہ ختم ہوتا چلا گیا۔ وہ اپنے سرکاری امور میں زیادہ سے زیادہ منہمک ہوتے گئے۔ ان کے صوبے اور ملک کے سماجی حلقے ان سے ناواقف ہوتے چلے گئے۔ تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے دل میں پریشان حال لوگوں سے ہمدردی کا جذبہ کبھی ختم نہیں ہوا۔ انھوں نے ہمیشہ خدمت خلق اور فلاح عامہ کے کاموں میں بڑھ کے حصہ لیا۔ تاہم ان کی شخصیت کی دانش ورانہ جہت کو اظہار کے زیادہ مواقع میسر نہ آسکے۔ سندھ سبھا قائم ہونے کے بعد اگر وہ سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے کر سندھ ٹائمز کا چارج سنبھالتے اور کراچی وکلا بار میں جا بیٹھتے تو بلاشبہ سندھ کے سب سے بڑے قومی رہنما اور ہندوستان کے صف اول کے رہنماؤں میں سے ایک ہوتے۔ میں نہیں سمجھتا کہ سندھ نے دوبارہ زمانۂ حال تک اُن جیسا گوہرِ قابل کوئی اور پیدا کیا ہے۔ ان کی یگانہ روزگار صلاحیت کا یوں ملازمتِ سرکار میں صرف ہونا سندھ اور ہندوستان دونوں کا عظیم نقصان تھا۔

مجھے یقیناً اپنے اس لاحاصل ملال کا راگ آغاز ہی میں نہیں الاپنا چاہیے۔ یوں ہوتا تو یوں ہو سکتا تھا قسم کی باتیں ہمیں محض بے سود قیاسات کی راہ دکھاتی ہیں جب کہ واسطہ ہمیں حقائق سے پڑتا ہے۔ بہرحال، اُس وقت سندھ میں جو تھوڑی بہت سماجی سرگرمی تھی وہ ڈیارام ہی کی بدولت تھی۔ یہ اُنھیں کا دماغ تھا جو بڑے منصوبے سوچتا تھا اور یہ دست و بازو بھی اُنھیں کے تھے جو انھیں پورا کر دکھاتے تھے۔ انھیں اعلیٰ قائدانہ صلاحیتیں ودیعت ہوئی تھیں۔ وہ نظم و نسق کی بے پناہ قدرت، مختلف الخیال لوگوں کو یکجا کرنے کی بہترین صلاحیت اور انھیں ایک ہی مقصد کے حصول میں بروئے کار لانے کی بے مثال اہلیت رکھتے تھے۔ وہ انانیت سے عاری ایک غیر معمولی کردار کے مالک تھے۔ یہ درست ہے کہ ان کی پاس وضعداری میں ایک حد تک ان کے سرکاری مرتبے کا بھی دخل تھا۔ وہ سندھ سبھا کا دفتر قائم نہیں کر سکتے تھے، سندھ ٹائمز کے ایڈیٹر نہیں بن سکتے تھے، لیکن اس طرح کے تاملات سے قطع نظر، ڈیارام فطرتاً

اپنے لیے ہر قسم کے نفعے کی طلب اور ہر طرح کی تشہیر سے اجتناب کرنے والے آدمی تھے۔ انھوں نے اپنی ہستی، ذات اور توانائی کو بےلاگ صرف کیا اور اس کے بدلے میں نہ کبھی کچھ طلب کیا اور نہ کچھ قبول کیا۔ انھیں صلے اور ستائش کی کوئی تمنا نہیں تھی۔

ہمارے اُن درویش کے معمولات کا بیان بہت سوں کے لیے دلچسپی کا باعث ہوگا۔ ڈیارام ہر صبح اٹھ کر اپنے مطالعے کی میز پر سندھ ٹائمز کے لیے لکھنے جا بیٹھتے۔ یہ اخبار ہفتے میں دو بار شائع ہوتا تھا۔ ڈیارام اہم قسم کے مسائل پر لکھتے تھے۔ اخبار کی ہر اشاعت میں عام طور پر ان کا ایک آدھ آرٹیکل شامل ہوتا تھا۔ ان میں اداریے چند ایک ہی تھے۔ وہ عموماً مقامی موضوعات اور سندھ کے مسائل پر لکھتے تھے۔ میں نے کلکتے میں اخبارات کے لیے کبھی کبھار لکھا تھا۔ نوجوانوں کے ایک معمولی اخبار کے لیے مجھے لکھنے کا موقع ملا تھا۔ جنوری ۱۸۸۴ میں کیشب چندر سین کی موت کے فوراً بعد میں نے ان پر ایک مختصر سی کتاب لکھی تھی۔ صحافت کا لیکن مجھے کوئی تجربہ نہیں تھا اور سندھ کے مسائل کے بارے میں تو بلاشبہ اس وقت میں بالکل کچھ نہیں جانتا تھا۔ صبح کے وقت میں ہیرانند کے ساتھ مل کر اخبارات پڑھا کرتا۔ صبح ناشتے کے بعد ڈیارام اپنے دفتر اور میں اور ہیرانند سندھ ٹائمز کے دفتر روانہ ہوجاتے۔ ہم مقامی خبریں بناتے، پروف کی غلطیاں درست کرتے، اخبار کے دفتر آنے والے سبھی حضرات سے ملتے اور خود کو مصروف رکھتے۔

ان تمام پرشوخی، شرارت اور ہمیشہ جاری رہنے والے ہنسی مذاق کے باوجود ہم لوگ اپنے کام کے معاملے میں واقعی سنجیدہ قسم کے نوجوان تھے۔ عمر میں ڈیارام ہم سب میں بڑے تھے۔ وہ سندھ سبھا کے فلاحی کاموں، سندھ کو درپیش مسائل اور پورے صوبے کی خوشحالی کے بارے میں سوچتے تھے۔ کچھ ہی عرصے بعد میں سندھ ٹائمز کے لیے اہم آرٹیکلز لکھنے لگا۔ اس سے ڈیارام کا بوجھ کچھ کم ہوگیا۔ اس طرح انھیں دیگر مسائل کے لیے زیادہ وقت مل جاتا تھا۔ ہیرانند مصروف [illegible] سندھ سدھار میں ہو گئے تھے جسے سندھ سبھا نے لے لیا تھا اور جو اسی پریس سے شائع ہوتا تھا جس میں سندھ ٹائمز چھپتا تھا۔

ڈیارام نہایت دریادل آدمی تھے۔ ان کے پاس سے کوئی پریشان حال شخص خالی ہاتھ نہ لوٹتا۔ اپنی ضرورتوں کے لیے قلیل سی رقم رکھنے کے علاوہ ساری تنخواہ وہ فلاحی کاموں میں خرچ کرتے تھے۔ بعد ازاں ان کے پاس ایک کتاب رہتی تھی جس میں ان لوگوں کے نام درج تھے جنھیں وہ ماہانہ اخراجات فراہم کرتے تھے۔ ہر مہینے کے شروع میں وہ لوگوں اور اداروں کو رقومات، اخراجات اور عطیات بھیجتے۔ وہ صحیح معنوں میں کتاب مقدس کے فرمان پر عمل کرتے تھے، ان کے بائیں ہاتھ کو خبر نہیں ہوتی تھی کہ ان کے دائیں ہاتھ نے کس کو کیا دیا ہے۔ ہم لوگ بھی، جو کہ ان کے ساتھ رہتے تھے ان کے ساتھ معاملات پر غور و فکر میں شریک ہوتے تھے اور ہمیشہ ایک دوسرے کو بھائی کہتے اور سمجھتے تھے، ان کے عطیات کے بارے میں اس کے سوا کچھ نہیں جانتے تھے کہ انھوں نے اپنے لیے کبھی کچھ جمع نہیں کیا۔ کراچی میں اُن دنوں ہر طرح کے لوگ امداد مانگنے آیا کرتے تھے۔ ان میں آرمینیائی، ترکی، فارسی اور کئی دوسرے ملکوں

کے دوران شامل تھے۔ معمول کے مطابق الماری کو جلدی جلدی چھان پھٹک کر ڈیارام کچھ نہ کچھ رقم نکالتے اور دیکھے بغیر سائل کے ہاتھ میں تھما کر اسے شکریے کے الفاظ کہنے کی مہلت دیے بغیر رخصت کر دیتے تھے۔ ملازمت میں ترقی کی وجہ سے سندھ سے جانے کے بعد بھی وہ ایک بڑی رقم عطیات کے لیے یہاں بھیجا کرتے تھے، پر مگر کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کل کتنی رقم خیرات کرتے تھے۔

سیٹھ آتمارام پریتم داس کی وفات کے بعد سندھ سبھا میں صدر کی حیثیت سے ان کے جانشین کا سوال اٹھا۔ اس وقت کراچی کے بڑے وکلا میں بیرسٹر ڈیارام اُدھارام کا نام آتا تھا۔ ڈیارام جیٹھ مل غیر معمولی وکالتی اہلیت والے خوش گفتار اور خوش اطوار منجھے ہوئے آدمی تھے۔ اُدھارام مولچند لحیم شحیم اور لمبے چوڑے آدمی تھے۔ عدالت سے متعلق بیشتر امور ڈیارام جیٹھمل سرانجام دیتے جب کہ اُدھارام اس شراکت میں کاروباری معاملات، مؤکلوں سے بات چیت اور لین دین سنبھالتے تھے۔ وہ دونوں اکٹھے رہتے تھے۔ ڈیارام گڈومل نے نہایت دانش مندی سے ڈیارام جیٹھ مل کو سندھ سبھا کا صدر منتخب کرایا۔ ڈیارام جیٹھ مل کے چھوٹے بھائی دولت رام، جو خود بھی وکیل تھے اور ان کی فرم میں شمولیت اختیار کر چکے تھے، سیکرٹری بنے۔ یوں ڈیارام جیٹھ مل پہلی بار سماجی زندگی میں منظر عام پر آئے۔ انھوں نے ۱۸۸۵ میں بمبئی میں پہلی انڈین نیشنل کانگریس میں شرکت کی، بمبئی لیجسلیٹو کونسل کے رکن نامزد ہوئے اور کراچی میں میونسپلٹی کے نائب صدر بنے۔ لیکن عوامی افادیت کے اعتبار سے ان کا دور بہت مختصر تھا۔ جواں عمری میں ان کا انتقال ہوا۔ ۱۸۸۷ میں جب وہ فوت ہوئے اس وقت ان کی عمر چالیس سے کچھ ہی اوپر رہی ہوگی۔

تھوڑے عرصے میں کچھ اور لوگ ہمارے حلقے میں آ شامل ہوئے۔ ہرچندرائے وشنداس جو بمبئی میں قانون کی تعلیم حاصل کر رہا تھا، چھٹیوں میں جب واپس آتا تو گھنٹوں ہمارے ساتھ گزارتا تھا۔ ایل ایل بی کا امتحان پاس کرنے کے بعد اس نے بہ حیثیت وکیل کراچی میں کام شروع کیا۔ وہ ایک ہنس مکھ، آزاد طبع اور چلبلا نوجوان تھا جو گانوں کے بول گنگناتا پھرتا تھا۔ وہ ڈیارام سے بہت محبت کرتا تھا اور انھیں بجا طور پر سندھ کا عظیم رہنما سمجھتا تھا۔ تمام تر لاابالی پن کے باوجود ایک وقت وہ آیا جب ہرچندرائے کراچی میونسپلٹی کا صدر بنا اور بمبئی لیجسلیٹو اور ازاں بعد انڈین لیجسلیٹو اسمبلی کا رکن ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔

ہرچندرائے کے بعد ٹِہل رام کھیم چند ہماری ٹولی میں شامل ہوا۔ وہ ایک شرمیلا نوجوان تھا اور اکثر اوقات لڑکیوں کی طرح جھینپ جاتا تھا۔ صرف ڈیارام ہی اس کے شرمیلے پن کو دور کر کے اسے پُراعتماد گفتگو پر آمادہ کر سکتے تھے۔ بعد میں ٹہلرام کراچی میں میرا سب سے قریبی اور محبوب دوست بن گیا۔ ہم نے میونسپلٹی اور دوسری جگہوں پر اکٹھے کام کیا۔ اخبار فینکس کے حصول میں میرا سب سے بڑا معاون وہی تھا۔ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا تھا جب ہماری ملاقات نہ ہوتی ہو۔ ٹہلرام تیزی کے ساتھ احترام و اعتبار کی منزلیں طے کرتا چلا گیا۔ اپنی صلاحیتوں اور کردار کی بنا پر وہ اس کا اہل بھی تھا۔ اس سے

پہلے کراچی میونسپلٹی میں، جو قابل افراد صدر رہے تھے وہ ان سے بدرجہا ممتاز تھا۔
اسی زمانے میں ڈیارام گڈومل نے بمبئی سے نکلنے والے اخبار انڈین اسپیکٹیٹر کے مدیر بہرام جی م. ملاباری کی محترم شخصیت کو دریافت کیا۔ دادا بھائی نوروجی وائس آف انڈیا نامی رسالہ نکالتے تھے۔ اس رسالے میں اخبارات کے اقتباسات شائع کیے جاتے تھے جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ ملک میں اس وقت رائے عامہ کیا ہے۔ یہ رسالہ ایک مختصر تلخیص کے ساتھ ہر ماہ شائع ہوتا تھا۔ ملاباری معمولی سی تنخواہ پر اس کے مدیر تھے۔ وائس آف انڈیا کی ملکیت میں ایک پریس تھا جو ملاباری نے لے لیا تھا۔ وائس آف انڈیا آخرکار انڈین اسپیکٹیٹر میں ضم ہو گیا۔ ملاباری گجراتی زبان کے شاعر بھی تھے۔ انھوں نے سماجی مصلح کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ وہ پارسی تھے لیکن انھوں نے تن تنہا، پارسی معاشرے کو خیرباد کہہ کر، ہندو معاشرے میں اصلاحات کا بیڑا اٹھایا۔ انھوں نے ہندوؤں میں بیوہ کی بیوگی اور کم عمری کی شادی جیسے مسائل پر زوروشور سے لکھا۔

ڈیارام نے *Life and Life work of B M Malabari* نامی کتاب ان کی شخصیت اور کارناموں کے بارے میں لکھی تھی۔ وہ انڈین اسپیکٹیٹر میں اہم آرٹیکل لکھا کرتے تھے۔ ملاباری نے جب ایسٹ اینڈ ویسٹ نامی ماہوار رسالہ جاری کیا تو ڈیارام اس کے اخراجات کی مد میں ایک بڑی رقم ہر ماہ دیا کرتے تھے۔ ملاباری بہت اچھے لکھنے والے تھے لیکن وہ کبھی حکومت کے سخت گیر نکتہ چیں نہ رہے بلکہ شاید ہندوستان کے وہ واحد صحافی تھے جو حکومت کی نگاہ میں نہایت اعتبار کے حامل تھے۔ ہند حکومت کے سیاسی سیکرٹری اور تنک مزاج بیوروکریٹ سر ولیم لی وارنر نے انڈین اسپیکٹیٹر کو م... نقاد قرار دیا تھا۔ ملاباری خود کو کوسنا نہیں کہا کرتے تھے۔ وہ کانگریس کے یا دوسرے سیاسی جلسوں میں کبھی نہیں جاتے تھے۔ یہ سچ ہے کہ ان کا اخبار کبھی نفع بخش نہیں ہوا مگر وہ تنگ دستی وافلاس کی حالت میں بھی فوت نہیں ہوئے۔

اعلیٰ تعلیم کے لیے سندھ کے لوگ بمبئی پر انحصار کرتے تھے۔ سندھ کے اسکولوں میں میٹرک درجے تک تعلیم دی جاتی تھی۔ میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد سندھی طلبا کو کالج میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے بمبئی جانا پڑتا تھا۔ اس سے نوجوانوں کی فکر اور نظر میں کشادگی تو آتی تھی اور دوسرے ثقافتی درجے سے استفادہ کرنے کا موقع بھی ضرور ملتا تھا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی تھا کہ تعلیم کا حصول مہنگا سودا تھا۔ ہر باپ یا سرپرست کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اپنے بچے کو حصول تعلیم کی خاطر چھ سات سال کے لیے بمبئی بھیج سکے۔ مزید برآں اس بڑے شہر میں کچھ ایسی رغبتیں بھی تھیں جن سے نئے نئے اسکول سے نکلے ہوئے نوجوان ہمیشہ اپنا دامن نہیں بچا سکتے تھے۔ ان سب سے بڑھ کر یہ بات ذلت کا باعث تھی کہ کئی ضلعوں پر مشتمل صوبے میں، جس کے کمشنر کو چیف کمشنر کا درجہ حاصل تھا، ایک کالج تک نہیں تھا۔ پورا صوبہ سندھ کم سے کم ایک کالج کو تو چلا ہی سکتا تھا۔ جن کے پاس سرمایہ تھا اور جو چاہتے تھے وہ اپنے لڑکوں کو بمبئی بھیج سکتے تھے لیکن سب

لڑکے جو وسائل کی کمی کے باعث میٹرک کے بعد تعلیم جاری نہیں رکھ پاتے تھے، اگر سندھ میں کالج ہوتا تو ضرور کالج جاسکتے۔

سندھ کے لیے مقامی کالج کا خیال سب سے پہلے ڈیارام گڈومل کو آیا۔ ٹھیک اسی زمانے میں اس خیال کو عملی شکل دینے کے لیے دو اہم اسباب بھی مہیا تھے۔ اول تو یہ کہ اس وقت لارڈ ریے (Lord Reay) بمبئی کے گورنر تھے۔ وہ ایک ممتاز ماہر تعلیم تھے اور تمام علاقوں میں تعلیم کو عام کرنے کے حامی تھے۔ یوں تو کراچی اور سندھ کو سوتیلی ماں ایسے سلوک کے خلاف شکایات تھیں جو بمبئی گورنمنٹ اس خطے کے ساتھ روا رکھے ہوئے تھی، تاہم کم از کم تعلیم کے معاملے میں یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی تھی کہ لارڈ ریے سندھ کے لیے مقامی کالج کے قیام کی تجویز پر یقیناً ہمدردانہ غور کریں گے۔ دوسرے یہ کہ سندھ ٹائمز اور سندھ سدھار کے ذریعے رائے عامہ کو اس مسئلہ پر بیدار کیا جاسکتا تھا۔ ڈیارام نے اس مسئلے پر میرا سد سے اور مجھ سے نہایت تفصیلی بات چیت کی۔ ایک قطعی لائحہ عمل وضع کیا گیا۔ یہ طے کیا گیا کہ اگرچہ دونوں اخبار اس منصوبے کے حق میں کام کریں گے اور لوگوں سے چندے اور عطیات کی اپیل کی جائے گی، تاہم اس مقصد کے لیے ایک سرگرم جماعت بھی قائم کی جائے جس کے نمائندے صوبے بھر کے اضلاع کا دورہ کریں، لوگوں سے چندہ اکٹھا کریں اور اس تجویز کے ان حامیوں کی فہرست بنائیں جو عطیات دیں گے۔ اس کے بعد بمبئی حکومت سے مالی اعانت کی درخواست کی جائے گی اور پھر عوامی اداروں، جیسے میونسپلٹیوں اور ضلعی بورڈوں، سے کالج کے اخراجات پورے کرنے کے لیے سالانہ گرانٹ کی درخواست کی جائے گی۔ اس بات پر بھی اتفاق کیا گیا کہ تمام سرکاری ملازموں اور تجارتی دفاتر سے ایک ماہ کی آمدنی امداد میں دینے کو کہا جائے گا جب کہ تاجروں، مالکان اور زمینداروں سے عطیات کی درخواست کی جائے گی۔ ہم نے یہ بھی طے کیا کہ کالج کی ہر جماعت میں ذات اور مذہب کی تخصیص کے بغیر سب کو حصول تعلیم کے یکساں مواقع حاصل ہوں گے، اور یہ کہ ہم سب سے بڑھ کر عامل برادری پر انحصار کریں گے جو سندھ کا تعلیم یافتہ طبقہ ہے۔

ہم نے عطیات کے سلسلے میں سب سے پہلے میسرز ڈیارام اُدھارام سے رابطہ کیا جو اپنی کاروباری ساکھ کی بدولت کراچی میں ہر طبقے کے لوگوں میں اثر ورسوخ رکھتے تھے اور سندھ بھر میں جانے پہچانے جاتے تھے۔ ڈیارام جیٹھومل نے بھرپور تعاون کا وعدہ کیا اور اُدھارام مولچند نے ان کی تائید کی۔ سندھ سدھار اور سندھ ٹائمز میں میرا سد اور میں اس مسئلہ کو بار بار اٹھاتے رہے۔ ہم ہر ہفتے اس موضوع پر مختلف حوالوں سے روشنی ڈالتے تھے۔ ہم نے لوگوں سے جذبۂ حب الوطنی اور عوامی ولولے کے اظہار اور دل کھول کر چندہ دینے کی اپیل کی۔ ہر روز شام کو ہم عطیات کے لیے لوگوں کے پاس جاتے۔ جب ہم شہر کے بڑے تاجروں اور متمول لوگوں، مثلاً ایدل جی ڈنشا، ایچ جے رستم جی اور شہر کے کئی دوسرے سیٹھوں سے رابطے کے لیے نکلے تو ہم نے ڈیارام اُدھارام سے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔ وہ خوشی ان دوروں میں ہمارے ساتھ رہے۔ انھوں نے خود دو ہزار روپے کا عطیہ دے کر اس مہم کا آغاز کیا۔ ایدل جی ڈنشا،

لیچ سیٹھ رستم جی اور چند دوسرے شہریوں نے بھی اتنی ہی رقم کے عطیات دینے کا وعدہ کیا۔ دیارام گدومل صبح کے وقت اپنے لکھنے کے اوقات میں بیٹھ کر سندھ بھر کے لوگوں کو مراسلے بھیجتے تھے۔ اس سلسلے میں لوگوں کی طرف سے جواب فوری اور خاصا حوصلہ افزا تھا۔ ہمارا مکان گہما گہمی اور سرگرمی کا مرکز بن لیا تھا۔ کراچی کے باشندوں کے علاوہ سندھ کے سبھی حصوں سے آنے والے لوگ یہ جاننے کے خواہاں تھے کہ اس عظیم منصوبے میں کیا پیش رفت ہو رہی ہے۔ ہر طرف سے روپیہ گویا برس رہا تھا۔ اتنے زمانے بعد اب جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، لگ بھگ ۸۰ ہزار روپے کی رقم اکٹھی ہوئی تھی اور بمبئی حکومت اتنی ہی رقم اور دینے پر آمادہ ہو گئی۔ یہ طے کیا گیا کہ لارڈ ریے جب پہلی بار کراچی اور سندھ کا دورہ کریں تو نئے کالج کا باقاعدہ افتتاح کریں۔ اس کالج کا نام سندھ آرٹس کالج رکھا گیا۔ دیارام جیٹھ مل کی موت کے بعد ان کے اہل خانہ نے اس شرط پر کہ اس کالج کو مرحوم کے نام سے منسوب کر دیا جائے، ایک خطیر رقم دینے کی پیش کش کی۔ ایسا ہی کیا گیا۔ لہٰذا اب یہ کالج دیارام جیٹھ مل [ڈی جے] کالج کے نام سے معروف ہے۔

دیارام گدومل کی زندگی بھر کی منشا کے عین مطابق بھی یہی ہے کہ جو کردار انھوں نے کالج کے قیام میں ادا کیا، اسے گوشۂ گمنامی میں ڈال دیا جائے۔ خود فراموشی ہی ان کی زندگی کا رہنما اصول تھا۔ انھوں نے جو کچھ اپنے لوگوں اور اپنے صوبے کے لیے کیا تھا وہ بجائے خود اپنا صلہ تھا۔

کچھ عرصے بعد دیارام کو سول سروس میں قانونی دان نامزد کیا گیا اور اسسٹنٹ کلکٹر کی حیثیت سے سیوھن میں تعینات کر دیا گیا۔ سندھ کی سماجی زندگی میں عملی طور پر یہ ان کے کریئر کا اختتام تھا۔ اس کے بعد سندھ ٹائمز کے لیے وہ کبھی کوئی اہم مضمون نہیں لکھ سکے اور نہ سندھ سبھا کے لیے کچھ کر سکے، اور یہ تنظیم غیر فعال ہوتے ہوتے چند برسوں میں بالکل دم توڑ گئی۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، عوامی فلاح اور خدمت خلق کے ہر منصوبے کی اعانت کے لیے دیارام ہمہ وقت تیار رہتے تھے، لیکن سندھ کی سماجی زندگی میں ان کی شناخت معدوم ہوتی چلی گئی تھی۔ وہ دو یا تین بار سندھ میں تعینات ہوئے۔ انھوں نے صدر کورٹ کے جج اور جوڈیشل کمشنر کی حیثیت سے کراچی میں کام کیا لیکن تمام تر سماجی تحریکوں اور سرگرمیوں سے ان کا تعلق منقطع رہا۔

دیر بعد دیارام سے پھر میری ملاقات لاہور میں ہوئی۔ میں وہاں اخبار ٹریبیون کا مدیر تھا۔ وہ ملازمت سے چھٹی لے کر سماجی اصلاحات کے پرچار کے لیے ملک بھر کا دورہ کر رہے تھے۔ اس وقت انھوں نے میرے ہاں قیام تو نہیں کیا لیکن مجھ سے ملنے کے لیے آئے۔ رات کا کھانا ہم نے ساتھ کھایا۔ اس کے بعد ان سے میری ملاقات بنارس میں ہوئی، جب انڈین نیشنل کانگریس کا اجلاس گوپال کرشن گوکھلے کی صدارت میں ہو رہا تھا۔ اس وقت الہ آباد کے انڈین پیپل کی ادارت میرے پاس تھی۔ دیارام پہلے الہ آباد گئے پھر بنارس آئے۔ ہماری ملاقات کانگریس میں ہوئی اور بعد میں ہم نے اکٹھے مشترک میں دیر تک وقت گزارا۔

جب میں ۱۹۱۷ میں بمبئی کے قریب باندرا میں ڈیارام سے ملا تو حالات بہت بدل چکے تھے۔ وہ سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہو چکے تھے اور نہایت اذیت میں وقت گزار رہے تھے۔ وہ سماجی زندگی سے قطعی لاتعلق ہو چکے تھے۔ تمام تر اعزازی عہدوں سے انھوں نے استعفیٰ دے دیا تھا، پرانے سب روابط سے رشتہ منقطع کر لیا تھا اور پرانے دوستوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا تھا۔ چوں کہ میرا قیام بھی اس وقت باندرا میں تھا اس لیے ان سے ساحل کے قریب اکثر ملاقات ہو جاتی تھی۔ ہم دونوں اشارے سے ایک دوسرے کو نمسکار کرتے لیکن ہمارے درمیان ایک لفظ تک کا تبادلہ نہ ہوتا۔ باندرا میں ہر شخص ان سے واقف تھا اور وہ ہر اس آدمی کے ساتھ اطمینان سے کھڑے ہو کر بات کرتے جس کا ان کے ماضی سے کوئی تعلق نہ ہو۔ ان کا ہر جاننے والا انھیں درویش طبع اور اعلیٰ کردار کا مالک بتاتا تھا۔

ڈیارام گڈومل کی کوئی بھی داستانِ حیات جس میں ان کے آخری برسوں کے واقعات کو نظرانداز کیا گیا ہو ہرگز مکمل نہیں کہلائی جا سکتی۔ ان برسوں اور ان میں بسر کی گئی زندگی نے ان کی شخصیت کو ربانی تقدیس و رفعت عطا کی۔ مجھے کوئی ایسا آدمی دھیان نہیں پڑتا جو بے باکی کے ساتھ ان کے بارے میں کوئی رائے صادر کر سکے۔ فوق البشری ہمت کے ساتھ انھوں نے اپنی پوری زندگی کو اٹھا کر پس پشت ڈال دیا تھا اور پھر کبھی مڑ کر اس کی طرف نہیں دیکھا۔ انھوں نے اپنے ماضی کے تمام روابط کو کمال بہادری سے کاٹ کر علیحدہ کر دیا اور خود اپنی ذات سے کنارہ کش ہو گئے۔ ان کی عمر کے آخری برس ان کی تپسیا کا کٹھن اور طویل کھنچا ہوا عرصہ تھے۔ دنیا میں رہتے ہوئے وہ اس دنیا کے آدمی نہیں رہے تھے۔ جو قوتِ ارادی انھوں نے اپنے اندر پیدا کی تھی وہ شاذ و نادر ہی انسان میں دکھائی دیتی ہے۔ ہر روز ہر گھڑی وہ اپنی روح اور اپنے بھگوان کے روبرو تھے۔ ایک عظیم روحانی قوت کا مالک میرو دیکھ وتہا تھا۔

خوش قسمتی سے مجھے ہندوستان کی بعض نادرِ روزگار ہستیوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ میں سوامی دیانند سرسوتی، رام کرشن پرم ہنس سے ملا ہوں، سوامی ویویکانند میرے ہم جماعت اور شکاگو اور امریکا میں اپنے قابلِ فخر کریئر کے بعد میرے مہمان بھی رہے ہیں، مجھے کیشب چندر سین سے ملنے اور انھیں سننے کا موقع بھی ملا ہے، اپنی سیاسی اور سماجی زندگی میں مجھے دادا بھائی نوروجی، فیروز شاہ مہتا، اے او ہیوم، ڈبلیو سی بنرجی، سریندر ناتھ بنرجی، جی کے گوکھلے، سی آر داس اور بہت سے دوسرے معروف لوگوں کا قرب حاصل رہا، لیکن ڈیارام گڈومل کا نام میرے حافظے میں مندر کی سی پوترتا کے ساتھ اب بھی محفوظ ہے۔ وہ، بلاشبہ، ان عظیم ترین لوگوں میں سے ایک تھے جنھیں زندگی میں مجھے جاننے کا موقع ملا۔

**

لوک رام ڈوڈیجا

سندھی سے ترجمہ اور تلخیص: اجمل کمال

کراچی کے تیرتھ اور دوسرے مقامات

ہمارے زمانے میں سندھ سرکاری انتظام کے لحاظ سے، آٹھ ضلعوں میں تقسیم تھا اور دارالحکومت کراچی شہر تھا جہاں سندھ کا حاکم کمشنر صاحب رہا کرتا تھا۔ کراچی کو بڑی اہمیت حاصل تھی کیوں کہ سندھ، پنجاب، افغانستان وغیرہ ملکوں کے لیے یہ واحد بندرگاہ تھی جس کے ذریعے وہ دنیا کے ساتھ تجارتی رابطہ قائم رکھ سکتے تھے۔ کراچی سندھ کی دولت کا مرکز تھا کیوں کہ وہاں بڑے بڑے محل، بازار، دنیا کے تمام بڑے بینکوں اور تجارتی کمپنیوں کے دفاتر کی عالیشان عمارتیں تھیں، جو سندھ کے کسی دوسرے شہر میں موجود نہ تھیں۔ آج بھی سندھ کے اسی شہر پر پورے پاکستان کی زندگی کا دارومدار ہے۔ ساحلِ سمندر پر واقع ہونے کے سبب کراچی کی آب و ہوا سندھ کے دوسرے علاقوں کی طرح سخت گرم یا سرد نہ تھی۔ غرض کراچی ہر اعتبار سے سندھ کی جنت اور سرتاج تھا۔

شروع میں ہم کھارادر کے علاقے کی جس بلڈنگ میں رہتے تھے وہاں کئی میربحروں کے بھی گھر تھے جو اپنی کشتیوں میں مچھلیاں اور نمک وغیرہ لے کر افریقا اور پردیس کے دوسرے مقامات پر جایا کرتے تھے۔ یہ لوگ سندھی مسلمانوں سے نرالے تھے اور نہایت فضیلت اور آسودگی سے رہتے تھے۔ ان کی عورتیں پردہ نہیں کرتی تھیں اور نیک اور پاکباز تھیں۔ ان موہانوں میں ایک عجیب خصوصیت یہ تھی کہ وہ بالکل ٹھیک ٹھیک بتا سکتے تھے کہ آج مینھ برسے گا یا طوفان آئے گا، جبکہ صاف آسمان اور کھلی دھوپ کو دیکھتے ہوئے ایسا کوئی امکان نظر نہ آتا۔

کراچی ابتدا میں ایک قلعہ تھا جس کے دو دروازے تھے: سمندر کی طرف کھارادر دروازہ اور میٹھے پانی کے کنووں کی طرف میٹھادر دروازہ۔ اُس وقت قلعے کی کوئی بھی دیوار سلامت نہ تھی۔ ان دونوں دروازوں کے بیچ کی تنگ گلیوں میں اوائلی سیٹھوں کے مکانات تھے اور چھاپرا اور سمتا ذات کے لوگ بھی وہاں رہا کرتے تھے۔ اس کے اطراف پورا شہر بسا ہوا تھا جس میں نہ صرف سندھ بلکہ ہندوستان کے تمام خطوں کے لوگ آباد تھے۔ قدیم سے رام باغ نام کا ایک میدان تھا جس کی بابت کہا جاتا تھا کہ ترتا یگ میں ہنگلاج جاتے ہوئے رام، لکشمن اور سیتا نے یہاں بسرام کیا تھا۔ آزادی کی تحریک کے دوران، ۱۹۲۰ سے

۱۹۴۷ تک کے عرصے میں، رہنماؤں کی تقریریں، تحریک اور ستیہ گرہ کے سلسلے میں شہادتیں اور فائرنگ کے واقعات یہیں پیش آئے تھے۔ اس کے مغرب کی جانب میں نے ایک بلڈنگ خرید کی تھی جس کے کٹہرے میں سے ہم یہ تمام تاریخی کارگزاریاں دیکھا کرتے۔ ۱۸۵۷ کے غدر میں جن سندھی سورماؤں نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کی تھی انھیں بھی رام باغ ہی میں توپوں کے منہ سے باندھ کر اڑایا گیا تھا۔ افسوس کہ اب اس اہم تاریخی مقام کا نام بدل کر آرام باغ کر دیا گیا ہے اور اس طرح سندھ کے قدیم تاریخی اور تیرتھ کے نشان کو مٹایا جا رہا ہے۔

اُن دنوں کراچی صدر سے کیماڑی تک، پانچ میل سڑک پر، ٹرام چلتی تھی اور یہ پورا سفر ایک ٹکے (تین پیسوں) میں طے ہو جاتا تھا۔ ٹراموں میں نہ دھکم پیل ہوتی تھی اور نہ مسافروں کے گرنے کا خطرہ۔ شہر میں جیوجا گیاں (four-seaters) چلتی تھیں جن میں چار پانچ آدمی آرام سے بیٹھ سکتے تھے۔ ہمارے شکارپوری پڑوسی رائے بہادر ہاراس داس نے کراچی میں موٹروں کی پہلی دکان کھولی تھی۔ اُس زمانے میں امریکی فورڈ موٹر کی قیمت ڈھائی ہزار اور شیورلیٹ کی تین ہزار روپے ہوتی تھی۔ لاریاں بھی چلنے لگی تھیں لیکن مال ڈھونے کے لیے اکثر اونٹ گاڑیاں استعمال ہوتی تھیں۔ ہم پندرہ سولہ افراد دس میل دور منگھوپیر کے گرم چشموں پر سیر کرنے جاتے تو اونٹ گاڑی پر فرش بچھا کر گاتے بجاتے جایا کرتے۔

کراچی میں کئی باغ تھے جن میں سب سے بڑے سرکاری باغ میں طرح طرح کے جانور، پرندے اور تالاب تھے۔ شہر سے تقریباً چار میل پرے، سمندر کے کنارے، ایک پارسی سیٹھ نے ایک سیرگاہ کلفٹن (ہوا بندر) بنوائی تھی۔ وہاں کی سیر کے لیے انگریز گھوڑوں پر اور ہم سائیکلوں پر سوار ہو کر جایا کرتے۔ شاندار عمارتوں میں میونسپل آفس، ہائی کورٹ، کلب، میری ویدر ٹاور، ڈینسو ہال وغیرہ شامل تھے۔ فریئر ہال کی شاندار عمارت گوتھک طرز کی تھی جس [کی لائبریری] میں ہزاروں انمول انگریزی کتابیں موجود تھیں۔ وہاں زیادہ تر انگریزوں کو ممبر بنایا جاتا تھا مگر مجھے بھی ایک پادری دوست کی سفارش پر داخلہ مل گیا تھا۔ مغربی فلسفیوں اور ادب سے میری واقفیت اسی لائبریری کے ذریعے سے ہوئی۔ غرض یہ کہ کراچی سندھ کی ناک تھا۔

کراچی میں سندھو ساہوکاروں کے بنوائے ہوئے کئی خیراتی اسپتال، زچہ خانے، ہائی اسکول اور یتیم خانے بھی تھے۔ ہندو شمشانوں سے آدھ میل پرے ایک تالاب کے کنارے گورکھ امری تھی جہاں گدامری کے پیڑ تلے قدیم زمانے میں گرو گورکھ ناتھ نے یوگ سادھنا کی تھی۔ ہمارے زمانے میں یوگی راج مست رام وہاں آ کر رہنے لگے تھے۔ وہ بالکل ننگے رہتے تھے جس پر آس پاس کے رہنے والے مکرانیوں نے اعتراض اٹھایا، مگر بعد میں ان کے روحانی نور اور الوہی بےخودی سے متاثر ہو کر وہاں سلام کرنے آنے لگے اور کھانا نذر کرنے لگے۔ شکارپور کے بھائی پرمانند نے انھیں اپنا گرو مانا تھا۔

کراچی کا سب سے نمایاں انگریزی اخبار سندھ آبزرور تھا جس کے ایڈیٹر ایک مدراسی کے پُتھیا

تھے اور دوسرا سندھ ٹائمز جس کے ایڈیٹر ہمارے دور کے عزیز شہری ٹیکم داس جیسوانی تھے۔ یہ دونوں اخبار انگریزوں کی بہت حرام کیے رکھتے تھے۔ میں نے ۱۹۲۲ کے لگ بھگ ایک سال سندھ ٹائمز میں نوکری کی۔ اس اخبار کے روح و رواں سادھو ٹی ایل واسوانی تھے۔ وہ اس اخبار کے دفتر کے اوپر ایک کمرے میں رہتے تھے۔ مجھے جو خاص کام سونپا گیا وہ دادا واسوانی کے مضامین شارٹ ہینڈ میں لکھنے اور پھر ٹائپ کر کے انھیں دینے کا تھا۔ ان میں سے بعض مضامین ایڈیٹوریل کے طور پر چھپتے تھے اور بعض کو وہ امریکی اور برطانوی رسالوں کو بھیجتے جہاں سے انھیں معاوضے کے طور پر خاصی رقم آیا کرتی۔ درحقیقت مجھ میں مضمون نگاری کا شوق اور ڈھنگ سادھو واسوانی ہی نے پیدا کیا۔ ان سے میری دوسری ملاقات چند سال بعد ہوئی جب میں ہمالیہ کے پہاڑوں کی سیر کر رہا تھا۔ انھوں نے مسوری اور دہرہ دون کے درمیان شکتی آشرم کھول لیا تھا جس کا مقصد ہندوی اور تیاگی نوجوان پیدا کرنا تھا جو ہندوستان کو آزاد کرائیں۔ انھوں نے بڑے تپاک سے مجھے دو دن اپنے پاس رکھا۔ میری رائے پوچھی تو میں نے کہا کہ یہ آدرش مہان ہے مگر یہ کام بہت مشکل اور رسائی سے باہر ہے۔ وہ سندھ کے سچے سپوت اور سنت تھے جنھیں ہر وقت دیش کی آزادی اور شاگردوں میں نیکی اور سلجھاؤ پیدا کرنے کی لگن رہتی تھی۔

کراچی کا تیسرا انگریزی روزنامہ ڈیلی گزٹ تھا جو انگریزوں کی وکالت اور ان کے گن گانے میں مصروف رہتا تھا۔ آخری برسوں میں مسلم لیگ والوں نے ڈان اخبار نکالا جس کے ایڈیٹر ایک بنگالی مسٹر الطاف حسین نہایت قابل سیاست داں تھے۔ سندھی میں الوحید اور ہندو سماچار اخبار تھے جو اپنی اپنی قوموں، یعنی مسلمانوں اور ہندوؤں، کے حق میں اور ایک دوسرے کے خلاف لکھتے رہتے تھے۔ ان میں بڑی خرابی یہ تھی کہ سادہ سندھی زبان میں عربی اور ہندی کے دشوار الفاظ ملایا کرتے تھے جو مجھے دودھ میں مکھی کی مثل لگتے تھے۔ اور بھی دو چار رسالے نکلتے تھے۔

کراچی میں بہت سے ہوشیار ڈاکٹر، حکیم اور طبیب رہتے تھے۔ کہیں دوسری جگہ لکھ چکا ہوں کہ اگلے زمانے میں ٹھٹھہ آیورویدک کا مرکز تھا۔ میرے زمانے میں ٹھٹھے کے مہاراج سکھرام داس کا یہ موروثی علم تھا۔ کراچی میں میری ویدر ٹاور کے قریب ان کا شفاخانہ تھا۔ بڑے بڑے نواب، سردار اور راجا بھی لاعلاج بیماریوں کا علاج کرانے ان کے پاس آتے تھے۔ وہ سندھ کے ویدوں کے سرتاج تھے اور خاص کر سِل کے موذی مرض کے علاج میں ماہر تھے۔ انھوں نے سِل کے مریضوں کے رہنے اور کھانے پینے کے لیے اونچا سینیٹوریم کھولا تھا۔ کئی وید اور حکیم ان سے تعلیم حاصل کرنے آیا کرتے تھے۔

کراچی میں کیماڑی پر ایک رام دلارے بھیا رہتے تھے۔ وہ بھی کراچی کے عجائبات میں سے ایک تھے۔ ٹوٹی ہڈیوں کو سیدھا کرنے والے جراح اور پارسی ماہر ہوتے تھے، مگر ان کے ہاتھ میں پروردگار نے کچھ عجیب ہنر دیا تھا۔ کراچی کے سول سرجن کرنل جانس کا بیٹا چھت سے گر پڑا اور اس کی ٹانگ تین جگہ سے ٹوٹ گئی تو اس کے باپ نے بیک وقت تین مقامات کا آپریشن کرنا نامناسب سمجھا۔ رام دلارے

کی اتنی شہرت تھی کہ اسپتالوں کے لوٹائے ہوئے لاعلاج مریض بھی اس کے پاس آ کر بھلے چنگے ہو جایا کرتے۔ کرمل جانس نے بھی اپنے بیٹے کا علاج پیسے سے کرایا اور جب انھوں نے مہینے دو مہینے میں اسے چلنے پھرنے کے قابل کر دیا تو وہ حیرت میں پڑ گیا۔ میرے پیر کی ہڈی ٹوٹی تو میں بھی رام دلارے سے پٹی بندھوانے جاتا تھا۔ دیکھتا تھا کہ وہاں صاحب بہادر یا دوسرے دولت مندوں کو بھی غریبوں کے ساتھ بیٹھ کر انتظار کرنا پڑتا تھا کیوں کہ رام دلارے بھیا امیر غریب کے ساتھ ایک سا سلوک کرتے تھے۔ کرمل جانس نے انھیں سرکاری اسپتال میں ڈیڑھ سو روپے کی نوکری کی پیشکش کی تب بھی وہ پورٹ ٹرسٹ میں بیس روپے تنخواہ پر چوکیداری کرتے رہے۔ کھاتے پیتے مریض جو سوغاتیں ـــ کپڑے، برتن، باندھنے کے لیے پٹیاں، ناشتہ، تیل وغیرہ ـــ لاتے وہ غریبوں میں بانٹ دیا کرتے۔

سکھرام داس وید کے قریب ہی سیٹھ ہرچندرائے وکیل کا دفتر تھا۔ اس عالیشان عمارت کے ایک آراستہ ہال میں ان کے والد وشنداس وشن سبھا لگایا کرتے یہاں ہم جیسے راگ کے شوقین آ کر جمع ہوتے۔ بڑے بڑے گویوں اور طوائفوں کو وہاں بلوایا جاتا۔ اس وقت سیٹھ وشنداس کی عمر اسی پچاسی سال کی تھی۔ راگ کے بھی اتنے ماہر تھے کہ بڑے بڑے استاد ان کے سامنے گاتے ہوئے گھبراتے کہ کہیں کوئی غلطی نہ ہو جائے۔ وہ خود بھی موج میں آ کر گایا کرتے اور ایسے تان پلٹے لگاتے کہ کیا کہیے۔ ان کا تعلق گلاب داسی پنتھ سے تھا جو ایک صوفی مت ہے جس میں ناچ گانا قیمہ کباب سب روا ہیں۔ انھوں نے بہت سی کتابیں بھی چھپوائی تھیں۔ قرآن شریف کا ترجمہ کر کے مفت بانٹتے تھے۔ کریما کا بھی فارسی سے ترجمہ کروایا تھا۔

جس جگہ سمندر شہر سے آ کر لگتا ہے وہاں بیٹو جیٹی پر ورن دیوتا اُوڈیرو لعل کا قدیم مندر تھا جہاں عورتوں اور مردوں کے اشنان کے لیے الگ الگ گھاٹ بنے ہوئے تھے۔ وہاں تیرنے، پل پر سے کودنے اور شرطیں لگانے میں بہت مزہ آتا تھا۔ نوروز اور چالیسویں پر بڑے میلے لگتے۔ تانبے کی دیگیں چڑھتی تھیں۔ منڈوے لگتے اور کھلونوں کا بازار لگتا تھا۔ ناریل پورنیما پر چڑھاوے بھی وہاں چڑھائے جاتے۔

بیٹو جیٹی سے کیماڑی تک ڈھائی میل کی گودیوں پر پردیسی جہاز مال اتارتے چڑھاتے تھے۔ کیماڑی سے بیرٹی پر ایک میل دور منوڑا کے جزیرے پر جایا جاتا تھا۔ بیرٹی والے ہر کسی سے ایک آنہ کرایہ لیتے مگر گھر کی عورتوں سے کرایہ نہیں لیتے تھے۔ منوڑے پر دریا شاہ کا قدیم مندر تھا جہاں ہر اتوار کو میلا لگتا تھا۔ کٹمب والے ٹفن بکس میں کھانا، چھبی میں میوے مٹھائیاں لے کر آتے۔ نہ بھی لاتے تو مندر سے ڈھوڈے ساگ کا پرساد ملتا تھا۔ یاتری ٹھیک کیرتن کرتے، تاش کھیلتے، سمندر کے کنارے گھومتے یا شرطیں لگاتے۔ بہار کا موسم آنے پر بڑا میلا لگتا تھا۔ منوڑے میں گوری فوج کا ایک رسالہ بھی رہتا تھا جس کے لیے اسکول، لائبریری اور کلب تھا۔ وہاں ایک گرجا اور مسجد بھی تھی۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ اس جزیرے کے چاروں طرف اتھاہ کھارا سمندر ہونے کے باوجود اس مندر کے کنویں کا پانی میٹھا ہوتا تھا۔ جزیرے پر لائٹ ہاؤس کے پاس شاہی پتھروں کی دیوار بنی ہوئی تھی جسے بریک واٹر کہا جاتا تھا۔ سمندر کی لہریں سدا اس دیوار سے لڑتی رہتی تھیں۔ دونوں فریقوں کی دھماچوکڑی کے دنگل ہر وقت لگے رہتے۔ لہریں شکست کھا کر پیچھے جا گرتیں، پھر زور سے اٹھ کر حملہ کرتیں اور دیوار پر بیس پچیس فٹ اوپر تک چڑھ جاتیں اور دوبارہ زوم کی آواز کے ساتھ پتھروں پر گرتیں۔ ہم پر بھی خوب چھینٹے پڑتے۔ زور آور کے ساتھ زور آزمائی سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

کلفٹن یعنی ہوا بندر پر پاتال رتنیشور مہادیو کا مندر بھی ایک اچنبھا تھا۔ سمندر کی سطح سے تیس چالیس فٹ نیچے، پہاڑی میں ایک اندھیری گپھا تھی جہاں سوئمبھو [خود تخلیق شدہ] مہادیو کا لنگ تھا۔ پجاری بتاتا تھا کہ اوائل میں ہنگلاج کے یاتری یہیں آکر بسرام کیا کرتے تھے۔ مندر کے ایک کونے پر میٹھے پانی کا چشمہ تھوڑا تھوڑا بہا کرتا تھا۔ لنگ کی شکل انڈے یعنی صفر کی سی ہوتی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ پورا سنسار کچھ بھی نہیں، صرف سپنے سمان دکھائی دے رہا ہے۔

کلفٹن سے منوڑے کا لائٹ ہاؤس دور سے نظر آتا تھا۔ کلفٹن اور منوڑے کی پہاڑیوں کے درمیان سمندر میں رام جھروکا نامی ایک چٹان تھی جسے آئسٹر راک بھی کہتے تھے۔ ہنگلاج جاتے ہوئے رام، لکشمن اور سیتا یہاں رکے تھے۔ تب سے اس چٹان کو رام جھروکا کہنے لگے تھے۔ شروع میں یہ چٹان کلفٹن اور منوڑے کی پہاڑیوں کے ساتھ جڑی ہوئی ایک قطار میں تھی۔ دسویں صدی کے زلزلے میں چھوٹی چٹانیں سمندر کے اندر اتر گئیں۔ اب منوڑے سے بیڑی میں بیٹھ کر رام جھروکے جایا جاتا ہے۔ مگر وہاں کوئی عمارت بنی ہوئی نہیں ہے اور شاذ و نادر ہی کوئی وہاں جاتا ہے۔

کراچی کی سمندری سیریں بھی بھلائی نہیں جا سکتیں۔ پورنماشی کی رات کو کیماڑی سے ایک بیڑی میں یار دوستوں کے ساتھ سلونی اور میٹھی چیزیں لے کر نکلا کرتے اور راگ رنگ اور ہنسی مذاق کے ساتھ ساتھ کھانا پینا بھی چلتا رہتا۔ ملاح بادبان تانتا تو موافق ہوا جھٹ بادبان کو بھر دیتی اور کشتی ایسی تیز چلنے لگتی جیسے موٹر لانچ چلی جا رہی ہو۔ کچھ دیر میں کنارے سے دور بیچ سمندر میں پہنچتے تو کشتی کبھی دائیں طرف تو کبھی بائیں طرف جھکنے لگتی جیسے دولہا شاہ کو دھیرے دھیرے پیار پیش کر رہی ہو۔

گہرا اتھاہ سمندر، روح کو راحت دینے والا منظر۔ اور تاروں بھری چھت میں چمکتا چاند کا گیس کا گولا۔ اب ورن دیوتا کے گھر کے گھیرے میں افق تک صرف کھارا پانی جس میں ہماری بیڑی جھولے کی طرح جھول رہی ہوتی۔ اسی لیے تو کہتے ہیں جھولے لال، جھولے لال، بندروں میں جھولے لال۔ کیا دھرتی بھی کوئی چیز ہوتی ہے؟ ایسا خاموشی میں لگے۔ اب دریا شاہ کے دیدار کے ادبھوت آنند کا کیا بیان ہو! اس کی جتنی مدح کی جائے کم ہے۔ یہ دیوتا ہی ہماری زندگی ہے۔ خود کھارا ہوتے ہوئے بھی یہ شاہ مہر سے میٹھے پانی کے بادلوں کے بھنڈار دیتا ہے۔ اے میرے جھولے لال، زندگی دینے والے دریا شاہ! میرا لاکھ لاکھ بار نمسکار!

درحقیقت یہ سمندر اُس عیسی سرجہار کی دونوں صورتوں کا دیدار کراتا ہے، ایک تو نیچے کی تہہ جو دکھائی نہیں دیتی، اچل، اٹکھ، بےانت، ہر لرزش سے آزاد؛ دوسری اوپر کی سطح جس کی لہریں سدا ملچل میں رہتی ہیں، پیدائش، عروج اور انجام۔ کبھی جنبش میں آ کر خوفناک ہو جاتی ہیں، گرجتی دہاڑتی ہوئی غضب ناک تباہی لاتی ہیں اور کبھی ایسے نرم گیلے لمس سے روح میں راحت اور آسودگی بھر دیتی ہیں۔ نظر نہ آنے والا کرتار ہی سب شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے۔

شہر سے تقریباً نو دس میل دور گرم گندھک کے پانی کے چشمے تھے جہاں ہم سیر کرنے یا تازہ دم ہونے جایا کرتے تھے۔ جن لوگوں کو جلد یا ماصے کی بیماریاں ہوتیں وہ تو وہاں جا کر مہینوں رہا کرتے۔ قریب ہی سادھو ہیرانند کے نام کا کوڑھیوں کا اسپتال اور آشرم تھا۔ اس کے لیے میونسپلٹی برائے نام گرانٹ دیتی تھی مگر اخراجات سادھو ہیرانند ٹرسٹ حیدرآباد والے ہی پورا کرتے تھے۔ کسی سرگباشی کے نام پر وہاں بانٹنے کے تھال، آموں کے ٹوکرے اور چاولوں کی بوریاں بھیجی جاتیں۔

گرم چشموں کے قریب آسومل حلوائی کی بنوائی ہوئی ایک دھرم شالا تھی جہاں سے برتن باسن، چادریں اور کھٹولے ملتے تھے۔ گرم پانی کے حوض بھی پکّے سے بنے ہوئے تھے لیکن اگر وہاں جاپان کی طرح حوضوں کے اوپر چھت اور دیواریں بھی ہوتیں تو لُو کے جھکڑوں سے بچاؤ ہو جاتا۔ جاپان میں تو مرد عورتیں ایک ہی چھوٹے سے گرم تالاب میں بالکل ننگے ہو کر اکٹھے اشنان کرتے ہیں مگر منگھوپیر میں یہ لطف میسر نہ تھا۔ عورتوں کے لیے اونچی دیواروں کے اُس طرف ایک کشتی علیحدہ تھی۔ حوض میں آگ کی طرح اُبلتا ہوا پانی، اوپر جلاتا ہوا سورج، اور جھلساتی ہوئی گرم ہوا۔ غشی طاری ہو جاتی اور سر چکرانے لگتا۔ تب ہم دو چار دوستوں نے آپس میں صلاح کی تھی کہ اوپر چھپر اور نیچے ٹائل کا فرش اور سیڑھیاں لگوا دی جائیں مگر بٹوارے کی اکھاڑ پچھاڑ میں اس منصوبے پر عمل نہ ہو سکا۔

منگھوپیر میں ایک کھڈ میں دس بارہ مگرمچھ آنکھیں موندے پڑے رہا کرتے مگر جب کوئی بکرا ان کی طرف اچھالا جاتا تو ذرا دیر میں اسے چیر پھاڑ کر نگل جاتے۔ ان میں ایک سردار مگرمچھ تھا، کسی بھی کھاج کا پہلا لقمہ وہی لیتا تھا اور باقی دوسروں میں بانٹ دیتا تھا۔ وہاں کھجور کے بہت سے پیڑ تھے اور پاس رہنے والی مکرانی عورتیں ایک آنے میں جھولی بھر دیا کرتی تھیں۔

کراچی سے ریل کے ذریعے روانہ ہوں تو قریب ۱۵ میل بعد لانڈھی کا اسٹیشن آتا تھا۔ وہاں نہر کے دوسری طرف ملیر کا گاؤں تھا جہاں بہت سے کنویں اور باغ باغیچے تھے۔ کراچی کے لیے دودھ اور ترکاریاں وہیں سے آتی تھیں۔ لانڈھی میں کھجور کے پیڑوں تلے شاہ پیر کی تربت تھی جس کے سالانہ عرس پر اکثر مکرانی آتے تھے۔ ملیر میں ساہوکاروں کے باغ اور بنگلے تھے جہاں ہم کثرت سمیت سیر کرنے جایا کرتے تھے، مگر سب سے زیادہ موج سائیں مولرام کے ٹھکانے میں ہوتی تھی۔ وہاں ہر اتوار کو

عہد، لنگر لگتا تھا۔ سوامی سولرام گلاداس پسند کے تھے جس کا مت صوفیوں جیسا ہے مگر تن کو کسی تکلیف میں رکھنا یا کسی شے سے پرہیز کرنا اس کے اصولوں میں نہیں۔ بڑے بڑے عملدار اور ساہوکار بھائی سولرام کو اپنا ست گرو اور مرشد مانتے تھے۔

سوامی سولرام خود اونچا بادشاہی ٹوپ پہنے، ایک شاہانہ پلنگ پر ریشمی گدیلا بچھائے اور گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے ہوتے اور ان کے دربار میں کنجریاں ناچتی گاتی تھیں۔ ہمارے استاد مبارک علی خان کے علاوہ اور بھی گویے وہاں آ کر گاتے تھے۔ پنجاب اور لکھنؤ کی مشہور طوائفوں کے مجرے بھی ہوتے تھے۔ سندھ کی مشہور گائیکاؤں موتی جان، اللہ جیوائی، اللہ رکھی کو میں نے سب سے پہلے وہیں سنا۔ حسین حیاتاں جب مجرے کے ساتھ تالیاں بجا بجا کر ٹھمری یا قوالی گاتی تو محفل میں واہ واہ کا شور اٹھتا۔ آج کل ایسی قوالیاں اور غزلیں سننے کے لیے آدمی سو پچاس روپے بھی خرچ کر ڈالتا ہے مگر کہنا پڑتا ہے کہ مائی حیاتاں اس سے دو قدم آگے تھی۔ ایک تو آواز اتنی میٹھی تھی جیسے شہد کا آبشار بہہ رہا ہو، اور پھر سندھ کی سمیتا کہ ایسا لطف نعمت میں ملتا تھا۔

کراچی سے چونسٹھ میل شمال مغرب کی سمت، لس بیلہ میں ہنگول ندی کے کنارے ایک بڑی سی گپھا میں سب سے بڑا تیرتھ استھان تھا ہنگلاج، جس کا ذکر قدیم سندھ شاستروں میں آیا ہے۔ وہاں آدجگاد سے اگنی کی لاٹ جیوتی نکلا کرتی تھی۔ سنسکرت گرنتھوں میں یہ کتھا اس طرح آئی ہے شنکر بھگوان کی پہلی پتنی ستی نے جب اپنے باپ دکھیا پرجاپتی کے یگیہ میں اپنے پتی کی برائی سنی تو وہیں اپنے شریر کو جلا ڈالا۔ شنکر مہادیو ستی سے بے حد پیار کرتے تھے۔ وہ ان کے جلے ہوئے شریر کو کندھے پر اٹھا کر ناچنے لگے۔ ان کی ایسی اکھڑی ہوئی حالت دیکھ کر انہیں سکون دینے کے لیے وشنو بھگوان نے اپنے سُدرشن چکر سے ستی کے شریر کے باون ٹکڑے کر کے بکھیر دیے۔ یہ باون ٹکڑے بھارت کے جس جس مقام پر گرے وہاں شکتی پیٹھ کے استھان بن گئے۔ ہنگلاج میں ستی کے منہ کا ٹکڑا گرا اور وہاں جو مورتی پیدا ہوئی اسے کوٹری کہتے ہیں اور اس کے بھیرو کا نام بھیم لوچن ہے۔

ہنگلاج کی یاترا بہت مشکل ہے کیوں کہ راستے میں پہاڑیاں اور ریگستان ہے جہاں پانی نہیں ملتا۔ اس کے باوجود ہزاروں سال سے بھارت کے دور دور کے علاقوں سے یاتری وہاں زیارت کرنے جاتے ہیں۔ وہاں مشہور یوگیوں گورکھ ناتھ، مچھندر ناتھ، گوپی چند اور دوسروں نے سادھنا کر کے سدھی حاصل کی، سدھی کا مطلب ہے جیسی طاقت، یعنی ہوا میں اڑنے، پہاڑ کی طرح بلند ہو جانے، کوئی بھی شکل صورت اختیار کر لینے یا غائب ہو جانے کی طاقت، یا دوسری سری صفتیں۔ شاہ کے رسالے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب نے بھی یوگیوں کے ساتھ اس سدھ پیٹھ کی زیارت کی تھی۔ کہتے ہیں کہ اس کے بعد اُن میں وائی کی پراسرار شکتی آ گئی تھی یعنی وہ جو کہتے تھے ہو جاتا تھا اور ان کے بولوں میں عجب اثر اور سدا حیات کیفیت پیدا ہو گئی۔ اس بات کی حقیقت کچھ بھی ہو، شاہ صاحب نے اپنے کلام میں ہنگلاج کے یوگیوں کی

بہت مہما گائی ہے۔ جو یاتری وہاں جاتے ہیں وہ گیروا لباس پہن کر جاتے ہیں۔ شاہ صاحب نے جو گیرو کفنی پہنی تھی وہ ان کی درگاہ پر اب بھی رکھی ہے۔

ہنگلاج کے یاتری پہلی منزل حب ندی پر کرتے تھے۔ وہاں تک سڑک بنی ہوئی ہے۔ میں ۱۹۳۵ میں دوستوں کے ساتھ موٹر پر حب ندی پر گیا تھا۔ وہاں ندی کنارے میں نے بہت سے مگرمچھ دیکھے جن پر بندوق کی گولی کا بھی کچھ اثر نہ ہوتا تھا۔ دوسرے وہاں روھیں نامی پہاڑی سرن میں جو انسانوں اور مگرمچھوں کے ڈر سے صرف رات کے وقت پانی پینے آتے ہیں۔ یاتری دوسری منزل بھوانی کے کنویں پر کرتے ہیں جہاں دھرم شالا ہے مگر بھوانی دیوی کا مندر کسی نے توڑ ڈالا ہے۔ تیسری منزل ہے ریدولک جہاں سے سمندر کی لہریں دکھائی دیتی ہیں اور نظارہ بڑا کت بھرا ہے۔ ریدولک کے قریب کچھ کنویں ہیں جنھیں سیتاماتا کے کنویں کہتے ہیں۔ یہ کچے کنویں ہیں لیکن لوگ تھوڑا سا کھودتے ہیں تو میٹھا پانی نکلتا ہے۔

سیتاماتا کے کنووں کے بعد سومیانی بندر ہے جو کبھی بھراپُرا تھا مگر اب وہاں صرف کچھ موہانوں کے مکان ہیں اور ہندو سب جا چکے ہیں۔ یہ بندر کراچی سے چوبیس کوس دور ہے۔ اس سے چار کوس پر چندر کوپ کے کنویں ہیں جو کسی انسان کے کھودے ہوئے نہیں۔ ان کی بابت کیپٹن ہارٹ نے سومیانی بندر کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مکران اور بلوچستان کے باشندے انھیں راجا رام چندر کے کنویں کہتے ہیں۔ رامائن کے مطابق شری رام میں اتنی شکتی تھی کہ ان کے ایک تیر سے کھجور کے سات پیڑ کٹ گئے اور پہاڑ پھٹ گیا۔ ممکن ہے کہ ہنگلاج کے یاتریوں کے آرام کے لیے انھوں نے تیروں سے پہاڑوں کو چیر کر یہ کنویں پیدا کیے ہوں۔

ہنگول ندی بلوچستان کی سب سے بڑی ندی ہے۔ اس سے پہلے اگھور ندی دو پہاڑوں کے بیچ سے بہتی ہے جن کے نام ہے اور وہے ہیں۔ یہ دونوں وشنو بھگوان کے دربان تھے جنھیں پرانے رشیوں نے سراپ دیا تھا۔ وہاں آشاپور نامی استھان پر کالی دیوی کا مندر ہے اور اس سے ڈیڑھ کوس کے فاصلے پر ناری پہاڑ کی ایک گپھا میں ہنگلاج دیوی کی سوئی ہوئی مورتی ہے۔ اس مورتی پر ہنگلو (سیندور) لگا ہوا ہے اور یاتری دودھ چڑھاتے ہیں۔ یہ غار اتنا کشادہ ہے کہ اس میں تین چار سو یاتری رہ سکتے ہیں۔

اس مندر کے نزدیک ایک تالاب میں اشنان کر کے اور کورا کپڑا باندھ کر یاتری دیوی کا درشن کرتے ہیں۔ دیوی کی بڑی گپھا کے ساتھ ہی دوسری چھوٹی گپھائیں ہیں جہاں یوگی سادھنا کرتے ہیں۔ کسی زمانے میں بھارت کا مغربی کنارہ تھا مگر اب تو صدیوں سے مسلم ریاست لس بیلہ میں ہے اور وہاں کا مجاور بھی مسلمان ہے۔ ہندو اس دیو کو اسا (اما) کہتے ہیں مگر جب سکندر اعظم سندھ سے واپس جاتے ہوئے وہاں سے گزرا تھا تو اس کے تاریخ نویسوں نے اسے سی کا مندر لکھا، اور اب مسلمان بھی اسے نانی کہتے ہیں۔ سنسکرت میں سی کے معنی ہیں ماں؛ مگر عام زبان میں نانی کا مطلب ہے ماں کی ماں۔ سندھ میں جو قدیم کھنڈر موئن جو دڑو، کوٹ ڈیجی، چانہو جو دڑو وغیرہ کھودے گئے وہاں سے بھگوتی دیوی اور اس

کے پتی کی سواری کے جانور کے پتلے نکلے جو ظاہر کرتے ہیں کہ شروع میں سندھ میں دیوی ماتا کی پوجا زوروں پر تھی۔ اس طرح ہنگلاج کا دیوی مندر ہزاروں برس پرانا ہے۔ ہمارے زمانے میں نیپال، آسام، کشمیر، بنگال وغیرہ پرگنوں سے یاتری کراچی محض ہنگلاج جانے کی غرض سے آیا کرتے تھے اور بھارتی سیات کے رہنموں کی رہنمائی میں قافلہ بنا کر وہاں جاتے تھے۔

**

سہراب کٹرک

انگریزی سے ترجمہ، تلخیص اور تدوین اجمل کمال

برطانوی سندھ کا صدر مقام

سندھ پر انگریزوں کے قبضے کے بعد سر چارلس نیپیئر نے حیدرآباد کو صدر مقام بنایا کیوں کہ وہاں کلہوڑوں کا بنوایا ہوا ایک عمدہ قلعہ موجود تھا، جو اب تک حیدرآباد کے موجودہ ریلوے اسٹیشن سے آدھ میل دور اچھی حالت میں قائم ہے۔ لیکن حیدرآباد شہر کا موسم نیپیئر کو بہت زیادہ گرم محسوس ہوا، اور یہ مقام برطانوی سپاہیوں کے لیے گرمیوں کے موسم میں ناقابلِ برداشت ہو جاتا تھا۔ اُن دنوں برطانوی فوج میں رچرڈ برٹن نامی ایک کیپٹن تھا جسے نیپیئر نے کراچی جا کر رپورٹ تیار کرنے کی ہدایت کی کہ آیا وہ رہنے کے لیے حیدرآباد سے بہتر مقام ہو گا۔

جملہ معترضہ کے طور پر، رچرڈ برٹن، جسے بعد میں نائٹ بنایا گیا، آکسفورڈ سے تعلق رکھنے والا ایک نہایت مشہور انگریزی اسکالر تھا جو اٹھائیس زبانیں جانتا تھا اور جس نے کوئی چالیس کتابیں لکھیں۔ وہ نہ صرف بنیادی زبانوں، لاطینی، یونانی، روسی، فارسی، عربی، سنسکرت وغیرہ سے واقف تھا بلکہ سنسکرت سے نکلنے والی بہت سی زبانیں، مثلاً گجراتی، مراٹھی، بنگالی وغیرہ، بھی بہت اچھی جانتا تھا۔ کیپٹن رچرڈ برٹن کے بارے میں جاننے کی ایک اور دل چسپ بات یہ ہے کہ وہ کسی بھی زبان پر مکمل عبور حاصل کرنے کا قائل تھا۔ اس کے سوانح نگار نے لکھا ہے کہ مشرقی زبانوں کے حصول کے لیے وہ مزدور طبقے کی دو عورتوں کو روزانہ معاوضے پر ملازم رکھ لیتا جن کا کام صرف یہ ہوتا کہ وہ اُس کے سامنے بیٹھ کر آپس میں باتیں کیا کریں۔ اس طرح وہ کسی زبان کا درست لہجہ سیکھ لیتا؛ اس نے اٹھائیس زبانوں میں مہارت اسی طرح حاصل کی۔

کراچی کے تعلق سے برٹن کی زندگی کا ایک دل چسپ واقعہ اُس وقت پیش آیا جب نیپیئر نے اسے کراچی کا جائزہ لے کر یہاں کے موسم اور دیگر حالات کے بارے میں رپورٹ دینے کو کہا، تاکہ وہ صدر مقام کو یہاں منتقل کرنے کی بات فیصلہ کر سکے۔ برٹن اس سفر پر، ایک ماتحت نوجوان کے ساتھ، گھوڑے پر سوار ہو کر روانہ ہوا۔ انھیں کراچی پہنچنے میں دس دن لگے۔ یہاں اپنے کام کے دوران ایک دن برٹن نے اپنے ماتحت سے، جو سترہ اٹھارہ برس کا انگریز نوجوان تھا، شہر کی سیر کو چلنے کے لیے کہا۔ اس

مقام کے آس پاس رہنے والے لوگ اسے منگھوپیر کہتے ہیں۔ مگر کے معنی مگرمچھ کے ہیں، اور ان مگرمچھوں کی دیکھ بھال کرنے والا شخص پیر کہلاتا تھا (اور اب تک کہلاتا ہے۔) اُن دنوں تالاب کے گرد دیوار نہیں تھی، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ مگرمچھ آزاد تھے اور سارے میں گھومتے پھرتے تھے۔ رات میں کئی مسافر ان کے ہاتھوں زخمی ہو جاتے، اور کبھی کبھی کوئی مارا بھی جاتا۔ اس وجہ سے بعد میں سر چارلس نیپیئر نے تالاب کے گرد دیوار بنانے اور مگرمچھوں کو باہر نہ نکلنے دینے کا حکم دیا جس سے راہ گیروں کی جان محفوظ ہو گئی۔

اُس دن جب رٹن اپنے نوجوان ماتحت کے ساتھ مگرپیر کے قریب پہنچا تو اسے کچھ فاصلے سے مگرمچھ ایک قطار کی صورت میں یوں پڑے دکھائی دیے کہ ایک کی ناک دوسرے کی دُم کو چھو رہی تھی اور ان کے ملنے سے ایک پُل سا بن گیا تھا۔ محض دل لگی کی خاطر رٹن نے نوجوان سے کہا کہ اگر وہ ان پر چڑھ کر کودے تو اسے دس پاونڈ ملیں گے۔ ناتجربہ کار نوجوان فوراً اپنے گھوڑے کی پیٹھ پر سے اترا اور ان بدہیئت جانوروں پر چڑھ کر کودنے لگا۔ جب تک وہ دوسری طرف پہنچا، اس کی پتلون اور جوتے پھٹ چکے تھے، درحقیقت وہ مگرمچھوں کا نوالہ بننے سے بال بال بچا تھا۔ بہرحال اس نے شرط جیت لی۔ مگر رٹن اتنی آسانی سے دس پاونڈ دینے پر رضامند نہ تھا۔ اس نے نوجوان سے ایک اور شرط لگائی اور کہا کہ اس رقم کے عوض وہ ایک مگرمچھ کی پیٹھ پر سوار ہو کر بدبودار گندھک کے پانی سے بھرے تالاب کا چکر لگانے کو تیار ہے۔ جب نوجوان نے یہ شرط تسلیم کر لی تو رٹن نے بازار سے، جو مگرمچھوں سے چند گز کے فاصلے پر واقع تھا، ایک لمبا بانس اور ایک زندہ مرغی خریدی اور مرغی کو بانس کے ایک سرے پر باندھ دیا تاکہ وہ مگرمچھ کی آنکھوں کے آگے پھڑپھڑاتی رہے۔ پھر وہ قریب ترین مگرمچھ کے پاس گیا اور بانس کا دوسرا سرا اس کے کھلے ہوئے جبڑوں میں ٹھونس دیا اور ساتھ ہی کود کر اس کی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔ مگرمچھ نے مرغی کو جبڑوں میں لینے کی بار بار کوشش کی، لیکن ہر کوشش کے ساتھ وہ تالاب میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ رٹن نے تالاب کا چکر پورا کر لیا اور مرغی مگرمچھ کے منھ میں نہ آئی۔ اس طرح رٹن نے اپنی ہاری ہوئی شرط جیت لی۔

رٹن کی رپورٹ ملنے پر کہ کراچی ساحل پر واقع مچھیروں کی بستی ہے جہاں جو یہاں کا موسم حیدرآباد کی نسبت معتدل ہے، اور یہ یہاں سے سمندر کے راستے خلیج فارس کے ساتھ تجارت کا بھی امکان ہے، سر چارلس نیپیئر نے صدر مقام کراچی منتقل کر لیا۔ جب نیپیئر کراچی آیا تو ایک چھوٹے سے بنگلے میں رہائش اختیار کی جسے بعد میں منسٹر ہاوس کہا جانے لگا تھا اور تقسیمِ ملک کے بعد مکمل طور پر گرا کر اس کی جگہ موجودہ عمارت تعمیر کی گئی جسے اب ایوانِ صدر کہا جاتا ہے۔ اسی موجودہ عمارت میں پاکستان کے صوبہ سندھ کے پہلے گورنر، سر لینسلاٹ گراہم کی رہائش تھی۔

۱۸۴۷ میں نیپیئر نے یوروپی فوج کے لیے بیرکیں بنوائی تھیں جنھیں اب تک نیپیئر بیرکس کہا جاتا ہے۔ وہاں اب کئی سرکاری دفتر قائم ہیں۔ ان بیرکوں کو انجینئرنگ کی اتنی مہارت کے ساتھ

تعمیر کیا گیا تھا کہ آج تک اس کا ایک پتھر اپنی جگہ سے نہیں سرکا ہے، اور نہ اس سادہ مگر مضبوط اور بارعب عمارتوں کو کسی بڑی مرمت کی ضرورت پیش آئی ہے۔

نیپیئر ۱۸۴۷ میں سندھ سے انگلستان واپس چلا گیا۔ اُس وقت کراچی کی آبادی بمشکل پچاس ہزار تھی اور تجارت مجموعی طور پر نہایت محدود تھی۔ لیکن اُن دنوں پنجاب میں غلہ بڑی مقدار میں پیدا ہوتا تھا جسے کچھ یورپی فرموں، رالی برادرز، سینڈا پیٹرک وغیرہ نے کراچی سے بیرونِ ملک برآمد کرنا شروع کیا۔ اس طرح کراچی ایک اہم برآمداتی شہر کی حیثیت سے ترقی کرنے لگا۔ اُس زمانے کی تجارتی فرموں میں، جو بیشتر یورپی تھیں، صرف دو ہندوستانی نام ملتے ہیں ایس طیب جی اینڈ کمپنی اور اردیشر اینڈ کمپنی، لیکن ان کے وجود اور اہمیت کی کوئی تفصیل دستیاب نہیں۔

گیہوں اور کسی قدر چاول کی تمام تر برآمدی تجارت اُس زمانے کی یورپی فرموں کے ہاتھ میں تھی جنھوں نے اپنے مفادات کی حفاظت کے لیے ۱۸۶۰ میں کراچی چیمبر آف کامرس کی بنیاد ڈالی۔ چیمبر کی اہمیت رفتہ رفتہ بڑھتی گئی اور اسے حکومت سندھ میں خاصا اثرورسوخ حاصل ہو گیا۔ وُڈ اسٹریٹ کا وہ قطعۂ زمین جس پر موجودہ ایوانِ صنعت و تجارت کراچی کی عمارت واقع ہے، حکومت نے ۱۸۶۳ میں دائمی پٹے پر دیا تھا۔ اس کی اصل عمارت کچھ ارکان کے چندے اور کچھ قرض سے تعمیر کی گئی تھی۔ اس کا افتتاح ۳۰ مارچ ۱۸۶۵ کو ہوا تھا۔ برآمدی تجارت پر یورپی تاجروں کی بالادستی کم از کم تیس برس قائم رہی، مگر پھر ہندوستانی تاجر بھی اس میدان میں داخل ہوئے اور سندھیا اسٹیم نیوی گیشن کمپنی کے نسبتاً چھوٹے اسٹیمروں کے ذریعے مال بیرونِ ملک بھیجنے لگے۔

۴-۱۸۴۳ میں کراچی کی برآمدی تجارت کی کل مالیت ایک لاکھ بائیس ہزار پاؤنڈ کے لگ بھگ تھی۔ دس سال بعد یہ مالیت بڑھ کر آٹھ لاکھ پچاسی ہزار پاؤنڈ سے تجاوز کر گئی اور ۱۸۶۰ میں ستائیس لاکھ پاؤنڈ کے قریب جا پہنچی۔ پانچ برس بعد، ۶-۱۸۶۵ میں، بندرگاہ سے بھیجے جانے والے سامان کی مالیت ۴۸ لاکھ پاؤنڈ سے زیادہ ہو چکی تھی۔ ۲-۱۸۸۱ میں، اُس وقت کی شرحِ تبادلہ کے مطابق، ساٹھ لاکھ پاؤنڈ اور بیسویں صدی کے آغاز پر ایک کروڑ پاؤنڈ سے زیادہ کا سامان برآمد کیا گیا۔ جنوری سے دسمبر ۱۹۶۰ تک ایک سال میں برآمد کیے جانے سامان کی مالیت، موجودہ شرحِ تبادلہ کے مطابق، تیرہ کروڑ پاؤنڈ سے زیادہ بنتی ہے۔

کراچی انڈین مرچنٹس ایسوسی ایشن، جو ۱۹۰۲ میں قائم ہوئی، صوبے میں ہندوستانی تاجروں کی سب سے قدیم انجمن ہے۔ ۱۹۱۳ میں اس ایسوسی ایشن کو کراچی میونسپلٹی میں اپنے دو نمائندے نامزد کرنے کا قانونی اختیار حاصل ہو گیا۔ ۱۹۲۵ میں، ایسوسی ایشن کے دعوے کے نتیجے میں، کراچی پورٹ ٹرسٹ ایکٹ میں ترمیم کر کے ہندوستانی تاجر برادری کے منتخب نمائندوں کی گنجائش پیدا کی گئی اور دو نشستیں ایسوسی ایشن کو حاصل ہوئیں۔

زرعی اجناس اور کپاس کی مارکیٹیں ایک عام سڑک پر واقع تھیں جہاں سیکڑوں بیوپاری جمع ہو کر سر راہ

لاکھوں روپے کا کاروبار کیا کرے۔ ۱۹۳۰ میں اسی مقام پر، جو شہر کے تجارتی علاقے کے وسط میں، ہندوستانی اور غیر ملکی کمپنیوں کے دفاتر اور بینکوں کے نزدیک ہے، ۱۵۰۰ مربع گز کا قطعہ حاصل کرنے کی باقاعدہ کوشش کی گئی لیکن مذاکرات ناکامیاب رہے۔ ۱۹۳۳ میں موجودہ جگہ ستائیس روپے فی مربع گز کے حساب سے خریدی گئی۔ ایک سال بعد، ۸ جولائی ۱۹۳۵ کو، مہاتما گاندھی نے عمارت کا سنگ بنیاد رکھا۔ اٹھارہ ماہ بعد عمارت بن کر تیار ہوئی اور اس کا افتتاح ۲۸ فروری ۱۹۳۶ کو کراچی انڈین مرچنٹس ایسوسی ایشن کے صدر راؤ بہادر سیٹھ شورتن موہٹا نے کیا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کراچی کے ہندوستانی تاجر اسی اہمیت منواتے گئے۔ بعد میں انھوں نے انڈین مرچنٹس چیمبر قائم کیا جس نے مسلسل کوشش کے نتیجے میں بمبئی کی لیجسلیٹو اسمبلی میں ایک نشست حاصل کی جو بمبئی پریزیڈنسی کے گورنر کی زیر ہدایت کراچی کا انتظام چلاتی تھی۔ گورنر کراچی میں مقیم کمشنر کے ذریعے سندھ پر حکومت کرتا تھا۔

نیپیئر کے بعد بی ای فریئر سندھ کا کمشنر بنا، جسے بعد میں سر بارٹل فریئر کے نام سے بمبئی کے گورنر کا عہدہ حاصل ہوا۔ فریئر نے پہلی بار کراچی کے غلیظ شہر کی حالت کو بہتر بنانے کا ارادہ کیا اور کراچی میونسپلٹی کی بنیاد رکھی۔ ایسی ہی میونسپلٹی وہ بمبئی پریزیڈنسی کے ایک اور شہر احمد آباد میں بھی قائم کر چکا تھا۔ فریئر نے ایک سینیٹری کمیٹی بنا کر میونسپلٹی کا آغاز کیا جس میں کیپٹن پریڈی (ریونیو کلکٹر)، جان میکلوڈ (کلکٹر کسٹم، جس کے نام پر کراچی کے میکلوڈ روڈ کا نام رکھا گیا) اور سیٹھ ناؤں مل ہوت چند شامل تھے۔ سیٹھ ناؤں مل کی مشہور یادداشتیں موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لیے سندھ، اس کے قدیم حکمرانوں اور انگریزوں کی فتح سندھ کے بارے میں معلومات کا بڑا ذخیرہ رکھتی ہیں۔

سندھ کی احسان شناس پبلک نے ۱۸۶۵ میں سر بارٹل فریئر کے اعزاز میں ایک شاندار یادگار تعمیر کی جسے فریئر ہال کہا جاتا ہے اور جو آج بھی کراچی کی سب سے زیادہ نفیس، خوب صورت اور دلکش عمارت ہے۔

۱۸۶۰ میں وہ قطعہ زمین جس پر اب سندھ مدرسۃ الاسلام کی عمارت قائم ہے، قافلہ سرائے تھا۔ اور اگرچہ سینٹ اینڈریو چرچ اور گرامر اسکول اسی جگہ واقع تھے جہاں آج ہیں، موجودہ کراچی جمخانہ گراؤنڈ میں لیڈیز کلب ہوا کرتا تھا۔

۱۸۹۲ میں کراچی کی آبادی بڑھ کر ساٹھ ہزار ہو چکی تھی، اور ۱۹۴۵ میں تین لاکھ تک جا پہنچی تھی۔ ۱۸۷۴ تک، شہر صرف ان علاقوں پر مشتمل تھا جنھیں نیٹو ٹاؤن کہا جاتا تھا جس کے مراکز میں کھارادر، میٹھادر، صدر کوارٹر اور کنٹونمنٹ سے متصل سول لائنز شامل تھے۔

اُس زمانے کی برآمدات میں سونا، غلہ، کپاس، اُون اور قلمی شورہ شامل تھے جبکہ درآمدات مصنوعات، مثلاً سوتی کپڑے، دھاتوں، ریشم، صاف شکر وغیرہ پر مشتمل تھیں۔ اون لیاری کے علاقے میں رنگی جاتی اور سونے کا بیل تاجروں کے کارخانوں میں میکلوڈ روڈ پر نکالا جاتا تھا۔

۱۸۵۶ تک کراچی بار بردار جہازوں کے لنگر انداز ہونے کی جگہ موجودہ ہیڈ جیٹی کے قریب تھی جہاں سامان اتارا اور چڑھایا جاتا تھا۔ ۱۸۸۷ میں کراچی پورٹ ٹرسٹ قائم ہوا جس کے بورڈ آف ٹرسٹیز میں دو نشستیں چیمبر آف کامرس کے لیے رکھی گئیں۔ چیمبر کے پہلے نامور ارکان بینک آف بمبئی کے جیمز گرانٹ اور وولکارٹ برادرز کے آوگی تھول تھے۔ چیمبر کے معاملات میں موخرالذکر صاحب کی فعال سرگرمی کے اعتراف کے طور پر کوسر روڈ پر واقع کراچی کے برآمدی یارڈ کا نام ان کے نام پر تھول پروڈیوس یارڈ رکھا گیا (جو اَب تک یہی کہلاتا ہے)۔

یہاں مجھے یہ بات بھی کہہ دینی چاہیے کہ پہلی جنگ عظیم کے دوران، کراچی میں آوگی تھول کے اثر ورسوخ کے باوجود، پیدائشی طور پر جرمن نژاد ہونے کے باعث انہیں بے دخل کر کے جرمنی بھجوا دیا گیا تھا۔

۱۸۹۹ تک کراچی کو غلے کی برآمد کے لحاظ سے سب سے بڑی مشرقی بندرگاہ کی حیثیت حاصل ہو چکی تھی۔

کراچی کی یادگاری عمارتوں میں عالی شان میری ویدر ٹاور بھی شامل ہے جو کیماڑی ڈاکس سے ڈھائی میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اسے ۷-۱۸۸۶ میں احسان مند شہریوں نے تعمیر کرایا تھا۔ اسے کمشنر سندھ میری ویدر کی یاد میں اُس وقت کے میونسپل کمشنر جیمز اسٹریچن نے تیار کیا تھا۔

بونس روڈ پر موجودہ ام بیکن میتھوڈسٹ گرلز اسکول کے قریب ہولی ٹرینیٹی چرچ کی عمارت ہے جسے ۱۸۵۵ میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کا سنگ بنیاد ۹ ستمبر ۱۸۵۲ کو کمشنر سندھ بارٹل فریئر نے رکھا تھا۔ چرچ کی عمارت اتنی بلند تھی کہ کسی طوفان کی صورت میں اس کے گر پڑنے کا خطرہ محسوس کیا گیا۔ اس لیے، لاہور کے بشپ کے مشورے پر، اب سے کوئی تیس برس پہلے اس کی دو بالائی منزلیں ڈھا دی گئی تھیں۔

شہر میں واقع بولٹن مارکیٹ کو ۱۸۸۳ میں کراچی کے میونسپل کمشنر بولٹن کی شہر کے لیے خدمات کے اعتراف میں تعمیر کیا گیا تھا۔

وکٹوریہ روڈ پر موجودہ پیراڈائز سینما کے مقام سے لے کر برنس گارڈن تک ایک قلعہ تھا جہاں برطانوی توپ خانہ اور دیگر اسلحہ رکھا جاتا تھا۔ ہر صبح پندرہ سے بیس توپیں، جن میں سے ہر ایک کو چھ گھوڑے کھینچتے تھے، مشق کے لیے باہر نکالی جاتی تھیں۔ توپوں کے سر کیے جانے کی دھمک کبھی کبھی سڑک پر اتنی زبردست ہوتی تھی کہ ارد گرد کے مکان اپنی بنیادوں تک ہل جاتے تھے۔ ان میں ہمارا مکان بھی شامل تھا جو وکٹوریہ روڈ پر موجودہ کٹرک بلڈنگ کے مقام پر تھا۔ دھماکوں سے کئی بار دروازوں اور کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ جایا کرتے۔

سندھ پر سر چارلس نیپیئر یا میروں کی حکمرانی سے بہت پہلے ڈاک تمام سمندری بندرگاہوں، مثلاً

بمبئی، پور سدر، کچھ، کراچی وغیرہ، تک بحری راستے سے پہنچا کرتی تھی۔ اُن دنوں ڈاک کے خاص طرح کے ٹکٹ استعمال کیے جاتے تھے۔ جب کسی خط کو اندرونِ سندھ کسی مقام پر پہنچانا مقصود ہوتا تو خاص قاصد چالیس میل کے فاصلے تک پیدل جایا کرتا اور اسے صرف چھ آنے ملتے تھے۔

پروفیسر ڈاکٹر ایڈرین ڈوارٹ نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے ۱۸۵۴ میں پوسٹ آفس کے موجودہ صورت میں قائم ہونے سے پہلے ڈاک کسی بھی دوسری تجارتی شے کی طرح پبلک کو فروخت کی جاتی تھی، یعنی نقد ادائیگی کے عوض دی جاتی تھی۔ ادائیگی ڈاک وصول کرنے والے کو کرنی ہوتی تھی، اور اس کا نرخ پیکٹ کے وزن اور سفر کے طول پر منحصر ہوتا تھا۔

۱۸۶۰ میں یوروپ سے آنے والی ڈاک بحری راستے سے بمبئی پہنچا کرتی تھی جس میں سے سندھ اور پنجاب کی ڈاک اسٹیمروں کے ذریعے کراچی بھیجی جاتی جنھیں ۴۹۰ میل کا فاصلہ طے کرنے میں، موسم کے لحاظ سے، تین سے پانچ دن تک لگتے تھے۔ ۱۸۶۸ میں کراچی اور بمبئی کے درمیان سمندری ڈاک کی سروس ہفتہ وار ہو چکی تھی۔ لیکن مون سون کے دنوں میں کراچی آنے والی ڈاک کچھ اور حیدر آباد سے ہو کر پہنچتی تھی۔ اُن دنوں کراچی سے ٹیلیگرام کے بمبئی پہنچنے میں ایک ہفتہ لگ جانا عام بات تھی۔

۱۸۸۱ میں انگریزوں کے زیرِ انتظام پورے برصغیر میں سرکاری دفتروں کے لیے مدراس کے وقت کی پابندی لازمی قرار دے دی گئی تھی، مگر عجیب بات ہے کہ کراچی میں عام اور پیشہ ور لوگ مقامی وقت استعمال کرتے جبکہ ریلوے، ڈاک خانوں، کسٹم اور وہارف کے کلاک مدراس کا وقت دکھایا کرتے۔ یہ معیاری وقت مشہور لارڈ کرزن نے نافذ کیا تھا۔ اگرچہ بمبئی کارپوریشن نے شیرِ بمبئی سر فیروز شاہ مہتا کی قیادت میں اس کی زبردست مخالفت کی، آخر کار معقولیت کی فتح ہوئی اور تمام ہندوستان کا معیاری وقت ایک ہو گیا۔ اس کی ضرورت اس لیے پیش آئی تھی کہ کسی یکساں وقت کی غیر موجودگی میں ریل گاڑیوں اور اسٹیمروں کے مسافروں کو سخت دقت پیش آتی تھی۔

پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴) سے کچھ پہلے تک ہماری ٹرام کاریں گھوڑے کھینچتے تھے۔ چھوٹی ٹرام میں ایک اور دو سرلہ ٹرام میں دو گھوڑے جُتے ہوتے تھے۔ گھوڑوں کو دھوپ سے بچانے کے لیے بڑے بڑے سولا ہیٹ پہنائے جاتے تھے۔ کیماڑی تک جانے اور واپس آنے کے دوران ہر دو میل پر گھوڑے تبدیل کیے جاتے تھے، اور سولجر بازار سے کیماڑی تک کا تقریباً پانچ میل کا سفر ایک آنے سے کم میں طے ہو جاتا تھا۔

برٹش انڈیا اسٹیم نیویگیشن کمپنی عرشے کے مسافروں سے کراچی سے بمبئی تک کا کرایہ پانچ روپے لیتی تھی۔ اس کی مسابقت میں حاجی قاسم اسٹیمر کمپنی کرایہ آدھا کر دیتی تھی، بلکہ مسافروں کو مائل کرنے کے لیے فی کس ایک ریشمی رومال بھی دیا کرتی تھی۔

اُن دنوں جب اسٹیمر بابر اور منوڑا کے قلعے کے درمیان آ کر لنگر انداز ہوتا تو عملے کو کھانا وغیرہ سپلائی کرنے والے دو بھاشیوں کے درمیان حوب دوڑ لگتی تھی۔ (دو بھاشی کا مطلب ہے دو زبانیں

بولنے والے، یعنی یہ وہ لوگ تھے جو اسٹیمر کے عملے کی زبان بھی جانتے تھے اور ان سے بات چیت کر سکتے تھے۔) انھیں تیزی سے کشتی کھیتے ہوئے اسٹیمر کی طرف جاتے دیکھنا ایک دل چسپ نظارہ ہوتا تھا کیوں کہ جو شخص کپتان تک سب سے پہلے پہنچتا عموماً ٹھیکا اُسی کو مل جاتا تھا۔ لیکن جب ان میں سے ایک نے پہلی اسٹیم لانچ خریدلی تو مقابلے کا سوال ہی نہ رہا۔

۱۸-۱۹۱۴ کی پہلی جنگ عظیم کے دنوں میں کراچی کی معیشت کو بہت فائدہ ہوا۔ درحقیقت بصرہ فوجی اڈا اور کراچی ہندوستان کی کرایے کی دکان بن گیا اور جنگ کے علاقے میں برطانوی اور اتحادی فوجوں کو خوراک اور اسلحہ سپلائی کرنے لگا۔ خطیر آمدنی کا یہ ذریعہ ملنے سے شہر کی تجوریاں بھر گئیں، اور نئی نئی عمارتیں نمودار ہونے لگیں جن میں میکلوڈ روڈ پر امپیریل بینک آف انڈیا (موجودہ اسٹیٹ بینک آف انڈیا)، لائیڈ بینک وغیرہ شامل ہیں۔

کراچی کی ترقی کے سلسلے میں جمشید نسروانجی مہتا کا خاص ذکر آنا ضروری ہے۔ انھوں نے آخردم تک شہر کی بے لوث خدمت کی۔ وہ تقریباً دس سال تک کراچی میونسپل کارپوریشن کے صدر رہے شاندار میونسپل بلڈنگ بنوائی۔ انھوں نے کراچی میں کئی نئی سڑکیں بھی تعمیر کرائیں جنھیں سیدھا رکھنے کے لیے متعدد مکان مسمار کرانے پڑے۔ انھوں نے شہر میں روشنی کا نظام بھی بہتر بنایا۔

مرحوم سر جہانگیر کوٹھاری نے، جو مشہور پارسی سیاح تھے اور تمام براعظموں کا دو مرتبہ سفر کر چکے تھے، لیڈی لائیڈ پیئر تعمیر کرایا جو کلفٹن کے ساحل کی رونق ہے۔ انھوں نے وہاں کوٹھاری پریڈ بھی بنوائی جہاں ہزاروں لوگ ہر اتوار اور تعطیل کے دن تازہ ہوا کھانے جاتے ہیں۔ سر جہانگیر کوٹھاری نے کلفٹن کا موجودہ پختہ پُل تعمیر کرایا۔ اس سے برسوں پہلے سے وہاں لکڑی کے تختوں کا بنا ایک شکستہ ڈھانچا کھڑا تھا جس کی چوڑائی مشکل سے آٹھ فٹ تھی۔ یہ تختے ایک دوسرے کے ساتھ ہمواری سے جُڑے ہوئے نہیں تھے، اس لیے ان کے درمیان جھریاں تھیں اور بچے ان پر سے چل کر جاتے ہوئے، نیچے کی گہرائی کو دیکھ کر سخت خوفزدہ ہو جاتے تھے۔

منگھوپیر پر مگرمچھوں کے تالاب سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر جذامیوں کی علاج گاہ واقع ہے جسے بنوانے میں حیدرآباد کے معروف سندھی سادھوؤں نولراے اور ہیرا نند کا بڑا حصہ تھا۔ ایک خاموش پارسی کارکن، مرحوم موبچہر کیخسرو اسپنسر، تیس برس تک باقاعدہ ہر اتوار کو وہاں جاتے رہے۔ وہ جذامیوں کو کھانا کھلاتے، ان کے ساتھ یسوع مسیح کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ان کے ساتھ دعا مانگتے اور انھیں اپنی قسمت پر صبر کی تلقین کرتے۔

کراچی بار بر سے کوئی دو میل دور دو چٹانیں ہیں جو اویسٹر روکس کہلاتی ہیں۔ ہندو انھیں رام جھروکا کہتے ہیں۔ ان چٹانوں کے بالکل سامنے ایک اور پہاڑی ہے جو منوڑا کا قلعہ کہلاتی ہے۔ سر چارلس نیپیئر نے اس پہاڑی کے نیچے ایک زبردست اسلحہ خانہ بنوایا تھا۔ یہ پہاڑی اس قدر مضبوط اور اسلحہ خانہ

اسی گہرائی میں ہے کہ کتنی ہی گولاباری کیوں نہ کی جائے اسے کچھ نقصان نہیں پہنچ سکتا۔
اسلحہ خانے کے قریب جانے کی کسی کو اجازت نہ تھی، اور اس کے اندر جانے کا تو سوال ہی نہ تھا۔ لیکن ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ میرے والد، سر کاوس جی کنٹریکٹر، ایک فرم کے ایجنٹ کے طور پر سپاہیوں کو بیئر سپلائی کرنے مسوڑا گئے ہوئے تھے۔ انھوں نے بیئر کے ایک نئے برانڈ کو متعارف کرانے کے لیے چند بوتلیں قلعے پر پہرہ دینے والے سپاہیوں کو مفت دینے کی پیش کش کی۔ اس پیش کش پر سپاہی اتنے خوش ہوئے کہ قلعے کو اندر سے دیکھنے کی میرے والد کی خواہش کو رد نہ کرسکے۔ جوں ہی وہ والد کو لے کر اندر پہنچے، خبر ملی کہ گیریژن کا آفیسر کمانڈنگ قلعے کے معائنے کے لیے آرہا ہے۔ سپاہی ایک دم سراسیمہ ہوگئے اور بات کو بگڑنے سے بچانے کے لیے فوراً انھیں والد کو قلعے کے خفیہ زیرزمین راستے سے گزار کر قلعے کے دوسرے سرے پر، بریک واٹر کے مقام کے قریب، نکالا پڑا جہاں سے انھیں جلدی سے ایک کشتی پر سوار کرا کے روانہ کر دیا گیا۔ یہ پہلا اور آخری موقع تھا کہ کسی سویلین کو مسوڑا کے پورے قلعے کو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہو۔

مسوڑا کے قلعے کے مغرب کی طرف، جہاں سے سمندر کے کنارے کنارے چلتا ہوا سینڈزپٹ، ہاکس بے ملکہ کیپ مونز سے آگے تک جاسکتا ہے، چھوٹے بڑے کچھوے رات کے وقت سمندر سے نکل کر آتے ہیں اور ریت میں انڈے دیتے ہیں۔
جن دنوں وائسرائے کی سکونت شملہ میں ہوا کرتی تھی، ہر سال کرسمس کے موقعے پر اعلیٰ افسروں کے لیے ایک شاندار ڈنر دیا جاتا تھا۔ اس ڈنر پر سب سے پہلے کچھوے کا سوپ پیش کیا جاتا جو ایک نہایت کمیاب اور اعلیٰ درجے کی شے تھی۔ اس کے لیے میری فرم، کنٹریکٹر اینڈ کو، سے مہینوں پہلے بڑے بڑے اصلی کچھوے پکڑ کر شملہ بھیجے کو کہا جاتا۔
تربہ کار ماہی گیروں کو کچھوے پکڑتے دیکھنا ایک بے حد عجیب تجربہ ہے۔ وہ لوہے کی لمبی لمبی سلاخیں لے کر ساحل کے قریب چھپ جاتے ہیں۔ جب کوئی بڑا سا کچھوا رینگتا ہوا ساحل کی طرف آرہا ہوتا ہے، وہ پیچھے سے جا کر سلاخوں کی مدد سے اسے اوندھا کر دیتے ہیں۔ ایک بار کچھوا پیٹھ کے بل ہو جائے تو اپنے آپ کو کبھی سیدھا نہیں کرسکتا۔ اسے اوندھی حالت ہی میں اٹھا کر ہمارے پاس لایا جاتا اور لکڑی کے کھوکھے میں اسی طرح رکھا جاتا کہ وہ سیدھا نہ ہوسکے۔ کھوکھے میں کچھوے کے سانس لینے کے لیے کافی گنجائش چھوڑی جاتی اور یوں سالم زندہ کچھوا ایکسپریس یا مال گاڑی کے ذریعے شملہ بھیجا جاتا۔
یہ بات بہت سے لوگوں کو معلوم نہ ہوگی کہ کچھوے کو مارا کیوں کر جاتا ہے۔ کچھوے کی گردن بہت چھوٹی ہوتی ہے جسے وہ وقتاً فوقتاً خول میں سے باہر نکالتا ہے۔ ماہی گیر رسی کا پھندا سا کر انتظار میں کھڑے رہتے ہیں کہ جوں ہی گردن باہر نکلے، اس میں پھندا ڈال دیں۔ پھر وہ رسی کو اس وقت تک مضبوطی سے پکڑے رہتے ہیں جب تک گردن کٹ نہ جائے۔ کچھوے کے خول کو نمک کے پانی سے دھو کر

خشک کیا جاتا ہے اور پھر پالش کر کے فروخت کیا جاتا ہے۔

جب کراچی کے لیے ایرپورٹ کی تعمیر کا خیال پیدا ہوا تو اس کے لیے موزوں مقام کے طور پر ملیر کا نام آیا۔ ہر شخص نے جس کے پاس کچھ فالتو رقم تھی، ملیر کے علاقے میں زمین کے بڑے بڑے قطعے خریدنے شروع کر دیے، تاکہ بعد میں انھیں حکام کے ہاتھ منھ مانگے داموں فروخت کیا جا سکے۔ کراچی شہر میں بروکروں نے مالدار لوگوں کو وہاں زمین خریدنے کی ترغیب دی۔ کاروبار زور پکڑ گیا اور لوگ بعد میں آنے والوں کو مہنگے داموں زمین بیچنے لگے۔ حکومت نے ہوا کے رخ کا اندازہ کرتے ہوئے، بڑی رازداری کے ساتھ، ڈرگ روڈ پر واقع وہ وسیع قطعہ زمین ایرفیلڈ قائم کرنے کے لیے خرید لیا جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ سرمایہ کاروں کو سخت غصہ آیا کیوں کہ انھیں اپنی زمین قیمتِ خرید سے بھی کم دام میں بیچنی پڑی تاکہ نقصان اٹھا کر رقم واپس نکالی جا سکے۔

اُن دنوں کراچی میں آر ۱۰۱ طیارے کی آمد پر بہت جوش و خروش پایا جاتا تھا جس کے لیے ایک خاص ہینگر بھی بنایا گیا تھا، لیکن وہ جسیم طیارہ کراچی پہنچنے سے پہلے راستے میں فرانس کے قریب گر کر تباہ ہو گیا اور اس میں سوار تمام لوگ مارے گئے۔ اس کے کراچی میں اترنے کا نظارہ کرنے والے ہزاروں لوگوں کے لیے خصوصی انتظامات کیے گئے تھے، مگر اس المیے پر سب کو مایوسی ہوئی اور طیارے کے بدقسمت مسافروں کے لیے سب نے ہمدردی محسوس کی۔

سر چارلس نیپیئر کا قاعدہ تھا کہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے دربار منعقد کرتا جہاں سندھ کے زمیندار اور میر تعظیماً حاضری دیتے تھے۔ یہ سلسلہ سندھ کے آخری کمشنر کے دور تک جاری رہا جس نے سینچر کا دن حاضری کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ اُس دن کراچی کے معززین کمشنر ہاؤس میں رکھی ملاقاتیوں کی کتاب میں اپنا نام لکھتے اور کمشنر سے، اپنے کام کی نوعیت اور اہمیت کے مطابق، پانچ سے دس منٹ تک کی ملاقات کرتے۔

اُن دنوں فوج کا سامان لانے لے جانے کے لیے گھوڑا گاڑیاں استعمال ہوتی تھیں۔ مگر جب یہ دیکھا گیا کہ گھوڑوں کے پاس زیادہ کام نہیں ہے تو انھیں تقریباً بیس روپے ماہانہ کے معمولی کرائے پر سویلین لوگوں کو دیا جانے لگا، اور یہ گھوڑے وکٹوریا گاڑیوں میں جوتے جانے لگے۔

حیدرآباد سے کام کے سلسلے میں کراچی آنے والوں کے لیے ساٹھ سال پہلے ایک ڈاک بنگلہ صدر روڈ پر جہاں اس جگہ بنا ہوا تھا جہاں اب وائی ڈبلیو سی اے کی عمارت کھڑی ہے۔
اس کے برسوں بعد ایک روسی باشندے نے کینٹونمنٹ ریلوے اسٹیشن کے سامنے ایک چھوٹا سا

ہوٹل کھولا اور اس کا نام پال ہوٹل (Paul's Hotel) رکھا۔ کچھ عرصے بعد اسے مسز کرول نامی ایک خاتون نے خرید لیا اور اس کا نام بدل کر کارلٹن ہوٹل کر دیا۔ یہ عمارت اب بھی موجود ہے مگر اس میں بہت تبدیلیاں اور اضافے ہو چکے ہیں۔ اب اسے حاجیوں کے کیمپ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

چند سال بعد ایک یہودی، مارڈر نامی، نے کارلٹن کے سامنے ایک اور چھوٹا سا ہوٹل کھول لیا جس کا نام مارڈرز ہوٹل تھا۔ یہ ان یورپی باشندوں کے لیے ایک گھریلو سا ہوٹل تھا جو اپنی فرموں کے لیے آرڈر حاصل کرنے آیا کرتے تھے۔ یہ مسافر پورے دن کے لیے پانچ روپے میں وکٹوریا گاڑی کرائے پر لے کر شہر کی سیر کیا کرتے تھے۔

اُن دنوں کراچی میں گندے پانی کے نکاس کا نظام نہ تھا، نہ فلش سسٹم تھا۔ ہر احاطے کے کونے میں بیت الخلا ہوتے تھے جنھیں ٹٹیاں کہا جاتا تھا، اور دن میں دو بار خاکروب آ کر لوہے کا ڈبا ہٹاتے اور انھیں صاف کر کے، چند قطرے فینائل کے ڈال کر واپس اسی جگہ رکھ دیتے۔ میونسپلٹی کی جانب سے اس تمام کام کی نگرانی ایک پارسی ہیلتھ آفیسر ڈاکٹر سہراب کاکا نہایت جانفشانی سے کرتے تاکہ کراچی کے بیت الخلا اس حد تک صاف رہ سکیں جتنا انھیں اُن حالات میں صاف رکھا جا سکتا تھا۔ وہ ہر صبح چار بجے اونٹ پر سوار ہو کر نکلتے اور ایک ایک احاطے میں جا کر خود دیکھتے کہ بیت الخلا صاف کیا گیا ہے یا نہیں۔ کراچی کو ویسا باضمیر، محنتی اور ہوشیار ہیلتھ آفیسر پھر کبھی نہیں ملا۔ دیکھنے میں وہ نہایت حسین و جمیل تھے، اور ان کا گورا رنگ دیکھ کر کوئی شخص نہ کہہ سکتا تھا کہ وہ انگریز نہیں ہیں۔

تاہم پرانی وضع کے یہ بیت الخلا کتنی ہی محنت سے صاف کیوں نہ رکھے جائیں، کراچی میں ہر سال دو مہینوں کے لیے آنے والی طاعون کی وبا کو روکنا ممکن نہیں تھا۔ وبا کے دوران آدھا شہر خالی ہو جاتا اور یہاں کے باشندے ٹھٹھ اور سندھ کے دوسرے چھوٹے قصبوں کو منتقل ہو جاتے۔

سڑکیں پتھر کی چھوٹی سلوں سے بنائی جاتیں اور پھر ان پر ریت اور بجری کا آمیزہ پانی ملا کر بچھایا جاتا اور سڑک کی سطح کو اسٹیم رولر کی مدد سے پختہ کیا جاتا۔ بالائی سطح پر کولتار کی تہہ جمانے کا طریقہ اُس وقت تک سے کم کراچی میں رائج نہ تھا۔

۱۸۸۲ میں، شہر سے ساڑھے سولہ میل دور، دریائے ملیر کے کنارے ڈملوٹی کے مقام پر دو کنویں کھودے گئے جن کے اندر اینٹوں کی چنائی تھی اور بیس لاکھ گیلن کے ذخیرے سے اسّی ہزار کی آبادی کو، ۲۵ گیلن فی کس کے حساب سے، پانی فراہم کیا جاتا تھا۔ ڈملوٹی کے کنووں سے پانی گائے کی کھال کی سی مشکوں میں شہر لایا جاتا اور بہشتی اس پانی کو گھر گھر پہنچاتے۔ لیکن ہر بار گرمیوں کے موسم میں یہ کنویں خشک ہو جاتے اور کراچی میں تشویش کی لہر دوڑ جاتی۔ یہاں بارش کا اوسط صرف تین انچ سالانہ تھا۔ اپنی زندگی میں مَیں نے تین متواتر سال ایسے دیکھے میں جب کراچی میں ایک قطرہ بارش نہ ہوئی اور ڈملوٹی کے کنویں بالکل خشک ہو گئے۔ کراچی کے اُس وقت کے میئر جمشید نسروانجی اس صورتِ حال پر اس قدر

پریشاں ہوئے کہ رات بھر میں ان کے مال مسعید ہو گئے۔ میونسپل حکام کی اس پریشانی کا تصور کیا جاسکتا ہے۔ ایک بار تو حکومت نے تعطیل کا اعلان کر کے لوگوں سے کہا کہ اپنی اپنی عبادت گاہوں میں جا کر بارش کی دعا مانگیں۔

ایسی صورتِ حال میں میونسپلٹی کی خوش قسمتی تھی کہ اسے ایک مرائٹھا انجینیر بھیڈے کی خدمات حاصل ہو گئیں۔ وہ پستہ قد، مگر بے حد ذہین اور تجربہ کار آدمی تھے اور انھوں نے کارپوریشن پر یہ حقیقت واضح کی کہ بڑھتی ہوئی آبادی کے پیشِ نظر، شہر کو پانی کی فراہمی کے لیے ملیر کے دو کنووں پر انحصار کرنا انتہائی خطرناک ہو گا۔ انھوں نے سندھ کا دورہ کر کے یہ اسکیم تیار کی کہ کوٹری کے قریب دریائے سندھ سے پانی حاصل کیا جاسکتا ہے جہاں سے شہر کے لیے پانی مستقل فراہم ہو سکے گا۔ اس اسکیم پر بمبئی کی حکومت سے مذاکرات بیس برس تک چلتے رہے، اور اس بات کا سہرا نوجوان لارڈ لائیڈ کے سر ہے کہ انھوں نے بمبئی کی کاؤنسل کے سامنے یہ معاملہ رکھا اور اسکیم کو منظور کرایا۔

جیسا کہ تصور کیا جاسکتا ہے، اُس زمانے میں بجلی کی روشنیاں اور پنکھے نہیں تھے، اور گرمیوں میں برف بھی دستیاب نہ ہوتی تھی۔ جب سر چارلس نیپیئر نے کراچی کو صدر مقام بنایا تو بمبئی کی حکومت کو انتظام چلانے کے لیے تجربہ کار عملہ بھیجنا پڑا جو بیش تر مرائٹھوں پر مشتمل تھا، کیوں کہ سندھی باشندے یوروپیوں، خصوصاً انگریزوں، سے رابطے میں نہ آئے تھے اور انگریزی زباں سے واقف نہ تھے۔ کراچی کے اسکولوں اور کالجوں میں استاد اور پروفیسر بھی مرائٹھے ہوتے تھے، سوائے ان اداروں کے سربراہوں کے جو انگریز یا پارسی تھے۔ ان مرائٹھا استادوں کے پڑھائے ہوئے طلبا قدرتی طور پر انھیں کا سا تلفظ اور لہجہ اختیار کر لیتے جو انگریزوں کو بڑا دل چسپ اور عجیب محسوس ہوتا۔

سدر روڈ پر واقع نارائن جگن ناتھ ہائی اسکول (عرفِ عام میں این جے ہائی اسکول) کے پہلے یوروپی ہیڈماسٹر مشہور انگریز پی سی رین (P C Wren) تھے جو اپولو کی طرح حسین شکل و صورت کے مالک تھے۔ وہ وکٹوریہ روڈ پر ایک چھوٹے سے بنگلے میں رہتے تھے جو عین اُس مقام پر تھا جہاں اب لیڈی عبداللہ ہاروں کی کوٹھی ہے۔ کہا جاتا تھا کہ یہ جگہ کسی فقیر کی بددعا کے اثر میں ہے جو اس کے بالکل سامنے ایک پیڑ کے نیچے بیٹھا رہتا تھا۔ اس نہایت باصلاحیت انگریز نے ایک مختصر اور بے حد لُبھانے والی کتاب *Dew and Mildew* کے نام سے لکھی جس میں بڑے پُرتخیل اور دل چسپ انداز میں وہ تمام واقعات بیان کیے گئے تھے جو فقیر کی بددعا کے باعث پیش آئے۔ اپنی شادی کی ناکامی کے نتیجے میں انھوں نے فوج میں شمولیت کا فیصلہ کیا اور کچھ ہی عرصے بعد مارے گئے۔ اس وقت تک انھیں رومانی ناولوں کے مصنف کے طور پر کچھ شہرت حاصل ہو چکی تھی۔

اُن دنوں جانوروں کے ذریعے کھینچی جانے والی گاڑیوں کا اسٹینڈ سدر روڈ پر، موجودہ لائٹ ہاؤس

سینما کے سامنے، واقع تھا جہاں میونسپلٹی نے ایک چھوٹا سا سر سبز قطعہ مخصوص کر دیا تھا۔ اس جگہ کو آج تک گاڑی کھاتا کہا جاتا ہے۔ عام باشندے بڑی تعداد میں اسی جگہ کے آس پاس رہتے تھے۔ رفتہ رفتہ اُن کی آبادی اُس مقام کی سمت میں پھیلنے لگی جو صدر بازار کہلاتا ہے۔

اُس زمانے میں کلفٹن جانا صرف گھوڑا گاڑیوں کے ذریعے سے ممکن تھا، جہاں چہ صرف خوش حال لوگ وہاں جا پاتے تھے۔ عام لوگوں کو تین چار میل پیدل چل کر کلفٹن جانے اور واپس آنے کا خیال کچھ زیادہ پسند نہ تھا۔ یورپی باشندوں کے پاس بگھیاں ہوتی تھیں اور اتوار کا دن کلفٹن کی سیر کے لیے پسندیدہ دن تھا۔ کلفٹن کا موجودہ پُل اُس وقت نہیں تھا اور وہاں ویسی ہی ریلوے کراسنگ تھی جیسی کنٹونمنٹ اسٹیشن پر آج بھی ہے۔

میں نے اس معاملے پر اخباروں میں ایک مہم شروع کی کہ اس مقام پر ایک پل بنانا ضروری ہے، کیوں کہ اس کی غیر موجودگی سے کلفٹن جانے والوں کو سخت دقت کا سامنا تھا اور بعض اوقات تو بیس بیس منٹ ٹرینوں کے گزرنے کے انتظار میں ضائع ہو جاتے تھے۔ کلفٹن کا پُل ۱۹۳۶ میں بنایا گیا اور یہ میری مسلسل اخباری مہم کا نتیجہ تھا۔

آبادی میں اضافے اور عالی شان عمارتوں کی تعمیر سے یقیناً کسی شہر کی اہمیت اور شان کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، اور اس لحاظ سے کراچی نے اپنی برتری کو پوری طرح ثابت کیا ہے۔ اس کی آبادی جو ۱۹۴۷ میں، پاکستان کے وجود میں آنے کے وقت، تین لاکھ کے لگ بھگ تھی، اب بڑھ کر اکیس لاکھ سے زیادہ ہو چکی ہے۔ اسی طرح بے شمار بڑی بڑی جدید عمارتیں بن چکی ہیں اور مزید بن رہی ہیں۔ ان میں سے چند اہم عمارتوں کے نام یہ ہیں

صدر روڈ پر قمر ہاؤس، میکلوڈ روڈ پر محمدی ہاؤس، کچہری روڈ پر پی آئی ڈی سی ہاؤس، پیلیس سینما کے نزدیک ہوٹل میٹروپول، کلفٹن جانے والی سڑک پر ہوٹل کولمبس، کراچی ہاربر کے قریب کوئنز روڈ پر بیچ لگژری ہوٹل، بونس روڈ پر امریکی چانسری، اور سب سے شاندار میکلوڈ روڈ پر اسٹیٹ بینک آف پاکستان کی نیارہ منزلہ عمارت، جس کی اونچائی ۱۵۷ فٹ ہے اور وہ ملک بھر میں سب سے بلند عمارت ہے۔

یہ تھی مختصر سی تاریخ کراچی کی جو کبھی سندھ کا صدر مقام تھا، جس کے ساحل سے رخصت ہوتے ہوئے سر چارلس نیپیئر نے کہا تھا

You will yet be the glory of the East, would that I could come again, Kurrachee, to see you in your grandeur

*

اگلے صفحات میں جس مضمون کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے وہ پاکستان کے مشہور ریسرچ اسکالر ڈاکٹر فیرور احمد کا تحریر کردہ ہے۔ ڈاکٹر فیرور متعدد تحقیقی مقالوں اور کتابوں کے مصنف ہیں، پاکستان فورم کے نام سے اردو اور انگریزی میں رسالہ شائع کرتے رہے ہیں اور آج کل واشنگٹن ڈی سی کی ہوورڈ (Howard) یونیورسٹی کے Institute of Urban Affairs and Research سے وابستہ ہیں۔ ان کا یہ مضمون Africa on the Coast of Pakistan کے عنوان سے یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام شائع ہونے والے سہ ماہی رسالے *New Directions* کے اکتوبر ۱۹۸۹ کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔

یہ مضمون کراچی کے علاقے لیاری میں رہنے والے اُن لوگوں کی تاریخ کا جائزہ لیتا ہے جنہیں مکرانی سمجھا جاتا ہے۔ اس مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ افریقا کے مشرقی ساحلوں سے خلیجِ فارس کے راستے غلام بنا کر لائے جانے والے افراد کی تجارت کے سلسلے میں کراچی کو ایک اہم منڈی کی حیثیت حاصل تھی۔ یہ تجارت اٹھارھویں صدی کے آخری برسوں اور انیسویں صدی کے نصف اول میں عروج پر تھی اور آخر کار انگریزوں نے غلاموں کی خرید و فروخت کو ممنوع قرار دیا۔ لیاری کے افریقی نسل کے باشندے غالباً کراچی کے قدیم ترین شہری ہیں، اور اس مضمون میں ان کی صورتِ حال کی بہت عمدہ تصویر کشی کی گئی ہے۔

فیروز احمد

انگریزی سے ترجمہ فہمیدہ ریاض

افریقا ـــــ پاکستان کے ساحلوں پر

ہر سال، اسلامی کیلنڈر کے مطابق ماہِ رجب میں، پاکستان کے کاروباری عروس البلاد کراچی سے دس کلومیٹر کے فاصلے پر، منگھوپیر میں افریقا جاگ اٹھتا ہے۔ اس مقام پر کراچی کے افریقی نژاد، جنھیں عرفِ عام میں شیدی کہا جاتا ہے، ایک ہفتے تک ایسی تقریبوں اور میلوں ٹھیلوں میں مصروف رہتے ہیں جو قدیم افریقی تمدن اور مقامی روحانی رسوم و رواج کا انوکھا امتزاج ہیں۔ اس موقعے پر عورتیں اور مرد، بوڑھے اور جوان، سب کے سب افریقی ڈھول (جسے یہاں مگارمن کہتے ہیں) کی تُند تال پر رقص کرتے ہیں، سواحلی اور مقامی زبانوں کی کھچڑی بولیوں میں گیت گاتے ہیں اور تالاب کے سب سے بڑے مگرمچھ کو گوشت کا نذرانہ پیش کرتے ہیں۔ اگر مگرمچھ نذرانہ قبول کر لے تو سمجھا جاتا ہے کہ یہ سال شیدیوں کے لیے مبارک رہے گا۔

مگارمن رقص کے افریقی ہونے کو تو عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے ـــ پاکستانی فنکار غیر ممالک میں اسے بڑے فخر سے خاص الخاص رقص کے طور پر پیش کرتے ہیں ـــ لیکن ان لوگوں کی تاریخ اور سماجیات کے بارے میں بہت کم لکھا گیا ہے جو مدتِ مدید سے اس علاقے میں افریقی کلچر کی نمائندگی کرتے رہے ہیں۔(۴) یہ لوگ کب یہاں آئے؟ کیا یہ سب غلام بنا کر لائے گئے تھے؟ ان کا دورِ غلامی کب اور کیسے ختم ہوا؟ اس خطے میں بسنے والی دوسری نسلوں سے ان کا جزوی اختلاط کب اور کیوں کر شروع ہوا؟ ان کی موجودہ سماجی حیثیت کیا ہے؟ وہ خود کو کیا کہلوانا پسند کرتے ہیں؟ کیا انھیں احساس ہے کہ وہ افریقی نژاد ہیں؟ یہ اور اس قبیل کے متعدد سوال ہیں جو کسی افریقی یا افریقی نژاد امریکی کے ذہن میں آسکتے ہیں جب اسے پاکستان جیسے بعید از قیاس ملک میں افریقی آ ی کے بارے میں علم ہو۔

ان سوالوں کے حتمی جواب تو وسیع النوع تحقیق کے بعد ہی فراہم ہو سکتے ہیں، البتہ پاکستان کے اس افریقی ورثے کے ابتدائی عمومی کوائف مرتب کرنے کے لیے غالباً یہ طریقِ کار مناسب ترین رہے گا کہ ان دو ثقافتی گوشوں کا مطالعہ کیا جائے جن کے درمیان یہ برادری بسی ہوئی ہے۔ پاکستان کا نسلی و لسانی تار و پود چار تاریخی قومیتوں سے مل کر بنا ہے۔ مزید برآں، موجودہ چار صوبوں میں متعدد دوسرے لسانی

گروہ بھی ہیں۔ سندھ اور بلوچستان کے ساحلی صوبوں میں ایسی آبادیاں موجود ہیں جن کے خدوخال واضح طور پر افریقی ہیں۔ بلوچستان کے ساحل مکران کے ساتھ ساتھ بسی ہوئی آبادی، جو مشرق میں سندھ کے شہر کراچی کے مزدور طبقے کے محلے لیاری تک چلی آئی ہے، بلوچی زبان بولتی ہے اور خود کو بلوچ سمجھتی ہے۔ اندرونِ صوبہ، جنوبی سندھ میں، وہ افریقی نژاد برادری آباد ہے جو شیدی کہلاتی ہے۔ یہ لوگ سندھی بولتے ہیں مگر سماجی اعتبار سے باقی آبادی سے الگ تھلگ ہیں۔ ان کی ایک قلیل تعداد صوبہ سرحد اور پنجاب کے اندرونی علاقوں میں بھی پائی جاتی ہے۔

سندھی شیدی

وادیِ سندھ کی تہذیب کے پانچ ہزار برس قدیم آثار سے برآمد ہونے والی مورتیوں میں افریقی خدوخال شناخت کیے گئے ہیں۔* مگر سندھ میں افریقیوں کی آمد کے دستاویزی شواہد ۷۱۱ء عیسوی کے بعد سے ملتے ہیں جب عربوں نے سندھ کو فتح کر کے برصغیر میں اسلام کو متعارف کرایا۔ تاریخی وقائع میں شجاع حبشی نامی ایک افریقی جنگجو کا تذکرہ موجود ہے جسے محمد بن قاسم نے راجا داہر سے جنگ کرنے پر مامور کیا تھا۔ سندھ پر عربوں کی حکومت تین سو برس تک رہی۔ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس مدت میں عرب اپنے ساتھ افریقی سپاہی اور ملازم لاتے رہے ہوں گے جو بعد میں یہیں بس گئے اور شادی بیاہ کے ذریعے مقامی آبادی میں شامل ہو گئے۔ تیرھویں صدی سے اٹھارھویں صدی تک ہندوستان کے مختلف علاقوں میں افریقی نژاد لوگوں کی موجودگی کے دستاویزی شواہد باقاعدہ ملتے ہیں۔ خلیج فارس کی ریاستوں میں، جن سے سندھ کے وسیع تجارتی تعلقات تھے، ساتویں صدی سے افریقی اصل کے لوگ موجود تھے۔ جب سندھ کے آخری مقامی فرماں روا خاندان کلہوڑوں کو ان کے کمانڈر ٹالپروں نے معزول کیا، اُس وقت ان کے چند افریقی نژاد محافظ بھی تھے۔ بااین ہمہ، یہ بات بعیداز قیاس محسوس ہوتی ہے کہ موجودہ شیدی قوم اُن افریقیوں کی نسل ہو جو ٹالپروں کے دورِ حکومت سے قبل سندھ میں آئے ہوں گے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں افریقی غلام بڑی تعداد میں سندھ میں لائے گئے۔ سندھ کے ساحلی شہر کراچی میں غلاموں کی تجارت کا بیان کرتے ہوئے الیگزانڈر بیلی (Alexander Bailee) نے لکھا ہے

> غلامی، غلاموں کی خرید و فروخت کی طرح، باقاعدہ رواج کی حیثیت رکھتی تھی۔ نہ صرف شہروں میں غلام رکھے جاتے تھے بلکہ کراچی کو اندرونِ ملک غلام مہیا

(*) ان مورتیوں کے خدوخال افریقی نہیں بلکہ دراوڑی ہیں۔ ایسے ہی خدوخال جنوبی ہند کی مورتیوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ حیرت ہے کہ ڈاکٹر فیروز احمد اینتھروپولوجسٹ ہوتے ہوئے ایسی بات کہہ رہے ہیں۔ (مترجم۔)

کرنے کے لیے ایک بڑی منڈی کی حیثیت حاصل تھی۔ سالانہ چھ سو سے سات
سو تک غلام درآمد کیے جاتے تھے جن میں تین چوتھائی عورتیں ہوتی تھیں
کمانڈر کارلیس کے بیان کے مطابق ۱۸۴۳ء میں کم و بیش پندرہ سو غلام مسقط
اور افریقی ساحل سے درآمد کر کے کراچی بھیجا لے گئے۔

ٹالپروں کے ہاتھوں افریقی غلاموں کی سندھ میں درآمد اُنھیں دنوں کی بات ہے جب مشرق میں غلاموں کی تجارت عروج پر تھی اور اس کام میں عمانی عرب پیش پیش تھے۔ عمان کا سلطان زنجبار پر (جو اب تنزانیہ کا حصہ ہے) اور افریقا کے مشرقی ساحل کے بڑے حصے پر حکمرانی کرتا تھا۔ چھاپامار دستے براعظم کے اندرونی خطوں سے گاؤں والوں کو گرفتار کر لاتے اور انھیں جزیرۂ زنجبار کی مشہورِ عالم غلام منڈی میں فروخت کیا جاتا جہاں انیسویں صدی کے وسط میں دس ہزار سے بیس ہزار تک غلاموں کی خرید و فروخت ہوتی تھی۔ سندھ لائے جانے والے غلام پہلے عمان میں مسقط کی بندرگاہ لے جائے جاتے جہاں سے انھیں بذریعہ بحری جہاز کراچی لایا جاتا۔ ممکن ہے انفرادی مالکوں کے درمیان تبادلے کے ذریعے سے ان میں سے کچھ غلام موجودہ ایرانی اور پاکستانی بلوچستان کے ساحل مکران کے مختلف مقامات سے اندرونِ سندھ پہنچے ہوں۔ معروف مستشرق رچرڈ برٹن کے بیان کے مطابق یہ غلام اُن علاقوں کے رہنے والے تھے جنھیں اب کینیا اور تنزانیہ کہا جاتا ہے۔ سندھ میں غلاموں کی مانگ غالباً اس لیے بڑھ گئی تھی کہ ٹالپر حکمرانوں نے بلوچ جنگجو سرداروں کو جاگیریں عطا کر دی تھیں اور وہ عیش و آرام کے طالب ہو گئے تھے۔

ایک قومی سورما

سندھ میں غلاموں سے زراعت جیسے پیداواری کام نہیں لیے جاتے تھے۔ ٹالپر انھیں زیادہ تر محلات کے محافظ یا خانگی ملازم بنا کر رکھتے تھے۔ بہت سے بڑے زمیندار اور تاجر بھی اپنے گھروں میں غلام رکھتے تھے۔ شرفا کے گھرانوں کی خواتین کی خدمت کے لیے نوعمر افریقی لڑکیوں کی بہت مانگ تھی۔ جوان عورتیں داشتائیں بنائی جاتی تھیں۔ برٹن کے مطابق، غلاموں سے سائیسوں، گھسیاروں اور عام مزدوروں کا کام لینا بھی عام تھا اور وہ مختلف پیشہ ور افراد، مثلاً بڑھئی، لوہار وغیرہ، کے مددگاروں کی حیثیت سے بھی کام کرتے تھے۔ تمام دستیاب کوائف سے معلوم ہوتا ہے کہ ان غلاموں سے عموماً جسمانی تشدد کا سلوک نہیں کیا جاتا تھا۔ ان کی حالت اور ان کے ساتھ سلوک کم و بیش ویسا ہی تھا جیسا دوسرے مسلم معاشروں میں غلاموں کے ساتھ مروج تھا، جہاں غلاموں سے سلوک کی اسلامی تعلیمات حالتِ غلامی کی صعوبت کی کسی قدر تلافی کر دیتی تھیں۔

چند ایک غلام ایسے بھی تھے جو اپنی ذہانت، وفاداری اور بہادری کی بدولت مالکوں کے منظورِ نظر بن

کیے اور انھوں نے ممتاز حیثیتیں حاصل کیں۔ ہوش محمد، عرف ہوشو شیدی، انھیں میں سے ایک تھا۔ بعض بیانات کے مطابق اس کا باپ حیدر آباد سندھ کے حاکم میر فتح علی خاں ٹالپر کی اطاعت میں تھا، اور ہوش محمد ایک خانہ زاد تھا، یعنی اس کی پیدائش اور پرورش شاہی گھرانے میں ہوئی تھی۔ ایسے غلاموں کو باعزت حیثیت دینے کے لیے ٹالپروں نے انھیں قمبرانی کا لقب دے دیا تھا۔ (قمبر حضرت علی کے منسوب غلام کا نام تھا جسے انھوں نے آزاد کر دیا تھا۔) کہا جاتا ہے کہ ہوشو میر فتح علی کے بیٹے صوبدار خاں کی معیت میں رہتا تھا۔ صوبدار خاں، اپنے عم زاد ناصر خاں کے برخلاف، سندھ پر قبضے میں انگریزوں کی مدد کر رہا تھا، جبکہ ناصر خاں انگریزوں کی مزاحمت کر رہا تھا۔ روایت ہے کہ انگریزوں کا مقابلہ کرنے میں ٹالپروں کی نیم دلی ہوشو کو سخت ناگوار تھی۔ ٹالپر ریاستیں سخت بدنظمی کا شکار تھیں۔ خیرپور کے حکمرانوں نے پہلے ہی محکومی قبول کر لی تھی، اور حیدر آباد کے حاکم میر ناصر خاں کو فروری ۱۸۴۳ میں میانی کی لڑائی میں شکست ہو چکی تھی۔ اپنے آقا کو مزاحمت پر آمادہ کرنے میں ناکام ہو کر ہوشو شیدی خود میدان میں اترا اور میرپور خاص کے حریت پسند حاکم میر شیر محمد خاں کے ساتھ مل کر دوبو کی لڑائی میں انگریزوں سے مقابلے پر آ گیا۔ سمجھا جاتا ہے کہ ہوشو نے اس لڑائی میں قائدانہ کردار ادا کیا۔ مقامی فوج مار گئی اور ہوشو بہادری سے لڑتا ہوا ۲۶ مارچ کو اس لڑائی میں کام آیا۔ حسن علی شاہ نامی شاعر نے ہوشو کو مندرجہ ذیل الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے

ہوشو نے اپنی جان قرباں کر دی
سو بہادر ساتھیوں سمیت
وہ دیو کی طرح لڑا
اور سورما کی موت پائی
اس پر کوئی الزام نہیں
یہ سب خدا کا کرنا تھا
فتح اُسی کے ہاتھ میں ہے
وہ جس کو چاہے اُسے دے
ہمارے سورما میداں سے پیچھے نہیں ہٹے
ہم اپنے سورماؤں کے گن گاتے ہیں

البتہ دوسرے مصنفوں کا دعویٰ ہے کہ ہوشو میدانِ جنگ میں نہیں لڑا تھا بلکہ حیدر آباد کے قلعے کے پہرے داروں کا افسرِ اعلیٰ تھا جہاں وہ انگریزوں کا بہادری کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے مارا گیا۔ ہوشو کے نام کے ساتھ کئی روایتیں اور داستانیں وابستہ ہو گئی ہیں۔ اسے ایک ہوشیار جنگ آزما اور دلیر

محب وطن سمجھا جاتا ہے، ایک حقیقی سورما جس نے اپنی کم مایہ حیثیت سے اوپر اٹھ کر اپنی آزادی برقرار رکھنے کے لیے سندھ کی آخری مزاحمت کی قیادت کی۔ جدید سندھی قوم پرست اسے اپنا ہیرو مانتے ہیں اور اس نعرے کو (جو کہا جاتا ہے کہ ہوشو کا نعرہ تھا) فخر سے دُہراتے ہیں کہ مرسُوں مرسُوں سندھ نہ ڈیسوں، یعنی مر جاؤں تو مر جاؤں، سندھ نہیں دوں گا۔ ہوشو کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے متعدد مضامین، کہانیاں اور نظمیں لکھی گئی ہیں۔ اس کے اخلاف کا پورا شجرہ تیار کیا گیا ہے اور اس بات پر بحث مسلسل جاری ہے کہ وہ کس جگہ مدفون ہے۔ ہوشو کے نام کے ساتھ عموماً شہید کا لفظ لکھا جاتا ہے اور اسے جنرل کا لقب بھی دے دیا گیا ہے۔

یہ بھی ایک ستم ظریفی ہے کہ ٹالپروں کی انگریزوں کے ہاتھوں شکست ہی وہ واقعہ تھی جس نے سندھ کے شیدیوں کی غلامی سے آزادی کی راہ ہموار کی۔ انگریزوں نے، جو ۱۸۴۳ میں دوبو کے مقام پر اپنی حتمی فتح سے چار سال پہلے کراچی پر قبضہ کر چکے تھے، سندھ میں غلاموں کی تجارت اور غلامی پر پابندی لگائی۔ مزید برآں، ان کی سختیوں کے باعث سندھی امرا اتنے کمزور ہو گئے کہ غلام رکھنے کی عیاشی کے متحمل نہ ہو سکتے تھے۔

امریکی صورتِ حال سے مماثلت

نو آزاد سندھی شیدیوں کی حالت کا جو بیان ممتاز سندھی مصنف محمد صدیق مسافر کے ہاں ملتا ہے، اس کے مطابق ان کا حال ریاست ہائے متحدہ امریکا کے جنوبی خطوں کے نو آزاد غلاموں سے کئی اعتبار سے مماثل تھا۔ ان میں سے بعض اپنے سابقہ مالکوں ہی کے ساتھ ملازم یا مزدور کے طور پر رہنے لگے، بعض نے پہلی بار جاگیردارانہ سرپرستی کے بغیر باہر کی دنیا میں قدم نکالا کہ آزاد شہری کے طور پر ایک نئی زندگی شروع کریں۔ بہرحال، وہ گاؤوں اور قصبوں میں اپنی بستیاں بسانے اور معاشرتی تنظیم قائم کرنے میں کامیاب رہے۔ باہمی امداد اور بھائی چارہ ان کی بقا کے لازمی عناصر تھے۔ آزاد کردہ غلام کھیت مزدوروں، خانگی ملازموں اور ہُنرپیشہ کاریگروں کے طور پر روزی کمانے لگے۔ شیدیوں نے متعدد افریقی روایتیں اور رسمیں قائم رکھیں، جن میں سب سے اہم اس ڈھول کی تال ہے جسے مگارمس یا مَسیندو کہا جاتا ہے؛ ساتھ ہی وہ اپنی مخصوص بولی میں، جو غالباً سواحلی اور عربی کا مرکب ہے، نغمے بھی گاتے رہے۔ مسافر کے مطابق، شیدیوں کے لیے مسیندو محض رقص اور اُچھل کود کا ساتھ دینے والا ایک باجا نہیں ـــــ وہ ان کی روح کا ساز ہے۔

مقامی معاشرے کے تقریباً درجہ وار (quasi-hierarchical) ذات پات کے نظام میں شیدیوں کو مسلمان ذاتوں میں سب سے کمتر مقام پر فائز کیا جا سکتا تھا۔ ان سے نچلا طبقہ صرف اچھوت ہندوؤں کا تھا۔ مقامی غلام یا نیم غلام گروہوں کی حیثیت بھی شیدیوں سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی۔ سندھ

کی پوری آبادی ہی صدیوں کے جاگیردارانہ نظام کے ظلم و ستم اور بیرونی حملوں کے باعث بری طرح کچلی ہوئی تھی اور معاشی بہتری اور عزتِ نفس کی بحالی کی ضرورت مسلمہ تھی۔ شیدیوں کے لیے یہ نسبتاً زیادہ دشوار مرحلہ تھا۔ اگرچہ سندھ میں نسل پرستی (racism) بطورِ نظریہ موجود نہ تھی، اور اسلام میں نسلی امتیاز کو ناپسندیدہ سمجھا جاتا تھا، لیکن ذات پات میں جکڑے ہوئے نظام میں ایسے گروہوں کے لیے معاشرے میں باعزت مقام حاصل کرنا اور بھی زیادہ مشکل تھا جن کا کمتر سماجی رتبہ ان کے رنگ اور شکل صورت پر گویا صاف صاف لکھا ہوا ہو۔ اس کے باوجود شیدیوں نے مستحکم برادریاں قائم کرنے میں شاندار کامیابی حاصل کی۔ نو آزاد غلاموں کی یہ برادریاں کیوں کر وجود میں آئیں، اس کے بارے میں معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ممکن ہے یہ عمل انگریزوں کی آمد سے پہلے ہی شروع ہو چکا ہو اور مقامی برادریوں سے شادی وغیرہ نے اس عمل کو مہمیز دی ہو۔ جیسا کہ غلام رکھنے والے دیگر معاشروں میں ہوتا ہے، نسلی اختلاط کی دو صورتیں تھیں (الف) دوسری نسلوں کے مرد افریقی عورتوں کو اپنی بیویاں یا داشتائیں بنا لیتے، (ب) اس تعلق سے پیدا ہونے والے لڑکے اور لڑکیاں خالص افریقی نسل میں شادی کر لیتے۔ نہ صرف امرا اور دوسرے مالدار لوگوں کی افریقی عورتوں سے اولاد ہوئی بلکہ دوسری سیاہ فام عورتوں اور مخلوط النسل مردوں نے بھی مقامی غلام یا نیم غلام ذاتوں، مثلاً خاصخیلیوں، میں شادیاں کیں۔ سندھ میں مخلوط النسل افراد کو عمومی طور پر گادو (یعنی گڈمڈ) کا نام دیا جاتا ہے، جبکہ خاص شیدیوں سے مخلوط ہونے والوں کو بی سر (یعنی دو سر والے) کہا جاتا ہے۔ تقریباً ڈیڑھ صدی کے عرصے میں مخلوط شادیوں کی سطح قابلِ لحاظ حد تک پہنچ گئی ہے۔

شیدی موجودہ دور میں

ایسے لوگوں کی تعداد کے تخمینے کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے جنھیں شیدی سمجھا جاتا ہو، یا جو کسی اَور طرح افریقی نسل سے تعلق رکھتے ہوں۔ شیدیوں کی برادریوں کے حجم پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی تعداد لاکھوں میں نہیں بلکہ ہزاروں میں ہو گی۔ اکثر افراد جنھیں آج شیدی سمجھا جاتا ہے، دراصل مخلوط نسل کے ہیں۔ خالص افریقی نژاد شیدی اب صرف ٹالپر حکمرانوں کے اخلاف گھرانوں میں مل سکتے ہیں، مثلاً ٹنڈو محمد خان میں میر اعجاز علی ٹالپر کے گھر۔ وہاں وہ گھریلو ملازمین کے طور پر کام کرتے ہیں جس کے عوض انھیں تنخواہ نہیں دی جاتی بلکہ صرف ان کی انتہائی بنیادی ضرورتیں پوری کی جاتی ہیں۔ ٹالپروں کے علاوہ سندھ کے سیدوں اور پیروں کے گھرانوں میں بھی شیدی ملازم رکھے جاتے ہیں۔ ان قدامت پرست خاندانوں میں شیدی عورتیں بہت اہم رول ادا کرتی ہیں؛ وہ مستورات کی ذاتی خدمت پر متعین ہوتی ہیں، ان پردہ نشین عورتوں کو رفاقت فراہم کرتی ہیں اور ان کے اور بیرونی دنیا کے درمیان ایک دریچے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان گھرانوں میں اطاعت شعاری اور وفاداری کا انعام تحفظ اور سرپرستی

کی صورت میں دیا جاتا ہے۔

سندھیوں کی غالب اکثریت کے برخلاف، شیدی روایتی طور پر ہاری (کسان) نہیں رہے ہیں۔ تاہم بہت سے شیدی جدید زرعی طریقوں میں ٹریکٹر ڈرائیور اور مکینک وغیرہ کے طور پر کام کرنے لگے ہیں۔ وہ بس اور ویں ڈرائیوری کے پیشے سے بھی وابستہ ہیں اور دوسرے کاریگری اور محنت مزدوری کے کام بھی کرتے ہیں۔ رقص اور موسیقی سے اپنے فطری لگاؤ کے باعث متعدد شیدیوں نے ان فنوں کو پیشے کے طور پر اپنا لیا ہے۔ یہ بات ضرب المثل کی طرح مشہور ہو گئی ہے کہ شیدی پیدائشی رقاص ہوتے ہیں، اور اکثر کہا جاتا ہے کہ ان کی عورتوں کی ایڑیوں میں اسپرنگ لگے ہوتے ہیں۔ دیہات میں شادیوں اور دوسری تقریبوں کے موقعوں پر شیدی عورتوں کی بڑی مانگ ہوتی ہے۔ شیدی مردوں اور عورتوں کے پیشہ ور گروہ صوبے بھر میں ناچنے اور گانے بجانے کے لیے جاتے ہیں۔ شیدیوں کی حسِ مزاح بھی بہت مشہور ہے اور وہ خوشی کی تقریبات میں مسخرے پن کے ناٹکوں سے لوگوں کو تفریح کا ساماں بہم پہنچاتے ہیں۔ شیدی سندھ کی روایتی کشتی ملھ اور دوسرے کھیلوں کے بھی بڑے ماہر ہیں، لیکن اس میداں میں ان کی صلاحیتوں کو ترقی دے کر پیشے کی سطح تک پہنچانے کے مواقع میسر نہیں ہیں۔

سندھ کے شیدیوں کی مذہبی رسومات میں شیعہ اور سنی مسلم اعتقادات کا امتزاج ہے۔ وہ محرم بڑے زور شور سے مناتے ہیں، وہ اس مہینے میں سیاہ لباس پہنتے ہیں اور ماتم کرتے ہیں۔ ان کے نغموں میں بھی مذہبی خیالات کی بھرمار ہے۔

عمومی تصورات سے ہٹ کر

[جو کچھ اوپر لکھا گیا وہ شیدیوں کے بارے میں عام طور پر سمجھا اور کہا جاتا ہے، لیکن] سندھ کے شیدیوں کی اکثریت نہ تو خانگی ملازموں پر مشتمل ہے اور نہ ناچنے گانے والوں پر۔ ان میں اکثر وہ سب کام کرتے ہیں جو دوسرے لوگ کرتے ہیں۔ ان میں بہت سوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے اور پروفیسر، وکیل، ڈاکٹر، انجنیئر اور ادیب بنے ہیں۔ تاہم انھیں احساس ہے کہ کچھ دوسری ذاتوں کی طرح انھیں بھی معاشرتی طور پر پس ماندہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ شیدیوں میں ممتاز شخصیتیں کم یاب ہیں۔ ان میں محمد صدیق مسافر کو شمار کیا جا سکتا ہے جن کا حوالہ اس مضموں میں آ چکا ہے۔ مسافر ۱۸۷۹ میں ٹنڈو باگو میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد کو غلام بنا کر زنجبار سے براستہ مسقط لایا گیا تھا۔ شروع میں مسافر پرائمری اسکول کے استاد بنے، پھر ٹیچرز ٹریننگ اسکول میں پڑھانے لگے۔ انھوں نے معلم، ادیب، شاعر اور مدیر کی حیثیت سے نمایاں مقام حاصل کیا۔ ۱۹۶۱ میں ان کی وفات ہوئی جس سے پہلے وہ سو سے زائد کتابیں، پمفلٹ اور مضامین تحریر کر چکے تھے اور ادبی سرگرمیوں میں پیش پیش رہے تھے۔ ہر سندھی کو بچوں کا وہ چھوٹا سا گیت یاد ہے جو انھوں نے ٹوئنکل ٹوئنکل لٹل اسٹار کی طرز پر لکھا تھا۔

مجموعی طور پر معاشرے میں سیاسی شعور میں اضافے کے ساتھ ساتھ، اور خود شیدیوں میں خواندگی کی تناسب بڑھ رہا ہے، ان میں اپنے سماجی رتبے کے بارے میں ایک نئی آگہی پیدا ہو رہی ہے۔ پدرانہ اصطلاح دادا کو تعلیم یافتہ افراد پسند نہیں کرتے۔ اگرچہ شیدی کو ابھی تک ایک بے ضرر اصطلاح سمجھا جاتا ہے، سندھ کے افریقی نژاد باشندوں کی بڑھتی ہوئی تعداد اس لفظ کو اسی طرح ناپسند کرنے لگی ہے جیسے افریقی نژاد امریکیوں نے لفظ نیگرو کے لفظ کو مسترد کر دیا ہے۔ اس کے بجائے پڑھے لکھے شیدیوں میں قمبرانی کا لقب استعمال کرنے کو ترجیح دی جانے لگی ہے۔ بعض دوسرے جو خود کو حضرت علی کے آزاد کردہ غلام سے نسبت نہیں دینا چاہتے، خود کو بلالی، یعنی حضرت بلال کی اولاد کہلواتے ہیں۔ سماجی ترقی کی تلاش میں شیدی خود کو تمام مثبت علامتوں سے وابستہ کر رہے ہیں۔ چند سال پہلے کچھ سندھی دانشوروں اور شیدی مصلحوں نے مل کر شیدیوں کی بہبود کے لیے ایک تنظیم قائم کی تھی اور اس کا نام شہید ہوش محمد شیدی ویلفیئر آرگنائزیشن رکھا تھا۔ ایک خاص گروپ کے لیے، جو ایسے مخصوص نسلی خدوخال کی بنا پر پہچانا جاتا ہو، کام کرنے اور ساتھ ہی معاشرے میں نسلی امتیاز سے اجتناب کرنے کی مشکلات کا اظہار اس تنظیم کے بیان کردہ اغراض و مقاصد سے بھی ہوتا تھا۔ اگرچہ یہ بات صاف طور پر بیان کی گئی تھی کہ تنظیم کا مقصد شیدی برادری کی فلاح و بہبود ہے، ابتدائی شقوں میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ اس تنظیم کو کسی بھی اعتبار سے نسلی تنظیم نہ سمجھا جائے۔

سیاہ فام بلوچ

کراچی میں اور مکران کے ساحل پر بسنے والے افریقی نژادوں کو اپنے تشخص کے سلسلے میں بظاہر اُس طرح کے مسائل کا سامنا نہیں کرنا پڑتا جو سندھ کے شیدیوں کو پیش آتے ہیں۔ اُبھرتی ہوئی بلوچ قوم پرستی تقاضا کرتی ہے کہ سیاسی اور دانشورانہ سطح پر وہ تمام لوگ جو نسلی (racial) اعتبار سے بلوچ نہیں، اپنی قبائلی شناخت کو نظر انداز کر دیں، اور بلوچی بولنے والے ایسے تمام لوگوں کو جو روایتی سماجی ڈھانچے میں کمتر سمجھے جاتے تھے، بلوچوں کی حیثیت سے تسلیم کر لیے جائیں۔ اگرچہ بیشتر سیاہ فام لوگ خود کو بلوچ کے طور پر شناخت کرتے ہیں، بلوچستان کے کچھ علاقوں میں مخلوط افریقی نسل کے لوگوں کو کم ذات سمجھا جاتا ہے اور نقیب اور درزادگ (ذات باہر) کہا جاتا ہے۔ شیدی اور اس لفظ کا بلوچی متبادل سیاہ کرداگ (سیاہ فام)، دونوں اب تک متروک نہیں ہوئے ہیں۔

افریقی نژاد لوگ مکران کے ساحل پر، سندھی شیدیوں کی طرح، غلاموں کی تجارت کے دور میں مشرقی افریقا سے عمان اور خلیج فارس میں لائے گئے۔ ان کا سفر غالباً کچھ زیادہ پیچیدہ تھا۔ عمان کے حکمرانوں نے اٹھارویں صدی کے اوائل سے بلوچوں کو تنخواہ دار سپاہیوں (mercenaries) کی حیثیت سے اپنی فوج میں بھرتی کرنا شروع کر دیا تھا۔ ان کے کھجور کے باغات میں کام کرنے والے افریقی غلاموں

کے علاوہ اس کی فوج میں بھی افریقی غلام سپاہی شامل تھے۔ ممکن ہے اس طرح مکران کے بلوچوں اور افریقیوں کے درمیان رابطہ پیدا ہوا ہو۔ ۱۷۸۲ میں قلات کے حکمران نے، جس کا مکران پر بھی تسلط تھا، گوادر اور اس سے ملحق ساحلی علاقے کا کنٹرول عمان کے حوالے کر دیا۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں عمان کا سلطان، جو ایرانی ساحل کی متعدد بندرگاہوں اور جزیروں کا کنٹرول حاصل کر چکا تھا، بندرعباس کو بھی پٹے (lease) پر حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اغلب ہے کہ وہ افریقی غلام جو خلیجِ فارس میں بحری بیڑوں پر کام کرتے تھے، کشتیوں کے ذریعے گوادر اور موجودہ پاکستان کی دوسری بندرگاہوں میں پہنچے ہوں۔ علاوہ ازیں، مکران کے صاحبِ حیثیت لوگوں نے اُن تاجروں سے بھی غلام حاصل کیے جو ایسا مال اسباب براستہ مسقط لے کر آتے تھے۔ سندھ میں غلامی پر پابندی لگائے جانے کے بعد بھی، اور سلطان زنجبار اور شاہِ فارس کے انگریزوں سے معاہدوں کے باوجود، خیال کیا جاتا ہے کہ ان ساحلوں پر غلاموں کی تجارت جاری رہی۔

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں ایران کے ساحلی علاقوں میں شدید قحط اور غلاموں کی بغاوتوں کے نتیجے میں بہت سے غلام آزاد ہوئے، اور غلام اور غیر غلام آبادی کے بڑے حصے نے مشرق کی سمت فرار اختیار کیا۔ ان میں سے کچھ مشرقی مکران میں بس گئے جبکہ زیادہ تر کراچی پہنچے اور پرانے شہر کے لیاری کوارٹر میں آباد ہوئے جہاں نو آزاد شیدی تاجر پہلے سے سکونت پذیر تھے۔ لیاری کے بغدادی نامی محلے میں خصوصاً ان سیاہ فام افراد کی بڑی تعداد آباد ہوئی۔ لیاری مختلف گروہوں اور تہذیبوں کے ملاپ کا مرکز بن گیا۔ مکران سے آنے والوں کو مکرانی، لس بیلہ سے آنے والوں کو لاسی، اور قحط کے باعث کچھ سے ہجرت کر کے آنے والوں کو کچھی پکارا جانے لگا۔ تاہم اکثر باہر کے لوگوں کے لیے مکرانی کا لفظ افریقی نسل کے تمام باشندوں کا نام بن گیا۔ لیاری کے علاقے میں سندھی اور بلوچی دونوں زبانیں بولی جاتی تھیں، مگر بیشتر سیاہ فام باشندے بلوچی کو اپنی پہلی زبان قرار دیتے تھے۔ لس بیلہ سے آنے والے سیاہ فاموں کا ایک چھوٹا سا گروپ سندھی زبان کی لاسی بولی بولتا تھا۔ سیاہ فام لوگ کراچی کے دوسرے حصوں میں بھی پھیل گئے، خاص طور پر شہر کے مضافات میں ملیر کے زرعی علاقوں میں جہاں انھوں نے دوسرے بلوچ یا جوکھیو زمین داروں کے پاس کھیت مزدور کے طور پر کام شروع کر دیا۔

بلوچ باریم

برطانوی حکومت کے دوران، انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں، کراچی ایک اہم بندرگاہ اور تجارتی مرکز کے طور پر ابھرا۔ عرشے کے مزدوروں، قلیوں اور گدھا گاڑی چلانے والوں کے علاوہ ماہی گیر اور کشتیوں پر کام کرنے والے بھی لیاری سے فراہم ہوئے۔ جب رفتہ رفتہ کراچی میں

چھوٹے پیمانے پر صنعتی کام شروع ہوا تو اس کے لیے مزدور بھی لیاری سے آئے۔ ۱۹۳۰ کی دہائی کے لگ بھگ لیاری نے ایک طرح سے بلوچ ہارلیم (Harlem) کی صورت اختیار کر لی۔ غریب اور مزدور پیشہ لوگوں کے بے ترتیب سے ہوئے مکانوں پر مشتمل اس آبادی نے، جہاں کوئی شہری سہولت موجود نہ تھی، ان سرگرمیوں کو میدان فراہم کیا جن کے لیے بلوچستان کے قبائلی معاشرے کا ماحول سازگار نہ تھا۔ یہاں بلوچ دانشور حلقوں میں سامراج کی مخالفت، قوم پرستی اور مارکسزم کا چرچا ہونے لگا۔ بلوچ ادبی تحریکیں شروع ہوئیں، بلوچی زبان کی ترویج کے لیے ادارے قائم ہوئے، بلوچی رسم الخط وضع کیا گیا، بلوچی سکھانے کا پہلا قاعدہ تیار کیا گیا، ڈرامے لکھے اور اسٹیج کیے گئے، بلوچی شاعری کے مجموعے شائع ہوئے، موسیقار گروپ سے اور سیاسی شخصیات اُبھریں۔ بلوچ نشاۃ ثانیہ کے یہ تمام ثمر یہاں سے بلوچستان پہنچتے رہے جو نوآبادیاتی دور ختم ہونے کے بعد ایسا تشخص حاصل کرنے کے لیے کوشاں تھا۔

اس تحریک کے رہنماؤں اور اس میں حصہ لینے والوں کی جلد کی رنگت غیر اہم تھی۔ وہ سب بلوچ تھے اور انھیں برابر کا درجہ دیا جاتا تھا۔ اس تحریک کے بہت سے سابقہ اور حالیہ رہنما افریقی نژاد ہی ہیں۔

سیاہ فام بلوچ فنکاروں میں سے چند ایک نے قومی اور بین الاقوامی سطح پر شہرت حاصل کی۔ بلاول بلیجم (اصل نام محمد بلاول) نے ایک غیر روایتی ساز بینجو بجانے میں مہارت حاصل کی اور اس ساز پر سندھی اور بلوچی موسیقی میں شاندار دھنیں پیدا کیں۔ ۱۹۲۹ میں ایک مزدور گھرانے میں جنم لینے والے بلاول نے ریڈیو پاکستان سے اپنی فنکارانہ زندگی کا آغاز کیا اور اس کے بعد ٹیلی وژن اور اسٹیج پر بھی اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ پاکستان کے سرکاری طائفوں میں شامل ہو کر اس نے بہت سے ملکوں کا دورہ کیا۔ ابتدائی حوصلہ افزائی اسے اپنے ماں باپ سے حاصل ہوئی، اس کی ماں مانگی ایک ممتاز مغنیہ اور باپ جھنک ایک ساز کورانک بجانے کا ماہر تھا۔ بلاول نے چند سال پہلے وفات پائی اور ایک تخلیقی فنکار کے طور پر ایک قابلِ قدر ورثہ چھوڑا۔ اس کی جلد کی رنگت، گھونگریالے بالوں اور موٹے ہونٹوں کے باعث اس کی افریقی اصل سے انکار ناممکن تھا۔ لیکن متعدد ایسے مخلوط النسل فنکار بھی موجود ہیں جو اپنے افریقی ورثے سے انکار کرتے ہیں۔

لیاری کے لوگ، خصوصاً افریقی نژاد پاکستان میں فٹ بال کے بہترین کھلاڑی ہیں۔ برصغیر کی تمام بڑی فٹ بال ٹیموں میں لیاری کے کھلاڑی شامل ہوتے تھے اور بڑے بڑے اعزاز حاصل کرنے والے اکثر سیاہ فام ہوتے تھے۔ ۱۹۵۰ اور ۱۹۶۰ کی دہائیوں میں شہرت پانے والا ایسا ایک پیشہ ور کھلاڑی محمد عمر تھا۔ اس نے پاکستان کی طرف سے تیرہ مرتبہ کھیل کر، جن میں سے پانچ مرتبہ وہ ٹیم کا کپتان تھا، بین الاقوامی شہرت حاصل کی۔ غلام عباس اور استاد شیدو دوسرے مشہور مکرانی کھلاڑیوں میں شامل رہے ہیں۔ آج اگرچہ حکومت کی جانب سے کوئی اعانت نہیں کی جاتی، کراچی میں بلوچوں کی ۳۷۰ رجسٹرڈ فٹ بال ٹیمیں موجود ہیں۔

سیاسی کردار

رطانوی دور میں لوکل سیف گورمنٹ کے تجربے کی بدولت بہت سے ممتاز سیاسی رہنما ابھرے۔ ان میں اللہ بخش گبول کا نام بھی شامل ہے جو کراچی کے میئر بھی تھے۔ ان کی ماں افریقی نژاد تھیں اور خود انھوں نے بھی سیاہ فام عورت سے شادی کی۔ ان کا وکیل بیٹا عبدالستار گبول ۱۹۷۰ میں لیاری سے قومی اسمبلی کا رکن منتخب ہوا۔ ۱۹۷۷ میں وہ دوبارہ منتخب ہوا اور ذوالفقار علی بھٹو کی کابینہ میں وزیر بنا۔ لیاری کے لوگ بھٹو کے دل و جان سے حامی رہے اور جنرل ضیاالحق کی فوجی آمریت کی ڈٹ کر مخالفت کرتے رہے۔ اس کے عوض ان پر سخت تشدد کیا گیا اور صوبے کے باہر سے آنے والے حکام انھیں حقارت سے بگڑو کہنے لگے۔ ۱۹۸۶ میں بعد ازاں کے علاقے میں ایسے ہنگامے ہوئے جن سے ریاست ہائے متحدہ امریکا کے واٹس اور میامی کے بلووں کی یاد تازہ ہوتی تھی۔ بھٹو کی پیپلز پارٹی کے بیش تر مقبول نعرے اور انتخابی مہم کے نعمے لیاری ہی نے فراہم کیے تھے اور یہیں سے موجودہ وزیراعظم بے نظیر بھٹو نے بھی [۱۹۸۸ کے] انتخابات میں کامیابی حاصل کی۔

آج کراچی میں تخمیناً ساڑھے تین لاکھ بلوچ آباد ہیں جن میں سے کم از کم نصف افریقی نژاد ہیں۔ لیاری کے رہنے والوں کی حالت اکثریت غریب ہے اور بُرے حالات میں زندگی بسر کرتی ہے۔ ان میں سے جن کی رنگت زیادہ سیاہ ہے ان کی حالت زیادہ خراب ہے، کیوں کہ ان کی جلد کی خالص رنگت ان کے سماجی طور پر ترقی نہ کر پانے کی غمازی کرتی ہے۔ مفلسی اور بےروزگاری نے، امریکی سیاہ فام باشندوں کی طرح ان میں بھی احساسِ بےگانگی پیدا کر دیا ہے جس کے باعث پولیس کی نظر میں مکرانی ایک جرائم پیشہ طبقہ بن گئے ہیں ــــ پاکستان کے غیر سندھی اور غیر بلوچ اسی اسٹیریوٹائپ پر یقین کرنے لگے ہیں۔

لیاری کے لوگ سندھ اور بلوچستان کے درمیان ایک کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں اور دونوں قومیتوں کی یکجہتی روح کا مظہر ہیں۔ ان میں سے بہت سوں کے رشتےدار اندرونِ سندھ میں بھی ہیں اور بلوچستان، خصوصاً ضلع مکران، میں بھی۔ کراچی سے مغرب کی جانب تین سو میل دور ایران کی سرحد تک پھیلے ہوئے ساحلِ مکران پر ماہی گیروں کی متعدد بستیاں آباد ہیں، مثلاً گوادر، پسنی، اورماڑہ اور جیوانی۔ ان مقامات پر کل آبادی کے دس سے بیس فیصد لوگوں کے خدوخال صاف افریقی ہیں، جبکہ اس سے کہیں زیادہ تعداد کم سیاہ رنگت والے لوگوں کی ہے جن میں افریقی خون شامل ہے۔ ساحلِ مکران اس اعتبار سے بلوچستان میں منفرد مقام رکھتا ہے کہ یہاں کا معاشرہ قبائلی سے زیادہ شہری (civic) خصوصیات رکھتا ہے۔ بیش تر سیاہ فام لوگ ماہی گیروں، ملاحوں اور حمالوں کے طور پر کام کرتے ہیں۔ وہ سماجی اور معاشی اعتبار سے دوسرے بلوچوں سے کمتر سطح پر ہیں۔ ۱۹۷۰ کی دہائی میں ان کی خاصی تعداد عمان کی فوج میں بھرتی ہو گئی تھی۔ اُسی دہائی کے آغاز سے، خلیجی ملکوں میں تیل کی دولت کی فراوانی کے زیرِاثر، بلوچ

مزدوروں کے خلیج کی ریاستوں میں کام کرنے کا رجحان بڑھا ہے۔ اس کے نتیجے میں بہت سے نچلے طبقے کے خاندانوں کی مالی حالت بہتر ہو گئی ہے، ان میں افریقی نژاد خاندان بھی شامل ہیں۔

مگر مکران ضلعے کے اندرونی حصوں میں اور بلوچستان کے ملحقہ علاقوں میں، جہاں ماضی میں افریقی غلاموں سے کھجور کے کھیتوں میں کام کرایا جاتا تھا، بہت سے افریقی نژاد باشندے بیگار مزدوروں (bonded labourers) کے طور پر آج بھی کام کرتے ہیں۔ خاوا کی پھلیوں کی بھوسی الگ کرنے کا کمر توڑ مشقت کا کام نہایت قلیل اُجرت پر سیاہ فام باشندوں ہی سے کرایا جاتا ہے۔ اگرچہ قلات کے حکمران نے، ہندوستان کی انگریزی حکومت کے دباؤ پر، غلامی کا نظام ۱۹۱۴ میں قانونی طور پر ممنوع کر دیا تھا، مگر ۱۹۵۰ تک صاحبِ حیثیت گھرانوں میں غلام رکھنے کا عام رواج تھا۔ آج بھی بعض جاگیرداروں اور ملاؤں کے گھروں میں ایسے افریقی نژاد خدمت گار موجود ہیں جنہیں غلام کی تعریف میں شامل کیا جاسکتا ہے، کیوں کہ انہیں اپنے مالکوں کو چھوڑ کر جانے کا اختیار حاصل نہیں، انہیں روٹی، کپڑے اور مکان کی قلیل ترین سہولتوں کے سوا کوئی اجرت نہیں دی جاتی اور انہیں چوبیس گھنٹے مالکوں کے احکام کا منتظر رہنا پڑتا ہے۔ دوسری طرف مخلوط نسل کے متعدد افراد نے سماجی اثرورسوخ اور سیاسی طاقت حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ ان میں سے ایک بلوچستان کی صوبائی کابینہ میں وزیر کے عہدے تک پہنچا۔ سیاہ فام بلوچ یا تو سنّی مسلمان ہیں یا ان کا تعلق مخصوص ذکری فرقے سے ہے۔

افریقی کلچر

اس سلسلے میں کسی باضابطہ تحقیق کی غیر موجودگی کے باعث افریقی کلچر کے اُن عناصر کی نشان دہی مشکل ہے جو پاکستان کے افریقی نژاد باشندوں میں اب تک موجود ہیں۔ شیدی رقص، جو مگارمس کی تیز تھاپ کے ساتھ یا اس کے بغیر کیا جاتا ہے، پاکستان میں افریقی کلچر کی واضح ترین باقیات کے طور پر معروف ہے۔ یہ رقص صرف منگھوپیر کے میلے ہی میں نہیں بلکہ کراچی اور مکران کی متعدد خانقاہوں پر اور ان علاقوں میں بلوچوں کی شادی کی تقریبوں میں بھی کیا جاتا ہے، اسے، کچھ تبدیلیوں کے ساتھ پاکستان کے لوک رقص کا بھی حصہ بنالیا گیا ہے اور اسے ٹیلی وژن اور اسٹیج پر اکثر پیش کیا جاتا ہے۔ سندھ کے اندرونی علاقوں میں شیدی اب بھی الاؤ جلا کر مگارمس کی تال پر اس کے گرد رقص کرتے ہیں۔

علاوہ ازیں، ایک افریقی رواج، جو گواتی کہلاتا ہے اور جس سے باہر کے لوگ عموماً لاعلم ہیں، افریقی طرز پر آسیب اتارنے اور علاج کرنے کا بھی ہے۔ ایسے لوگ، اکثر عورتیں، جن کے بارے میں سمجھا جائے کہ ان پر کسی بدروح یا جن کا سایہ ہے یا جو جسمانی یا ذہنی امراض میں مبتلا ہوں، معالج کے پاس لے جائے جاتے ہیں جو عموماً کوئی افریقی نژاد عورت ہوتی ہے۔ اب تو بہت سے بلوچ مرد بھی گواتی کی مانند جن اتارنے کا دھندا کرنے لگے ہیں۔ یہ رسم کئی دن تک جاری رہ سکتی ہے؛ اس دوران ڈھول

کی تھاپ پر رقص کیا جاتا ہے اور ایک ایسی زبان میں ارواح کو للکار کر بلایا جاتا ہے جس کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ یہ کوئی افریقی بولی ہے۔ اس رسم میں مرغی یا بکری کی قربانی بھی دی جاتی ہے اور اس کا خون مریض کی پیشانی اور دوسرے اعضا پر بھی ملا جاتا ہے۔ اس دوران شاندار طعام بھی پیش کیا جاتا ہے۔

لیاری کی سیاہ فام عورتیں غالباً پاکستان کی سب سے زیادہ آزاد (liberated) عورتیں ہیں، اور ان کو اپنے سڑک پر چلتے پھرتے دیکھ لیے جانے سے کسی قسم کی الجھن نہیں ہوتی۔ ملک بھر میں کہیں اور آپ انتخابی فتح کی خوشی مناتی ہوئی عورتوں کو مستی میں سڑک پر رقص کرتا ہوا نہیں دیکھ سکیں گے۔ رقص کرنے اور ساز بجانے سے سیاہ فام لوگوں کی رغبت کو افریقی کلچر کے تسلسل کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ اس خصوصیت نے شیدیوں کی مخصوص خوش مزاج سے مل کر شیدی بادشاہ کی اصطلاح کو جنم دیا ہے جو 'happy-go-lucky Negro" کی طرح کا ایک اور اسٹیریوٹائپ ہے۔ بہت سے سیاہ فام باشندوں کی روزمرہ کی بولی میں کئی ایسے الفاظ شامل ہیں جن کی اصل افریقی ہے۔ لیاری میں ایک سڑک کا نام مومباسا اسٹریٹ ہے، اور سیاہ فام ایک دوسرے کو مذاق میں موماسا کہتے ہیں۔

نسلی احساس

پاکستان کے افریقی نژاد باشندوں کو بظاہر اپنے افریقی نسلی پس منظر کا احساس نہیں ہے۔ ان میں جو افراد تعلیم یافتہ ہیں وہ تو اس حقیقت سے واقف ہیں مگر اکثر ــــ خصوصاً بلوچ ــــ اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ وہ غلاموں کی اولاد ہیں۔ ان میں غریب طبقہ اپنی مالی بدحالی کو طبقاتی فرق سے جوڑتا ہے اور ایسا نہیں سمجھتا کہ اس میں ان کی جلد کی رنگت کا کوئی دخل ہے، کیوں کہ دوسری نسلوں سے تعلق رکھنےوالوں میں بھی ان جیسے غریب لوگ موجود ہیں۔ غلامی کا پس منظر اور سیاہ رنگ کچھ افریقی نژاد لوگوں ہی سے خاص نہیں ہے۔ دوسری نسلوں کے لوگ بھی غلام بنائے گئے تھے، جیسے ترک، جارجیائی اور مقامی لوگ؛ اور دوسرے گروہوں کے لوگوں کی رنگت بھی ان جیسی، اور کبھی کبھی ان سے زیادہ، سیاہ ہو سکتی ہے۔ یہ معاشرہ سفیدفام حاکموں اور سیاہ فام سابق غلاموں میں بٹا ہوا نہیں ہے۔ علاوہ ازیں، خاص طور پر بلوچ نسل متعین کرنے میں باپ کے نطفے کے فیصلہ کن ہونے کے نظریے پر اتنی سختی سے کاربند ہے کہ مادری ورثے کو سرے سے نظرانداز کر دیتا ہے۔ چناں چہ واضح افریقی خدوخال رکھنے والا کوئی شخص بڑے خلوص سے یہ ایمان رکھ سکتا ہے کہ وہ نسلی اعتبار سے خالص بلوچ ہے۔ تہذیبی طور پر ایک ایسے معاشرے کا حصہ ہونے کے باعث جو نہ صرف قانونی اور نظریاتی طور پر، بلکہ بڑی حد تک عملی اعتبار سے بھی ایک غیر نسل پرست معاشرہ ہے، افریقی نژاد لوگ پسند نہیں کرتے کہ انھیں ان کا نسلی طور پر مختلف پس منظر یاد دلایا جائے۔ البتہ یہ معاشرہ جلد کی رنگت کے بارے میں خاصا حساس ہے، خصوصاً اس وقت

جب کسی مرد کے لیے بیوی کا انتخاب کیا جا رہا ہو۔ چناں چہ ایک ایسے معاشرے میں جہاں گورے رنگ کو فوقیت دی جاتی ہو، کسی شخص کے لیے اپنے افریقی پس منظر پر اصرار نہ کرنے کا جواز موجود ہے۔

تاہم بعض سیاہ فام دانشوروں نے، ایسی دشوار صورتِ حال پر غور کر کے، اپنے ہم نسل لوگوں کی حالت پر نظر ڈال کر یا دنیا بھر میں سیاہ فاموں کو پیش آنے والی سچائی کے بارے میں پڑھ کر، افریقا اور دنیا کے مختلف خطوں میں پھیلے ہوئے افریقی نژاد باشندوں سے اپنی وابستگی کا اظہار کیا ہے۔ ان میں سے محمد صدیق مسافر نے اپنی مختصر سندھی کتاب غلامی اور آزادی کے آنکھیں کھول دینے والے حالات کے ۱۳۸ میں سے ۴۴ صفحات امریکی شیدیوں کے حالات پر لکھے ہیں۔ سندھ میں غلاموں کو پیش آنے والی سختیوں کا ذکر کرتے ہوئے، وہ کہتے ہیں یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ امریکا میں افریقی غلاموں کو جس ظلم، نفرت اور حقارت کے برتاو کا سامنا کرنا پڑا، وہ برتاو سندھ میں غلاموں کے ساتھ نہیں کیا گیا۔ ان کی کتاب میں بار بار افریقی نژاد امریکیوں سے یک جہتی کا اظہار ملتا ہے اور سندھی شیدیوں کو سماجی ترقی کے سلسلے میں ان کی مثال سامنے رکھنے کی تلقین بھی کی گئی ہے۔ اس میں فریڈرک ڈگلس اور بُوکر ٹی واشنگٹن کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے۔ مسافر کی ماپختہ یان افریکن ازم اس کتاب کے علاوہ ان کی ایک نظم افریقا کا تحفہ سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔

معاصر بلوچی ادب، جس کی نمایاں خصوصیت اس کا انقلابی مواد ہے، افریقیت (negritude) کی چھاپ سے مکمل طور پر آزاد ہے۔ سیاہ فام بلوچ شاعر بھی غیر ملکی، طبقاتی اور قومیتی جبر کو موضوع بناتے ہیں۔ البتہ حال ہی میں ایک نوجوان افریقی نژاد بلوچ شاعر ن م دانش نے اردو میں سیاہ فاموں کی دنیا بھر میں تذلیل کے موضوع پر نظمیں لکھی ہیں۔

بین الاقوامی تہذیبی لین دین، بیرونِ ملک سفر اور غیر ملکی، خصوصاً امریکی پروگراموں کے ٹیلی وژن پر نشر کیے جانے کی بدولت پاکستان کے افریقی نژاد باشندوں میں افریقا اور دنیا بھر میں پھیلے ہوئے افریقیوں کے بارے میں آگاہی بڑھ رہی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے جب سندھ کی ایک شیدی لڑکی گھانا کے ایک طالبِ علم سے شادی کر کے افریقا واپس چلی گئی تو مقامی اخبار میں اصل کی طرف واپسی کا تھوڑا بہت غلغلہ بلند ہوا تھا۔

پاکستان کے افریقی نژاد باشندوں کی موجودہ پست سماجی اور معاشی حالت کی تاریخی جڑیں تو ان کے آباواجداد کے غلام بنا کر یہاں لائے جانے میں تلاش کی جا سکتی ہیں، لیکن ان کی زندگی کے حقائق اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ مساوات کے لیے ان کی اُمنگیں، سماجی انصاف اور قومیتوں کے مابین برابری کی وسیع تر جدوجہد کا حصہ ہیں۔ اکیسویں صدی کی جانب دیکھتے ہوئے یہ لوگ ایک جمہوری اور منصفانہ معاشرے کے خواہاں ہیں جس میں تمام نسلی پس منظر رکھنے والے گروہ وقار کے ساتھ زندہ رہ سکیں اور ترقی کر سکیں۔ افریقی اکائی کا یہ ایک ایسا جز ہے جو اپنی شناخت بحیثیت سیاہ فام افریقی کرانا بالکل نہیں چاہتا۔

**

اگلا مضمون گوپال داس کھوسلا (G D Khosla) کی کتاب *Stern Reckoning* کے ایک باب کے ترجمے پر مشتمل ہے۔ کھوسلا کی یہ کتاب پہلی بار ۱۹۴۹ میں چھپی تھی۔ اس کا ذیلی عنوان A Survey of the Events leading up to and following the Partition of India تھا اور اس میں فسادات کا شکار ہو کر پاکستان میں شامل ہونے والے علاقوں سے ہجرت کرنے والے ہندوؤں اور سکھوں کی زبانی فسادات کی تفصیلات جمع کی گئی تھیں۔ اپنے ماخذات کے محدود ہونے کے باعث کتاب کا یک طرفہ ہونا ناگزیر تھا، اور اس میں بیان کردہ بعض واقعات کی صحت پر اعتراضات بھی کیے گئے ہیں، تاہم معاصر تاریخ کی حیثیت سے اس کتاب کی اہمیت مسلم ہے۔ کتاب کا دوسرا ایڈیشن، جس سے یہاں استفادہ کیا گیا ہے، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، نئی دہلی، نے ۱۹۸۹ میں شائع کیا۔

کتاب کا جو باب اشاعت کے لیے منتخب کیا گیا ہے وہ سندھ اور بلوچستان کے بارے میں ہے۔ اس باب کے پہلے حصے میں سندھ کی ۱۹۴۷ سے پہلے کی سیاست کا پس منظر بیان کیا گیا ہے اور اس کے بعد فرقہ وارانہ کشیدگی اور فسادات کے واقعات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ کراچی کی تاریخ کے تعلق سے یہ مضمون بہت اہم ہے کیوں کہ یہ ان حالات کی تصویر پیش کرتا ہے جن کے باعث سندھ کے ہندوؤں اور سکھوں کو ہجرت پر مجبور ہونا پڑا۔ اُن دنوں ٹرین کے ذریعے پنجاب سے گزر کر جانا سخت خطرناک تھا، اس لیے سندھ سے غیر مسلموں کی ہجرت زیادہ تر کراچی کے راستے بحری جہازوں کے ذریعے سے ہوئی۔ اس مضمون میں کراچی کے ۶ جنوری ۱۹۴۸ کے فسادات کا بھی تفصیلی ذکر ہے جن میں رتن تلاؤ میں واقع گردوارے میں بہت سے سکھ ہلاک کر دیے گئے تھے۔

گوپال داس کھوسلا

انگریزی سے ترجمہ اجمل کمال

سندھ کی سیاست اور ہندو مسلم فسادات

سیاسی پس منظر

سندھ کے نئے قائم شدہ صوبے (۱) میں واقعات نے ایسا منفرد راستا اختیار کیا۔ ہندوستان کے اس خطّے کو مسلمانوں نے سب سے پہلے فتح کیا تھا اور یہ ہمیشہ سے مسلمانوں کا مضبوط گڑھ رہا ہے۔ برطانوی حکومت کے زمانے میں یہ انتظامی لحاظ سے ۳۱ مارچ ۱۹۳۶ تک بمبئی پریزیڈنسی کا حصہ رہا۔ یہ صوبہ معاشی اعتبار سے خوش حال نہ تھا اور، کراچی کی بندرگاہ کے موجودہ مقام تک پہنچنے سے پہلے، مالیاتی اعتبار سے بمبئی پر ایک بوجھ سمجھا جاتا تھا۔ بمبئی پریزیڈنسی کے ہندو رہنما اس بوجھ کو اتار پھینکنے کے لیے بے تاب تھے اور اکثر سندھ کو بمبئی سے الگ کر دینے پر زور دیا کرتے تھے۔ پہلے پہل اس تجویز کو توجہ کے قابل نہ سمجھا گیا کیوں کہ برطانوی حکومت اسے ناقابلِ عمل سمجھتی تھی۔ مگر رفتہ رفتہ پنڈولم بالکل مخالف نقطے پر جا پہنچا جب کراچی کی بندرگاہ سے ہونے والی آمدنی میں اضافہ ہوا اور سندھ کے مسلمانوں نے سندھ کی بمبئی سے علیحدگی کے لیے ایجی ٹیشن شروع کیا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ کسٹم کی آمدنی کو صوبائی ریوینیو کے حوالے کیا جائے تاکہ سندھ ایک خود کفیل صوبہ بن سکے۔ جس دوران برطانوی حکومت اس سلسلے میں کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی، سر ہز ہائینس آغا خاں نے تاجِ برطانیہ کے لیے اپنی سالہاسال کی خدمات کے عوض، اور اس کے علاوہ اپنے نقد اور سونے کے پیش بہا خزانے سے ایک خطیر رقم ادا کر کے، اس صوبے کو خرید لینے کی پیش کش کی۔ آغا خاں کے نوابِ سندھ بن جانے کا امکان بہت سے لوگوں کے لیے ناخوشگوار نہیں تھا اور انھیں اپنی تجویز کے لیے، خصوصاً برطانوی اشراف کے راسخ عناصر کی جانب سے، خاصی حمایت حاصل ہو گئی۔ البتہ ہندوستانی رائے عامہ اس رجعت پسندانہ قدم کے سخت خلاف تھی کیوں کہ اس کا مطلب ایک بالکل غیر ضروری مطلق العنان ریاست کا قیام ہوتا اور جب وزیرِ ہند نے اعلان کیا کہ آغا خاں کی درخواست مسترد کر دی گئی ہے تو اس خبر کو ایک تسکین کے احساس کے ساتھ سنا گیا۔ اس کے کچھ ہی عرصے بعد گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ، ۱۹۳۵ ، منظور ہوا جس

کے تحت سندھ ایک علیحدہ صوبہ بن گیا۔
۱۹۴۱ کی مردم شماری کے مطابق صوبے کی کل آبادی بیستالیس لاکھ پینتیس ہزار تھی جس میں سے ستر اعشاریہ سات فیصد مسلمان آبادی تھی۔ صوبے کی معیشت کا انحصار بڑی حد تک زراعت پر ہے اور وہاں کوئی خاص اہم صنعت موجود نہیں۔ مشاہدہ کیا گیا ہے کہ صوبے کا صرف نصف سے کچھ کم رقبہ قابل کاشت ہے کیونکہ وہاں بڑے بڑے ریتیلے علاقے موجود ہیں جہاں کچھ نہیں اُگتا۔ حقیقت میں پورے رقبے کے پانچویں حصے سے بھی کم پر کاشت ہوتی ہے۔ صوبے نے آب پاشی کی اسکیموں پر بڑی بڑی رقمیں خرچ کی ہیں اور اس کے باوجود کہ آبپاشی کے اخراجات تقریباً ایک کروڑ ستر لاکھ سرسٹھ ہزار روپے سالانہ ہیں، آبیانے اور لینڈ ریوینیو سے ہونے والی آمدنی صرف ایک کروڑ پچیس لاکھ چھبیس ہزار روپے ہے۔ ملک کی تقسیم سے پہلے سندھ کو مرکزی ریوینیو سے ایک کروڑ پانچ لاکھ روپے کی امداد ملتی تھی جس کے بغیر صوبے کے بجٹ کو ہموار کرنا ناممکن تھا۔ ان حقائق سے اس چھوٹے صوبے کی مفلسی کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔(۲) ہندو بیشتر چھوٹے دکاں دار، غریب مزدور یا مسلمان زمین داروں کے کاشتکار (tenants) تھے۔ اگرچہ ہندوؤں کی ایک خاصی بڑی تعداد شہری علاقوں میں آباد تھی جہاں وہ تجارتی یا صنعتی سرگرمیوں میں مشغول تھے لیکن یہ تعداد کل ہندو آبادی کا بہت مختصر حصہ تھی۔ چند ہندو زمیندار بھی تھے لیکن ان کی تعداد بہت غیر اہم تھی۔ پنجاب کے غیر مسلموں کے برعکس، سندھ کے ہندو زور آور یا جارحانہ مزاج رکھنے والے نہ تھے۔ وہ سیاسی ایجی ٹیشن میں حصہ لینے یا اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کرنے کے بھی عادی نہ تھے۔ تاثر یہ ملتا ہے کہ ہندوؤں نے خود کو اس نظریے سے مفاہمت پر آمادہ کر لیا تھا کہ سندھ کے مسلمان ایک برتر طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور انہیں ہندوؤں سے زیردستوں کا سا برتاؤ کرنے کا حق حاصل ہے۔ مزدور اور غریب کاشتکار خاص طور پر مسکین تھے اور کسی بھی مسلمان غنڈوں کی مزاحمت کرنے یا جائیداد کے سلسلے میں اپنے تھوڑے بہت حقوق پر اصرار کرنے کو تیار نہ تھے۔ جب ہنگامے شروع ہوئے تو نسلی طور پر ان کا پہلا ردعمل وہیں ٹھہر کر مقابلہ کرنے کے بجائے بھاگ کھڑے ہونے کا ہوتا تھا۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ (۱۹۳۵) کے تحت کرائے جانے والے پہلے انتخابات کے نتائج سے یہ بات واضح ہو گئی کہ سندھ میں کوئی پائیدار حکومت قائم کرنا آسان کام نہیں ہوگا۔ پارٹیوں کی صورت حال یہ تھی کہ کسی واحد پارٹی کو ایوان میں مطلق اکثریت حاصل نہ تھی۔ مسلم لیگ کو ساٹھ میں سے صرف آٹھ نشستیں حاصل ہوئی تھیں۔ سب سے زیادہ تعداد میں نشستیں آزاد امیدواروں نے حاصل کی تھیں جو کسی پارٹی سے وابستہ نہ تھے۔ خودغرض ممبروں سے ناگوار سودے بازی کرنے کے بعد سر غلام حسین ہدایت اللہ وزارت بنانے میں کامیاب ہو سکے۔ مگر وہ زیادہ عرصے تک اقتدار میں نہ رہ سکے اور کانگریس اور اللہ بخش گروپ نے مل کر انہیں جلد ہی شکست دے دی۔ اب اللہ بخش سومرو وزیراعظم بن گئے اور ایسے

کار کے لیے کانگریس کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ اللہ بخش میں قومی نیشنلسٹ رجحان موجود تھا اور وہ مسلم لیگ کے پروگرام کے حامی نہ تھے۔ یہاں تک کہ انھوں نے ایسے حامی ممبروں کے ساتھ کانگریس میں شامل ہونے کی بھی پیش کش کی بشرطیکہ کانگریس پائیدار وزارت بنانے میں ان کی مدد کرے۔ لیکن مولانا ابوالکلام آزاد نے، جنھیں اس معاملے کا تصفیہ کرانے کا کام سونپا گیا تھا، مشورہ دیا کہ صوبے کے مفاد کے لحاظ سے بہتر ہوگا کہ ایک متحدہ مسلم پارٹی بنائی جائے جو اپنی تمام توجہ اور توانائی معاشی اور سماجی ترقی پر مرکوز کردے۔ اگر اللہ بخش ایسا کرنے میں کامیاب ہو جائے تو مسلم لیگ کی سندھ میں کوئی قوت باقی نہ رہتی۔ لیکن جناح صاحب نے اس متحدہ مسلم پارٹی کے قیام کا راستا روک دیا اور مسلم لیگ کے ممبروں نے اللہ بخش کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ ہندو پارٹی تک نے مسلم لیگ پر مشتمل حزب اختلاف سے اتحاد کر لیا۔ یوں اللہ بخش کی پوزیشن خاصی نازک ہو گئی۔ ۱۳ فروری ۱۹۴۰ کو انھیں رائے شماری میں شکست کا سامنا کرنا پڑا اور چھ دن بعد انھوں نے گورنر کو استعفیٰ پیش کر دیا۔ مگر انھیں کسی پائیدار وزارت کے قیام تک اپنے عہدے پر رہنے کی ہدایت کی گئی۔ ۲۶ فروری کو اسمبلی میں وزارت کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کی گئی اور اللہ بخش نے وزارت ڈھانے کی اس کوشش کا کامیابی سے مقابلہ کیا، حالاں کہ انھوں نے استعفیٰ واپس نہیں لیا تھا اور وزارت سے دست بردار ہونے کی پیش کش پر قائم تھے۔ انھیں عدم اعتماد کی تحریک کے خلاف کامیابی اسپیکر کے کاسٹنگ ووٹ کی بدولت حاصل ہوئی۔ اس خفیف کامیابی سے ظاہر تھا کہ ان کی پوزیشن نہایت غیر محفوظ ہے، اور ۱۸ مارچ ۱۹۴۰ کو ان کا استعفیٰ منظور کر لیا گیا۔ گورنر کے کہنے پر بندے علی خاں ٹالپر نے نئی وزارت بنائی۔ وہ انتظامی صلاحیت کے اعتبار سے بالکل غیر موزوں ثابت ہوئے اور ان کی نااہلی اور خود غرضی کے باعث صوبے کی امن عامہ اور معیشت کی حالت خاصی خراب ہو گئی۔ ایک بار پھر مولانا ابوالکلام آزاد سے صوبے کی سیاسی گتھی سلجھانے کو کہا گیا۔ انھوں نے وہ معاہدہ تیار کیا جسے آزاد پیکٹ کہا جاتا ہے جس کے تحت بندے علی خاں کو استعفیٰ دینے اور اللہ بخش یا سر غلام حسین ہدایت اللہ کو اپنی جگہ وزارت بنانے کی اجازت دینے پر آمادہ کیا گیا۔ اس معاہدے کے تحت نئی حکومت مسلم لیگ کی نہیں ہوگی، گو اس میں لیگ کے ممبر بطور وزیر شامل ہوں گے، اور اسے کانگریس کی بھی حمایت حاصل ہوگی۔ بندے علی خاں نے اس معاہدے کو نافذ کرنے پر رضامندی ظاہر کی مگر بعد میں جناح صاحب کے مشورے پر اس سے دست کش ہو گئے۔ ۸ مارچ ۱۹۴۱ کو اس وزارت کا تختہ الٹ دیا گیا اور اللہ بخش دوبارہ وزارت پر فائز ہو گئے۔ ان کے نیشنلسٹ رجحانات اور پختہ ہو گئے تھے اور وہ انتظامی معاملات میں کانگریس کی ہائی کمان سے کھلم کھلا ہدایات حاصل کرنے لگے۔ اگست ۱۹۴۲ میں کانگریس کی کوئٹ انڈیا قرارداد نے انھیں بے حد متاثر کیا اور انھوں نے اپنا خان بہادر کا خطاب لوٹا دیا۔ انھوں نے اپنے اس فیصلے کی اطلاع وائسرائے ہند کو ایک سخت خط لکھ کر دی، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو دن کے اندر اندر گورنر سندھ نے انھیں گورنر ہاؤس طلب کر کے انھیں سندھ کی وزارتِ عظمیٰ سے فوری طور پر برطرف کر دیا۔ اس کے چند

مہینے بعد (۱۴ مئی ۱۹۴۳ کو) اللہ بخش کو قتل کر دیا گیا۔ اس سلسلے میں جن افراد پر مقدمہ چلا ان میں خان بہادر محمد ایوب کھوڑو بھی شامل تھے جو سر غلام حسین ہدایت اللہ اور سید علی خان کی حکومتوں میں وزیر رہ چکے تھے۔ اللہ بخش کے قتل کے وقت بھی وہ وزیر تھے اور اس مقدمے کا سامنا کرنے کے لیے انہیں وزارت سے علیحدہ کیا گیا۔(۳)

۱۰ اکتوبر ۱۹۴۲ کو سر غلام حسین ہدایت اللہ کو ایک بار پھر وزارت سازی کی دعوت دی گئی۔ اس طرح وہ اقتدار میں واپس آ گئے اور صوبائی گورنر کے ساتھ مختلف سیاست میں شراکت کرتے رہے، یہاں تک کہ پاکستان بن گیا اور انہوں نے خود کو گورنر کے عہدے پر متمکن کر لیا۔ وزیراعظم کے طور پر ان کی پوزیشن کسی بھی طرح سہل نہ تھی، حتیٰ کہ مسلم لیگی ممبروں میں بھی ان کی مخالفت موجود تھی۔ ۱۴ فروری ۱۹۴۵ کو چند مسلم لیگی ووٹوں کی مدد سے ان کی وزارت ڈھا دی گئی۔ ہدایت اللہ نے کسی بگڑے ہوئے بچے کا سا برتاؤ کیا اور اعلان کیا "سندھ اصلاحات کے لیے موزوں نہیں ہے۔ ہم لوگ اس ایوان میں بیٹھ کر فریب دہی کی تربیت دے رہے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ برہمی کے عالم میں باہر نکل گئے۔ لیکن اس شکست کے نتیجے میں انہوں نے اللہ بخش کے بھائی خان بہادر حاجی مولا بخش سومرو کو اپنی کابینہ میں شامل کر لیا جو مسلم لیگ کے ممبر نہ تھے اور ان کو وزیر بنانے کے بدلے میں مسلم لیگ کے حلف پر دستخط کرنے کو کہا گیا۔ مولا بخش نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور مسلم لیگ ہائی کمان کی جانب سے ہدایت اللہ کو ایک بار پھر اپنی کابینہ نئے سرے سے تشکیل دینے کو کہا گیا۔ ۱۲ مارچ ۱۹۴۵ کو ہدایت اللہ نے اپنی کابینہ دوبارہ تشکیل دینے کی غرض سے استعفیٰ دے دیا۔ اس اثنا میں مولا بخش نے گورنر کے پاس جا کر کہا کہ وہ خود پائیدار وزارت قائم کرنے کی پوزیشن میں ہیں بشرطیکہ انہیں بارہ گھنٹے کی مہلت دے دی جائے۔ گورنر کو البتہ اس بات میں کچھ معقولیت نظر نہ آئی کہ مولا بخش کی سودے بازی ہدایت اللہ کے مذاکرات کے مقابلے میں معاملات کو کیونکر زیادہ پائیداری بخش سکتی ہے، چنانچہ اس نے مولا بخش کی تجویز کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

ہدایت اللہ کی نئی وزارت خاصی لڑکھڑاہٹ کے ساتھ چلی لیکن بنیادی طور پر اس وجہ سے قائم رہنے میں کامیاب ہوئی کہ کانگریس اسمبلی پارٹی کو اجلاس میں شریک ہونے کی اجازت نہ تھی۔ اب ہدایت اللہ کا تختہ الٹنے کی کوششیں شروع ہوئیں اور ان کوششوں کی قیادت سندھ صوبائی مسلم لیگ کے صدر جی ایم سید نے کی۔ جی ایم سید کو فوری طور پر مسلم لیگ سے نکال دیا گیا۔ ۸ فروری ۱۹۴۶ کو ہدایت اللہ نے ایک بار پھر اپنی کابینہ تشکیل دی۔ نئی کابینہ کے تمام وزیر مسلم لیگی تھے۔ مخالف گروپ نے جی ایم سید کی قیادت میں ایک مخلوط حزب اختلاف بنائی۔ ۱۹ مارچ ۱۹۴۶ کو ایک وزیر کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کی گئی۔ اس تحریک کو صرف ایک ووٹ سے شکست ہوئی، تیس نے اس تحریک کے خلاف اور انتیس نے اس کے حق میں ووٹ دیا۔ اس سے پہلے کہ اس گرتی ہوئی بےجان وزارت کو کوئی اور نقصان پہنچ سکے، اسمبلی کا اجلاس ملتوی کر دیا گیا۔ اسمبلی کا اگلا اجلاس یکم جولائی ۱۹۴۶ کو ہوا جس کا مقصد

آف انڈیا آئین سازاسمبلی کے لیے ممبروں کا انتخاب تھا۔ پہلے دن ایک بار پھر عدم اعتماد کی تحریک پیش کی گئی، لیکن اس پر بحث ایک تکنیکی نکتۂ اعتراض کے باعث روک دی گئی، اور اگلے دن اجلاس پھر ملتوی کر دیا گیا۔ اے جی ایم سید نے گورنر سے اپیل کی اور کہا کہ لیگ وزارت کو مستعفی ہونے پر مجبور کیا جائے۔ گورنر نے اس سے اتفاق نہ کیا۔ وزارت کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک داخل کی گئی جس پر بحث ۱۰ ستمبر ۱۹۴۶ کو شروع ہونی تھی۔ وزارت کو انتیس ووٹ ملنے کی توقع تھی جبکہ حزب اختلاف تیس ممبروں پر مشتمل تھی۔ ساٹھواں ممبر اسپیکر کے عہدے پر فائز تھا جس کا تعلق مسلم لیگ سے تھا لیکن اس کے لیے ووٹ دینا ممکن نہ تھا۔ اس طرح توقع کی جارہی تھی کہ تحریک ایک ووٹ سے کامیاب ہو جائے گی۔ اس بدقسمتی کا مقابلہ کرنے کے لیے اسپیکر نے خودعاید کردہ اور بے بس غیرجانبداری کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا تاکہ تحریک کے خلاف ووٹ دے سکے۔ اب دونوں فریقوں کے پاس تیس تیس ووٹ ہو گئے۔ تحریک کے زیربحث آنے کے دن ڈپٹی اسپیکر مس جیٹھی سپاہیملانی کو اجلاس کی صدارت کرنی پڑتی اور یوں حزب اختلاف کے پاس ایک ووٹ کم ہو جاتا۔ اسپیکر کے استعفے نے بازی اُلٹ دی تھی اور اب عدم اعتماد کی تحریک ایک ووٹ سے ناکام ہو جانے والی تھی۔ اس صورت حال کے مقابلے کے لیے مس سپاہیملانی نے ڈپٹی اسپیکر کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسپیکر کی کرسی پر بیٹھنے کے لیے کوئی شخص باقی نہ بچا۔ ماضی میں، ایسے موقعوں پر جب اسپیکر اور ڈپٹی اسپیکر دونوں موجود نہ تھے، ایک یورپین مسٹر فریزر اجلاس کی صدارت کر چکے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اس بار بھی اسپیکر کی کرسی پر بیٹھنے کے لیے آمادگی ظاہر کی، لیکن چوں کہ وہ حکومت کے طرفدار تھے، ان کے اجلاس کی صدارت کرنے کا مطلب حکومت کے لیے ایک ووٹ کا نقصان ہوتا۔ یوں ایک سخت تعطل پیدا ہو گیا اور لوگ بےتابی سے انتظار کرنے لگے کہ دیکھیں اسے کیوں کر ختم کیا جاتا ہے۔ آخر گورنر نے اس مسئلے کو حل کیا اور اپنے خصوصی اختیارات استعمال کرتے ہوئے اسمبلی توڑ دی تاکہ نئے انتخابات کرائے جا سکیں۔

اس دوران ہدایت اللہ وزارت قائم رہی اور انتخابات کے نتائج کو اپنے حق میں موڑنے کے لیے ہر قسم کے دباؤ اور اثرورسوخ سے کام لیتی رہی۔ ووٹروں کو ڈرایا دھمکایا گیا اور مسلم لیگ کے امیدواروں کا ساتھ دینے پر مجبور کیا گیا۔ جی ایم سید کے ایک حامی سید مراد علی شاہ کو مسلم لیگ کے ایک کارکن نے اُن کے گاؤں میں گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ مخلوط پارٹی کے ایک اَور حامی سید حسنڈیال شاہ کو گرفتار کر لیا گیا اور ضمانت پر رہا نہ کیا گیا۔ حاجی مولا بخش نے مسلم لیگ کے ایک امیدوار کے مقابل انتخاب لڑا اور انھیں کامیاب قرار دیا گیا۔ لیگ کے غنڈوں نے اپنی ہار کا بدلہ لینے کے لیے ریونیو کمشنر اور ریٹرننگ آفیسر کے دفتر کے باہر اُن پر حملہ کیا۔ انھیں ریٹرننگ آفیسر اور پولیس کی موجودگی میں گالیاں دی گئیں اور مارا پیٹا گیا، مگر کسی نے مداخلت نہ کی۔ حاجی مولا بخش کے بیٹے منصور کو بھی مسلم لیگ کے غنڈوں نے زدوکوب کیا۔ انتخابات سے ذرا پہلے آزاد ہندو عملدار کاروں کا تبادلہ کر دیا گیا۔ ایک مسلمان پریزائیڈنگ

آفیسروں کو جو انہیں دیا جانے کے لیے مشہور تھے، استعفیٰ دینے پر مجبور کیا گیا۔ ایک سرکاری اہلکار نے چھٹی لے کر کھلم کھلا لیگ کے ایک امیدوار کے لیے کام کیا۔ ایک دولت مند زمیندار کو جو بیس سال کی قید کاٹ رہا تھا، وقت سے پہلے رہا کیا گیا۔ ایک اور زمیندار کو اس شرط پر رہیں دی گئی کہ وہ سر غلام حسین کے بیٹے اور ہدایت اللہ کی مدد کرے گا۔ کراچی ضلعے میں جعلی ووٹ ڈالنے کے لیے حیدر آباد سے پانچ سو آدمیوں کو لایا گیا۔ جی ایم سید نے آخری وقت میں اپنے حلقے کے پولنگ اسٹیشنوں اور پریزائیڈنگ اور پولنگ آفیسروں میں تبدیلی کی شکایت کی اور خدشہ ظاہر کیا کہ بڑے پیمانے پر جعلی ووٹ ڈلوانے کا منصوبہ بنایا گیا ہے۔ انتخابات کے نتائج سے ظاہر ہوا کہ یہ تمام ہتھکنڈے اپنا مطلوبہ مقصد حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ مسلم لیگ نے کل ساٹھ میں سے پینتیس نشستیں جیت لیں اور اس طرح سے ایوان میں مطلق اکثریت حاصل کر لی۔

پاکستان کے قیام کے بعد ہدایت اللہ سندھ کے گورنر بن گئے۔ ان کے سابق حامی اور حریف مسٹر ایوب کھوڑو وزیراعظم بنے مگر جلد ہی مسٹر جناح کی ہدایات پر ہدایت اللہ نے انہیں برطرف کر دیا اور انہیں کرپشن اور بدعنوانی کے الزامات کی تحقیقات کے سلسلے میں ایک خصوصی ٹریبونل کے سامنے پیش کیا گیا۔ ان کی جگہ پیر الٰہی بخش کو وزیراعظم بنایا گیا۔ کچھ ہی دنوں بعد کراچی کے پانچ اخباروں نے ان کے خلاف مہم شروع کر دی اور ان کی فوری برطرفی کا مطالبہ کیا۔ ان کے خلاف دائر کی گئی ایک انتخابی عذرداری کے نتیجے میں ان کا انتخاب کالعدم قرار دیا گیا اور انہیں استعفیٰ دینا پڑا۔

سندھ کے سیاسی واقعات کے اس مختصر بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ صوبائی حکومت دراصل انتظامی مشینری کی ایک مضحکہ خیز نقل سے زیادہ کچھ نہ رہ گئی تھی۔ پارٹیوں سے وابستگی کا دارومدار اخلاقی اعتقاد یا عوامی بھلائی کی خواہش کے بجائے ذاتی فائدے پر تھا۔ ۴۶-۱۹۴۵ کے عام انتخابات میں، جو پاکستان کے ایشو پر لڑے گئے تھے، ووٹنگ کا جائزہ لینے سے پتا چلتا ہے کہ صرف ۴۰۳ء۶ فیصد مسلمان ووٹروں نے مسلم لیگی امیدواروں کے حق میں ووٹ دیا، اور کل ووٹوں کے صرف ۲۰۰۸ ووٹ مسلم لیگ کے حق میں پڑے۔ اس طرح، کیونکہ آبادی میں مسلمانوں کی اکثریت تھی، مسلم لیگ کی حمایت انتہائی کمزور تھی۔ ان حالات میں یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ وزیروں کی پوزیشن نہایت ناپائیدار تھی اور حقیر سازشوں کے زور پر وہ اپنے موقف سے ہٹ جاتے تھے۔ اپریل ۱۹۴۱ میں سر ہیو ڈاؤ (Sir Hugh Dow) نے صوبے کے گورنر کا عہدہ سنبھالا، اور اس کے کچھ ہی عرصے بعد حکومت کے روزمرہ انتظامی معاملات میں مداخلت شروع کر دی۔ اللہ بخش کو، جو اس وقت وزیراعظم تھے، اس کیفیت پر سخت ناگواری محسوس ہوئی اور انہوں نے یہ معاملہ اسمبلی میں اٹھایا۔ لیکن وہ خود بے بس تھے اور انہوں نے کہا کہ انہوں نے یہ معاملہ وائسرائے کے سامنے پیش کر دیا ہے، اور یہ بھی کہا کہ ان کا عجلت میں استعفیٰ دے دینا بے سود ہو گا۔ بلاشبہ انہیں احساس تھا کہ جوں ہی انہوں نے استعفیٰ دیا، گورنر کو کوئی اور شخص مل جائے گا جو زیادہ مفاہمت پسند اور کم احتجاج کرنے والا ہو گا۔ جب سیاست میں ذاتی نفع اندوزی ہی بنیادی

مقصد ہو اور متعدد ناپائیدار پارٹیاں مسلسل تبدیلیوں کی زد میں ہوں تو حکومت انتظامی معاملات پر مضبوط گرفت نہیں رکھ سکتی اور نہ امن قائم رکھ سکتی ہے۔ مختلف وزارتیں جنھوں نے سندھ کا اقتدار سنبھالا، اس اہم مسئلے کا سامنا کرنے میں ناکام رہیں۔ بڑے بڑے علاقوں میں انتشار کو پھیل جانے دیا گیا جس نے انتظامی بندوبست کو درہم برہم کر دیا۔ ان ناخوشگوار حالات کو پیدا کرنے میں پیر پگارا اور ان کے بدنام غارت گروں کے ٹولے نے کچھ کم حصہ نہیں لیا۔ ۱۹۴۲ میں پیر کے پیروکاروں نے، جن کی تعداد ہزاروں میں تھی، وسیع پیمانے پر قتل، غارت گری اور ڈکیتی کے بل پر پورے پورے ضلعوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جون ۱۹۴۲ میں سندھ میں مارشل لا نافذ کر کے ہی پیر کے ان جنونی مریدوں کو قابو میں کیا جا سکا۔ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا کیوں کہ حُر، جو ان مریدوں کا لقب ہے، تربیت یافتہ غنڈے تھے اور اپنے پیچھے ستر برس کی مجرمانہ تاریخ رکھتے تھے۔ ان کا بنیادی ہتھیار کلہاڑا تھا، اگرچہ ان کے پاس آتشیں اسلحہ اور گولا بارود بھی موجود تھا۔ ہر مخالفانہ اقدام کے جواب انتقامی کارروائی کے ذریعے دے کر انھوں نے آبادی کو دہشت میں مبتلا کر دیا تھا۔ ان کی بڑی کمیں گاہ ایک گھنا جنگل تھی جہاں روپوش ہو کر وہ آسانی سے گرفتاری سے بچ جاتے تھے۔ حُر بنیادی طور پر ایک جرائم پیشہ قبیلہ تھے اور ان کی سرگرمیاں برادری کی نوعیت کی نہ تھیں، لیکن ان کے قابو میں کر لیے جانے کے بعد ان کی سرگرمیوں سے جنم لینے والے لاقانونیت کے رجحان نے صوبے بھر میں ہندو مسلم کشیدگی کی صورت اختیار کر لی جسے مسلم لیگی لیڈروں نے مسلم عوام کو اپنا حامی بنانے کے لیے استعمال کیا۔ ایک معروف حُر پر اللہ بخش کے قتل کا جرم ثابت ہوا جنھوں نے مسلم لیگ کی پیروی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

ہندو مسلم فسادات

پاکستان کے قیام سے ذرا پہلے تک مسلمان لیڈر ہندوؤں کے خلاف ایک بےباک پروپیگنڈا مہم چلاتے رہے تھے اور ان کے بیانات ایسے تھے جن سے امن قائم رکھنے میں مدد نہ مل سکتی تھی۔ ۴۶-۱۹۴۵ کے سندھ لیجسلیٹو اسمبلی کی انتخابی مہم کے دوران محمد ایوب کھوڑو نے، اطلاعات کے مطابق، کہا تھا میں بے تابی سے اُس دن کا منتظر ہوں جب سندھ کے ہندو معاشی طور پر اتنے کمزور اور مفلس ہو جائیں گے کہ اُن کی عورتیں کھیتوں اور بازاروں میں مشقت کرتے ہوئے اپنے شوہروں، بھائیوں اور بیٹوں کے لیے دوپہر کا کھانا لے جانے پر مجبور ہوں گی، جیسا کہ آج ہماری غریب عورتیں کرتی ہیں۔ (۳) بعد میں، جب وہ کابینہ میں پبلک ورکس کے وزیر تھے تو انھوں نے اعلان کیا

> سندھ کے ہندوؤں کو سندھ چھوڑ کر کہیں اَور جانا ہوگا۔ انھیں اسی وقت چلے جانا چاہیے جب امن و امان ہے اور ان کے لیے جانا ممکن ہے، ورنہ میں انھیں خبردار کرتا ہوں کہ بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے جب انھیں سندھ سے

جانے کے لیے کوئی گھوڑا، کوئی گدھا، کوئی گاڑی یا کوئی اور سواری نہیں مل سکے گی۔ (۴)

لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر اور ڈپٹی اسپیکر آغا بدرالدین نے سکھر ضلعے کی مسلم لیگ کانفرنس کے نام اپنے خط میں کہا

یہ مسلمان نہایت بے تابی اور بے چینی سے کان کھڑے کر کے گھوڑوں کے سموں کی آوازیں، تلواروں کی جھنکاریں اور مسلمان مجاہدوں کے اللہ اکبر کے نعرے سننے کے منتظر ہیں۔ (۵)

تعلیم اور لوکل سیلف گورنمنٹ کے وزیر (بعد میں وزیراعظم سندھ) پیر الٰہی بخش نے اپریل ۱۹۴۷ میں جیکب آباد میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ سندھ کے ہندوؤں کو مسلمانوں سے پانی پت کی چوتھی جنگ میں مقابلہ کرنا ہوگا اور یہ ہندوؤں کے لیے واٹرلو ثابت ہوگی۔ سندھ کا مسلم پریس بھی اتنا ہی پُرتشدد تھا۔ روزنامہ ڈان نے، جو مسلم لیگ کا سرکاری ترجمان ہے، اپنی ۱۳ ستمبر ۱۹۴۷ کی اشاعت میں مسلم لیگ نیشنل گارڈز سے اپیل کی کہ وہ سندھ چھوڑ کر جانے والے ہندو مسافروں، مردوں اور عورتوں، کے سامان کی تلاشی لینے میں ہاتھ بٹائیں۔ حیدرآباد سے نکلنے والے ایک سندھی روزنامے ہلالِ پاکستان نے ۶ اکتوبر ۱۹۴۷ کی اشاعت میں ایک اشتعال انگیز مضمون شائع کیا جس میں مسلمان جرائم پیشہ افراد اور غنڈوں سے اپیل کی گئی کہ وہ اپنی توانائیاں ہندوؤں کے خلاف کارروائی کرنے میں صرف کریں۔

تمھیں مسلمانوں کو نہ قتل کرنا چاہیے اور نہ لوٹنا چاہیے۔ اس کے بجائے تمھاری پوری طاقت، جوش و جذبہ اور ہتھیار اُن لوگوں سے انتقام لینے میں استعمال ہونے چاہییں جنھوں نے آج بھی ہزاروں مسلمان عورتوں کو قیدی بنا رکھا ہے ہر مسلمان جس کی نظر سے یہ مضمون گزرے اور جو کسی ڈاکو، چور، زورآور یا ہتھیارےدار کو جانتا ہو، اُسے چاہیے کہ اُس تک ہماری یہ درخواست پہنچا دے اور اسے ہدایت کرے کہ وہ یہ پیغام اپنی جمعیت کے تمام ارکان میں پھیلا دے تمھیں چاہیے کہ اپنی جمعیت کے بارے میں ہمیں اطلاع دو یا ہم سے رابطہ قائم کرو تاکہ ہم تمھیں مطلوبہ ہدایات اور معلومات فراہم کر سکیں۔

یہ مضمون تقسیمِ ملک کے بعد شائع کیا گیا تھا اور اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مسلمان عوام کے جذبات کو کس حد تک بھڑکایا جا رہا تھا۔

مسلم لیڈروں کے ان اشاروں کی پیروی میں مذہبی معلم اور مقامی زمیندار بھی فوراً میدان میں نکل آئے جنھوں نے اس مندود شمن پروپیگنڈے میں اپنے ذاتی لالچ کی تسکین کا موقع دیکھا۔ سکھر ضلعے کے اوباڑو تعلقے میں پیر سرہندی کے مریدوں کی بڑی تعداد تھی۔ پیر نے ہمیشہ اسمبلی کے انتخابات میں لیگ کے امیدواروں کی حمایت کی تھی اس لیے انھیں لیگ کے وزیروں کا اعتماد حاصل تھا۔ انھوں نے

ایسے مریدوں کو اُکسایا کہ ہندوؤں کو دہشت زدہ کر کے ان کی فصلوں اور زمینوں پر قبضہ کر لیں۔ لاڑکانہ ضلعے کے قاضی فضل اللہ نے، اطلاعات کے مطابق، کہا "ایک ہاتھ میں تلوار اٹھا لو اور دوسرے ہاتھ میں قرآن، اور اسلام کو فتح سے ہمکنار کر دو۔" نسبتاً چھوٹے زمینداروں نے اپنے ہاریوں کے ذریعے ہندوؤں کو ہراساں کیا اور ان کی فصلیں اور گھر لُوٹ لیے۔ اس طرح بوئے گئے مذہبی اور فرقہ وارانہ نفرت کے بیج جلد ہی پھل لے آئے۔

سندھ کے مسلمانوں کا رویہ ہندوؤں کی بابت روز بروز مخاصمانہ اور معاندانہ ہوتا گیا۔ بلاشبہ ان کے طرزِ عمل میں مالی فائدے کے عنصر کا خاصا دخل تھا۔ حکام، جن پر قانون قائم رکھنے کی ذمے داری عائد ہوتی تھی، اس تمام صورتِ حال سے بے پروا تھے اور انھیں دونوں برادریوں کے درمیان امن قائم رکھنے کی کوئی حقیقی خواہش نہ تھی۔ تقسیمِ ملک سے کچھ عرصہ پہلے سندھ کے جنوبی ضلعوں میں ہندوؤں کی جان اور مال پر اکادکا حملے شروع ہو گئے تھے۔ البتہ بڑے پیمانے پر بدامنی اُس وقت شروع ہوئی جب مشرقی پنجاب سے مسلمان مہاجر وہاں پہنچے اور انھوں نے اُن مظالم کی داستانیں سنائیں جن سے انھیں غیر مسلموں کے ہاتھوں دوچار ہونا پڑا تھا۔ انھیں ان کے گھروں سے اکھاڑ دیا گیا تھا۔ وہ بڑے پیمانے پر قتلِ عام اور لوٹ مار دیکھ چکے تھے اور انھیں سندھ کے ہندوؤں اور سکھوں سے انتقام لینے پر آمادہ ہونے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ ان کی پہل پر سندھ کے مسلمانوں نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ اکادکا واقعات ایسے تھے جن میں مقامی مسلمانوں نے انھیں روکنے کی کوشش کی، انھوں نے ہندوؤں کو حفاظت کی پیش کش کی اور مسلمان جنونیوں کے حملوں سے ان کا دفاع کرنے کی نیم دلانہ کوششیں کیں، مگر بہت جلد وہ بھی قتل و غارت کرنے والوں میں شامل ہو گئے تا کہ ہندوؤں کو نقصان پہنچا کر خود اپنے لیے مالی فائدہ حاصل کر سکیں۔ اس سلسلے میں سکھر ضلعے کے گاؤں جوگی کے خان بہادر سردار جوگی خان کا ذکر کیا جاتا ہے جس نے ہندوؤں کو یقین دلایا تھا کہ ان کے جان و مال کی حفاظت کی جائے گی، لیکن تقسیم کے بعد اُس نے خود انھیں لوٹنے میں نمایاں طور پر حصہ لیا۔ کنڈڑی گاؤں کے مکھیا فقیر غلام علی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے گاؤں کے ہندو باشندوں کی جانیں بچائیں مگر ان کے اثاثوں کو لٹنے سے نہ بچایا اور اس لُوٹ میں اپنا حصہ وصول کیا۔

سندھ کے ہندوؤں پر ہونے والے حملے دو واضح خطوط پر تھے۔ ان میں زیادہ اہم ہر جانب سے پڑنے والا مالی دباؤ تھا، اور اس میں مسلمان اہلکاروں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس سلسلے میں ہندو اور سکھ آبادی کی بابت مسلمان زمینداروں کے رویے کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اس کا اظہار یوں ہوا کہ مسلمان جاگیرداروں نے اپنے ہندو کاشتکاروں کی فصلیں ضبط کر لیں۔ مسلمان زمینداروں نے اپنے ہندو ہاریوں کو فصل میں ان کا حصہ دینے سے انکار کر دیا۔ مسلمان ہاریوں نے فصلیں اپنے ہندو زمینداروں کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ ریونیو حکام نے وقت سے پہلے لینڈ ریونیو کی ادائیگی کا مطالبہ کر دیا، اور مسلمان ہاریوں کو ہدایت کی گئی کہ جب تک لینڈ ریونیو کی ادائیگی کی رسیدیں نہ دکھائی جائیں، وہ ہندو زمینداروں

کو فصل نہ اٹھانے دیں۔ وہ اناج کی کٹی ہوئی فصلیں اٹھا لے گئے اور فصلوں کے ہندو مالک بے بسی سے
دیکھتے رہ گئے۔ ایک موقعے پر مسلمان جاگیردار ہندو کاشتکار کی کاٹی ہوئی پوری فصل اٹھا لے گیا۔ کاشتکار
نے جاگیردار پر مقدمہ کر دیا، لیکن ایک دن گاؤں لوٹتے ہوئے اسے گھیر کر قتل کر دیا گیا۔ ہندوؤں کو اپنی
منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد فروخت کرنے کی اجازت نہ تھی۔ اور اگر وہ کوئی خریدار ڈھونڈ بھی لیتے تو انھیں
اپنی جائیداد کوڑیوں کے مول بیچنی پڑتی۔ تھرپارکر ضلعے کے گاؤں ناصر، کے ایک دکان دار کو اپنی دکان
کا ہزاروں روپے مالیت کا سامان صرف پندرہ روپے میں فروخت کرنا پڑا۔ پتھلی ریلوے اسٹیشن پر ایک
میڈیکل ڈسپنسری صرف سو روپے میں بیچی گئی۔ لاڑکانے کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے حکم جاری کیا کہ
ہندوؤں کا اپنی جائیداد فروخت کرنا جرم ہے جس کی سزا چھ ماہ قید ہے۔ اس الزام میں تین ہندوؤں کو
کئی روز تک واقعی قید میں رکھا بھی گیا۔ دیہی علاقوں میں ہندوؤں کے اسباب کی چوری کی بے تحاشا
وارداتیں ہونے لگیں۔ چراگاہوں سے ان کے جانور زبردستی لے جائے جاتے۔ دن دہاڑے گھروں اور
دکانوں کے دروازے توڑ کر مال اسباب لوٹ لیا جاتا۔ ان وارداتوں کی ایک عجیب بات یہ تھی کہ دروازے
اور کھڑکیاں تک اکھاڑ کر لے جائی جاتیں۔ ڈکیتی کی وارداتیں بھی ہوئیں جن میں حملہ آور آتشیں اسلحے اور
کلہاڑیوں سے مسلح تھے۔ دادو ضلعے میں پولیس کے ایک سب انسپکٹر نے ہندوؤں کی ایک مذہبی عمارت
کی ٹائلیں اکھاڑ لیں اور انھیں اپنے گھر میں لگا لیا۔ ضلع دادو کے گاؤں لدھو دیرو کے مختیار کار نے مسلمان
ہاریوں سے پوچھا کہ انھوں نے پاکستان کے قیام کا جشن منایا یا نہیں ــــ جس کا مطلب تھا کہ انھوں نے
ہندو زمیندار کی فصل لوٹی یا نہیں۔

ہندوؤں کو ان کے مکانوں سے نکال کر مسلمان مہاجروں کو ان کی جگہ آباد کر دیا گیا۔ بعض موقعوں
پر ہندوؤں کی موجودگی ہی میں انھیں مکان کے ایک حصے میں آباد کر دیا جاتا اور ان کی موجودگی کے دباؤ سے
ہندو اپنا مکان چھوڑنے پر مجبور ہو جاتے۔ ایک موقعے پر ایک ہندو کارخانہ دار کو نوٹس دیا گیا کہ اگر اس
نے چار دن کے اندر اندر اپنے کارخانے کے لیے چاول کی ایک خاص مقدار نہ خریدی تو اس کے کارخانے
پر قبضہ کر لیا جائے گا۔ ہندو کارخانہ دار نے احتجاج کیا کہ اس کا کارخانہ چل رہا ہے اور چاول کی ضروری
مقدار اس کے ذخیرے میں موجود ہے۔ اس پر اسے اپنے کارخانے کا قبضہ ایک مسلمان کے حوالے
کرنے کا حکم دیا گیا۔ ملوں کے ہندو مالکان کو مجبور کیا گیا کہ وہ مسلمانوں کو ساجھے دار بنائیں ورنہ ان کے
کارخانے ضبط کر لیے جائیں گے۔ ضلع سکھر کے گاؤں داؤں والو میں ہندوؤں کو گاؤں چھوڑ کر پولیس کے
دستے کے ساتھ محفوظ مقام پر منتقل ہونے کی ہدایت کی گئی، جوں ہی انھوں نے گاؤں چھوڑا، ان کے
مکانوں پر مسلمان مہاجروں نے قبضہ کر لیا اور تمام غیر منقولہ اسباب لوٹ لیا۔

مقامی حکام کی طرف سے حکم جاری کیا گیا کہ ہندو تاجر اور مہاجن مسلمان کے رہن رکھے ہوئے تمام
زیورات اور قیمتی اشیا جمع کرا دیں۔ یہ اشیا قرض چکائے بغیر ان کے مسلمان مالکوں کو لوٹا دی گئیں۔ دادو
کے ایک مہاجن بھوجامل نے ہمت کر کے اپنے قرض کی ادائیگی کا مطالبہ کیا۔ اس پر حملہ کیا گیا اور اسے

کلمہ پڑھنے اور مسلمان کا جھوٹا دیں کھانے پر مجبور کیا گیا اور اس کے بعد بھگا دیا گیا۔ ہر جگہ ہندوؤں سے مسٹر جناح کے قائم کیے ہوئے مہاجروں کے امدادی فنڈ میں چندا دینے کو کہا گیا۔ ضلع نواب شاہ میں، جہاں ہندوؤں پر جبر سب سے زیادہ تھا، ڈسٹرکٹ میجسٹریٹ نے اعلان کیا کہ اگر ہندوؤں نے ایک لاکھ روپے کی رقم جمع کر کے نہ دی تو انہیں ضلعے سے باہر نہیں نکلنے دیا جائے گا۔

جب صوبے سے ہندوؤں کا بڑے پیمانے پر انخلا شروع ہوا تو حکومت نے پرمٹ کا نظام نافذ کر دیا۔ ۱۵ فروری ۱۹۴۸ کو حکومت نے اعلان کیا کہ حکام کے جاری کیے ہوئے پرمٹ کے بغیر کسی غیر مسلم کو جانے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ اس اقدام سے بڑے پیمانے پر ایسے اختیارات سے ناجائز فائدہ اٹھانے اور رشوت وصول کرنے کا دروازہ کھل گیا۔ ہر روز ایک محدود تعداد میں پرمٹ جاری کیے جاتے اور درخواست گزاروں کو ان کے لیے بھاری رقم ادا کرنی پڑتی۔ پرمٹ جاری کیے جانے سے پہلے درخواست گزار کو پورے آٹھ سرٹیفکیٹ پیش کرنے پڑتے کہ اس نے سندھ میں ایسے تمام واجبات ادا کر دیے ہیں۔ اس سے مسلمانوں کو ہندوؤں پر جھوٹے دعوے کرنے کا موقع مل گیا جس سے ہندوؤں کی روانگی میں تاخیر ہوتی، اور کوئی راستہ نہ پا کر انہیں بلیک میلروں کو رقم کی ادائیگی کر کے سرٹیفکیٹ حاصل کرنا پڑتا۔ پرمٹ حاصل کرنے کے بعد بھی ہندو تارکین وطن کی مشکلات ختم نہیں ہوتی تھیں۔ انہیں ریلوے کے بکنگ کلرک کو بھاری رشوت دے کر ریل کا ٹکٹ حاصل کرنا پڑتا۔ انہیں تلاشی کے عمل سے گزرنا اور سخت تذلیل کو برداشت کرنا پڑتا۔ غیر مردوں کی نظروں کے سامنے ان کی عورتوں کی جامہ تلاشی لی جاتی۔ تلاشی لینے والے تمام زیورات اور قیمتی چیزیں رسید دیے بغیر ضبط کر لیتے۔ بعض موقعوں پر راستے کی ضرورت کا کھانا تک چھین لیا گیا۔ دونوں ڈومینین ریاستوں کے درمیان یہ معاہدہ ہو چکا تھا کہ تلاشیاں نہیں لی جائیں گی، اور وزیر اعظم پاکستان مسٹر لیاقت علی خان نے پاکستان میں ہندوستانی ہائی کمشنر کو یقین دلایا تھا تارکین وطن کی تلاشی نہیں لی جائے گی۔ اس کے باوجود تلاشیاں جاری رہیں، اور جب یہ معاملہ وزیر اعظم سندھ مسٹر ایوب کھوڑو کے علم میں لایا گیا تو انھوں نے کہا

> میں اس بات پر حکومتِ پاکستان سے متفق نہیں ہوں کہ ملک چھوڑ کر جانے والے مسافروں کی تلاشی نہ لی جائے۔ یہ حکم ناقابلِ عمل محسوس ہوتا ہے کیوں کہ اس سے بددیانتی کی حوصلہ افزائی ہو گی۔ (۶)

صوبائی حکومت نے دونوں ریاستوں کے درمیان ہونے والے معاہدے کی اس طرح تکریم کی! نواب شاہ کے ڈسٹرکٹ میجسٹریٹ نے اعلان کیا کہ کسی ہندو کو اپنے ساتھ دس روپے سے زیادہ رقم لے جانے کی اجازت نہیں ہو گی۔ ریل گاڑی کی بریک وین میں رکھا ہوا سامان نکال لیا جاتا اور سفر کے خاتمے پر سامان کا مالک اپنی ہر چیز سے محروم ہو چکا ہوتا۔ گاڑی کے کھچا کھچ بھرے ہوئے ڈبوں میں مسلمان داخل ہو جاتے اور ہندو مسافروں کو اٹھا کر ان کی جگہ بیٹھ جاتے اور ان کے کچھ سامان پر بھی قبضہ کر لیتے۔ غیر مسلم مسافروں کو راستے میں جگہ جگہ تلاشیوں کا سامنا کرنا پڑتا اور ہر بار ان کے اسباب کا کچھ حصہ ضبط کر لیا جاتا۔

بعض اوقات سفر کے جاتے پر ان کے پاس تن کے کپڑوں کے سوا کچھ باقی نہ بچتا۔ کراچی کے ریفیوجی کیمپ سے کشتی کے ذریعے روانہ ہوتے وقت غیر مسلموں کو مزید تلاشیوں سے گزرنا پڑتا۔ ایک مداری سے تماشا دکھانے کا پورا سامان چھین لیا گیا حالانکہ یہ سامان تلاشی لینے والوں کے کسی کام کا نہ تھا۔

مسلمان غنڈوں نے ہٹ سے مندروں اور عبادت گاہوں کی بے حرمتی کی۔ بعض موقعوں پر ان کا مقصد اسباب لوٹنا تھا، لیکن اکثر غیر مسلموں کے مذہبی جذبات کو مجروح کرنا مقصود ہوتا تھا۔ مورتیوں کو توڑ کر مندر کے باہر پھینک دیا جاتا۔ مقدس کتابیں پھاڑ کر کیچڑ میں پھینکی جاتیں اور انہیں قدموں تلے روندا جاتا۔ متعدد موقعوں پر انہیں جلایا بھی گیا۔ اگر پجاری کی طرف سے ذرا سی مزاحمت ہوتی تو حملہ کر کے اسے زدوکوب کیا جاتا اور بعض موقعوں پر قتل بھی کیا گیا۔ سکھوں کو، جن کے ہاتھوں مسلمانوں کو مشرقی پنجاب میں سخت مظالم کا سامنا کرنا پڑا تھا، خاص طور پر حملوں کا نشانہ بنایا گیا اور شاید ہی کوئی گردوارہ مسلمان لٹیروں کے حملوں سے محفوظ رہا ہو۔

ان حالات نے سندھ میں غیر مسلموں کا زندہ رہنا ناممکن بنا دیا۔ جہاں کہیں ان کی زندگی محفوظ بھی تھی، وہاں ان کا مال اسباب اور روزی کمانے کے ذرائع چھین لیے گئے تھے۔ جب وہ وطن چھوڑ کر جانا چاہتے تو ان کے راستے میں بے شمار رکاوٹیں کھڑی کی جاتیں اور راستے میں انہیں ہر طرح سے ہراساں اور ذلیل کیا جاتا۔ اس طرح سندھ کے غیر مسلموں کی کثیر تعداد ترکِ وطن پر مجبور ہوئی۔ ہندوستان ٹائمز کی ۱۹ جنوری ۱۹۴۹ کی اشاعت میں حکومت پاکستان کے اعلامیے کے مطابق جو اعداد و شمار شائع ہوئے اُن کی رو سے سندھ چھوڑ کر جانے والوں کی تعداد آٹھ لاکھ اکیس ہزار ہے، لیکن تخمینہ لگایا گیا ہے کہ بارہ لاکھ غیر مسلم آبادی میں سے تقریباً دس لاکھ افراد وطن چھوڑنے پر مجبور ہوئے، اور ابھی یہ انخلا جاری ہے۔

سندھ میں غیر مسلموں کا جانی نقصان اُس پیمانے پر نہیں ہوا جس پیمانے پر مغربی پنجاب اور شمال مغربی سرحدی صوبے میں ہوا، لیکن قتل، جبری تبدیلی مذہب اور اغوا کا شکار ہونے والوں کی تعداد کسی بھی طرح معمولی نہیں ہے۔ درست اعداد و شمار فراہم کرنا ممکن نہیں ہے، لیکن مقتولوں کی تعداد بلاشبہ ہزاروں میں ہے اور جبراً مسلمان بنائے جانے والوں کی تعداد بھی اس سے کم نہیں ہے۔ عورتوں کے اغوا کے واقعات بہت زیادہ نہیں ہوئے اور ہندو شرنارتھیوں کی شہادتوں سے پتا چلتا ہے کہ اس سلسلے میں غریب مزدور اور اوڈ سب سے زیادہ متاثر ہوئے۔ شہری علاقوں میں ڈکیتی کی بے تحاشا وارداتیں ہوئیں جن کے دوران لوگوں کو قتل بھی کیا گیا۔ مشرقی پنجاب سے مہاجروں کے آنے کے بعد تشدد اور جرائم میں سُرعت سے اضافہ ہوا۔ شرنارتھیوں کی شہادتوں میں راتوں پر حملے اور لوٹ مار کے واقعات کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان واقعات میں جانی نقصان بھی لازماً ہوتا تھا۔ گاؤوں سے نکلنے والی تارکینِ وطن کی لاریوں کو راستے میں روک کر ان پر حملے کیے گئے۔ دادو شہر میں پانچ ہندو خاندانوں کو جبراً مسلمان بنایا گیا اور انہیں سڑکوں پر پھرایا گیا۔ ضلع سکھر کے گاؤں مدیجی میں مسلمانوں کے ہجوم نے ہندوؤں سے بھری ہوئی لاری

پر حملہ کیا اور کئی افراد کو قتل کر دیا۔ مجرموں کی نشان دہی ہوئی اور وہ گرفتار بھی ہوئے، مگر بعد میں انھیں بغیر کسی کارروائی کے رہا کر دیا گیا۔ نواب شاہ کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے اعلان کیا کہ وہ مسلمان مہاجروں کی مدد کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہے، اور اس نے مہاجروں کو اس حد تک اُکسایا کہ وہ ہندوؤں پر اندھادھند حملے کرنے لگے۔

کوئٹہ، حیدر آباد اور کراچی میں ہونے والے ہنگامی کے واقعات کا خاص طور پر ذکر کیا جانا چاہیے۔ کوئٹہ اگرچہ بلوچستان کا حصہ ہے، لیکن اس کا ذکر اسی باب میں کرنا مناسب ہوگا۔

کوئٹہ کے ہندوؤں کے ذہنوں میں عمومی اضطراب پایا جاتا تھا مگر انھوں نے پاکستان کے قیام کا جشن منانے میں مسلمانوں کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ ۱۹ اگست ۱۹۴۷ کو بہت سے مسلمان مہاجر شہر میں آئے اور ان کو پیش آنے والے مظالم کی داستانوں نے مقامی مسلمانوں میں سخت اشتعال پیدا کر دیا۔ ہندوؤں کے مکانوں پر حملے کا تفصیلی منصوبہ تیار کیا گیا اور ۲۰ اگست کو رات نو بجے کئی ہزار مسلمانوں کے ہجوم نے، جس میں نئے آنے والے مہاجر بھی تھے اور آس پاس کے دیہات میں رہنے والے مقامی مسلمان بھی، شہر کو گھیرے میں لے لیا۔ افواہیں زوروں پر تھیں کہ حملہ کیا جانے والا ہے اور کچھ ممتاز ہندوؤں نے پولیس کو اس کی اطلاع بھی دی تھی، لیکن آنے والے قتلِ عام کو روکنے کے لیے کوئی قدم نہ اٹھایا گیا۔ پورے شہر میں ہندوؤں کے مکانوں کو حملہ کر کے لُوٹا اور جلایا گیا۔ لوٹ مار پوری رات جاری رہی اور ہندوؤں کا سخت جانی اور مالی نقصان ہوا۔ ۲۱ تاریخ کی صبح ہنگامہ تقریباً تین گھنٹے کے لیے ٹھنڈا پڑا اور صبح نو بجے حملے دوبارہ شروع کر دیے گئے۔ بڑی تعداد میں ہندو اور سکھ مارے گئے۔ ایک کروڑ روپے سے زیادہ مالیت کی جائیداد تباہ ہوئی اور اندازاً ایک ہزار لوگ قتل کیے گئے۔ ۲۱ تاریخ کی شام کو ڈوگرا سپاہیوں نے شہر میں داخل ہو کر صورتِ حال پر قابو پایا۔

جب کوئٹہ کے قتلِ عام کی خبریں سندھ میں پہنچیں تو ہندوؤں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ لوٹ مار اور حملوں کی ان وارداتوں نے، جو بظاہر کوئٹہ کے واقعات سے حوصلہ پا کر کی گئی تھیں، ان کی تشویش کو اَور بڑھا دیا۔ تاہم ۱۷ دسمبر ۱۹۴۷ کو حیدر آباد میں ہونے والے فسادات تک وسیع پیمانے پر قتل و غارت گری کا کوئی واقعہ پیش نہ آیا۔ ۱۶ دسمبر ۱۹۴۷ کو حیدر آباد میں ایک جلسہ ہوا جہاں مقرروں نے اجمیر شریف کی درگاہ کے جلائے جانے اور سیکڑوں مسلمانوں کے قتل کی جھوٹی اور مبالغہ آمیز افواہیں پھیلائیں۔ کہا گیا کہ ۱۷ دسمبر کو مسلمانوں کی لاشوں سے بھری ایک ٹرین حیدر آباد پہنچنے والی ہے۔ ٹرین کی آمد سے پہلے ایک بڑا ہجوم ریلوے اسٹیشن پر جمع ہو گیا۔ جب ٹرین آئی تو اس میں لاشیں نہیں بلکہ اجمیر شریف سے آنے والے مسافر سوار تھے جنھوں نے اپنی مصیبتوں کی روداد سنائی۔ اس روداد سے مسلمانوں کے ہجوم میں اشتعال پھیل گیا اور اس نے ریلوے اسٹیشن سے نکل کر پورے شہر میں قتل اور لوٹ مار کی کارروائیاں شروع کر دیں۔ ہندوؤں کے مکانوں اور اسکولوں کو حملہ کر کے جلا دیا گیا۔ ان وحشت ناک حملوں کے نتیجے میں اندازاً ڈھائی سو سے زیادہ ہندو قتل ہوئے اور ایک ہزار مکان لُوٹے گئے۔

کہا جاتا ہے کہ پارلیمانی سیکرٹری قاضی محمد اکبر نے خود اس لوٹ مار میں حصہ لیا۔ حیدر آباد ایک بڑا اور خوش حال شہر تھا جس میں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ تجارت تقریباً مکمل طور پر ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی، اور انھیں ان فسادات میں سخت نقصان اٹھانا پڑا۔ دیہی علاقوں میں ہندو تارکینِ وطن پر حملے کیے گئے اور انھیں لوٹا گیا۔ بدامنی پر کئی گھنٹوں کے بعد قابو پایا جا سکا۔

جنوبی سندھ میں ہونے والے بدامنی کے ان واقعات نے غیر مسلموں کو اپنے گھر چھوڑنے پر مجبور کیا اور وہ بڑی تعداد میں کراچی پہنچے تاکہ ہندوستان جا سکیں۔ کچھ لوگوں کو ٹرین اور باقی لوگوں کو کشتیوں کے ذریعے روانہ ہونا پڑا۔ کچھ لوگ شہر کے مختلف محلوں میں اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کے گھروں میں ٹھہرے جبکہ بیشتر لوگوں کو عارضی ریفیوجی کیمپوں میں رکھا گیا۔ ۱۹۴۷ کے آخر تک کراچی میں ان تارکینِ وطن کی بہت بڑی تعداد جمع ہو چکی تھی۔ ۶ جنوری ۱۹۴۸ کی صبح دو سو سے تین سو تک سکھوں کا ایک قافلہ جس میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے، کراچی پہنچا۔ یہ قافلہ پولیس کے دستے کی معیت میں آیا تھا لیکن اس کی آمد کی اطلاع کراچی میں مقیم ہندوستانی ہائی کمشنر کو نہیں دی گئی تھی۔ بہاری مسلمانوں کے ایک ہجوم نے ریلوے اسٹیشن پر سکھوں کو اترتے دیکھا تو ان میں سخت اشتعال پھیل گیا۔ قانون نافذ کرنے کے ذمے دار حکام نے ان سکھوں کی حفاظت کے سلسلے میں انتہائی بے پروائی کا مظاہرہ کیا اور انھیں پولیس یا فوج کی نگرانی میں بھیجنے کے بجائے کھلی گاڑیوں میں رتن تلاؤ کے گردوارے کی طرف روانہ کر دیا جس کے ارد گرد کے مکانوں پر اب تک مسلمان مہاجروں کا قبضہ ہو چکا تھا۔

ان سکھوں کی آمد کی خبر پورے شہر میں پھیل گئی اور ذرا سی دیر میں سندھی اور بہاری مسلمانوں کا ایک بڑا ہجوم کلہاڑیوں، تلواروں، چاقوؤں، سلاخوں اور لاٹھیوں سے مسلح ہو کر گردوارے کے سامنے آ پہنچا اور اس پر پتھراؤ کرنے لگا۔ سکھوں نے خود کو گردوارے میں بند کر لیا تھا لیکن ہجوم میں سے کچھ افراد دیواروں پر چڑھ کر گردوارے کے احاطے میں پہنچ گئے۔ دروازے بند ہونے کے باعث انھیں اندر داخل ہونے کا راستہ نہ ملا۔ یہ دیکھ کر ارد گرد کے مکانوں میں رہنے والوں نے گردوارے پر جلتے ہوئے انگارے پھینکنے شروع کر دیے جس سے تھوڑی دیر میں پوری عمارت نے آگ پکڑ لی۔ متعدد سکھ زندہ جل گئے۔ جن سکھوں نے عمارت سے بھاگ کر جان بچانے کی کوشش کی انھیں ہجوم نے مار مار کر ہلاک کر دیا۔ تقریباً ڈیڑھ بجے، جب یہ یک طرفہ لڑائی جاری تھی، پولیس سکھوں کو گردوارے سے نکالنے کے لیے دو ٹرک لے کر آ پہنچی۔ جب ٹرک بھر گئے تو ہجوم نے راستہ روک لیا اور تمام سکھوں کو سڑک کے کنارے ذبح کر دیا۔ ایک عینی شاہد کا بیان ہے: "ہجوم نے (گردوارے کے) دروازے توڑنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ گردوارے اور رام مندر کے درمیان ایک بلڈنگ تھی جس پر مسلمان قابض ہو چکے تھے۔ اس کے مکینوں نے چھت پر چڑھ کر کوئلوں کی بوری گردوارے کے احاطے میں پھینکی تاکہ عمارت کو آگ لگائی جا سکے۔ اس موقعے پر بیس مسلح پولیس والوں کا ایک گروپ وہاں پہنچا اور اس نے ہجوم سے منتشر ہو جانے کو کہا مگر ہجوم نے انکار کر دیا۔ پولیس والوں نے خاموشی اختیار کی۔" ایک اور عینی شاہد کا کہنا ہے "تقریباً ڈیڑھ بجے جس

وقت گردوارے کے اندر کشت و خون جاری تھا، پولیس کے اہلکاروں نے سکھوں کو دو ٹرکوں میں سوار کر کے لے جانے کی کوشش کی مگر غنڈوں نے ٹرکوں کا راستا روک لیا اور اس کے دروازے اور کھڑکیاں توڑ کر پولیس کی نظروں کے سامنے سکھوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔

گردوارے کے سامنے بلوہ دو بجے کے بعد تک جاری رہا اور بلوائی کئی لڑکیوں کو وہاں سے لے گئے۔ ہجوم کی اس قتلِ عام سے تسکین نہ ہوئی، بلکہ اس کا جوش اور بڑھ گیا اور وہ شہر کی گلیوں میں پھیل کر نعرے لگانے لگے "کافروں کو مارو! ہندوؤں کو مارو! کافروں کے گھر لوٹ لو!" ہجوم اندھادھند چاقوزنی اور قتل میں مصروف رہا اور اس نے بہت سی معصوم عورتیں اور بچے اس کا شکار ہوئے۔ ایک ٹولی نے ریلوے اسٹیشن پہنچ کر ہندو مسافروں پر حملہ کیا۔ کچھ افراد ایک گجراتی ہندو کے گھر میں گھس کر اس کی تین نوجوان لڑکیوں کو اٹھا لے گئے۔ ان لڑکیوں کی ماں غم سے ایسی بے حال ہوئی کہ اپنے دو شیرخوار بچوں کو گود میں لے کر اپنے مکان کی بالکنی سے کود گئی۔ تینوں وہیں ہلاک ہو گئے۔ بچوں کے باپ کو غنڈوں نے اسی بالکنی سے نیچے پھینکا اور وہ بھی اسی انجام کو پہنچا۔ کچھ غنڈوں کو ایک سات سالہ بچے پر حملہ کرتے دیکھا گیا۔ انھوں نے اس کے بدن میں چاقو گھونپ دیا اور اس کی ٹانگوں کو چیر کر خون میں لت پت گوشت کے ٹکڑے سڑک پر پھینک دیے۔ دھرم شالاؤں اور ریفیوجی کیمپوں میں پناہ گزیں ہندوؤں پر حملے کیے گئے۔ انھیں قتل کیا گیا اور متعدد نوجوان لڑکیوں کو اغوا کر لیا گیا، عورتوں کو بےحرمتی رہا اور بےپناہ تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔

ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر انتظار کرتے ہوئے اور اندرونِ سندھ سے آئے ہوئے ہندوؤں کو سخت مصیبت سے گزرنا پڑتا۔ جوں ہی کوئی ٹرین آتی، قاتلوں کے جلیے کے افراد اسے گھیر لیتے اور ہندو مسافروں پر چاقوزنی اور لوٹ مار شروع کر دیتے۔ ہندو بھاگ کر ویٹنگ روموں میں پناہ لیتے، مگر وہاں بھی وہ محفوظ نہ تھے۔ سندھ کا ایک بڑا [ہندو] زمیندار جو لیجسلیٹو اسمبلی کا رکن بھی رہ چکا تھا، اُس صبح کراچی پہنچا تھا، اور جب اس نے ٹرین پر حملہ ہوتے دیکھا تو حفاظت کے لیے اپنی بندوق نکال لی۔ پولیس کے ایک سب انسپکٹر نے آ کر وہ بندوق اس سے لے لی اور کہا کہ وہ اسی بندوق چھوڑ آیا ہے۔ سب انسپکٹر بندوق لے کر غائب ہو گیا اور ہجوم نے زمیندار کے ڈبے پر حملہ کر کے تمام سامان لوٹ لیا۔ ویٹنگ روم میں چھپے ہوئے ہندوؤں کو کھانے پینے کے لیے کچھ نہ مل سکا اور پہرے پر تعینات پولیس والوں نے پانی کے ایک گلاس کی ایک روپیہ قیمت وصول کی۔

شہر کے مندروں اور گردواروں پر حملہ کر کے ان کی بےحرمتی کی گئی۔ گرو رام داس دربار، جگن ناتھ مندر، جیندل کاشی مندر، سائیں وسیارام کا مندر، گرو نانک مندر، رام باغ گاڑی کھاتے کے پاس والا گردوارہ، رنچھوڑ لائن کا سومناتھ مندر، لارنس روڈ کا سیتلا مندر، گاڑی کھاتے کا جیسمل گردوارہ، سوامی نارائن مندر، بھاکیاری مندر اور شاردا مندر ـــــ ان سب عبادت گاہوں پر حملے کیے گئے اور جہاں کہیں ہجوم کو مقدس کتابیں ملیں انھیں پھاڑا یا جلایا گیا۔

اس تمام بدامنی میں غنڈہ عناصر کا عمل دخل رہا، لیکن اس بات کے ناقابلِ تردید شواہد موجود ہیں کہ مڈل کلاس سے تعلق رکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد نے ان واقعات میں حصہ لیا۔ یہاں تک کہ سرکاری اہلکار بھی لوٹ مار میں شریک ہوئے۔ عمدہ لباس پہنے ہوئے افراد کو ہندوؤں کی دکانیں لوٹتے اور ایسے کام کی چیزیں اٹھاتے دیکھا گیا۔ لوٹی گئی چیزوں کی بڑی مقدار پاکستان سیکرٹیریٹ کے عملے کے ارکان کے قبضے میں پائی گئی۔ حکومت کی جانب سے ان اہلکاروں کے گھروں کی تلاشی کے اقدام پر خاصا احتجاج کیا گیا اور ان کے ایک وفد نے پاکستانی حکام سے مل کر اس ہندو نواز اقدام کی غیر دانشمندی کو واضح کیا۔

کراچی میں فسادات کی یہ لہر دو دن تک جاری رہی جس کے بعد ہجوم کے جذبات کو تسکین ہوئی۔ جانی اور مالی نقصان کا کوئی درست تخمینہ موجود نہیں ہے۔ لاشوں کی کئی لاریاں بھر کر شمشان گھاٹ لے جائی گئیں جہاں انہیں ڈھیر کی صورت میں پٹرول چھڑک کر جلا دیا گیا۔ قتل ہونے والوں کی تعداد تین سو سے کسی طرح کم نہیں تھی اور زخمی ہونے والے اس سے دگنی تعداد میں رہے ہوں گے۔

سندھ میں ہونے والے ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ حیدر آباد اور کراچی کے فسادات کے سوا سندھ کے مسلمانوں کی طرف سے ہندوؤں کے قتل عام کی بڑے پیمانے پر کوئی منظم کوشش نہیں کی گئی۔ لیگ کے لیڈروں کی طرف سے کئی برس سے پورے ہندوستان میں جو تباہ کن پروپیگنڈا جاری تھا، اس کے اثر سے مسلمانوں کا رویہ ہندوؤں کی بابت جارحانہ اور مخاصمانہ ہو گیا۔ اس پروپیگنڈے نے ایسے وقت میں جب سندھ بھر میں لاقانونیت پھیلی ہوئی تھی، ہندوؤں میں عدم تحفظ کا شدید احساس پیدا کیا اور مسلمان اور زیادہ دلیر ہو گئے۔ لوٹ مار اور مالی فائدے کے لالچ نے انہیں ہندوؤں کی ابتلا کی طرف سے بے حس سا دیا۔ مشرقی پنجاب کے مسلمان مہاجروں کی آمد نے جذبات کے اس بارود کو آگ دکھا دی اور پورا صوبہ شعلوں کی لپیٹ میں آ گیا۔ جنوبی ضلعوں میں قتل، ڈکیتی اور لوٹ مار کی پُرتشدد وارداتیں شمالی ضلعوں کی نسبت زیادہ وسیع پیمانے پر ہوئیں۔ شمالی ضلعوں میں بلوائیوں نے خود کو ہندوؤں کی جائیداد کی لوٹ مار اور انہیں ان کے گھروں سے نکال دینے تک محدود رکھا۔

**

نوٹس

(۱) سندھ کو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ، ۱۹۳۵ء کی رو سے بمبئی سے الگ کر کے الگ صوبے کا درجہ دیا گیا۔

(۲) ان اعداد و شمار میں مرکز سے وابستہ شہریوں سے ہونے والی آمدنی شامل نہیں ہے جس سے وصول ہونے والے محاصل مرکزی ریونیو میں جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان میں ان اخراجات کا بھی ذکر نہیں ہے جو مرکز کو دفاع اور ایسے دیگر شعبوں میں کرنے پڑتے ہیں جن سے صوبے کو بالواسطہ فائدہ پہنچتا ہے۔ بہر کیف، دونوں کا حاصل تفریق بیان کردہ رقم کے لگ بھگ ہی ہوتا ہے۔

(۳) بعد میں مسٹر کھوڑو کو ان کے عہدے سے ایک بار پھر برطرف کیا گیا اور بدعنوانی اور چوری کا مجرم پایا گیا۔
(۴) بحوالہ پرسرام وی ٹھلرامانی، *Why the Exodus from Sind*
(۵) ایضاً۔
(۶) روزنامہ الوحید، کراچی، ۹ اپریل ۱۹۴۷۔
(۷) بعد میں مسٹر کھوڑو کے قبضے سے غیر مسلموں سے لوٹی کی اشیا برآمد ہوئیں۔

آئندہ صفحات میں پیش کیے گئے تین مضامین سندھی کے تین ادیبوں کی یادداشتوں پر مشتمل ہیں۔

پہلا مضمون سندھی کے معروف فکشن نگار موہن کلپنا کی خودنوشت سوانح بکھ، عشق، ادب (بھوک، عشق، ادب) سے اقتباسات پر مشتمل ہے۔ وہ حیدرآباد کے قریب کوٹری میں پیدا ہوئے اور ۱۹۴۸ میں ہجرت کر کے بمبئی چلے گئے۔ ہندوستان میں ان کی زندگی کا بیشتر حصہ بمبئی کے قریب اُلہاس نگر میں گزرا۔ ان کی یہ کتاب حیدرآباد سے ۱۹۸۴ میں شائع ہوئی۔

شیخ ایاز جدید سندھی کے مسلمہ طور پر اہم ترین شاعر ہیں۔ اس انتخاب میں ان کی جو تحریر شامل کی گئی ہے وہ ان کی کتاب ساہیوال جیل جی ڈائری (ساہیوال جیل کی ڈائری) کے ایک مختصر اقتباس پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۸۶ میں حیدرآباد سے شائع ہوئی۔

سوبھو گیان چندانی ادیب سے بڑھ کر ایک بزرگ سیاسی کارکن کے طور پر معروف ہیں۔ تقسیم ہند کے وقت وہ سندھ کی کمیونسٹ تحریک سے وابستہ تھے اور ان کی پوری عملی زندگی پاکستان میں بائیں بازو کی سیاسی سرگرمیوں میں بسر ہوئی۔ ان کے اخباری کالموں کا مجموعہ تاریخ جا وساریل ورق (تاریخ کے بھلائے ہوئے اوراق) کے عنوان سے ۱۹۹۲ میں حیدرآباد سے شائع ہوا۔ اس انتخاب میں شامل دو کالموں میں کراچی کے ۱۹۴۸ کے فسادات اور پاکستانی کمیونسٹ پارٹی کے ایک اہم کارکن حسن ناصر کا تذکرہ ہے۔

موہن کلپنا

سندھی سے ترجمہ، تلخیص اور تدوین اجمل کمال

سندھ کی یادیں

میں نے سکھر کے راجا رام ہائی اسکول میں کچی پہلی سے تیسری کلاس تک پڑھا۔ سامنے سندھ کا شاہی دریا تھا جہاں مائی راجا نام کا کوئی مندر بھی تھا۔ وہاں ایک پیپل کا پیڑ بھی تھا، جس پر پتھر سے میں نے ایک نام لکھا تھا موہن۔ بڑا سا بند تھا، پانی اس سے کوئی آٹھ دس فٹ نیچے۔ چالیس برس سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے مجھے سکھر دیکھے ہوے۔ کبھی دیکھتا ہوں، ایک بچہ ہے، پیپل کے پیڑ کے پاس بیٹھا سندھو کی طرف نہار رہا ہے۔ چاہتا ہوں، کاش ایک بار وہاں پہنچ جاؤں، اُسی پیڑ کے نیچے، اگر وہ ابھی تک ہے، اور اگر نہیں ہے تو تصور کا کوئی پیڑ کھڑا کر لوں۔ اسی تصور میں کتنی ہی بار سندھو کے کنارے، پیپل کے نیچے بیٹھا ہوں۔ اب بھی بہت سے لوگ وہاں بیٹھتے ہوں گے۔ کسی کو خبر نہ ہو گی کہ اس جگہ سات برس کا موہن کلپنا بھی بیٹھتا تھا۔

ہم رہتے فریئر روڈ پر کسی پریس کے اوپر تھے، جس کا دروازہ پچھلی گلی میں کھلتا تھا۔ پریس اکثر بند رہتا تھا اور اندر بلیاں گھوما کرتی تھیں۔ بیم کی جھاڑی کے پاس شاید پو کرداس اینڈ سنز کا شاہی کتاب گھر تھا۔ نکڑ پر تانگا اسٹینڈ تھا۔ سڑکیں پکی سیمنٹوں کی تھیں جن پر میونسپلٹی کے ٹرک پانی کا چھڑکاو کرتے تھے، یا کبھی کبھی یہ کام پکھالی [بھشتی] کیا کرتے تھے۔ مجھے کچھ خبر نہ تھی کہ اسی شہر میں مجھ سے پانچ دس برس بڑے شیخ ایاز، سگن آہوجا، بیمون کالانی اور رشید بھٹی رہتے تھے یا اس شہر کی گلیوں میں سے خطرناک انقلابی رسالہ ودیارتھی گزرتا تھا۔

میں ایک بچہ، اسکول سے لوٹ کر تیر کمان اٹھا کر بلیوں کا شکار کرنے لگتا۔ پتا نہیں کس کی بلی میں نے مار ڈالی۔ کونے پر ایک گراموفون کی دکان تھی، وہاں کھڑا ہو کر کتے کی تصویر والے گراموفون ریکارڈ سنا کرتا، یہی عادت بعد میں لیڈروں کی تقریریں سننے میں بدل گئی۔

میں اس دکان والے سے گراموفون کی سوئیاں لیتا تھا اور تیروں کے آگے، سوئیوں کا موٹا سِرا اندر کی طرف ٹھونس کر شکار پر نکل جاتا تھا۔

ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ بازار بند ہونے لگا ہے۔ کچھ لوگ دکانیں لُوٹ رہے تھے۔ مسرل کاد!

مندر کا واقعہ تھے شہر میں ہندو مسلم فساد ہو گیا ہے۔ تب مجھے خبر نہ تھی کہ لوگ ہندو بھی ہوتے ہیں اور مسلمان بھی۔ جان تو دونوں کو پیاری ہوتی ہے، مگر دونوں سمجھتے ہیں کہ صرف انھیں کو پیاری ہے، دوسروں کو نہیں۔

دادا، میرے ابا، بھی ایک دکان سے سے نوٹ اٹھا لائے۔ بعد میں جب ملٹری آتی تھی تو شہر میں جیسے راکاس پھر جاتا تھا۔ ماں بیٹوں کو چھاتی سے لگا کر خوف اور ہراس سے آسمان کی طرف دیکھنے لگتی اور میں سوچنے لگتا کہ لوگ آپس میں کیوں لڑتے ہیں۔ بہت بعد میں سمجھ میں آیا کہ لڑتے نہیں، لڑوائے جاتے ہیں۔

ایک دن میں نے دادا سے پوچھا دادا، مندر کا دکھ کیا ہے؟

میں نے دکھائی تو تھی تمہیں۔

مگر ہے کیا؟

مسلمان کہتے ہیں کہ وہاں ایک پرانی مسجد ہے۔

مسجد کسے کہتے ہیں؟

ہندو مندر میں بھگوان کی پوجا کرتے ہیں اور مسلمان مسجد میں خدا کی۔

بھگوان اور خدا میں کیا فرق ہے؟

کچھ بھی نہیں۔

مندر اور مسجد میں کیا فرق ہے؟

کچھ بھی نہیں۔

بھلا ہندوؤں اور مسلمانوں میں؟

سر پر ہاتھ رکھ کر پیار کرتے ہوئے بولے سچ پوچھو تو کچھ بھی نہیں۔

جب کسی چیز میں کوئی فرق نہیں تو یہ لوگ لڑتے کیوں ہیں؟

ان پڑھ ہیں۔

فساد شروع ہوا تو جیسے طوفان آ گیا۔ چاروں طرف ویرانی اور سنسنی، خوف اور ہراس گلی میں موت کا گشت شوٹ ایٹ سائٹ کے آرڈر

میں صبح پانچ بجے خالصوں (سکھوں) والے بڑے گلاس میں دادا کے لیے چائے لینے جاتا تھا۔ سخت اندھیرا یہ واچ مین نے پوچھا کون؟ ارے، موہن ہو۔ جاؤ جاؤ!

کسی درویش کے عزیز کو کچھ جنونی ہندوؤں نے مار ڈالا۔ کچھ دوسرے جنونیوں نے بدلے میں بھگت کنور کا خون کر دیا۔ تیر تھ بستی نے کنور پر ایک زبردست کتاب لکھی ہے۔ سال بھر ہوا، میں نے اسے دوبارہ پڑھا۔ کنور نہ ہندو تھا نہ مسلمان، اور ابھی تک سندھ کے قوم پرستوں نے کنور کا دن نہیں منایا ہے۔ انھیں رہڑکی میں کنور کی سمادھی کے آگے گھٹنے ٹیک کر اپنے بڑوں کے گناہوں کی معافی مانگنی

چاہیے۔

میں کنور کی آخری رسوم میں شامل ہوا تھا۔ لوگ رو رہے تھے، میں نہیں رویا۔ کچھ سمجھ بھی نہ سکا کہ کنور کو کیوں مارا گیا ہے۔ میں نے اس کا کھلا چہرہ دیکھا جس پر نور تھا۔ لوگ گا رہے تھے، کچھ اس طرح کہ ہائے ہائے ہمارا ست سچا کنور چھین لیا، دیکھتے ہی دیکھتے

اس محفل میں مسلمان بھی تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی شکلوں میں فرق صرف داڑھی مونچھوں اور کپڑوں کا تھا۔ چہرے، خدوخال، قدوقامت، بولنے کا انداز، سب ایک سا۔ مسلمانوں کے سینوں میں کعبہ، ہندوؤں کی چھاتیوں میں کاشی۔ سندھ کہیں دیکھنے میں نہ آتا تھا ــــ سندھ تو فقط لطیف کے کلام میں تھا۔

میں کچھ خاص حالات میں آر ایس ایس میں شامل ہو گیا تھا، کراچی میں، عمر شاید گیارہ برس کی تھی۔ ۱۹۴۲ سے ۱۹۵۲ تک شامل رہا۔ مگر پھر بھی ہر مسلمان سے نفرت نہ کر سکا، بلکہ میں نے ہندوؤں سے زیادہ مسلمانوں سے محبت کی کیوں کہ سندھ کی دھرتی نے مسلمانوں میں بہت سے اچھے لوگ، فنکار، مفکر، درویش پیدا کیے ہیں۔ مگر ہائے پیر علی محمد راشدی، جس نے مسلمانوں کو اچھا انسان بننے کے بجائے غلط مسلمان بنانے کی کوشش کی، جس میں جی ایم سید نے کافی مدد کی۔

سو جب میں نے ہوش سنبھالا تو مجھے بتایا گیا کہ میں ہندو ہوں۔

***

میرا جنم سنیچر ۲۲ نومبر ۱۹۳۰ کو کوٹری میں صبح ساڑھے پانچ بجے ہوا۔ دادا کا پہلا پوتا، نانا کا پہلا نواسا اور ماں باپ کا پہلا بیٹا تھا۔ کہتے ہیں پیسا ہاتھ کا میل ہے، شاید زندگی کے پہلے دن میرے ہاتھوں کو اس قدر چھا گیا کہ آدھی صدی ہونے کو آئی اب تک ان میں میل نہیں جما۔ دیگیں چڑھیں، شہنائی بجانے والے بلوائے گئے۔

میرے والد، نولچند منگھارام لال، اصل سیوہانی، ریلوے میں کلرک تھے اور ہر پانچ سات سال بعد ان کا تبادلہ ہو جاتا تھا۔ اس طرح کوٹری کے بعد ہمارے کچھ برس سکھر، کچھ برس لاہور، کچھ برس کالکا (شملہ)، دوبارہ کچھ سال کوٹری اور کچھ سال کراچی میں گزرے تھے۔ میرے دادا لالا منگھارام بہت بارُعب شخص تھے اور لوگ ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ ننھیال والے حیدر آباد کے مغربی کچے کے علاقے میں رہتے تھے۔ جب میں دوسری بار کوٹری آیا تو پیدل حیدر آباد جاتا اور اُسی دن واپس آتا تھا۔ میرے پھوپھا حیوت رام بھٹ شاہ میں اسٹیشن ماسٹر تھے۔ میں شاہ لطیف کی زمین پر پیدا ہوا، لیکن یاد نہیں کہ کبھی بھٹ شاہ گیا ہوں۔ میرے والد کے ماموں تُلسی داس بھی کوٹری کی سیوہانی گھٹی [گلی] میں رہتے تھے، ان کی دو بیٹیاں رُکمنی اور لیلاں شہر کی حسین لڑکیوں میں شمار ہوتی تھیں اور خاص طور پر بلوچ اُن کے گھر کے باہر ٹھنڈی سانسیں بھر بھر کے پورے شہر کو ایئر کنڈیشنڈ کر دیا کرتے تھے۔ ماما میٹھارام شانی ڈپٹی کلکٹر

تھے۔ میری ماں دھمی بائی نے کانونٹ میں تعلیم پائی اور مرتے دم تک ٹوٹی پھوٹی انگریزی بولتی رہیں۔ دکھ کی حالت میں اکثر انگریزی نظمیں گنگنایا کرتیں۔ میرے دادا بھی ریلوے میں تھے۔ ریٹائر ہونے کے بعد انھوں نے چارلس ڈکنز کے ناول پڑھنے شروع کیے۔ اس کے علاوہ ان کے پاس ٹیگور کی کتابیں ہوتی تھیں۔ آخر آخر میں نابینا ہو گئے تھے۔

میں شکل سے ذہین لگتا تھا اور کم پڑھنے کے باوجود، یادداشت تیز ہونے کے سبب، کچی پہلی سے لے کر میٹرک تک کلاس کا مانیٹر رہا۔

سکھر میں زندہ پیر کے مقبرے پر جاتا اور ایک پائی میں سادھ بیلے سے روٹی، چٹنی اور لسی خریدا کرتا۔ سندھو دریا میں یہ بیلا [جزیرہ] مجھے بہت پسند تھا۔ میں چھوٹی عمر ہی سے سیلانی بن گیا اور دادا کی طرح مسلسل باتیں کرنے کا شوقین۔ مجھے پیڑوں پر چڑھ کر بڑی ٹہنیوں پر لٹکنے کی عادت پڑ گئی جو اب تک ہے۔ کوٹڑی اور سکھر میں بیر اور کھجور کے پیڑوں کا کچھ شمار نہ تھا۔ کھجور مجھے بہت بھاتی تھی۔ (میں کعبے کی کھجور بھی کھا چکا ہوں۔) کھجور اتنی اچھی چیز ہے کہ اسے حاصل کرنے کے لیے ہندوستان اور پاکستان میں دائمی جنگ بندی کا معاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ گھومتا پھرتا، بھٹکتا، سوچتے رہتا، سوچتے رہتا۔ میں کہاں سے آیا؟ کہاں جاؤں گا؟ زندگی اور موت میں کیا غلط ہے، کیا صحیح؟ اسے کیونکر بہتر بنایا جائے؟ سکھر کی منزل گاہ نے میرے دل پر نہایت گہرا اثر چھوڑا، مگر عمر کم تھی، مسئلہ سمجھ میں نہ آیا۔ سومروں اور سموں کے زمانے سے، ریاستی سطح پر، سندھ میں مذہبی نفاق دیکھنے میں نہیں آتا۔ ترخانوں کے وقت میں کچھ سختی ہوئی مگر انگریزوں نے اکا دکا واقعات پر بہت زیادہ زور دیا۔ لیکن مسلمانوں مسلمانوں، ہندوؤں ہندوؤں کے درمیان لڑائی کی کئی ہی مثالیں تاریخ میں موجود ہیں، یعنی روایات کی لعنت۔ مگر سامراج وادیوں نے اپنے راج کو قائم رکھنے کے لیے سندھیوں میں نفاق کا بیج بویا۔ سندھ کی تاریخ اور ہندوستان کی تاریخ میں بڑا فرق ہے، سندھ میں تصوف کا بہت اثر رہا ہے۔

بات یہ تھی کہ تحقیقاتی کمیٹی نے ثابت کیا کہ منزل گاہ پرانی مسجد ہی ہے۔ کانگریس کے سندھی لیڈر، خاص طور پر جے رام داس، دولت رام اور جیو سند رام گدوانی، پہلے ہندو مہاسبھا کے رہنما رہ چکے تھے۔ وہ مسلمانوں کو جاہل، جٹ اور حیوان سمجھتے تھے۔ ان میں صبر نہیں تھا۔ حکومت میں ان کی چلتی تھی، بڑے عہدوں پر تھے۔ مسلمان اکثر کم پڑھے لکھے تھے اور ان کی اکثریت دیہات میں رہتی تھی۔ بس سادھ بیلے کے مہنت نے کہہ دیا بیلے کے سامنے مسجد نہ ہونی چاہیے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ اگر ایک گھر میں ہندو رہتا ہے تو دوسرے میں مسلمان کو نہ رہنا چاہیے۔ سکھر میں ہندوؤں کی اکثریت تھی اور اُس طرف کے ہندو لڑاکے بھی تھے جنھوں نے سکھر کے پاس اچھی خاصی جنگیں کیں۔ انھوں نے مسلمانوں کو مارنا شروع کیا۔ کانگریسی رہنماؤں کا ہندو سنسکار جاگ اٹھا۔ معاملہ علی محمد راشدی اور کھوڑو نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ سندھ کے مسلمان جو ہندوؤں کے لیڈروں میں وشواس رکھتے تھے، ہندوؤں سے کٹ گئے۔ سندھ میں مسلم لیگ نے زور پکڑ لیا۔ ہندو مسلمان خود کو الگ الگ قومیں سمجھنے لگے۔ کبور سنگت مارا گیا۔ بٹوارا ہوا۔

سندھی ہندوؤں کو ملک بدر ہونا پڑا۔

سادھ بیلے کا مہنت شری سرنام داس ضرور کوئی مہاپُرش ہو گا، مگر اسے شاید سندھ کی تاریخ سے واقفیت نہ تھی۔ اسے تصوف میں اعتقاد نہ تھا۔

میں آپ بیتی سے تاریخ میں تجاوز نہیں کرنا چاہتا، مگر کوئی بھی شخص تاریخ کی قوتوں کے اثر سے باہر نہیں ہوتا۔ ایک سادھو مہاتما کی غلطی اور اس کی اتنی سزا؟ سرل گاہ گئی سو گئی، سندھ بھی گیا۔ اب ہم کہانیوں کی طرح آسمان سے اُلٹے لٹکے ہوئے ہیں اور نظریں سندھ کی طرف لگی ہیں۔

***

میں شاید نو دس سال کا تھا جب کسی کے ساتھ لاہور گیا۔ وہاں بھی اسٹیشن پر ہندو چائے، مسلمان چائے دیکھی۔ میں نے دونوں کو پی دیکھا، مجھے تو کچھ فرق نظر نہ آیا۔

لاہور باغوں کا شہر ہے۔ بڑی تاریخی عمارتیں اور مقبرے ہیں، جیسے دلی اور آگرے میں ہیں۔ شالامار باغ جیسا باغ میں نے نہیں دیکھا ہے، اگرچہ کشمیر اب تک جانا نہیں ہوا۔ نئی پرانی انارکلی اسٹریٹ، چڑیا گھر، ۱۰ انسر اے کا بنگلا، راوی کنارے راجا رنجیت سنگھ کا قلعہ۔ میں خوب گھومتا پھرتا تھا۔ گھر رام گلی میں تھا جہاں اکثریت سندھی ہندوؤں کی تھی۔ سندھ میں چائے زیادہ پی جاتی تھی۔ پنجاب میں انگریز مفت میں چائے کی پُڑیاں بانٹتے تھے۔ گھروں میں پھینک جاتے تھے۔ سڑکوں پر، چوکوں میں، چائے مفت ملتی تھی۔ وہاں میں پنجابی زبان سیکھ گیا اور ـــــ تعجب ـــــ سندھی بھول بیٹھا۔ دادا، بھائی اور بہنوں کو مال روڈ لے جایا کرتے۔ اُس وقت ہندوستان کا تمام حُسن وہیں نظر آ جاتا تھا۔ لڑکیاں جیسے ہونٹوں پر پنکھ اور چاندنی مل کر گھومتی تھیں۔ بہت اچھی لگتی تھیں۔ سوچا کرتا کہ بڑا ہو کر کسی پنجابی دوشیزہ سے شادی کروں گا۔ دادا ریلوے میں نوکر تھے اور شاید تھیئٹر والوں سے ان کی دوستی تھی، اس لیے اکثر سینما کے ٹکٹ نہیں خریدنے پڑتے تھے۔ سکھر میں تمام سینما مفت، لاہور میں دو چار۔ میں نے سکھر اور لاہور میں خاص خاص فلمیں، خزانچی، نوکر، اچھوت کنیا، سندھی اور ماڈیا کی کچھ فلمیں دیکھیں۔ دراصل میرا جنم اُسی سال ہوا تھا جب ہندوستان میں فلم انڈسٹری کی بنیاد پڑی۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ میں مکالمے بازی اور خانگی زندگی میں اداکاری کرنے میں ماہر ہو گیا۔ خوش شکل اور لمبا تھا، بال بھی گھنے تھے جو اب پچھلے دس پندرہ سال سے سر کو خدا حافظ کہہ رہے ہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی معمولی جھڑپیں ہوا کرتی تھیں، ایسے جیسے کوئی دکان سے پان کھا کر نکلا اور کیلے کے چھلکے پر پھسل گیا۔

لاہور سے ہم کالکا گئے۔ پڑھائی سے بالکل فراغت۔ وہاں پہاڑوں جیسے اور ہاتھی کی ٹانگوں جیسے بڑے بڑے کچالو دیکھ کر حیرت میں پڑ جاتا۔ گنی کے ٹکڑے پر جا کر قدرت کا حسن دیکھا کرتا۔ چاندنی کا پیڑوں کے سوں میں الجھنا، دودھ کی طرح زمین پر گرنا اور پھولوں کی طرح سارے میں پھیل جانا۔ سورج یوں نکلتا جیسے

دل میں کسی خواب نے جنم لیا ہو۔ ہوا ٹھنڈی۔ اب بھی کبھی کالکا کا خیال آ جائے تو سخت گرمی میں بھی پل بھر کو دل میں ٹھنڈک سی تیر جاتی ہے۔ شملہ گھنٹے بھر کے فاصلے پر تھا مگر میں وہاں جا نہ سکا۔ وہاں کے سور جنگلی تھے جنھیں میں تیر کمان سے زخمی کرتا تھا، گو تیروں میں سوئیاں نہیں ہوتی تھیں۔

***

پھر واپس کوٹری۔ مکان دادا کے گھر کے سامنے، بڑی سڑک پر، بالائی منزل۔ نیچے مودی کی دکان۔ نور محمد اسکول میں داخلہ۔ دکان کے برابر میں سپاہی کا گھر۔ وہ ایک پٹھان لڑکی تھی۔ آنکھیں بڑی بڑی اور سیاہ، کبھی بھی مُندی ہوئی نہ ہوتیں۔ ہونٹ بھرے بھرے اور اتنے سُرخ جیسے تمام وقت کوئی چومتا رہا ہو۔ ناگوں جیسے کالے بال، گردن لمبی، سر اُٹھاتی تو لگتا جیسے خواب سے جاگی ہو۔ چھاتیاں شاید سخت اور بھاری، جن کے بوجھ سے چلتے وقت اس کا سر ذرا جھک جاتا۔ کالی شلوار، کالا کُرتا جس پر ٹوٹے ہوئے آئینے جڑے ہوئے۔ میں نے اکثر اسے کالے یا پھر سفید لباس میں دیکھا۔ مجھے یاد ہے، ۱۹۴۰ کا سال تھا اور دوسری عالمی جنگ چھڑ چکی تھی۔ میرا پیر دسویں سال میں تھا اور وہ سترہ اٹھارہ سال کی تھی۔ اُس سے پریم یا شادی نہ کر پانے کا دکھ چالیس برس سے سینے میں سنبھالے ہوئے ہوں۔

میرے دادا کہتے تھے کہ سامنے عید گاہ ہے، وہاں کبھی نہ جانا، وہاں ایک جن ہے۔ اس کا سر نہیں ہے اور آنکھیں چھاتی میں ہیں۔ میں خوف سے ناواقف، روز اُس کی تلاش میں جاتا۔ جہاں جانے میں خطرہ ہو، مزہ تو وہیں ہے۔ وہاں گھنے پیڑ تھے۔ میں کسی ایک پیڑ کے نیچے کھڑا ہو کر پہلے اس کے پیچھے، پھر اوپر اور پھر سامنے دیکھتا۔ اس سے آگے بند تھا۔ بند پر میں نے کبھی کسی آدمی کو نہ دیکھا۔ ان پیڑوں میں بے شمار پرندے تھے اور ان کی میٹھی آوازیں۔ سیپیر کو پیدا ہوا تھا، اس لیے پیروں میں سیپیر تھا۔ بند پر گھومتے ہوئے راگ گنگنایا کرتا، اوپر چڑھ کر کودتا، پرندوں کو تکتا، پھل توڑ کر کھاتا، خود کو خوش سمجھتا اور اس بات سے ناواقف تھا کہ دنیا کی سب سے خطرناک دوسری عالمی جنگ جاری ہے جس نے لوگوں کو پیڑ اور پرندوں کی آوازیں فراموش کرا دی ہیں۔

ایک دفعہ دادا کسی سے کہہ رہے تھے میری فیملی۔ میرے پاس تو روس کی فوج ہے۔ ہمارے گھر ہر دوسرے تیسرے سال کوئی پیدا ہوتا۔ پہلے بہن لیلاں، جو مجھ سے چار سال بڑی ہے۔ اس کی شادی تیس کے ایک زمیندار سے ہوئی، اب تو دادی نانی ہو چکی ہے۔ اس کے بعد اسقاط ہو گیا۔ پھر میں پیدا ہوا۔ پیدائشی نام سکھارام۔ میرے بعد گلاب، جو پچھلے ۳۲ سال سے برٹش ایرویز میں کام کرتا ہے۔ اس کے بعد اندرا جس نے اشوک کشورانی سے شادی کی اور جن کے بچے سنسکرت کے پنڈت ہیں۔ کملا، مایا، موتی، آشا۔ آشا بٹوارے کے سال پیدا ہوئی۔ موتی پر کراچی کے ٹیلیگراف آفس کا لوہے کا دروازہ گر پڑا! وہ اس پر چڑھا ہوا تھا۔ نو سال کا تھا۔ کسی نے مدد نہ کی۔ خود زور لگا کر دروازہ اوپر اٹھایا جو پھر اس کے اوپر آ گرا اور

وہ مر گیا۔ اس کا ہمارے پاس کوئی فوٹو نہ تھا۔ تب میں نے سوچا تھا کہ مصور بنوں گا اور بھائی کا ایک امر چترر بناؤں گا۔ مگر یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ خود میں اس کی صلاحیت ہی نہ دیکھی۔ چترر تو دل پر بنا ہوا ہے۔ مجھے رنگ نہیں، لفظ ملے۔

سب بہن بھائیوں کی شادی ہو چکی ہے اور بس، چل رہے ہیں۔ تو یہ تھی روس کی موج۔

بیاضی لسی کے گلاس بھیجتی تھی۔ کبھی میں بیاضی کے گھر پہنچ جاتا۔ وہ مجھے چھاچھ پلاتی، سینے سے لگاتی، چمیاں دیتی۔ تب مجھے محسوس ہوتا کہ اس کا سینہ تاج کے گنبد کی طرح، سنگ مرمر کی طرح سخت ہے۔

کوٹری میں کون کون بڑے لوگ رہتے تھے، یہ تو مجھے خبر نہیں، مگر وڈیرا نصیر خان یاد ہے۔ بڑی سڑک پر اس کی اوطاق تھی۔ پُل کے سامنے طرف جا کر بائیں اور ہرن مارتا تھا اور ان کی کھالیں ایوان کی دیواروں پر لٹکاتا تھا۔ وہاں بندوقیں اور تلواریں بھی لٹکی ہوتی تھیں۔ لمبا، قد آور، آنکھیں سُرخ، مونچھیں راجا پرتاپ سنگھ کی طرح چڑھی ہوئی۔ بڑے گھیر کی شلوار، شاہی جوتا۔ بدن پر کارتوسوں کی پیٹی۔ ایک دفعہ اس نے مجھے بلایا۔

تم لالا سنگھارام کے پوتے ہو؟

ہاں۔

بیاضی کو پہچانتے ہو؟

ہاں۔

ایک کام کرو گے؟

کہیے۔

یہ پانچ روپے اُسے دے دینا۔ کہنا آج رات نہیں آؤں گا۔

وہ آپ کو جانتی ہے؟

پاگل۔ میری سُریت [داشتہ] ہے وہ۔

نوکرانی؟

میری رال [بیوی]۔

مگر آپ کی رال تو پیچھے حویلی میں رہتی ہے۔

وہ پہلی ہے۔ وہ مسکرایا۔ حق سندھی۔

تو آپ کی دو بیویاں ہیں؟

ہاں۔ اب بک بک نہ کرو۔ اور لالا سنگھارام سے نہ کہنا۔

بعد میں پتا چلا کہ لوگ اس سے بات نہیں کر پاتے تھے اور آنکھیں چار کرتے ہوئے اکثر لوگوں کا

پیشاب حطا سو جاتا تھا۔

تم نصیر حاں کی رال ہو؟

تم سے کس نے کہا؟

اس نے حود۔

اس نے حوشی میں بے احتیار مجھے چوم لیا۔

حود کہا کہ میں اس کی رال ہوں؟

مگر حق سدھی نہیں۔

وہ اُداس ہو گئی۔ میں صرف سدھی ہوئی ہوں، میرا کیا حق!

اور یہ پانچ روپے دیے ہیں۔

اس نے لے لیے۔ بولی، ایک کام کرو۔ یہ ایک آنہ لو۔ پل کے پاس ایک دکان ہے۔ وہاں سے افیم لادو۔ اس نے پتا بتایا۔

اس دن کے بعد میں رور یا اکثر اسے افیم لا کر دیتا۔ ایک دن دیکھا کہ رو رہی ہے۔ پاس میں ایک لاٹھی کھڑی تھی۔

میں نے اسے ہاتھوں سے تھام کر پوچھا، کیوں رو رہی ہو؟

میرا نصیب۔

نہیں، بتاؤ۔

اس نے مجھے مارا۔ نصیر حاں نے۔

کیوں؟

میں نے اس سے کہا کہ میں ماں ننا چاہتی ہوں ہمیشہ کہتی ہوں۔

وہ تمھیں ایسی ماں کیسے بنا سکتا ہے؟

اُس کی ماں نہیں، اپنے بچے کی ماں۔

تو پریوں سے کہو نا۔ نانی کہتی ہیں، بچے مانگنے پڑتے ہیں۔ رات کو پریاں سفید کپڑے پہن کر چاند سے اُترتی ہیں اور بچے کو ماں کے پاس لٹا کر واپس چلی جاتی ہیں۔

اس نے میری آنکھوں میں دیکھا۔ اداس ہوتے ہوئے بھی مسکرائی۔

تمھیں کچھ پتا نہیں۔

تمھیں مارا کس چیز سے؟

اس ڈنڈے سے۔

میں نے وہ ڈنڈا اٹھا لیا۔

کیا کر رہے ہو؟

میں اس کا سر پھاڑ دوں گا۔
وہ تمھیں کوئی مار دے گا۔
کیوں؟ میں کوئی ناگہ ہوں؟
تم کچھ نہیں سمجھتے۔
سب سمجھتا ہوں۔ ایک کام کرو۔ مجھ سے شادی کر لو۔ میں لال پری سے کہوں گا کہ تمھیں ایک بچہ لا دے۔
وہ مسکرائی۔ تمھیں پتا بھی ہے شادی کیا ہوتی ہے؟ تم چھوٹے، میں بڑی۔ تم ہندو، میں مسلماں۔
شادی کا مطلب ساتھ رہنا۔ باقی بڑا تو میں جلد ہی ہو جاوں گا۔ ہندو کیا، مسلماں کیا؟ تم بڑی ہو تو مجھے چومتی ہو۔ میں بڑا ہو جاؤں گا تو میں بھی تمھیں چوموں گا۔
اچھا ٹھیک ہے۔ یہ لاٹھی رکھ دو۔ چارپائی پر لیٹ جاؤ۔
میں لاٹھی رکھ کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ وہ بھی لیٹ گئی۔ میں کافی لمبا تھا۔ اس نے مجھے لپٹا لیا، میں نے اُسے۔ وقت کی کچھ خبر نہ رہی۔ پھر دیکھا کہ اس کی آنکھوں سے پانی بہہ رہا ہے۔ میں چپ چاپ اٹھا اور چلا آیا۔
جلد ہی ہمیں کراچی جانا پڑا۔ وہ مجھے چھاتی سے لگا کر روئی۔ کچھ تو دیکھا ہو گا اس نے مجھ میں، پتا نہیں کیا۔ کہنے لگی میرے شہزادے، ہمیشہ خوش رہو۔ کراچی میں اُس کی یاد آتی تھی، مگر وہ نہ آئی۔ جب سولہ سال کا ہوا تو سینے میں درد کی لکیر اُبھری۔ اس کی یاد آئی۔ میں نے اماں سے پانچ روپے لیے۔ ایک روپے نو آنے کا کوٹڑی کا ٹکٹ لیا۔ اسٹیشن سے تانگے میں بیٹھا۔ دو آنے کرایہ، دو میل کا راستا۔ مجھے لگتا تھا کہ اب جوان ہوں اور اسے لپٹا کر چوم سکتا ہوں۔ میرے بدن میں آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ کراچی میں کشتی، کلے ماری وغیرہ سیکھ چکا تھا۔ سائیکل چیمپیئن بھی تھا، مگر پڑھتا تھا جو تھی انگریزی میں۔
نصیر خاں کی ایسی کی تیسی! ایک لات عصور میں پر، ایک پیٹ میں۔ ناک پر ایک ٹکر، اور نصیر خاں فرش پر۔ میں اس کی چھاتی پر پیر رکھ کر چلاؤں گا ہا آ آ آ ہووو۔ مگر جب تانگے سے اترا تو نصیر خاں یاد نہ آیا۔ سیدھا بیاصی کے گھر پہنچا۔ بس اسے بانہوں میں لے کر سو جاؤں گا اور صبح اس سے کہوں گا دیکھو اپنے شہزادے موہن کو۔ لڑکیاں دیکھتی ہیں تو بے ہوش ہو جاتی ہیں۔ میری آنکھوں میں کلوروفارم بھرا ہے۔ میں اُس وقت پکا ہندو تھا اور آر ایس ایس کا ممبر بھی۔ مگر عشق میں فقط ایک انسان تھا۔
دیکھا تو گھر پر تالا، جیسے منہ پر لگا ہوا ہو۔ دل جیسے بیٹھنے لگا۔
وہ بیاصی؟ سال بھر ہوا چلی گئی۔ خدا جانے کہاں۔ اس کے باپ کی شاید کابل میں خشک میوے کی دکان ہے۔ شاید وہیں گئی ہو۔

***

کراچی میں میرا گھر رنس روڈ پر تھا، لا کالج کے داہنے ہاتھ ٹیلیگراف آفس کے پچھلے گیٹ کے بالکل سامنے۔ پیچھے بائیں طرف، آزاد پریس تھا۔ گھر تیسری منزل پر تھا، بلڈنگ کا نام کرم داراس بلڈنگ تھا، جو بعد میں بدل کر رگھومل تولارام مینشن ہو گیا۔ میرے برابر میں ایک سندھی لڑکی رانی بھاٹیا رہتی تھی جو اب آل انڈیا ریڈیو بمبئی میں اونچے عہدے پر ہے۔ اردو شاعری کی کتابیں پڑھا کرتی اور مجھے بھی دیتی۔ کراچی میں اردو کا چلن یوں تھا جیسے لندن میں فرانسیسی کا۔

ہم محلے کے لڑکے ــــ ہندو مسلمان سندھی پنجابی ــــ اکٹھے کھیلا کرتے اور لوَرز برج (Lovers Bridge) کے درواروں کے پاس سے گزر کر کلفٹن جایا کرتے۔ سائیکل پر ریسیں ہوا کرتیں۔ جنگ کے باعث کراچی میں بلیک آؤٹ ہوتا تھا۔ ہم گایا کرتے

ٹھک ٹھو ٹھا، جلیبی کھا

جرمن مَرے، ہمارا کیا!

کانگریس کے جلوس دیکھنے کے بعد سڑکوں کے بلب بھی دیکھا کرتے۔ میں ایک کو ہینڈل پر، ایک کو آگے، ایک کو پیچھے، ایک کو کھڑا کر کے اور کبھی کبھی ایک کو کندھے پر بٹھا کر سائیکل چلاتا۔ میں نے اسکول میں اس طرح کے کئی مقابلے جیتے۔ کراچی ملیر کراچی کی ریس میں اول آیا تھا۔ پھر یرا تھا، دوڑنے اور اُچھلنے کودنے میں ہوشیار۔ سولہ سولہ فٹ کی بلندی سے کود جایا کرنا۔

ایک دودھ والے کے بیٹے نے مجھے گالی دی۔ میں نے اس کے سر پر زور سے گھونسا مارا تو گومڑا نکل آیا۔ وہ جا کر اپنے باپ کو بلالایا۔ کہنے لگا اس نے مجھے پتھر مارا ہے۔ میں نے اس کے سر پر دوسرا گھونسا رسید کیا اور اس کے باپ سے کہا، جھوٹ بولتا ہے۔ دیکھو یہ دوسرا گومڑا۔

صدر میں میرے ہم عمر ایک انگریز لڑکے نے مجھ سے ریس کی۔ خود بخود ہو گئی، ریگل سے بے ٹیسر کی طرف۔ وہ جیت نہ سکا اور کسی سے ٹکرا کر گر پڑا۔ مجھے دکھ ہوا۔ اس کے بعد میں آہستہ سائیکل چلانے لگا۔ وہ بھاگا۔ آگے اس کے باپ کی دکان تھی۔ میں نے دیکھا کہ باپ بیٹا دونوں بازو اوپر کیے کھڑے ہیں۔ مجھے انگریزی اچھی طرح سمجھ میں آجاتی تھی کیوں کہ ماں بھی پڑھی ہوئی تھیں، ابا بھی میٹرک تک پڑھے تھے اور ماموں موہن نے خاص شوق سے مجھے انگریزی سکھائی تھی۔ میں نے کہا، سر، ون بائی ون! اس کا باپ بولا، یہ تمہاری عمر کا ہے۔ اس سے لڑو۔ سو ہماری باکسنگ شروع ہو گئی۔ ٹریفک جام ہو گیا۔ میں بچاؤ کرنے میں ماہر تھا اور پتا نہ چلنے دیتا تھا کہ حملہ کس طرف کروں گا۔ جوان کی ناک اور منہ سے خون بہنے لگا اور وہ زمین پر گر پڑا۔ اور وہ انگریز باپ! بیٹا زمین پر گرا پڑا ہے مگر میری طرف آیا، مجھ سے ہاتھ ملایا اور پیشانی چوم کر بولا یو آر اے ہیرو۔ سکسٹ، فائٹ فور یور نیشن! واقعی کوئی عظیم

انگریز تھا۔
کاش اُس وقت کسی نے مجھے قوم کا کوئی دانش مندانہ تصور دیا ہوتا۔ میں گیارہ برس کی عمر میں انقلابی ہو گیا۔ سولہ سال کی عمر میں انڈر گراؤنڈ بھی رہا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں تین مہینے جیل میں بھی رہا، مگر اس وقت مجھے حسرت یہ بھی کہ قوم کیا ہے اور کس قوم کے لیے لڑنا ہے۔ میری زندگی کا وہ اہم دور ایک غلط آدرش واد کی نذر ہو گیا۔ میں گویا ایسے ہی خلاف لڑ رہا تھا، ایسے ہی کو رحمی کر رہا تھا۔ کسی جگہ بندوقوں، کارتوسوں اور بلموں کی دیکھ بھال کی ذمے داری بھی اٹھائی، اور اس بیچ میں ایک بار کوٹھری بھی ہو آیا جہاں سیاسی نہیں تھی، فقط اس کی یاد تھی۔

***

گیارہ سال کوئی بڑی عمر نہیں ہوتی مگر اُس وقت میں خود کو کافی بڑا اور سمجھ دار سمجھتا تھا۔ اب جب اس عمر کے بچوں کو دیکھتا ہوں تو اُن کی اسکول اور جوابوں کو سمجھ سکتا ہوں۔ سر میں کچھ حرانی تھی، اس لیے مار دھاڑ بہت کرتا تھا۔ دوست بھی کہا کرتے کہ میں محلے کا دادا ہوں، سو انگریزی میں مانیں مارو بر پی ڈی، یعنی پاڑے کا دادا، کے حروف لکھوائے، جواب بھی موجود ہیں، اور کئی دوستوں کے مختصر نام بھی۔ انھوں نے بھی میرا نام اور دوسروں کے نام لکھوائے۔
میں ماڈل ہائی اسکول میں پڑھتا تھا۔ ایک بار کلاس کے لڑکے ریسس میں کبڈی کھیل رہے تھے۔ میں نے کہا کہ مجھے بھی کھلاؤ مگر انھوں نے نہ کھلایا۔ میں بیچ میدان میں کھڑا ہو گیا کہ مجھے نہیں کھلاؤ گے تو کھیل نہیں ہو گا۔ دو چار لڑکے آگے بڑھے۔ میں نے انھیں مار لگائی۔ وہ بھاگ گئے۔ مجھے ماسٹر نے بلایا او کہا کہ مار پیٹ کرنے سے بہتر ہے کہ تم ناٹک میں کام کرو۔ سو انھوں نے سالانہ جشن کے ناٹک میں بھارت ماتا کا رول دیا۔ ویسے ایک ناٹک میں نے ۱۹۴۹ میں کلیان ریفیوجی کیمپ [بمبئی] کے سندھ نیشنل ہائی اسکول میں بھی کیا جس میں مجھے حیدر آباد دکن کے جاگیردار سما قاسم رضوی کا رول کرنا پڑا۔ مگر اداکاری میں زندگی میں تو کر پایا، ناٹک میں نہ کر سکا۔
کراچی کے میکلوڈ روڈ کے اوپر سے برنس روڈ کی سڑک نکلتی ہے جو پریمیئر ہائی اسکول کے بعد بندر روڈ پر ختم ہوتی ہے جسے پہلے مہاتما گاندھی روڈ بھی کہتے تھے اور اب وہ جناح روڈ ہے۔ میکلوڈ روڈ اب چندریگر روڈ ہے اور برنس روڈ کا نام کہتے ہیں محمد بن قاسم روڈ رکھ دیا گیا ہے۔ ان دونوں سڑکوں کے کونے پر برٹش اوورسیز ایرویز کارپوریشن کا خالی پلاٹ تھا۔ اس کے بعد ایک بلڈنگ، جس کے ساتھ ایک سڑک اندر کو جاتی تھی۔ سڑک کے پرلے کونے پر پہلی بلڈنگ، جہاں میرا گھر تھا، مشرق کی جانب۔
ہم اُس میدان میں کرکٹ کھیلا کرتے۔ ایک دن کیا دیکھتے ہیں کہ وہاں تیس چالیس پچاس لڑکے قطاریں اور گول دائرے بنائے کھیل رہے ہیں۔ میرے دوست کھیلنے پہنچے تو لڑکوں نے انھیں ڈانٹ

ڈپٹ کر بھگا دیا۔ وہ آر ایس ایس کی ایک شاخ تھی اور میدان پر کیسری جھنڈا لہرا رہا تھا۔ وہ دوست میرے پاس آئے ہوئے تھے، یہ ظلم ہے، بعداد ہے۔ آر ایس ایس، اور تمہارے ہوتے ہوئے! ان میں ایک سجانی، ایک سندھی، ایک گجراتی اور ایک مرہٹہ تھا دھرم پال، لعل، کشن اور بال کشن۔ میں نے نیکر پر بیٹی باندھی اور ان کے ساتھ میدان میں پہنچا۔ دوسرے دوست باہر کھڑے تھے کیوں کہ سنگھیوں نے وہاں سے گزرنے پر بھی روک لگا رکھی تھی۔ میں میدان میں سے گزرا تو اس کا انچارج آگے بڑھا اور بولا
یہاں سے گزرنا منع ہے!
وہ کوئی پچیس برس کا جوان تھا۔
یہ میدان تمہارے باپ کا ہے؟ میں نے جوش میں آ کر کہا۔
بھاگ جاؤ ورنہ مار کھاؤ گے۔
میں نے اسپین کے بیل کی طرح اُس پر حملہ کر دیا۔ دونوں ہاتھ اُس کے گلے میں اور سر چھاتی پر لگا کر ایسا دھکا دیا کہ وہ چھ فٹ دور جا گرا اور میں اس کی چھاتی پر چڑھ کر منہ اور کنپٹی پر گھونسے مارنے لگا۔ اس نے چلا کر کہا کُڑوا یعنی مارو۔ بس پھر تو سب لڑکے مجھ پر پل پڑے، انھوں نے مجھے ٹانگوں، بازوؤں، گردن اور بالوں سے پکڑ کر ہوا میں اٹھا لیا اور زمین پر دے مارا۔ میں اٹھ کر ایک آدھ کو دھکا دوں تو وہ مجھے پھر گرا دیں۔ میرے دوست بھاگ گئے۔ آخر خوب مارنے کے بعد انھوں نے مجھے دیوار کے پاس بٹھا اور کھیلنے لگے۔ ایک لڑکا شاید گاڑی کھاتے کچھ رپورٹ کرنے چلا گیا۔ میرے منہ اور ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ کپڑے پھٹ گئے تھے۔ چہرے اور تمام جسم پر زخم آئے تھے۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وہاں سے ہٹا نہیں اور رویا نہیں۔ ایک طرف وہ انگریز باپ تھا اور دوسری طرف یہ ہندو بہادر! میں سوچنے لگا کہ یہ انچارج بھی آج گھر تو جائے گا ہی، اور اگر گروپ میں گیا تو اسے گھر سے نکال کر ماروں گا۔
اتنے میں نیلی آنکھوں والا ایک جوان وہاں پہنچ گیا جس کا نام رگھو شانی تھا۔ وہ آج کل ناگپور میں رہتا ہے اور ۱۹۵۹ میں ناگپور اسمبلی کے مشاعرے میں میری زبردست کامیابی دیکھ کر میرے پاس آیا تھا۔ بالکل سوکھ کر کانٹا ہو چکا تھا۔ اسے فخر تھا کہ کبھی وہ میرا سیاسی گرو رہا تھا اور اس نے بتایا کہ میری کہانیاں بھی پڑھتا رہا ہے۔ خیر، تو اس نے آتے ہی کچھ اس طرح کی بات کی تم ویر ہو۔ بچپن میں رام اور کرشن بھی ایسے ہی تھے، رانا پرتاپ اور شواجی بھی۔ نام کیا ہے؟ ہوس لال؟ تو ہوس جی، تم اس میدان کے لیے لڑتے ہو، کیوں کہ یہ تمہارا ہے؟ ہم بھی ایک میدان کے لیے لڑ رہے ہیں جو ہم سب کا ہے۔ اس میدان کا نام ہے بھارت۔ آج بھارت ماتا انگریزوں کی غلام ہے۔ ہمیں اسی ماں کو آزاد کرانا ہے اور میدان کو بھی اپنے قبضے میں کرنا ہے۔ پہلے بھارت میں دودھ اور شہد کی نہریں بہا کرتی تھیں، اب پانی بھی پورا نہیں ملتا۔ پہلے بھارت سونے کی چڑیاں بناتا تھا، اب مٹی کی بھی نہیں بناتا۔ بھارت ہندوؤں کا ہے۔ اگر ہم سب ہندو ایک ہو جائیں تو انگریز یہاں ایک دن بھی نہیں ٹھہر سکتے۔ تم بھی ہندو ہو۔ تم بھی روز یہاں آیا کرو اور بھارت میں انقلاب لاؤ۔

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا، پیار کیا، بازو سے تھام کر آگے لے آیا۔ دائرے اور قطاریں ختم کرا کے اس نے میرا تعارف کرایا۔ ان سب نے مجھ سے معافی مانگی اور سب مل کر ایک گیت گانے لگے

بھارت ماں تیری جے ہووے
تو شُدھ تو بُدھ تو پریم آکار
تیرا اُدے سوریہ، ماتا اُدے ہوا

***

۱۹۴۱ میں میں سنگھ میں شامل ہوا اور ۱۹۵۲ میں اس سے الگ ہوا۔ گیارہ سال کی عمر میں داخل ہوا اور بارہ برس گزارے۔ ۱۹۵۲ میں میں نے ناول آوارہ لکھا۔ یوں تو ۱۹۴۹ سے میں سنگھ سے ٹوٹ گیا تھا مگر پوری طرح الگ ہونے میں تین سال اور لگے۔ بٹوارا اسی درمیاں میں ہوا۔ اگر میں سنگھ میں نہ ہوتا تو شاید سندھ کبھی نہ چھوڑتا۔ میں نے سپنوں سے پیار کیا اور یہ سپنے بھارت کی آزادی کے تھے۔ بھارت آزاد ہوا، لیکن سندھ اس میں شامل نہ تھا۔ اس لیے میں نے سندھ چھوڑ دیا۔ میں ایسا کوئی عذر پیش نہیں کروں گا کہ میں بچہ تھا اور مجھے سمجھ نہ تھی اس لیے غلط رستے پر پڑ گیا تھا۔

صبح اسکول، شام کو سنگھ کی شاکھا۔ اتوار کو صبح کی شاکھا اور کتاب۔ میں نے اس میں اتنی ترقی کی کہ تین چار سال میں ایک شاخ کا اسسٹنٹ انچارج بن گیا۔ اور ۱۹۴۸ میں کلیاں ریفیوجی کیمپ یعنی اُلہاس نگر میں اس [آر ایس ایس] کی بنیاد ڈالی اور گنو ساستانی اور راجن چاولا کو بھی اس میں لے کر آیا۔ ان دونوں نے بھی بعد میں سنگھ چھوڑ دیا۔ اس وقت اُلہاس نگر کے بڑے بڑے لیڈر، عہدے دار اور افسر میرے پرانے شاگرد ہیں اور اب تک اس پارٹی میں ہیں اور میری کافی عزت کرتے ہیں۔

راگ، کھیل، کراتی کے گیت سنگھ کے آدرش کچھ اس قسم کے تھے

ہندوستان ہندوؤں کا ملک ہے، ہندی ہماری راشٹر بھاشا ہے، ہندو دھرم ہمارا راشٹر دھرم ہے، ہندوستان میں سب رہ سکتے ہیں، مگر وہ سب ہندوستان کے قومی سورماؤں کو اپنے قومی سورما سمجھیں اور ہندوستان کے وفادار رہیں۔ اس لیے ہندوؤں میں اتحاد ہونا ضروری ہے۔ کہیں کوئی ہندو مار کھائے تو اس کے مخالف پر اکٹھے ہو کر حملہ کرو اور اسے اچھی طرح مار دے کر پھر ان دونوں میں صلح کراؤ۔ کانگریس کی اہنسا [عدم تشدد] بزدلی ہے۔ ظلم کا مقابلہ ہنسا [تشدد] سے کرو جیسے روس میں بولشویکوں نے کیا۔ مسلمانوں کی اکثریت ان بزدل ہندوؤں پر مشتمل ہے جنھوں نے اسلام کا سورج اُبھرتے دیکھ کر اسے اختیار کر لیا، ان سے ڈرنا نہیں چاہیے۔ اگر راجا ماں سنگھ پرتاپ کا ساتھ دیتا یا جے سنگھ چھترپتی شواجی کی مدد کرتا تو کب کا ہندوستان میں ہندو راج قائم ہو چکا ہوتا۔ ہندوستان کی غلامی کا سبب ہندوؤں کی نااتفاقی

ہے۔ دشمن نکال دو اور ملک پر قربان ہو جاؤ۔

میں اخبار پڑھتا اور اُس زمانے میں چاہتا تھا کہ ہٹلر جنگ جیت جائے اور سبھاش چندر بوس، جرمنی اور جاپان کی مدد سے، ہندوستان کو آزاد کرا لیں۔ مگر جنگ انگریزوں اور ان کے ساتھیوں نے جیتی۔ ہٹلر نے شاید خود کو گولی مار لی اور سبھاش بابو بھی ہوائی حادثے کا شکار ہو گئے جس کا اب تک مجھے بڑا صدمہ ہے۔

سکھر میں میں نے خوب نام پیدا کیا۔ سندھ کے انچارج راج پال پوری سے بھی واقفیت ہو گئی۔ ایک اور بھی پرمود اس ٹائی تھا جس کا کہنا تھا کہ پاکستان ضرور بنے گا۔ ہم اچانک سندھ کے پولیس اسٹیشنوں، ایئرپورٹ، ریڈیو اسٹیشنوں وغیرہ پر قبضہ کر لیں گے۔ اُس اعتبار سے میں ابھی چھوٹا تھا اور مجھے خبر نہ تھی کہ ہتھیار کہاں سے آتے ہیں۔ کرم مارا اس نے اپنی بلڈنگ رگھومل تولارام کو بیچ دی اور خود جانے کہاں چلا گیا۔ اس کی جوان بیٹی پین کو میں نے پھر کبھی نہ دیکھا۔ اس نے فلیٹ خالی کیا جس کی چابی مجھے ملی۔ وہاں سنگھ کے کئی انقلابی آتے تھے۔ شری شواجی سکھر اکثر آتا اور ایک پنجابی جیون جیت سنگھ۔ اس نے یہ دہلی کے سنٹرل بینک میں نوکری کر لی اور مجھے دو تین خط بھی لکھے۔ دادا مجھے خط میں نورِ چشم لکھتے تھے، یعنی آنکھوں کا نور، میں اس کا مطلب یہ سمجھتا تھا کہ پیارے موہن۔ سو میں نے جواب میں اُسے لکھا: نورِ چشم جیون جیت سنگھ۔ اس نے لکھا: نورِ چشم تم میرے ہو یا میں تمہارا؟
۱۹۴۹-۵۰ میں ادیب مجھے برخوردار کہا کرتے تھے کیوں کہ میں سب میں کم عمر تھا۔ ایک دن میں نے مسٹری کوئلس کے مصنف لیکھو ٹلسیانی سے کہا: چلیے برخوردار۔ وہ بولے: برخوردار تم میرے ہو یا میں تمہارا؟ تم بنو اور میں کاٹوں یا میں بنوں اور تم کاٹو؟

یہ وہ وقت تھا جب دن بیتتے ہیں، دل میں اُمنگیں جاگتی ہیں اور خوابوں کے لیے لڑا جاتا ہے۔ نئے خیال، نئے منصوبے۔ آزادی، آزادی، آزادی۔ کبھی من مایوس ہو تو اندر سے آواز آتی ہے کرانتی۔ ہم رات کو مشعلیں اٹھا کر گایا کرتے۔ میں نے سندھی میں کچھ ویدوں کا مطالعہ کیا اور رامائن، مہابھارت اور بھاگوت پڑھی۔ مہابھارت میں نے جیون جیت کے ساتھ پڑھی جو گورکھپور کے کلیان رسالے نے شائع کی تھی۔ اسے پورا کرنے میں تین سال لگے۔

سندھ میں کون سی وزارت بنتی یا گرتی ہے، اس کی مجھے کچھ سمجھ نہ آتی۔ بس ہندی، ہندو، ہندوستان! مجھے جو خالی فلیٹ ملا اس میں کچھ کارتوس اور کرچیں بھی نظر پڑیں۔ کرچ جیسے ہاتھ میں چھوٹا سا ڈنڈا، کھول کر حملہ کرو تو خنجر۔ مجھے کہا گیا کہ تم شکل سے معصوم لگتے ہو اس لیے خفیہ محکمے میں آ جاؤ اور جاسوسی کا فن سیکھو۔ آزادی تو جانے ملے یا نہ ملے، پاکستان ضرور بنے گا۔ تم فہرست اور پتے لو اور فلاں فلاں کا پیچھا کرو کہ کہاں جاتے ہیں، کس سے ملتے ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ پھر یہ خبریں فلاں جگہ راجپال پوری کو پہنچاؤ (جن کو ہم شری جی کہا کرتے تھے)۔

رہ رہ کر میرا دل کوٹھڑی کی طرف بھاگتا تھا، مگر وہاں ساتھی کو نہ پا کر میں نے پورے دل سے خود کو

سنگھ کے کاموں میں لگا دیا۔ زور حاضری، زور جاسوسی، زور مارا ماری۔ کھیلتے میں ٹانگوں پر بہت چوٹیں لگیں۔ پہلے تو میں علاج ہی نہ کراتا، پیسے ہوتے تب بھی نہیں۔ پھر کچھ پیسے لے کر کراتا بھی تو زخم مہینوں چلتے۔ میری نشانی ہی یہ تھی کہ ٹانگ پر پٹی بندھی ہے۔

اُس انقلابی جیسے میں جہاں ہتھیار ہوتے تھے، ہندوؤں کے دھرم، سنسکرتی، ساہتیہ، برت، پرانے مندروں میں ان کی مہارت پر خاصی بحث ہوا کرتی۔ ہم کلکٹر پرشو کے مندر میں جا کر سنسکرت میں گیت گایا کرتے۔ دس اوتاروں کی (جن میں سے نو ہو چکے ہیں) کتھا میں سنتے۔ اس دیش میں کچھ نہایت سندر اور الوکک ہے جسے کہا جاتا ہے، کچھ بھید بھرا، پُراسرار۔

ہمارے مکان کی حالت کچھ اس طرح تھی: بیڈروم اور ہال۔ ٹائلیں فقط کوٹھے اور بالکنی میں تھیں۔ رسوئی، کاکوس اور اشنان گھر کے علاوہ اسٹورروم بھی تھا۔ کرایہ اکیس روپے۔ پانی نلکوں سے آتا تھا، کوٹری اور سکھر کی طرح پکھالی نہیں لاتے تھے۔

دادا کو انگریزی کیمپ میں گروسر کی نوکری کی پیش کش ہوئی اور وہ خاصی تنخواہ پر وہاں کام کرنے لگے۔ انہوں نے للت پور، بینا، ساگر اور چھترپور میں کام کیا اور بٹوارے کے وقت ان کی شاپ کلیان ملٹری کیمپ میں تھی، یعنی آج کل کے اُلہاس نگر میں، جہاں ہمارا کنبہ پہلا سندھی کنبہ تھا جو آباد ہوا۔

ماما نے بھی برنس روڈ پر سیوھانی کلب کے اوپر بڑا سا مکان لے لیا جس میں پانچ بیڈروم تھے۔ ماموں موہن شاہانی دادا کو پسند تھے اور لاہور میں بھی ہمارے پاس آ کر دو چار ماہ رہ چکے تھے۔ کراچی میں وہ سَردیوی ہائی اسکول کے باہر لڑکیوں کو تاکتے تھے اور اکثر ان میں سے کسی کو سائیکل پر بٹھا کر برنس گارڈن لے جاتے تھے۔ وہ بھی دادا کے پاس جا کر کام پر لگ گئے۔ ایک دن تار آیا کہ کان کے درد سے وہ فوت ہو گئے ہیں اور دادا کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ایک انگریز سے ان کا جھگڑا ہو گیا تھا۔ اُس نے کہہ دیا کہ ہندوستانی کتے ہیں، جس پر ماموں نے گھونسا مار کر اس کے آگے کے دانت توڑ دیے۔ انہیں فوراً شوٹ کر دیا گیا۔ دادا پر مقدمہ چلا اور انہیں دو تین سال قید کی سزا دی گئی۔ دادا نے یہ معاملہ کبھی تفصیل سے نہیں بتایا۔ انہیں اپنا یہ سالا بہت پیارا تھا۔ اس کی بہادری اور شہادت کی خبر کسی اخبار میں نہ چھپی۔ ماں تار پڑھ کر بے ہوش ہو گئیں۔ پھر ان کے کپڑے، جو ان کے پاس تھے، چھاتی سے لگا کر بہت رویا کرتیں۔

کراچی میں میری ماں نے مجھے سفید پتلونیں اور سفید قمیصیں سلوا کر دی تھیں۔ سفید موزے، سفید ٹینس شوز، سفید رومال۔ یہی لباس پہن کر میں کوٹری سیاصی سے ملنے گیا تھا۔ چہرہ بھی گورا تھا جسے میں نے دھوپ میں پھر پھر کر سانولا کر لیا۔ اب بھی کبھی قمیص اتاروں تو لگتا ہے کہ شکل ایک کی ہے، بدن دوسرے کا۔ بدن اب بھی خاصا گورا ہے۔

ایک دفعہ آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے میں بیٹھارام ہاسٹل میں چلا گیا تھا اور وہاں ایک کمرے میں جا چھپا

تھا۔ برابر کے کمرے میں شاہ لطیف کی شاعری پر بحث چل رہی تھی۔ پھر کھیل میرے دماغ سے نکل گیا۔ میں کچھ دیر وہاں اسٹڈی کلاس کے سامنے کھڑا رہا۔ میں سفید لباس پہنے تھا اور ذہن میں یہ خیال تھا کہ زندگی میں سوں گا تو ادیب ہی۔ وہاں آٹھ دس جوان آدمی تھے۔ ان کی آنکھوں اور چہروں میں امنگیں تھیں۔ کسی کا نام نہیں سنا تھا مگر سمجھتا ہوں کہ ان میں شیخ ایاز ضرور ہو گا۔

میں نے قومی کہانیوں کے ساتھ ساتھ سندھ میں رہتے ہوئے خاص طور پر موپاساں اور چیخوف کی کہانیاں پڑھیں۔ ٹولسٹائی کو بعد میں پڑھا۔ ایک اصل سندھی کی کہانی بھی پڑھی جو کچھ اس طرح تھی

طوفان آ رہا ہے۔ بجلیاں کوند رہی ہیں۔ کلاکار محل کے دروازے کھڑکیاں بند کیے بیٹھے پر ستار بجا رہا ہے جس کی آواز سن کر اس کی پریمکا ایسے کھڑی رو رہی ہے۔

میں نے سوچا طوفان، بجلی، دروازے کھڑکیاں بند ـــــ پھر کلاکار کے ستار کی آواز دوسری جگہ پہنچی کیسے؟ میں لکھوں گا کہانیاں، اور اس ملک میں انقلاب لاؤں گا! لوگ کہیں گے، کہانی کا مطلب ہے موہن۔ جہاں کہیں سے گزروں گا، لوگ کہیں گے اسے دیکھو، یہ موہن ہے، ادیب ہے۔

***

ایک شام میں سیڑھیاں چڑھ رہا تھا، جو نکڑ میں آدھا ملا کرتا تھا، کہ ہماری ہوٹل میں رکھے ریڈیو پر اعلان ہوا کانگریس نے دو قوموں کا اصول مان لیا ہے اور مسلم لیگ کو پاکستان ملنے والا ہے۔ لوگ جمع ہونے لگے اور پاکستان زندہ باد کے نعرے لگانے لگے۔

ہماری بلڈنگ کے سامنے، دوسری منزل پر ایک مسلم لیگی مسلمان رہتا تھا۔ اس کا چہرہ اور آنکھیں اتنی بڑی تھیں کہ ایک وقت میں پورا چہرہ دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ نام تھا شاہ جی۔ گہری سُرخ رنگت، لمبا قد، سفید شلوار سفید کرتا۔ میں ہر ہولی میں اس پر سُرخ رنگ کی پچکاری مارتا۔ سب کپڑے خراب۔ مگر وہ ذرا ناخوش نہ ہوتا۔ ہنستا اور لے جا کر جلیبیاں کھلاتا۔ سندھی مسلمان سندھی ہندوؤں سے جتنا پیار کرتے تھے، اتنا پیار ہندوستانیوں نے ہندوستانیوں سے شاید ہی کیا ہو۔

اس نے بھی خبر سنی۔ آگے بڑھ کر پوچھنے لگا اب تمہارا اسکول کیا کرے گا؟

کیوں؟

اب تو تم ہندوؤں کو سندھ چھوڑنا پڑے گا۔

سندھ کے اصل مالک ہندو ہیں۔

اب تو سندھ مسلمانوں کا ہوم لینڈ ہے گا۔

میں چپ رہا۔

اور تم لوگ ہندوستان جاؤ گے۔

کچھ اسی طرح کی گفتگو، پوری یاد نہیں۔ مجھے محسوس ہوا جیسے سامنے کوئی عمارت تھی جو بیچ میں سے ٹوٹ گئی ہے۔ بس یہی دیکھتے دیکھتے پاکستان بن گیا۔ میں جشنِ جمہوریت دیکھنے صدر گیا تھا۔ جناح اور ماؤنٹ بیٹن ایک کار میں بیٹھے تھے اور ان کے ساتھ ہندوستان میں انگریزی فوج کا کمانڈر بھی تھا۔ جشن بہت زوردار تھا۔ میں نے خود کو نہایت حقیر محسوس کیا۔ ملک کی قسمت بنانا، معلوم ہوا کہ مشکل کام تھا۔ میں تو شطرنج کا پیادہ تھا، اعلیٰ سطح پر میری کوئی آواز نہ تھی۔

میں نے کہیں لکھا ہے کہ ہندوستان کی آزادی نے مجھے کوئی خوشی نہیں دی اور میں نے گزرے ۳۵ برسوں میں ہندوستان کے قومی جھنڈے کو کبھی سلامی نہیں دی ہے۔ اس آزادی کو میں نے لولالنگڑا سی سمجھا اور آزادی کے دن کے جشن میں کبھی شامل نہیں ہوا۔ یہ دن مجھے یاد دلاتا ہے کہ ہم سے ہمارا وطن اس دن چھن گیا تھا۔

***

پڑوس میں شیلا رہتی تھی اور وہ کیرم بورڈ کھیلنے میرے گھر آتی تھی۔ میرا اسے لفٹ دینے اور عشق بگھارنے کا کوئی پروگرام نہ تھا۔ ویسے وہ جوان لڑکے لڑکیوں کے ساتھ کلفٹن جاتی اور پہلو میں بیٹھ کر کافی ہنسی مذاق بھی کرتی۔ اس کا باپ ڈی جے سندھ کالج میں بایولوجی کا پروفیسر تھا اور بھائی نہال ٹینس کا چیمپین تھا۔ مجھے لگا کہ میں شادی اسی سے کروں گا۔ اُس کی مسکراہٹیں اور اداس نگاہیں مجھے آج بھی یاد ہیں۔ بٹوارا ہوا۔ شیلا جانے کہاں چلی گئی۔ اسے میں نے کراچی کے بعد آج تک نہیں دیکھا۔

میں نے ۱۹۴۸ میں پہلی کہانی لکھی جس کا عنوان تھا "آتم ہتیا"۔ یہاں کے کسی سندھی فلمی رسالے میں چھپی تھی۔ کہانی بٹوارے اور جدائی کے بارے میں تھی۔ میں نے کلاس میں گنو سامتانی کو پڑھ کر سنائی۔ گنو نے پوچھا "کیا اردو سے ترجمہ کیا ہے؟" میں نے کہا "نہیں، اوریجنل ہے۔"

شکارپور کالونی میں ہم پھٹا اور پرھوداس بٹانی مارا گیا۔ ایک دن صبح سویرے فوجیوں نے ہماری بلڈنگ کو گھیر لیا۔ تین چار سپاہی اوپر چڑھ آئے۔ ان کے ہاتھوں میں بندوقیں اور ٹارچیں تھیں۔

ایک فوجی نے چہرے پر ٹارچ کی روشنی مارتے ہوئے پوچھا "یہ آر ایس ایس کا دفتر ہے؟"

"یہ گھر ہے۔"

"عورتیں ہیں؟"

"ہندوستان چلی گئیں۔ ہم بھی دو تین روز میں جانے والے ہیں۔"

"ہمیں تلاشی لینی ہے۔"

"کا ہے کی؟"

ہتھیاروں کی۔

ہتھیار اور یہاں ؟ میں اسکول کا طالب علم ہوں اور ہندوستان جا کر فلمی ایکٹر بننا چاہتا ہوں۔
دروازہ کھولو، پورا۔ وہ اندر گھس آئے۔ جیرل جینت ڈر گیا۔ مجھ سے بولا ماسٹر بلڈنگ کو ملٹری نے گھیر لیا ہے۔ میں نے کہا تمہاری شکل خراب ہے۔ کہا، میں ان کا نوکر ہوں۔ میں نے کرچیں اور کارتوس بالکنی میں تلسی کی شاخوں سے چھپا کر رکھے ہوئے تھے جو اگر انہیں مل جاتے تو گرفتاری اور پھانسی یقینی تھی۔ وہ ہماری شکلیں دیکھ کر سٹ پٹا گئے اور سرسری تلاشی لے کر، معافی مانگ کر واپس چلے گئے۔
حاجی نے کہا کہ یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔ اس لیے رتن تلاؤ پر ایک مکان کرائے پر لیا گیا۔ سکھ کی شاخیں لگا کر ہندو ہو گئی تھیں۔ ماموں کا ایک دوست مسلمان تھا جو کسی ہندو لڑکی سے شادی کرنے کے لیے خود کو ہندو کہتا تھا اور اس نے اپنا نام بدلوا کر رکھ لیا تھا۔ اس نے مجھے کراچی صدر میں پی ڈبلیو ڈی کے حصے کے ڈویژن میں ٹریسر کی نوکری دلوا دی۔ تنخواہ ستر روپے۔ سب خوشی ہوئی۔ وہ زمانہ ہی کچھ دوسرا تھا۔

۶ جنوری ۱۹۴۸ کو باہر سے آئے ہوئے مہاجروں نے فساد کیا اور بہت سے آدمیوں کو مار دیا۔ کچھ ٹولیاں رتن تلاؤ میں لوٹ مار کرنے آئیں اور ان میں سے ایک ہمارے گھر بھی پہنچی۔ ایک جوان چاقو کھول کر گھر میں گھسا۔ حاجی نے اس سے کہا کیا اسلام نے تمہیں یہی سکھایا ہے کہ عورتوں اور بیوں پر حملہ کرو؟ تمہیں کیا ملے گا؟ میرے بیوں کو ہاتھ نہ لگانا۔ مجھے بھلے ہی مار دو۔
میں ہوتا تو شاید خون خرابہ ہو جاتا، مگر میں دفتر میں تھا۔ سنا کہ حاجی نے کچھ ایسے اعتماد سے بات کی کہ وہ لوگ واپس چلے گئے۔ ایک پاجی دیوار میں کیل سے لٹکی میری سفید پتلون لے گیا۔ اس کا دکھ کئی سال میرے دل میں رہا۔ اسے پہن کر مجھے پاجی یاد آ جاتی تھی۔ اب بھی کبھی سفید لباس پہنتا ہوں تو اکثر یاد آ جاتی ہے۔
میں ٹرام میں بیٹھ کر دفتر جاتا اور ٹرام ہی میں واپس آتا تھا۔ وہاں سے سیدھا اپنے پرانے محلے میں جاتا جہاں کی رونق ختم ہو گئی تھی ــــ بالکل سنسان، کوئی چہل پہل نہیں۔ جمعو دادا جو محرم میں خود کو چھریاں مار کر لہولہان کر لیتا تھا کہا کرتا کیوں یار، تم بھی سندھ چھوڑ جاؤ گے؟ جمعو دادا ناکسر تھا، مگر چاقو نہ چلاتا تھا۔ وہ گویا ہمارے محلے کا مجسٹریٹ تھا۔ کوئی دوسرا غنڈا اس کی حد میں گھسا اور جمعو دادا کی ٹکریں اور گھونسے شروع۔ پھر بعد میں باہر سے ایک جعدی دادا آیا اور اس نے جمعو دادا کو بہت مارا۔ سندھیوں نے مار کھانے کے سوا کیا ہی کیا ہے۔
ان غیر سندھیوں کے فساد کے باعث ہندوؤں میں کھلبلی اور ہراس پیدا ہو گیا اور ایک دن ہم نے بھی اپنا سامان اٹھایا، اونٹ گاڑی میں سوار ہوئے اور کراچی بندر آ گئے۔ عیدگاہ کے باہر بہت سندھی کتابیں بک رہی تھیں، دو دو آنے میں۔ میں نے بہت سی کتابیں خریدیں۔ شاید وہ ۱۲ جنوری ۱۹۴۸ کا دن تھا اور میں زندگی کے تیرہ سال پورے کر رہا تھا۔ وہ اونٹ گاڑی پل پل مجھے میری دھرتی، سندھو

ماں سے دور کر رہی تھی۔ برنس روڈ، کچہری روڈ، ڈی جے سندھ کالج، کاڑی کھاتہ، لاٹ ہاؤس، صدر روڈ، میونسپلٹی، بولٹن مارکیٹ۔ جمعو دادا نے دیکھ لیا اور سائیکل پر آ کر ہاتھ پکڑ کر ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ بولا بھائی، تم ہمیشہ کے لیے جا رہے ہو؟

نہیں، میں نے کہا۔ میں واپس آؤں گا۔ اس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا اور وہ چلا گیا۔

واپس اور میں؟ اور وہ بھی سندھ۔ سگریٹ کے دھوئیں میں اب بھی دیکھ سکتا ہوں ایسا کراچی۔ وہ اوسٹ گاڑی میں جلاوطنی کا سفر۔ ملی نے ٹب سے باہر نکلنے کے لیے بڑی بڑی چھلانگیں لگائیں۔ برس سے اونچی دیواریں۔ کرے کیا؟ ایک سرد آہ، ایک زرد خاموشی۔

بندرگاہ پر ایک سمندر انسانوں کا بھی تھا۔ ہم ایک رات چادریں بچھا کر زمین پر سوئے اور اگلے دن جہاز اور بندرگاہ کے بیچ میں لٹکی سیڑھیاں پر دھکے کھاتے جہاز کے ڈیک تک پہنچے۔ لوگوں کو دکھ تھا کہ وطن چھوڑنا پڑ رہا ہے اور ایک ان لکھی خوشی بھی تھی کہ وہ ایک ایسے ملک کی طرف جا رہے ہیں جہاں آزادی اور سلامتی کے ساتھ سانس لے سکیں گے۔

جہاز چلا، اور میں آہستہ آہستہ سندھ کی دھرتی سے دور ہوتا گیا۔ مجھے سب کچھ اچھی طرح یاد ہے۔ درودیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں۔ خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں۔ خیال آیا کہ ہوا کا جھونکا بن جاؤں اور سندھ کی زمین، مکانوں اور لوگوں کو چومنے لگوں، کتا بن جاؤں اور سندھ کی سڑکوں پر پھرتا رہوں، بھنگی بن جاؤں اور سندھ کی زمین پر جھاڑو دیتے ہوئے اس کی مٹی سے اشنان کروں۔ شاید کسی چیز کی قدر اسے گنواتے وقت ہی ہوتی ہے۔

دراصل وطن کی یاد تو ہمیشہ آتی رہی مگر اس نے کچھ عرصے بعد ہی ایسی طرف کھینچنا شروع کیا۔ پہلے واپس جانے کی آس تھی، اس آس نے نہ معلوم کب دم توڑا۔ اب صرف سندھ دیکھنے کی خواہش ہے، اور یہ بھی پتا نہیں بے ہوشی کے عالم میں ہے یا دم توڑ چکی ہے۔

سندھ میں زندگی کا ایک دور پورا ہوا۔

***

بمبئی بندر سے ہم وی ٹی [وکٹوریا ٹرمینس] آئے۔ دیکھا کہ گاڑیاں بغیر انجن کے چلی جا رہی ہیں۔ ہم بھی سامان لے کر سوار ہو گئے۔ گاڑی خالی تھی۔ اب وہ خالی گاڑی صرف خوابوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ میں گھر والوں کو کلیان اسٹیشن کے باہر چھوڑ کر ملٹری چھاؤنی میں گیا جہاں انگریز فوجی اب تک تھے۔ پوچھ تاچھ کر کے دادا کو ڈھونڈا۔ وہ مجھے دیکھ کر تعجب میں پڑ گئے۔ سینے سے لگایا، پیٹھ تھپتھپائی۔ انھیں کسی نے بتایا تھا کہ ۶ جنوری کے فسادات میں ان کا خاندان مارا گیا۔ گلو بھی وہیں تھا، وہ بھی خوش ہوا۔ دادا

نے ایک حبیب کا بندوبست کیا اور برسوں بعد ہمارے کنبے نے ایک جگہ اکٹھا ہو کر ڈیرا ڈالا۔ وہاں میری ایک بہن ودیا پیدا ہوئی جو پورا دودھ نہ ملنے کے باعث گزر گئی۔ میں نے اپنے ناول "آوارہ" میں اس کا منظر کھینچا ہے۔

کیمپ میں صرف ہمارا سندھی کنبہ تھا۔ دو سینما تھے جن میں شام کے وقت دو شو انگریزی فلموں کے ہوتے تھے۔ ادبی تقریب پندرہ روزہ ہوتی تھی۔ دادا کے پاس ایک پرانا ریڈیو تھا۔ ایک دن خبر آئی کہ کسی شخص نے مہاتما گاندھی کا خون کر دیا۔ سنگھ میں ہونے کی وجہ سے ہمارے دل میں گاندھی کی کوئی خاص عزت نہ تھی، اور نہ ہمدردی۔ مگر شاید زندگی میں پہلا موقع تھا کہ آنکھیں بھر آئیں۔ میں پیدل کلیاں شہر گیا اور وہاں سے ممبئی گیا۔ نہرو نے ریڈیو پر کہا "روشنی چلی گئی، اب ہر طرف اندھیرا ہے۔"

مئی جون میں کیمپ میں سندھی آنے لگے، اور کیمپ کھلنے لگے۔ جیم سائیڈنگ پر ایک اسکول کھلا جہاں میں نے پانچویں کلاس میں داخلہ لیا۔ کنو سامتانی اور راجن جاولا بھی اسی کلاس میں تھے اور وہیں دوست بنے۔ میں نے تین نمبر میں سنگھ کی شاخ کھولی مگر اس پر پابندی ہونے کے باعث کام کو بڑھا نہ سکا۔ سنگھ پر سے پابندی ہٹانے کے لیے ہندوستان بھر میں تحریک چلی اور جو لوگ اس تحریک میں گرفتار ہوئے، میں بھی ان میں شامل تھا۔ کہا گیا معافی مانگ لو۔ میں نے انکار کر دیا۔ مجھے چھ مہینے کی سزا ملی اور میں نے ایک رات کلیاں کے لاک اپ میں، ایک دفعہ تھانہ جیل میں اور باقی وقت ویساپور جیل میں گزارا۔

ویساپور جیل میں ہم آٹھ سو قیدی تھے۔ جمعے کو آپس میں کشتی کرتے، کھیل کھیلتے۔ روز رات کو راگ اور تقریریں۔ وہاں بابا اس بھارتی بھی تھا جو دیوار پر سنگھ پر پابندی کے خلاف پوسٹر لگاتے ہوئے گرفتار ہوا تھا۔ وہ اپنی مرضی کے خلاف جیل میں آیا تھا، دوسروں سے کٹا کٹا رہتا۔ البتہ میری تقریریں چاہ سے سنتا اور مجھ سے محبت کیا کرتا۔

جیل میں مجھ سے ملنے کوئی نہ آیا، کوئی دوست بھی نہیں۔ میں جیل کی سلاخوں سے باہر آسمان کو تکا کرتا۔ آسمان میں پرندوں کو دیکھ کر سوچا کرتا کہ کب آزاد ہوں گا۔ میدان میں پھرتی گایوں کو دیکھتا تو خود کو بدقسمت سمجھتا۔

سندھ کے سکھی ہندو تھے اور ہندو راج کی باتیں کرتے تھے۔ وہ مسلمانوں کے مخالف تھے مگر ان سے نفرت نہ کرتے تھے۔ جیل میں سندھی دس بارہ ہی تھے، باقی زیادہ تر مرہٹے جو سخت کٹر تھے۔ جوش میں آ کر گایا کرتے

ہے جند تو نے ہند کو برباد کر دیا
غیروں کو لا کے ہند میں آباد کر دیا
کاشی سی بنارس، پریاگ الہ آباد
ایودھیا پوری کو فیض آباد کر دیا

مجھے پہلی بار محسوس ہوا کہ ان لوگوں کے پاس کرنے کے کام کچھ بھی نہیں، فقط نعرے اور تقریریں اور نفرت ہے۔ صرف ماضی کی بڑائیاں ہیں۔ آج کیا کیا جائے، دیش کو کیسے مضبوط کیا جائے، اقلیتوں کے حقوق کیسے سلامت رکھے جائیں، انھیں کچھ خبر نہیں۔

ایک رات وہاں سیمینار ہوا اگر گاندھی کا قتل نہ ہوا ہوتا تو؟
کسی نے کہا تو ہم سندوراج قائم کر لیتے۔
کسی نے کہا تو ہم پاکستان کو ختم کر دیتے۔
میں نے کہا کچھ بھی نہیں۔ بس ہم کچھ کم راگ گایا کرتے۔

ساگ، تیل اور سوکھی روٹیاں، ہمیں جیل کا کھانا پسند نہیں تھا۔ چائے بھی نہ ملتی تھی۔ ہمارا سندھی لیڈر، فرینچ کٹ داڑھی والا کشور واسوانی جیلر سے ملا اور چائے کا مطالبہ کیا۔ وہ اور میں خاصی بحث کیا کرتے تھے۔ ایک دن چائے آئی تو سندھیوں نے فوراً گھونٹ بھرے۔ جیل کے ایک مراٹھی لیڈر نے سندھیوں کے بارے میں ایک خطرناک تبصرہ کیا انھیں دیکھو۔ پاکستان میں مسلمانوں سے تو لڑ نہیں سکے۔ یہاں آکر پاگلوں کی طرح چائے پر ٹوٹے پڑ رہے ہیں!
چندر واسوانی بولا سندھی ایک ماڈرن قوم ہے۔ مہاراشٹر کو چائے قبول کرنے میں ایک صدی لگے گی۔ وہ سندھیوں سے حسد کرتے ہیں۔
ایک مراٹھی لیڈر بولا تم لوگ سندھی میں کیوں باتیں کرتے ہو؟ یا ہندی بولو یا مراٹھی۔
سنگھ سے میں ذہنی طور پر اُسی دن الگ ہوا۔ مگر سامنے کوئی دوسرا آدرش نہ تھا اور کام کرنے کا جنون سر پر سوار تھا۔

جیل میں پانی خراب ہونے کی وجہ سے میرے پیٹ میں گڑبڑ ہو گئی، اس لیے مجھے پھانسی کھاٹ کی ایک کوٹھری میں بند کر دیا گیا جس کی لمبائی چوڑائی چھ چھ فٹ تھی۔ سنڈاس اور پانی اندر تھا، کھانا سلاخوں میں سے دیا جاتا۔ برابر میں دوسری کوٹھری تھی جس میں چالیس سال عمر کا ایک قیدی تھا جسے پھانسی ہونے والی تھی۔
ایک دفعہ اس نے مجھے آواز دی۔ کیا تم نے بھی اپنی بیوی کا خون کیا ہے؟
میں کنوارا ہوں۔
عمر؟
اٹھارہ سال۔
تمھیں کیوں بند کیا ہے؟

میں سچ بولتا ہوں۔
سچ بولنے پر پھانسی؟
پھانسی نہیں، جیل۔ تمھیں پھانسی ہو گی؟
ہاں۔
کیوں؟
میں نے اپنی بیوی کا خون کیا ہے۔
کیوں؟
وہ بےوفا نکلی۔
بیویاں بےوفا نہیں ہوتیں۔
تو پھر؟
تم نے اسے پیار نہیں دیا ہو گا۔ وہ اسے کہیں اَور سے مل گیا ہو گا۔ چلی گئی ہو گی۔
بھلا میں مزدوری کرتا یا دن بھر اسے چومتا چاٹتا؟
تو تمھیں پھانسی ہو گی؟
ہاں۔
وہ اپنی کھانے کی چیزیں مجھے دے دیا کرتا۔ جب اسے پھانسی دینے کے لیے لے جایا جا رہا تھا تو وہ میرے سامنے آیا اور بولا مجھے پتا چلا کہ تم دیش بھگت ہو۔ بھائی، یہاں ایسا راج برپا کرو کہ مزدوروں کو اچھی تنخواہ ملے۔ انھیں آرام ملے تاکہ وہ بیویوں سے پیار کر سکیں۔
اس کے چہرے پر بالوں کا جنگل تھا اور آنکھوں میں پانی۔ پتا نہیں اسے کہاں لے جا کر پھانسی دی گئی۔ جب وہ چلا گیا تو مجھے خیال آیا ایسا ہونا نہیں چاہیے تھا۔

ایک دن اعلان ہوا کہ کچھ تالستوں کے بیچ میں پڑنے سے سنگھ اور حکومت میں سمجھوتا ہو گیا ہے۔ ویسے سنگھ پر الزام یہ تھا کہ ناتھورام گوڈسے سنگھ کا سابق ممبر تھا۔ سنگھ کے پاس نفرت کا فلسفہ ہے، جس کے ہاتھوں گمراہ ہو کر گوڈسے نے گاندھی کا خون کیا۔ ویر ساورکر کو بھی گرفتار کیا گیا جسے انگریزوں نے ساٹھ سال جیل کی سزا دی تھی۔
جیل سے رہا ہونے کے بعد میں شری گروجی کو کیمپ میں لے کر آیا اور دو دفعہ دادر اور گلیاں میں بھی ان سے ملا۔ ایک بار ہندو مہاسبھا کے لیڈروں پنڈت دگ وجے ناتھ اور شری دیش مکھ کو بھی بلایا۔ بہت تقریریں ہوئیں۔ بولے گاندھی نہیں رہا تو پاکستان کیسے رہے گا؟
کیسے جائے گا؟ میں نے پوچھا۔
جب نہرو جائے گا۔

پھر وہ کیسے جائے گا؟ بھگوان ورما نے پوچھا۔
موہن جی سے پوچھو۔ ممکن ہے یہی اُسے گولی ماریں۔
بس اُس دن سے میں نے یہ راہ ترک کی۔

جے رام داس دولت رام اور پروفیسر گھنشام سندھیوں کو ہندوستان میں جذب ہو جانے کی صلاح دیتے تھے اور انھوں نے حکومت کو سندھی زبان کو تسلیم کرنے کے بجائے ہندی لپی [رسمِ خط] اختیار کرنے کے لیے لکھا۔

میں نے جے رام داس کو ایک خط لکھا آپ کہتے ہیں، سندھ کو بھول جاؤ۔ آپ جب بہار کے گورنر تھے تب ایک تالاب میں بوٹنگ کرتے ہوئے آپ کی ایک انگوٹھی پانی میں گر گئی تھی۔ وہ آپ کے بڑوں کی یادگار تھی۔ آپ نے سرکاری خرچ پر وہ تالاب خالی کرایا۔ آپ نے گنوایا ہی کیا تھا؟ فقط ایک انگوٹھی۔ ہم نے تو وطن گنوایا ہے سائیں!

**

شیخ ایاز

سندھی سے ترجمہ: اجمل کمال

ساہیوال جیل کی ڈائری

نیند سے اٹھ کر میں نے کل کی لکھی ہوئی ڈائری پڑھی اور اس میں کافی اضافے کیے۔ سیاسی حالات پر غور کرتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ رسول بخش پلیجو نے اپنی اصطلاح "پنجابی مہاجر سامراج" کہاں سے نکالی ہے۔ کیا ہر پنجابی سامراجی ہے؟ کیا ہر مہاجر سامراجی ہے؟ عوام کے مسائل تو مشترک ہیں۔ مجھے اپنا دوست مونس یاد آیا جو پنجابی تھا اور جوانی ہی میں مر گیا تھا۔ اس سے میرا تعارف ۱۹۴۶ میں جشو کیولرامانی نے کراچی میں کرایا تھا۔ مونس سیالکوٹ کا رہنے والا تھا اور کراچی لاکالج میں پڑھ رہا تھا۔ میرے کسی ہمعصر کا اتنا مطالعہ نہ تھا جتنا مونس کا۔ اسے نیند نہیں آتی تھی اور وہ ساری ساری رات پڑھا کرتا تھا۔ وہ مارکس وادی تھا مگر جشو کی طرح بورژوا فن اور فکر کا توجہ سے مطالعہ کرتا تھا۔ جشو نے اسے اور مجھے انگریز ادیبوں اسٹیفن اسپنڈر، کرسٹوفر اشروڈ اور آڈن کے بارے میں لیکچر دیے تھے۔ جشو جن دنوں انگلستان میں تھا، تب یہ تینوں وہاں کے ترقی پسند ادب پر چھائے ہوئے تھے۔ جشو ہمیں کمیونزم اور سوشلزم کے بارے میں بھی لیکچر دیا کرتا تھا اور اس دور کے کمیونسٹ اور سوشلسٹ رہنماؤں اور ان کے خیالات سے ہمیں متعارف کراتا تھا۔ جشو کراچی میں لاکالج کے پاس ایک فلیٹ میں رہتا تھا جس میں دو کمرے تھے۔ دونوں کمرے کتابوں سے بھرے ہوئے تھے جن کے درمیان فقط بیٹھنے اور سونے کی جگہ تھی۔ جشو خود کو بوہیمین کہا کرتا۔ اُس نے شادی نہیں کی تھی اور پرائی عورت سے لاسے یوں ہی پیار کرتا تھا۔

اس نے آکسفورڈ میں اندرا گاندھی کے ساتھ اُس وقت پڑھا تھا جب اندرا اور فیروز گاندھی کا معاشقہ چل رہا تھا۔ کراچی لوٹ کر جشو نے انگریز سامراج کے خلاف ایک پوسٹر شائع کیا جس میں ہندوستان کے نقشے پر ایک لانگ بوٹ بنا ہوا تھا اور نیچے لکھا تھا Stop this march of Imperialism! یہ پوسٹر شائع کرنے کے جرم میں انگریزوں نے اُسے دو سال قید کی سزا دی تھی مگر وہ ڈیڑھ سال بعد، اکتوبر ۱۹۴۱ میں، چھوٹ کر باہر آگیا۔ جیل سے نکلنے کے بعد اس نے سوبھو گیانچندانی کے ساتھ مل کر سندھ کا دورہ کیا۔ اس وقت پوری سندھ اسٹوڈنٹس فیڈریشن جشو کے زیر اثر تھی۔ اس نے سوبھو سے طالب علموں کا تعارف کرایا اور پھر اُسے فیڈریشن کا سیکرٹری مقرر کر دیا۔ سوبھو آج بھی یہ بات یاد کر کے مسکرا

سنا ہے کہ لاڑکانے میں جتو نے سوبھو کا گاؤں سنڈی دیکھ کر اس سے کہا تھا

You are a flower on a dung-hill!

انگلستان سے جتو بغیر ڈگری لیے لوٹ آیا تھا۔ وہ کسی پارٹی کا ممبر نہ تھا اور کبھی وقت پر کھانا نہ کھاتا تھا۔ اس نے نہ کوئی مستقل روزگار حاصل کرنے کی کوشش کی تھی اور نہ کسی نظریے کا پیروکار تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس کی پوری زندگی ایک سوالیہ نشان ہے۔ اس کی ذاتی زندگی بھی اس کے ذہنی مد و جزر کی عکاسی کرتی تھی۔ آکسفورڈ میں اس کی واقفیت ایک عیسائی لڑکی شانتی سیلڈونا سے ہوئی جو بمبئی کی رہنے والی تھی۔ کراچی لوٹ کر اس نے شانتی سے خط و کتابت جاری رکھی۔ ۱۹۴۲ میں جب انگریز سرکار کے خلاف آزادی کی جدوجہد زوروں پر تھی تو جتو بمبئی گیا اور وہاں شانتی کے ساتھ زبردست معاشقہ لڑایا اور اس سے وعدہ کر آیا کہ جلد ہی بمبئی لوٹ آئے گا۔ ۱۹۴۴ کے لگ بھگ جب جتو کا بمبئی جانا ہوا تو شانتی نے اسے آخری اطلاع دی کہ اگر اب مجھ سے شادی نہ کی تو میں تمہارے انتظار میں نہیں رکوں گی۔ جتو فیصلہ نہ کر پایا اور شانتی سیلڈونا نے ایک انگریز افسر سے شادی کر لی جو کمیونسٹ تھا۔ (دوسری جنگ عظیم کے دوران ۱۹۴۲ کے بعد بہت سے انگریز کمیونسٹ، فوج میں بھرتی کیے گئے تھے کیوں کہ کمیونسٹ پارٹی نے جرمنی کے خلاف برطانوی حکومت کی حمایت کی تھی۔)

ایک بار میں اور موس جتو کے فلیٹ میں بیٹھے اُس کے ساتھ وسکی پی رہے تھے۔ جتو یوں تو تمام وقت سیاست، بین الاقوامی معاملات، فلسفے اور ادب پر باتیں کیا کرتا تھا، مگر اُس دن اس نے عشق کے موضوع پر باتیں شروع کر دیں۔ مجھے لگا کہ مجھے اُن مردوں سے نفرت ہے جو کسی حسین عورت کی دوستی پر اتراتے پھرتے ہیں۔ ایسے مردوں میں قابلِ رحم احساسِ کمتری ہوتا ہے جبھی تو وہ اس بات کا ذکر کرتے ہیں کہ کوئی حسین عورت ان کے ساتھ ہے۔ جتو کو کاسانووا ٹائپ مرد پسند نہ تھے، وہ صرف ایک بار محبت کا قائل تھا۔ باتیں کرتے کرتے جب وہ سرور میں آیا تو انگریزی میں بولا شانتی تم بھی! پھر اس نے ایک ٹھنڈا سانس لے کر ایک ہی گھونٹ میں ڈبل پیگ پیا اور پھر اُسے نیند آ گئی۔

یہی تذبذب جتو کے ذہن میں کمیونزم سے محبت کے سلسلے میں بھی پیدا ہوتا تھا۔ وہ اکثر کسی کا قول دہراتا تھا کہ میں کمیونزم کے لیے جینا چاہتا ہوں، میں کمیونزم کے لیے مرنا چاہتا ہوں، لیکن میں کمیونزم کے تحت رہنا نہیں چاہتا۔ وہ سوبھو سے بھی کہا کرتا تھا کہ کمیونسٹ تمہیں ہمیشہ استعمال کریں گے، اور تمہاری جان اور ہڈیاں ایک نئی عمارت کی تعمیر میں کام آئیں گی۔

۱۹۴۷ کے سال میں جتو کو نظر بند کر دیا گیا کیوں کہ وہ پوری رات اپنے فلیٹ میں کچھ ٹائپ کرتا رہتا تھا۔ (اُن دنوں وہ سائیں جی ایم سید کی کتاب "نئے سندھ کے لیے جدوجہد" کا انگریزی ترجمہ کر رہا تھا۔) جب اس کی نظر بندی کی میعاد بڑھانے کے لیے اسے مسعود کھدر پوش کے سامنے پیش کیا گیا، جو اُس وقت کراچی کا ایڈیشنل کمشنر تھا، تو میں اُس کے وکیل کی حیثیت سے ساتھ گیا۔ مسعود آئی سی ایس تھا اور جس وقت بمبئی میں ڈپٹی کمشنر تھا تو آدی واسیوں میں بہت مقبول تھا۔ وہ جتو سے پہلے ہی سے واقف تھا

اور جشو اُس کے سیاسی فلسفے کو تحلیل ازم کا فلسفہ کہا کرتا تھا۔ ہندوستان میں مسعود کو مسعود ننگواں کہا جاتا تھا۔

جب پولیس نے جشو کو مسعود کے سامنے پیش کیا تو جشو نے تھری پیس سوٹ اور فیلٹ ہیٹ پہن رکھا تھا۔ اس نے فیلٹ ہیٹ اتار کر مسعود کو مخاطب کیا، ہیلو مسعود!

ہیلو جشو! مسعود نے جواب دیا۔ پھر جشو نے مسعود کو مجھ سے متعارف کراتے ہوئے کہا، یہ ٹیگور کے بعد برصغیر کا سب سے بڑا شاعر ہے، لیکن اس وقت میرے وکیل کی حیثیت سے آیا ہے۔ مسعود کچھ مسکرایا جیسے جشو کی مبالغہ آمیزی کی عادت سے پہلے ہی واقف ہو۔ پھر اس نے ہم دونوں کو کرسیاں پیش کیں۔ باتیں کرتے کرتے مسعود نے جشو سے پوچھا جشو، تم ہندوستان کیوں نہیں چلے جاتے؟

مسعود، یہ میرا وطن ہے۔ میں ہندوستان کیوں جاؤں؟

مسعود نے اپنے انگوٹھے سے برابر میں کمشنر کے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا 'You Sindhis would be decimated like Red Indians (تم سندھی ریڈ انڈینز کی طرح ملیامیٹ کر دیے جاؤ گے۔) پھر اُس نے سر جھکا کر جشو کی نظر بندی کی میعاد بڑھانے کے احکام لکھے اور جب تک ہم کمرے میں رہے ہماری طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھا۔ میں مسعود کی بات سن کر حیران رہ گیا تھا کیوں کہ وہ آدی واسیوں کے حقوق کا بھی حامی تھا۔

جشو کی رہائی کے کچھ دن بعد اسے ملک بدر کر دیا گیا۔ ہم اسے سائیں جی ایم سید کے گھر سے ایرپورٹ چھوڑ آئے۔ واپس لوٹتے وقت ہوش نے ایرپورٹ کی دیواروں کو گھونسے مارے اور کار میں بیٹھ کر آنسو بہائے۔

سائیں جی ایم سید جب انگلستان میں کرشامینن سے ملے جو وہاں ہندوستان کے ہائی کمشنر تھے، تو انھوں نے مینن سے کہا تھا میں آپ سے واقف ہوں کیوں کہ مجھ سے جشو کیولرامانی نے آپ کا تذکرہ کیا تھا۔

مینن نے دو تین بار پیشانی پر انگلی رکھ کر کچھ یاد کرنے کی کوشش کی اور پھر کہا

"Yes yes, now I remeber the man — the little man who always said that Sindhis are a nation."

۱۹۶۳ میں جب میں دہلی میں جشو سے ملا تو اُس کی سرلا سے شادی ہو چکی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ سرلا نے اپنے پہلے شوہر کے مرنے کے بعد جشو سے شادی کی تھی۔ جشو اُس وقت بھی فری لانس صحافی تھا۔ اس نے پاکستان کے بارے میں کئی مضامین Pakistan x-rayed کے عنوان سے ہندوستان اسٹینڈرڈ اخبار میں شائع کرائے تھے جنھیں وہ *The Uprooted and the Upright* کے نام سے کتابی صورت میں جمع کر رہا تھا۔ مجھے لگا کہ جشو ٹوٹ چکا ہے۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ جب میری ماں کا دہلی میں انتقال ہوا اور جمنا کے کنارے اس کی چتا جل رہی تھی تو میں نے پتا نہیں کیا محسوس کیا جس نے

میری زندگی بدل کر رکھ دی۔ اسے اس بات کا بھی شدید احساس تھا کہ اس کی قوم نے اس کی بے قدری کی ہے۔

دہلی سے رخصت ہوتے وقت جب میری خشو سے الوداعی ملاقات ہوئی تو اس نے مجھ سے کہا تھا ایار، ایک بات سر گرہ باندھ لینا۔ اگر تم نے پاکستان میں کسی ریفیوجی (مہاجر) پر ہاتھ اٹھایا تو سمجھنا کہ مجھ پر ہاتھ اٹھایا، کیوں کہ میں بھی ہندوستان میں ریفیوجی (شرنارتھی) ہوں۔

خشو جیسا عظیم انسان میں نے آج تک نہیں دیکھا۔

**

سوبھوگیان چندانی

سندھی سے ترجمہ اجمل کمال

کراچی کی یادداشتیں

چھ جنوری کے فسادات

چھ جنوری ۱۹۴۸ — میں ڈیڑھ بجے جلدی جلدی کھانا کھا رہا تھا کیوں کہ تین بجے ایم ای ایس کے انگریز انجینیر سے مزدوروں کے مطالبات کے سلسلے میں ملاقات ہونی تھی۔ اتنے میں "مارو، کاٹو، لوٹو" کی بلند آوازیں نیچے سے سنائی دیں۔ دروازے ٹوٹنے اور شیشے ٹکنے کی آوازیں چوتھی منزل تک سنائی دے رہی تھیں۔ چھوٹی بیٹی بالکنی سے دوڑتی ہوئی آئی۔ "بابا! نیچے گلی میں لوگ لڑ رہے ہیں!" میں لپک کر بالکنی میں پہنچا۔ دور سے دھواں اور شعلے اٹھتے نظر آ رہے تھے۔ چھوٹے بڑے لڑکے گندھا ہوا آٹا، کوئلے اور برتن اٹھا کر پاس کے گھروں سے نکل کر بھاگ رہے تھے۔ جوان مرد میزیں، کرسیاں، پیٹیاں اور چھوٹی بڑی الماریاں پیٹھ پر اٹھائے گھروں سے نکل رہے تھے۔ ایک بس آ کر نیچے رکی۔ بس میں سے ایک سکھ لڑکے کو گھسیٹ کر اتارا گیا اور ذبح کر دیا گیا۔ ایک بڑھیا لہنگے میں ہاتھ دیے بھاگی چلی جا رہی تھی۔ ایک ادھیڑ عمر شخص نے اسے سمجھایا، "مائی، اپنے گھر جاؤ۔" اس نے جھٹکا دے کر خود کو چھڑایا اور بولی، "موئے، اپنے گھر ہی تو جا رہی ہوں۔"

آرٹلری میدان نمبر ایک اور فریئر روڈ سے ملی ہوئی ایک گلی میں ایک شخص، سلک کی شیروانی اور سلک ہی کی گاندھی ٹوپی پہنے، فٹ پاتھ پر ادھر اُدھر آ جا رہا تھا اور لوگوں کو روکنے کی کمزور کوشش کر رہا تھا۔

یہ پورا منظر میں نے سیکنڈوں میں دیکھا۔ پھر کسی نے مجھے پیچھے سے کالر میں ہاتھ دے کر کھینچا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو نیچے تیسری منزل پر رہنے والا وزیر خان تھا۔ وہ پاکستان کی ریلوے وزارت میں ملازم تھا اور اسے نیچے کا فلیٹ میں نے ہی دلوایا تھا۔ کہنے لگا، "دوست! ہم دلی میں یہ نظارے دیکھ آئے ہیں۔ خدا نہ کرے کہ تمھیں پناہ دینے سے میرا گھر اُجڑ جائے۔ چلو، بال بچوں سمیت میرے گھر چل کر رہو۔"

ہمارے ساتھ ایک ہندو سرکاری ملازم کا خاندان بھی رہتا تھا جس کی ایک دو لڑکیاں بڑی تھیں۔ ہم نے نیچے تیسری منزل پر وزیر خان کے گھر کے ایک خالی کمرے میں پناہ لی۔ اُس کی ماں مجھ سے بار بار

پوچھ رہی تھی، بیٹا، کھانا کھایا ہے یا نہیں؟

نیچے سے اب تک دروازے ٹوٹنے کی آوازیں اور شیشوں کی جھنکار سنائی دے رہی تھی۔ اتنے میں کامریڈ اشرف علی (جس کا پورا خاندان کمیونسٹ تھا اور ہے) اوپر آیا اور اس نے بتایا کہ ہم لوگ سیڑھیوں پر پہرہ دیتے رہے اور اسی جوائنٹ فلیٹوں والی چار منزلہ بلڈنگ بچالی۔

ان جوائنٹ فلیٹوں میں سے دو چار مہاجروں کے تھے۔ باقی سب میں سندھی خاندان رہتے تھے۔ چھ بجے باہر سے کرفیو لگنے کا سائرن سنائی دیا۔ اس کے ساتھ ہی اسسٹنٹ انجینئر شوکت علی (جو ہندوستان کے مشہور کمیونسٹ لیڈر اور تاریخ داں ڈاکٹر کے ایم اشرف کا چھوٹا بھائی تھا) اپنی بیوی اور ایک بیٹی کے ساتھ اوپر چڑھ آیا اور مجھے کھینچ کر اپنے فلیٹ میں لے گیا۔ بولا، جب تک ایسے حالات ہیں، میں تمہارے ساتھ رہوں گا اور اس سے پہلے کہ تمہیں کچھ ہو، میں مارا جاؤں گا۔ دروازہ کھولنے تم نہیں جاؤ گے۔ کوئی بھی کھٹکا ہوا تو میں خود دروازہ کھولوں گا۔

ہم نے رات جیسے تیسے کمرے میں بچھی چٹائیوں پر گزاری۔ میں، میری چار سالہ بیٹی اور بیوی ایک چٹائی پر اور کامریڈ شوکت علی اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ دوسری چٹائی پر۔ سونا مشکل تھا۔ کان باہر کی آوازوں پر لگے ہوئے تھے۔ یہ کرفیو متواتر بہتر گھنٹوں تک چلا۔ البتہ میری جان اُس گھر کے بندی خانے سے دوسرے دن آٹھ بجے چھوٹ گئی جب قاضی مجتبیٰ (جو سندھ حکومت کا پارلیمانی سیکرٹری تھا اور سندھ اسمبلی میں مزدوروں کی طرف سے منتخب کیا ہوا نمائندہ بھی) لاؤڈ سپیکر لگی ہوئی پولیس کی گاڑی لے کر آیا اور بولا چلو، سارے شہر میں گھوم کر امن کی اپیل کرنی ہے۔

سو ہم نے سات جنوری کو آدھے شہر میں پولیس کی حفاظت میں مختلف محلوں میں جا کر امن اور بھائی چارے کے لیے تقریریں کیں۔ مجھے آج بھی یاد ہے، ہم نے کہا تھا بھائیو! جناح صاحب کا فرمان ہے کہ اقلیتوں کے ساتھ نہ صرف انصاف کا بلکہ فیاضی کا سلوک کرنا ہے۔ قانون کو ہاتھ میں نہ لیں۔ جلد ہی تلاشیاں شروع ہوں گی۔ اس لیے پڑوسیوں سے جو کچھ لوٹا ہے انہیں واپس دے دیں۔ اگلے دن کیا دیکھتے ہیں کہ آرٹلری میدان، برنس روڈ، بندر روڈ اور عید گاہ میدان سمیت ساری سڑکیں پھینکی ہوئی پیٹیوں میں سے بکھرے ہوئے سامان اور کپڑوں وغیرہ سے اٹی پڑی تھیں جن پر گائیں منہ مار رہی تھیں۔ کہیں کہیں کونوں میں لاشیں بھی پڑی دکھائی دیں جنہیں چھ اور سات تاریخ کی درمیانی رات شاید پولیس اٹھا نہیں سکی تھی۔

دو بجے دوپہر سے لے کر شام چھ بجے کرفیو لگنے تک چار گھنٹوں میں پولیس کے اندازے کے مطابق تقریباً تین سو اور ہمارے اندازے کے مطابق تقریباً گیارہ سو لوگ پورے کراچی میں قتل ہو چکے تھے۔ رحمی کرنے کا رواج تب تک شروع نہیں ہوا تھا۔ قینچی یا بیل ذبح کرنے والے چھرے سے لوگوں کو قتل کیا گیا تھا۔ فسادات کا منظر اگر آج بھی کسی کو دیکھنا ہو تو انگریزی آر کے فلم کمپنی کی فلموں میں، یا حال ہی میں بنی ہوئی فلم 'تمس' میں دیکھ سکتا ہے۔

ہوا یہ تھا کہ سکھر سے لائے سکھ (جنہیں پنجابی میں موٹے سکھ بھی کہتے ہیں) پولیس کی حفاظت میں ریل گاڑی میں کراچی اسٹیشن پر اترے تھے۔ وہاں سے انہیں پولیس کی گاڑیوں میں اکال بھونگا والے سکھ مندر تک پہنچایا جاتا تھا۔ تقریباً تین سو سکھ اپنے خاندانوں سمیت سٹی اسٹیشن پر اترے تو لوگ جمع ہونے شروع ہو گئے۔ دھکوں اور گالیوں تک نوبت پہنچنے لگی۔ کانگریسی ایم پی اے کرشنا سد لے، جو اخلا کا انچارج تھا، اسٹیشن پر پولیس کی گاڑیاں نہ دیکھ کر تانگے منگوائے اور جلدی جلدی مسافروں کو تانگوں میں سوار کرا کے اکال بھونگا کی طرف روانہ کیا۔ راستے میں ان میں سے سب سوں کو تانگوں سے گھسیٹ کر اتار لیا گیا۔ چیخ پکار اور "مارو"، "کاٹو" کے نعروں کے درمیان تقریباً سو ڈیڑھ سو لائے سکھ مندر میں داخل ہوئے۔ لیکن مندر کے سامنے کے کھلے میدان میں دو ایک گھنٹوں میں تقریباً سوا لاکھ لوگ اکٹھے ہو گئے۔ (اس پلاٹ پر اب پریڈی پولیس کوارٹر بنا ہوا ہے۔) چند گھنٹوں میں لوگ پولیس کا گھیرا توڑ کر اندر گھس گئے اور مشکل سے کچھ بچے اور عورتیں جان بچا کر بھاگ سکے یا انہیں بھگایا جا سکا۔ مندر کا آنگن اور اصطبل کی کوٹھڑیاں خون سے تر ہو گئیں۔ یہ احوال مجھے شوکت علی نے اُسی رات اپنے گھر پر سنایا تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ اس نے دو زخمی بچوں کو سول اسپتال پہنچایا تھا۔ ایک سپاہی نے اُسے روکنے کی کوشش میں اس کی ران پر سنگین ماری تھی جس کا نشان اس کی ران پر ظاہر تھا۔ معلوم نہیں پولیس والے نے اسے قاتل سمجھ کر مارا یا بچانے والا سمجھ کر!

بہتر گھنٹوں کا کرفیو اٹھنے کے بعد دو گھنٹے کا وقفہ دیا گیا جس میں میں پیدل چل کر پارٹی اور ٹریڈ یونین کے ہیڈ کوارٹر پر پہنچا۔ راستے میں دیکھا رنس روڈ اور پاکستان چوک کی طرف آنے والی سڑک پر اور کچہری روڈ سے لائٹ ہاؤس سینما تک دکانیں کھلی، لٹی اور جلی ہوئی تھیں اور لوگ وقفے کا فائدہ اٹھا کر انہیں دوبارہ لوٹنے کے لیے ان کے سامنے جمع ہو رہے تھے۔

دوسرا کرفیو تقریباً پینتالیس گھنٹے چلا۔ ان دوران ہم نے پولیس کی لاری میں پورے کراچی کا دورہ کیا۔ ہم نے انسانوں کی انسانوں کے ساتھ کی ہوئی وحشی کارروائیوں کی داستانیں سنیں، وحشت اور بربریت کی باتیں سنیں اور اُن فرشتہ سیرت بہادروں کی باتیں بھی سنیں جنہوں نے اپنی جانیں خطرے میں ڈال کر پڑوسیوں کو پناہ دی تھی۔

سارے اسکول اور کالج ہندو پناہ گزینوں سے بھرے پڑے تھے اور پولیس اسٹیشن ٹوٹی ہوئی کرسیوں، میزوں اور الماریوں کے انباروں سے اٹے ہوئے تھے۔ سندھی ہندوؤں کو پولیس کے پہرے میں بمبئی جانے والے بحری جہازوں میں سوار کرایا جا رہا تھا۔ ڈاکس کے مزدوروں کی چاندی تھی، دس دس، بیس بیس، سو سو روپے مزدوری لے رہے تھے۔ دیوان لوگ اپنے بنگلے، گھر بار اور سامان لٹوا کر، اور نہ لٹے ہوئے گھر سیٹھیوں کے آگے ڈال کر شرنارتھی بن کر جا رہے تھے تاکہ ہندوستان سے آئے ہوئے، اور تمبوؤں میں رکھے گئے پناہ گزینوں کے لیے جگہ پیدا ہو۔ ایسی خوشی سے نہ یہ جا رہے تھے نہ وہ آئے تھے۔ یہ ہندوستان اور پاکستان کی دھرتی کا آزادی کے بعد اپنے بچوں سے حسنِ سلوک تھا!

پانچ جنوری کی رات کو تقریباً دس بجے ہم ٹریڈ یونین میں کام کرنے والوں کو ایک دردی کامریڈ نے بتایا تھا کہ ہونے ڈونو مسافر خانے میں شکست خوردہ مولویوں کی میٹنگ ہوئی تھی جس میں یہ فیصلہ ہوا کہ خوف پیدا کیا جائے تاکہ ہندو بھاگ جائیں اور مکان خالی ہوں۔ کیوں کہ ان کے خیال میں بے غیرت سندھی مسلمان ہندوؤں کو مار بھگانے کے لیے تیار نہ تھے۔

ایک لطیفہ شاعر ظہور نظر نے (جو ایار کے قریب رہتا تھا) سنایا کہ چھ جنوری کے فساد میں اس نے چار بجے ایک سوٹ بوٹ اور فیلٹ ہیٹ پہنے ایک مچلے شخص کو پیٹھ پر سوٹ کیس اٹھائے جاتے ہوئے دیکھا جو یہ گاتا ہوا جا رہا تھا کہ اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کی بات نہیں۔

ایک حقیقت اور بھی بیان کر دوں کہ میرے کراچی والے فلیٹ میں میلے کچیلے کالے کلوٹے مزدور کارخانوں سے نکل کر آیا کرتے تھے اور مجھ سے باتیں کرتے تھے۔ صبح میرے روانہ ہونے کے بعد اُس بلڈنگ کی مالکہ آ کر میری بیوی کو طعنے دیتی تھی جو میری بیوی دوپہر کے کھانے پر مجھ تک پہنچاتی اور کہتی کہ مجھے کس دوزخ میں لے آئے ہو۔ بلڈنگ کی مالکہ کہتی ہے کہ تمہارے گھر میں جٹ اور بُوش آتے ہیں، چکلا کھول رکھا ہے! میں اپنی بیوی سے کہتا کہ یہ طعنے تو سہنے ہی پڑیں گے۔

فساد ختم ہونے کے سات دن بعد اوڑھنی گلے میں ڈال کر میری بیوی کے پاس آئی اور کہنے لگی، بہن، مجھے معاف کر دو۔ میں نے تمہیں غلط سمجھا تھا۔ تمہارے شوہر کی وجہ سے میرا پورا محلہ محفوظ رہا۔ اُنہیں بُوشوں نے آ کر ہماری جان بچائی، عزتیں بچائیں اور مال بچایا۔

آٹھ جنوری کے دن میں سڑک پر پارٹی آفس کی طرف جا رہا تھا کہ پیچھے سے کسی نے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ یہ گیہو تھا جو موٹر سائیکل میرے قریب لا کر آہستہ سے کان میں بولا خیال رکھنا۔ میرے آر ایس ایس کے یاروں نے تمہیں قتل کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ گیہو کسی زمانے میں کانگریس سیوادَل میں رہ چکا تھا اور اسے میری جان اب تک عزیز تھی۔

نو یا دس جنوری کو راہ چلتے میری ملاقات سعید باروں سے ہوئی جو اُس وقت مسلم لیگ نیشنل گارڈ کا کرتا دھرتا اور میرا پرانا دوست تھا۔ اس نے مجھے دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا۔

میں اس قتلِ عام کا چشم دید گواہ ہوں۔ میں نے اس فساد میں لٹیرے، ڈاکو اور قاتل بھی دیکھے اور فرشتہ صفت انسان بھی جنہوں نے جان کا خطرہ مول لے کر نہ صرف میری، ایک کامریڈ کی، بلکہ عام ہندوؤں کی بھی جان بچائی اور لاکھوں کو بحفاظت ہندوستان جانے دیا۔

کیا تاریخ خود کو دُہرا رہی ہے؟ کل ایک سندھی تھے، اور آج تینتالیس چوالیس سال گزرنے کے بعد کیا دوسرے سندھیوں کی باری ہے؟

***

حسن ناصر

پاکستان قائم ہونے کے فوراً بعد بہت سے نوجوان کمیونسٹ ہندوستان کے مختلف علاقوں سے یہاں پہنچے۔ حسن ناصر ۱۹۴۸ کے شروع میں کراچی آیا۔

۱۹۵۱ میں راولپنڈی سازش کیس کے سلسلے میں جو گرفتاریاں ہوئیں ان میں حسن ناصر بھی تھا جو شاید اکتوبر کے آخر میں کراچی جیل میں پہنچا۔ اسے احترام کے ساتھ ہمارے وارڈ میں پہنچایا گیا جہاں میری اس سے خاصی صحبتیں رہیں۔ حسن ناصر سے معلوم ہوا کہ وہ حیدر آباد دکن کے ریٹائرڈ ہوم سیکرٹری کا بیٹا ہے اور نظام حیدر آباد کے خلاف تلنگانہ میں جو تحریک چل رہی تھی اُس سے اس کا بالواسطہ تعلق رہا تھا۔ چوں کہ تلنگانہ کی تحریک ایک قسم کی گوریلا تحریک تھی، اس لیے پارٹی کو یہ جاننے کی ضرورت تھی کہ ان طبقوں میں اس تحریک کی بابت کیا سوچ بچار اور تدبیریں ہیں۔ کسی حد تک انہیں معلومات کی بنیاد پر پارٹی ایسی پالیسیاں بناتی تھی۔ جب ہندوستانی فوجیں حیدر آباد دکن میں داخل ہوئیں اس سے پہلے ہی حسن ناصر بمبئی سے ہوتا ہوا کراچی پہنچ چکا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اسے انگلستان بھیج کر اس کی تعلیم مکمل کرنی تھی لیکن کراچی پہنچ کر اس نے آگے کے سفر کا ارادہ ترک کر دیا کیوں کہ کراچی، سندھ اور پاکستان میں اُبھرتی ہوئی ترقی پسند تحریکوں نے اُسے پکڑ لیا۔

۱۷ اپریل ۱۹۴۸ کو بڑی تعداد میں گرفتاریاں ہوئیں۔ کراچی کی پوری ٹریڈ یونین لیڈرشپ اسی تاریخ کو گرفتار ہوئی۔ ہمیں کراچی جیل پہنچایا گیا۔ گو کہ حسن ناصر کے ذریعے سے ہمیں دو دن پہلے خبر مل چکی تھی کہ ہمیں گرفتار کیا جانے والا ہے۔

۷ یا ۸ اکتوبر ۱۹۵۸ کو اسکندر مرزا نے اسمبلی توڑ دی اور مارشل لا کی بنیاد پڑ گئی۔ یہ خبر بھی ہمیں ۳ اکتوبر کو حسن ناصر کی زبانی مل چکی تھی کہ کچھ ہونے والا ہے۔ حسن ناصر کو ایک دوست نے کھانے پر بلایا اور بتایا کہ اسکندر مرزا نے مجھ سے پوچھا کہ اگر میں فیروز خان نون کو چلتا کروں تو ملک کے لوگوں کا ردِ عمل کیا ہوگا۔ اس دوست نے اسکندر مرزا کو جواب دیا کہ مجھے پتا نہیں کیا ردِ عمل ہوگا، لیکن اگر مجھے دو تین دن کا وقت دیں تو میں معلوم کر کے بتاتا ہوں۔ لیکن اسکندر مرزا اتنی جلدی قومی اسمبلی توڑ دے گا یہ کسی کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔

حسن ناصر ایک سلجھا ہوا، استائی ایماندار اور قربانی کا جذبہ رکھنے والا جوان تھا اور اسے تقریباً ۳۳ برس کی عمر میں، ۱۹۶۰ میں، لاہور کے شاہی قلعے کی تیرہ نمبر کھولی میں مار دیا گیا۔ بعد میں انکوائری ہوئی۔ حیدر آباد دکن سے آئی ہوئی اُس کی والدہ کو ایک دفنائی ہوئی لاش نکال کر دکھائی گئی۔ یہ حسن ناصر کی لاش نہ تھی۔ حسن ناصر کی والدہ نے یہ لاش قبول کرنے سے انکار کر دیا اور یہ کہہ کر حیدر آباد واپس چلی گئیں کہ میرا صرف ایک بیٹا جیل میں نہیں، باقی بیٹے بھی جیلوں میں ہیں۔

حسن ناصر میں کچھ ایسی خوبیاں تھیں جو اسے ایک انوکھے قسم کا آدمی ثابت کرتی تھیں۔ ۱۹۵۱

میں جب وہ کراچی جیل میں میرے ساتھ تھا تو اسے سخت پریشانی تھی کہ کس طرح ڈاؤ میڈیکل کالج کے کامریڈ طالب علموں سے لیا ہوا قرض واپس کرے۔ جب اس کی والدہ اس سے ملنے آئیں تو اس نے پہلی بات یہی کہی کہ ان طالب علموں سے لیے ہوئے ساڑھے چھ سو روپے واپس کر دیں۔ اور دوسری ملاقات میں اس نے اپنی والدہ کو ہمارے لیے کھانے پینے کے سامان، شکر، چائے، مکھن، دودھ کے ڈبوں وغیرہ کی ایک لمبی فہرست دی جس کی قیمت اندازاً ساٹھ آٹھ سو روپے بنتی تھی۔ حسن ناصر ایسا کامریڈ تھا کہ اپنی ہر چیز اپنے ساتھیوں میں بانٹ دیتا تھا اور اچھے گھر کا ہونے کے باوجود اس میں گھمنڈ بالکل نہ تھا۔

کامریڈ پوہو کی گرفتاری کے بعد کراچی کمیٹی کے سیکرٹری کی حیثیت سے حسن ناصر نے پارٹی کی تنظیم کو مضبوط کرنے میں خاصا اہم رول ادا کیا۔ اس کے سیکرٹری ہونے کے زمانے میں کراچی کی تنظیم بہت فعال اور وسیع تھی۔ پھر اسے دو سال کے لیے پاکستان سے نکال دیا گیا۔ دو سال ہندوستان میں رہ کر جب وہ لوٹا تو میں بھی سندھ اخبار کے سلسلے میں کراچی میں تھا۔ وہ میرے پاس آیا اور بولا میں جلاوطنی کے دو سال کاٹ کر واپس آ گیا ہوں۔ اب کیا حکم ہے؟ میں نے اسے نیشنل عوامی پارٹی کا مرکزی دفتر سنبھالنے کو کہا اور وہاں ہر روز ہماری ملاقات ہونے لگی۔

اکثر کامریڈ خشک مزاج ہوتے ہیں اور خاندانی زندگی میں مشکل ہی سے فٹ ہوتے ہیں۔ لیکن حسن ناصر جہاں جاتا وہاں اپنے دوست اور ساتھی پیدا کر لیتا۔ اخلاق کے لحاظ سے حسن ناصر بہت اونچے درجے کا آدمی تھا۔ برسوں کی کنوارے پن کی زندگی میں ہم نے اس کے متعلق کوئی اسکینڈل نہ سنا۔ وہ ایک صاف ستھرا آدمی تھا جس کا ہر کیمپ میں عزت اور محبت سے خیر مقدم کیا جاتا تھا۔

کراچی کی پارٹی آرگنائزیشن سے حسن ناصر نے ہمیں عزیز سلام بخاری، ابراہیم ملباری، زبیر اور سائیں عزیز اللہ جیسے عمدہ ساتھی بھیجے۔ ہنس کر کہتا تھا کہ میں اپنے سر درد کراچی سے نکال کر سندھ میں بھیج رہا ہوں۔ تم انہیں سندھ میں لگاؤ۔ یہ سب ساتھی سندھ پارٹی کے لیے بہت کارآمد کارکن ثابت ہوئے اور مرتے دم تک اپنی انقلابی ڈیوٹی سرانجام دیتے رہے۔

۱۹۶۰ میں اُسے روپوشی کے دوران گرفتار کیا گیا اور لاہور کے شاہی قلعے میں اذیتیں دے کر مار دیا گیا۔ اسے جو بات جاننے کے لیے مارا گیا وہ یہ تھی کہ اس کے ساتھی کون ہیں اور اس کی مالی امداد کون کرتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ حسن ناصر کو اسی لیے مارا گیا کہ اس نے اپنے مددگاروں کے نام بتانے سے انکار کر دیا تھا۔ انقلابی اخلاق یہی ہے کہ مرتے مر جاؤ لیکن اپنے ہمدردوں اور ساتھیوں کے نام ہرگز نہ بتاؤ۔

**

آئندہ صفحات میں پیش کیے جانے والے چار مضامین جمشید نسروانجی مہتا (۱۸۸۶ - ۱۹۵۲) کی شخصیت کے بارے میں ہیں۔ انہیں بجا طور پر جدید کراچی کے معمار کا لقب دیا گیا ہے لیکن، جیسا کہ آپ کو ان مضامین سے اندازہ ہوگا، ان کی شخصیت اس لقب سے کہیں زیادہ بلند تھی۔ جمشید نسروانجی گیارہ برس تک کراچی میونسپلٹی کے سربراہ رہے۔ کراچی شہر اور اس میں بسنے والوں سے — خواہ ان کا تعلق کسی بھی مذہب، زبان، نسل یا علاقے سے ہو — جمشید نسروانجی کی مکمل وابستگی تھی۔ ان کی یہ وابستگی نہ تو کسی قسم کے تعصب پر مبنی تھی اور نہ جذباتیت پر، بلکہ وہ اس شہر میں آ کر بسنے والے تمام لوگوں کو پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتے تھے اور اس سلسلے میں مکمل حقیقت پسندی سے کام لے کر شہر اور شہریوں کی حالت بہتر بنانے کے لیے زندگی بھر کوشاں رہے۔
کراچی میونسپلٹی کے معاملات سے جمشید نسروانجی نے اُس وقت کنارہ کر لیا جب حکومت نے اس ادارے کے منتخب سربراہ کے اختیارات محدود کر دیے، لیکن شہر کے معاملات سے ان کا ذاتی تعلق، جو بلاامتیاز خدمت کے جذبے پر مبنی تھا، آخر وقت تک برقرار رہا۔ ۱۹۴۷ کے بعد آبادی کی بڑی تعداد میں نقلِ مکانی نے اس شہر کو یکسر تبدیل کر دیا۔ نئے آنے والوں کو اس شہر کے ماضی اور اس کی اساسیت اور کردار سے کچھ زیادہ واقفیت نہ تھی اور شہر کے انتظامی معاملات جن لوگوں کے ہاتھوں میں آئے وہ جمشید نسروانجی کی بصیرت اور عدم تعصب سے محروم تھے۔ چنانچہ یہ تعجب کی بات نہیں کہ کراچی شہر جسے برصغیر کے خوش انتظام ترین شہروں میں شمار کیا جاتا تھا، رفتہ رفتہ شدید بدانتظامی کا شکار ہو گیا۔ اس شہر کے کردار کو دیکھتے ہوئے یہ بات کہنا ناگزیر ہے کہ شہر کے موجودہ مسائل کا حل جمشید نسروانجی کی سی بصیرت اور حقیقت پسندی کے بغیر ممکن نہیں ہوگا۔
یہ مضامین Jamshed Nusserwanjee A Memorial نامی کتاب سے منتخب کیے گئے ہیں جسے جمشید نسروانجی میموریل والیوم کمیٹی نے ان کی وفات کے دو برس بعد ۱۹۵۴ میں کراچی سے شائع کیا تھا۔

کیول موٹوانی

انگریزی سے ترجمہ اور تلخیص اجمل کمال

جمشید نسروانجی

کسی نوجوان کی زندگی میں، جو ابھی آنکھیں کھول کر دنیا کی رنگارنگی پر نظر ڈالنا شروع ہی کر رہا ہو، اس سے بڑھ کر کیا خوش قسمتی ہو سکتی ہے کہ اسے ایک ایسی شخصیت کے ساتھ ذاتی طور پر وابستہ ہونے کا موقع مل جائے جو ایک عالی مرتبہ روح کی کرنوں سے جگمگا رہی ہو، بلند آدرش اور خدمت کے جذبے سے مالامال ہو اور جس کی شخصی زندگی اس نوجوان کی نشوونما اور تقدیر پر گہرا اثر ڈال سکے۔ مجھے یقین ہے کہ جمشید نسروانجی مہتا کے دوستوں میں — جن کی تعداد ایک پورے لشکر سے کم نہ تھی — میں شاید واحد آدمی تھا جسے سالہاسال دن کا بیشتر حصہ ان کے ساتھ گزارنے کا شرف ملتا رہا۔ ان کے پرسنل سیکرٹری کی حیثیت سے مجھے نہ صرف جمشید کو کام کے دوران دیکھنے کے موقعے ملے بلکہ ان کی شخصیت کی عظمت، بے پناہ قوت اور ان تھک کام کرنے کی حیرت انگیز صلاحیت کی جھلکیاں بھی بارہا نظر آئیں۔ جمشید کی زندگی خدمت کا ایک مسلسل نغمہ تھی، یوگ کے اعلیٰ ترین درجے کا عملی روپ تھی، اور ہندوستان کے ایک بے بدل جینیئس کا نقطۂ عروج تھی۔

جمشید سے میرا پہلا تعارف فروری 1919 میں ہوا جب تھیوسوفیکل سوسائٹی کی ڈاکٹر اینی بیسنٹ حیدرآباد کے نیشنل کالج میں آئیں جہاں میں بھی ایک طالب علم تھا۔ میں ڈاکٹر بیسنٹ کی شخصیت اور کام کا حد درجہ گرویدہ تھا۔ ان کو پہلی بار دیکھ کر میری عقیدت نے خاموشی کی مہر توڑ دی اور ایک نظم — میری زندگی کی واحد نظم — کی صورت اختیار کر لی۔ اگلے دن ڈاکٹر بیسنٹ ہمارے کالج کے بورڈ کے ساتھ ایک میٹنگ میں مصروف تھیں۔ میں نے جمشید کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا تو لپک کر اپنی نظم ان کو تھما دی اور اسے ڈاکٹر بیسنٹ تک پہنچانے کی درخواست کی۔ جمشید نے میری درخواست مان لی۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر بیسنٹ نے میٹنگ روک کر مجھے اندر بلوا لیا اور نظم کے لیے میرا شکریہ ادا کیا۔ یوں جمشید اس مسرور کن موقعے پر میری زندگی میں داخل ہوئے۔

اگلے تیس برسوں میں جمشید سے میری گاہے گاہے ملاقات ہوتی رہی۔ وہ نیشنل کالج کے بورڈ کے اعزازی خازن (درحقیقت اہم ترین مالی مددگار) اور سیکرٹری تھے اور میں کالج کے پرنسپل کا سیکرٹری تھا،

جہاں تک اپنے کام کے سلسلے میں ہمارا رابطے میں آنا ناگزیر تھا۔ تاہم یہ رابطہ قطعی دفتری نوعیت کا تھا اور کالج کے معاملات تک محدود رہتا تھا۔ ۱۹۲۲ میں میں نے بی اے کیا اور احمد آباد کے گجرات ودیاپیٹھ میں چند ماہ پولیٹیکل سائنس کے استاد کی زندگی کا تجربہ کرکے کراچی آکر بس گیا۔

یہ ۱۹۲۳ کے اوائل کے ایک سنیچر کی شام تھی۔ ہم چند نوجوان کسی خاص مقصد کے بغیر تھیوسوفیکل سوسائٹی کے لان میں مل بیٹھے تھے اور ادھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے کہ غیر متوقع طور پر جمشید وہاں نمودار ہوئے۔ ہم نے تقریباً ان کا دامن پکڑ کر اپنے پاس بیٹھ کر کچھ باتیں کرنے پر مجبور کر دیا۔ ابھی یہ طے نہ ہوا تھا کہ جمشید کی گفتگو کا موضوع کیا ہو، کہ میں نے قدرے گستاخی سے کام لیتے ہوئے کہہ دیا ہمیں اپنے بارے میں کچھ بتایئے۔ ہم آپ کی شخصیت کو جاننا چاہتے ہیں۔ جمشید یہ سن کر اپنے مخصوص انداز میں ہنسے — اُن کی ہنسی میں ہمیشہ دلی مسرت، خلوص اور گہرائی کی گونج سنائی دیتی تھی — اور کہا کہ ان کی زندگی میں ایسی کوئی عالی شان یا خاص بات نہیں کہ اس کے بارے میں بات کی جائے۔ مگر ہمارے اصرار پر جمشید نے اپنے دل آویز، بچوں کے سے معصوم انداز میں ہتھیار ڈال دیے، اور یوں ہمارا سنیچر کی کلاسوں کا وہ ہفتہ وار سلسلہ شروع ہوا جو ۱۹۵۲ میں ان کی وفات تک جاری رہا۔ جمشید نے ہمیں اپنے اسکول اور کالج کے زمانے، والدین کے ساتھ گزارے ہوئے دنوں، اپنے والد کے کاروبار کی سب سے نچلی سیڑھی سے اپنی عملی زندگی کے آغاز اور اپنی سیاسی زندگی کی ابتدا کے بارے میں بتایا، اپنی اوائلی زندگی کے بحران کا ذکر کیا، بمبئی میں پہلی بار تھیوسوفیکل سوسائٹی کے ایک جلسے میں اتفاقاً جاکر ڈاکٹر بیسنٹ کی تقریر سننے کا واقعہ یاد کیا، اور اپنی زندگی کے دشوار لمحوں میں اپنی والدہ کے پُرشفقت تحفظ کی باتیں کیں۔ جمشید نے بڑے خلوص اور سادگی کے ساتھ، جس میں ایک مبہم سی اُداسی بھی گھلی ہوئی تھی، اپنا دل ہمارے سامنے کھول کر رکھ دیا اور ہم عقیدت اور تشکر کے جذبات کے ساتھ گویا اُن کی زندگی میں حصے دار بن گئے۔ جمشید کی زندگی اُن کے آدرشوں کا عملی روپ تھی جس سے ہمیں اپنے آدرشوں کے لیے تقویت حاصل ہونے لگی۔ ان کی نجی زندگی کے حالات کا ذکر ہفتہ وار کلاسوں کے پہلے سال میں پورا ہو گیا۔ پھر جمشید نے ہر بار کسی کتاب کو تفصیلی گفتگو کے لیے منتخب کرنا شروع کر دیا۔ کتاب کا متن جمشید کے تبصرے سے روشن ہو جاتا اور ان کی زندگی کے گوناگوں اور قیمتی تجربات سے جگمگا اٹھتا۔

جمشید بلاشبہ اُن افراد میں سے تھے جو اپنی عملی زندگی کی ابتدا ہی میں عام لوگوں کی سطح سے بلند ہو جاتے ہیں۔ ۱۹۲۳ میں شروع ہونے والی ہماری کلاسوں سے پہلے ہی سے جمشید ایک نہایت سرگرم اور مصروف زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کا کام بے تحاشا بڑھ چکا تھا اور مجھے بارہا حیرت ہوتی تھی کہ وہ کسی پرائیویٹ سیکرٹری کی مدد کے بغیر یہ سارا کام کیوں کر نمٹاتے ہوں گے۔ وہ سندھ میں ہوم رول لیگ کی تحریک کی مرکزی شخصیت تھے اور حیدرآباد کی صوبائی کانفرنس میں لیگ کے صوبائی صدر منتخب ہو چکے تھے۔ وہ کراچی میونسپلٹی کے صدر، کراچی پورٹ ٹرسٹ کے ممبر، ہندوستانی ایوانِ تجارت کے بانی صدر، سندھ نیشنل کالج حیدرآباد کے سیکرٹری اور جان، کراچی کے متعدد تعلیمی اداروں — ڈی جے

سندھ کالج، پارسی ویربائی جی نوائر بائی اسکول، ماما پارسی گرلز ہائی اسکول ــــ کے بورڈ کے رکن، سندھ سنٹرل کوآپریٹو بینک کے بانی اور مینیجنگ ڈائریکٹر، سندھ کے صوبائی چیف اسکاوٹ، گلبائی میٹرنٹی ہوم کے (جسے انھوں نے اپنی والدہ کی یاد میں قائم کیا تھا) ٹرسٹی اور چارج، اور نابیناؤں کے اسکول کے بورڈ کے چیئرمین تھے۔ ان تمام عوامی مصروفیات کے علاوہ وہ اپنے والد کے وسیع کاروبار کی بھی نگرانی کرتے تھے جو کئی فلور ملوں، سیمنٹ ٹائلز فیکٹری، سالٹ ورکس، ایریٹیڈ واٹر اینڈ آئس فیکٹری او در آمد و بر آمد کے پھیلے ہوئے کام پر مشتمل تھا جس کی سیلز ایجنسیاں شمالی ہندوستان میں بہت سی جگہوں پر واقع تھیں۔ مگر انھیں بھی سیکرٹری کی ضرورت کا احساس تھا، اور شاید کوئی قدیم رشتہ ہم دونوں کا ایک دوسرے کی طرف کھینچ رہا تھا۔ اگرچہ انھوں نے مجھے اس اعزاز کے لیے منتخب کر لیا تھا لیکن مجھ سے براہ راست اس بارے میں کچھ نہ کہا۔ مجھے یہ قدم اپنے بل بوتے پر اور اپنی مرضی سے اٹھانا تھا۔

غالباً اس اندرونی یقین کے باعث کہ مجھے جلد یا بدیر ان کے کاموں میں شامل ہونا ہی ہے، جمشید مجھے اپنی شخصیت سے قریب لانے کے متعدد مواقع پیدا کرتے رہتے تھے۔ ہفتے میں ایک بار میں اور گردیال ملک صبح سویرے جمشید کے گھر جاتے۔ وہ ہمیں اپنے انتہائی سادہ ناشتے میں شریک ہونے کی دعوت دیتے جو چند بسکٹوں اور چائے کی پیالی پر مشتمل ہوتا، اور پھر ہمیں ساتھ لے کر گاندھی گارڈن کی طرف نکل جاتے تاکہ وہاں کی وسیع تر فطری زندگی کا لمس پا سکیں۔ میں اور گردیال اس بات پر حیران ہوتے تھے کہ ایک ایسا شخص جو مختلف اداروں میں بے شمار کاموں میں مصروف رہتا ہے، ایسی مصروفیات میں سے اپنے نوجوان دوستوں کے فطرت سے تعلق کو تازہ کرنے کی خاطر بھی وقت نکال سکتا ہے۔ ہر سال بیساکھ کے مہینے میں چودھویں کی رات ہم میں سے چند لوگوں کے ساتھ کوئی پروگرام بناتے۔ ہم سب گاڑی میں کراچی کے ساحلی علاقے کلفٹن جاتے او اپنے ایک دوست کے بنگلے میں ٹھہرتے۔ چاند نکلنے سے پہلے کا پورا دن روزے، مراقبے اور مطالعے کے لیے وقف ہوتا، تاکہ بدن اور ذہن دونوں آنے والے نایاب لمحے کے تقدس کو جذب کرنے کے قابل ہو جائیں۔ پھر ہم ایک ہلکے سے ناشتے کے بعد اپنے روزمرہ کاموں پر توجہ دینے کے لیے کراچی لوٹ آتے۔ روح کے منطقے میں داخل ہوتے وقت جمشید کو اپنے دوستوں کا ساتھ بہت عزیز ہوتا تھا۔

میں یہ یاد کر کے خوشی او تشکر کے جذبات محسوس کرتا ہوں کہ ان کے تمام دوستوں میں میرا تعلق ان کے ساتھ سب سے زیادہ گہرا تھا۔ ایک شام جب ہم تھیوسوفیکل لاج کی سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے تھے، میرا بھتیجا، جو پیشے کے اعتبار سے وکیل اور عمر میں مجھ سے بڑا تھا، سامنے سے گزرا او ان نے ہمیں دیکھ کر ہاتھ ملایا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ جمشید کو کراچی میں میرے رشتے داروں کے وجود کا علم ہوا۔ لیکن انھیں یہ جان کر تعجب ہوا کہ میرے تعلقات موروثی جائیداد کے قضیے پر اپنے بھائی سے کشیدہ ہیں۔ جمشید نے بہت نرم مگر سنجیدہ لہجے میں مجھے احساس دلایا کہ میرا یہ طرزِ عمل تھیوسوفیکل سوسائٹی کے رکن کے طور پر میرے آدرشوں سے مطابقت نہیں رکھتا۔ میں نے موروثی جائیداد میں اپنے حق پر اصرار کیا تو جمشید نے کہا کہ گویا

معاملہ سوسائٹی کی ترکیب اور چند ایسی دیاوی چیروں کے حصول کے درمیاں انتخاب کا ہے جو در حقیقت میری ذاتی محبت کا تو نہیں ہیں۔ جمشید نے زور دے کر کہا کہ یہ کوئی مجرد تصور نہیں ہے بلکہ اس کے باعث آگے چل کر میرے ذہن میں تضاد کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ جمشید کی بات کی روشنی میں اس معاملے پر غور ڈال کر میرا موقف بالکل بدل گیا اور میں موروثی جائیداد میں اپنے حصے سے دست بردار ہو گیا۔

رفتہ رفتہ جمشید اور میں ایک دوسرے کے قریب آتے گئے اور انھوں نے محسوس کیا کہ اب مجھے کوئی ذمے داری کا کام سونپا جا سکتا ہے۔ اُن دنوں ڈاکٹر بیسنٹ کا تیار کردہ کامن ویلتھ آف انڈیا بل برطانوی پارلیمنٹ کے اپوزیشن لیڈر ریمزے میکڈانلڈ کی جانب سے پیش کیا جا چکا تھا۔ جب جمشید نے کراچی میں اس بل کے حق میں ایک کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا تو اس کا سارا کام میرے حوالے کر کے خود ایک تعلیمی کانفرنس میں شریک ہونے تانا، بمبئی، چلے گئے۔ یہ کانفرنس فروری ۱۹۲۶ میں منعقد ہوئی، سر چندرائے وشنداس اس کی استقبالیہ کمیٹی کے چیئرمین اور ڈاکٹر بیسنٹ کانفرنس کی صدر تھیں۔

جب مجھے جمشید کے سیکرٹری کے طور پر کام کرتے ہوئے کئی ماہ ہو گئے اور مجھے میری خدمات کا کوئی معاوضہ نہ ملا تو میں نے ان کے نام ایک مختصر سا رقعہ لکھا، کیوں کہ مجھے زبانی بات کرتے ہوئے شرمندگی ہوتی تھی اور میری جمع پونجی اب میرا ساتھ چھوڑتی جا رہی تھی۔ اگلے دن اپنے دفتر میں داخل ہو کر جمشید نے اپنی چیک بک نکالی اور ایک چیک پر رقم لکھے بغیر دستخط کر کے اسے میرے حوالے کر دیا۔ جب میں نے اس فروگذاشت کی طرف توجہ دلائی تو انھوں نے وہ الفاظ کہے جو مرتے دم تک میرے حافظے سے محو نہ ہو سکیں گے۔ جمشید نے کہا "کیول، جب میں اپنے والد کے کاروبار میں شامل ہوا تھا تو انھوں نے مجھے ایک بلینک چیک دیا تھا کہ اس میں جو رقم چاہوں بھر لوں۔ میں اپنے گھرانے کی روایت کی پاس داری کر رہا ہوں۔" اس بے پایاں محبت کے دائرے میں آ کر میرا دل تشکر اور انکسار کے جذبات سے لبریز ہو گیا اور میں سوچنے لگا کہ ایسے کتنے باپ ہوں گے جو اپنی اولاد کے ساتھ بھی اس قدر دریادلی کا سلوک کر سکیں۔ میں نے کبھی جمشید کا ساتھ نہ چھوڑنے کا ارادہ کر لیا۔ جمشید کی مدبرانہ شفقت بھی ہمیشہ میرے ساتھ رہی۔ ۱۹۲۸ میں جب میں نے سوشل سائنسز میں پوسٹ گریجویٹ کے لیے امریکا جانا چاہا تو جمشید نے، یہ خیال کیے بغیر کہ انھیں میری خدمات کی ضرورت ہے، مجھے نہ صرف جانے کی اجازت دے دی بلکہ چار برس تک میری بیرون ملک تعلیم کا پورا خرچ خود برداشت کیا۔ ماہانہ اخراجات کا چیک مجھے باقاعدگی سے ملتا رہا اور جمشید کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے خط بھی۔ انھوں نے باپ اور سرپرست کے طور پر اپنا فرض پوری خوش اسلوبی سے پورا کیا۔ ان کی شفقت کا شکریہ ادا کرنے کا میرے پاس ایک ہی ذریعہ تھا، اور میں نے سوشیالوجی کے موضوع پر اپنی تصنیف جمشید کے نام معنون کی۔

جمشید مذہب کے اعتبار سے زرتشتی تھے، لیکن ان کی داخلی اور خارجی زندگی تمام مذاہب کے ظاہری اختلافات سے بلند تھی۔ ان کا سادہ ذاتی فلسفہ محبت، اتحاد اور دوستی کی بنیادوں پر قائم تھا اور اس کا عملی

اظہار اپنے ارد گرد کے تمام انسانوں کی خدمت سے ہوتا تھا۔ ان کا فیض، ذات پات اور مذہب کی تخصیص
کے بغیر سب لوگوں تک پہنچتا تھا۔ وہ سیکڑوں افراد اور خاندانوں کی متواتر مالی امداد کرتے تھے۔ ہر مہینے
کی پہلی تاریخ کو وہ اپنی دراز سے فہرست برآمد کرتے، کراچی میں رہنے والے خاندانوں کے نام نقد روپوں
کے لفافے بنا کر بھیجتے اور کراچی اور ہندوستان کے باہر کے خاندانوں کو منی آرڈر اور چیک کے ذریعے
رقمیں بھیجتے۔ جب میں نے ان کے سیکرٹری کی ذمے داری سنبھالی تو انھوں نے کمال مہربانی سے اس
کام کا انتظام میرے سپرد کر دیا اور گویا مجھے بھی اپنی نیکیوں میں حصے دار بنا لیا۔ ہندوستان اور باہر کے
اداروں اور تنظیموں کو دی جانے والی رقمیں زیادہ بڑی ہوتی تھیں۔ ۱۹۴۶ میں ان سے آخری بار
رخصت ہوتے وقت میں نے ان کی اس دریادلی کا ذکر کیا اور مجموعی رقم کا تخمینہ پچاس لاکھ روپے لگایا۔
جمشید نے فوراً میری تصحیح کی اور کہا کہ درست رقم چالیس اور پینتالیس لاکھ کے درمیان ہے۔ مجھے یقین
ہے کہ اس کے بعد ان کی زندگی کے چند برسوں میں اس رقم میں کئی لاکھ روپے کا اضافہ ہو گیا ہو گا۔ لیکن یہ
تمام سخاوت اس قدر رازداری سے کی جاتی تھی کہ لوگوں کے دلوں میں محفوظ شکر کے جذبے کے سوا جمشید
نے اس کا کوئی مادی نشان نہیں چھوڑا۔

دوسروں کی خدمت کے ذریعے اپنی دشواریوں اور تکلیفوں کو بھلا دینا جمشید کے محبت کے فلسفے کا
اظہار تھا۔ لڑکپن کے زمانے میں جمشید کو ہرنیا کی تکلیف ہو گئی تھی جس نے انھیں عمر بھر ناقابلِ بیان
تکلیف میں مبتلا رکھا۔ میں نے انھیں بارہا آپریشن کرانے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی مگر انھوں نے ہر بار
انکار کر دیا۔ آپریشن میں درد سے نجات کا امکان ضرور تھا لیکن جان کا خطرہ تھا۔ یہ بات نہیں کہ جمشید کو
موت سے ذرہ برابر خوف آتا ہو، مگر ایسے خاندانوں اور افراد کی تعداد بلامبالغہ سیکڑوں اور ہزاروں میں تھی
جن کا دارومدار جمشید کی طرف سے ملنے والی مالی امداد پر تھا اور جمشید کی موت ان کی زندگیوں کو تہہ و بالا کر
سکتی تھی۔ یہ وجہ تھی کہ جمشید نے درد برداشت کرنے کو ترجیح دی۔ جب کبھی اس درد کا دورہ پڑتا تو جمشید
کی زبان سے شکایت کا ایک لفظ تک نہ نکلتا اور نہ ان کی روزمرہ مصروفیت میں کوئی خلل پڑتا۔ اس کے
برعکس وہ اس روز اپنی مصروفیت کو اور بڑھا لیتے۔ وہ اسپتالوں کا چکر لگاتے، اپنے دوستوں اور ساتھیوں سے
ملاقاتیں کرتے اور ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے اور مشکلوں کو دور کرنے میں خود کو مصروف رکھتے۔ ایسے
موقعوں پر جب کبھی میں جمشید کے ساتھ ہوتا، وہ مجھ سے کہا کرتے، "کیول ان لوگوں کی تکلیفوں کے
سامنے میرا درد کیا حیثیت رکھتا ہے!" جمشید ظاہری طور پر ادھر ادھر آ جا رہے ہوتے، مریضوں، ڈاکٹروں
اور نرسوں سے بات چیت میں مشغول ہوتے، لیکن اندرونی طور پر مراقبے کی حالت میں ہوتے اور اپنے
گرودیو، اپنے استاد سے سب کے لیے رحمت طلب کر رہے ہوتے۔ اپنے ارد گرد، اوپر اور نیچے کی وسیع
زندگی سے رابطہ پیدا کر کے جمشید اپنی تکلیف پر غالب آ جاتے اور اسے دوسرے انسانوں کی خدمت میں
بدل دیتے۔

دوسروں کی مدد کے لیے بے حد سخی ہوتے ہوئے بھی جمشید اپنی ذاتی زندگی میں جُزرسی کی حد تک

کفایت شعار تھے۔ انہیں وسائل کا ضیاع کسی بھی صورت میں پسند نہ تھا۔ وہ کئی بار ہمیں یہ دکھانے کے لیے شہر کے دورے پر لے جاتے کہ لوگ کس طرح رہتے ہیں اور شہری ادارے کس طرح کام کرتے ہیں۔ ایک ایسے ہی موقعے پر ہم پانی کے ایک مشترکہ نلکے پر پہنچے اور منہ ہاتھ دھونے کے لیے رکے۔ ہم میں سے ہر ایک نے پانی استعمال کرتے ہوئے نلکے کو کھلا رکھا اور استعمال میں آنے والے پانی سے کہیں زیادہ مقدار میں پانی ضائع کیا۔ جب جمشید کی باری آئی تو انھوں نے ایک ہاتھ سے پانی استعمال کیا اور دوسرے ہاتھ سے نلکے کے پانی کو ضائع ہونے سے روکا۔ منہ دھونے کے بعد جمشید نے جو بات کہی وہ میرے ذہن پر نقش ہو گئی۔ انھوں نے کہا میرے دوستو، کراچی میں پانی کی بہت قلت ہے۔ آپ لوگ جانتے ہیں کہ ہمارے دریائی کنویں سوکھ گئے ہیں۔ آپ لوگوں نے منہ دھونے میں اتنا پانی ضائع کیا ہے جس سے ایک بڑے خاندان کی ہفتے بھر کی ضرورت پوری ہو سکتی تھی۔ انھوں نے ایک تجربہ کار استاد کی طرح ایک قیمتی سبق ہم سب کو ذہن نشین کرا دیا جو آسانی سے محو نہیں ہو سکتا تھا۔ ذاتی عادتوں میں جمشید نہایت کفایت شعار تھے۔ وہ قلیل مقدار میں اور سادہ غذا کھاتے۔ ان کی خوراک میں گوشت اور روغن بالکل شامل نہ ہوتا۔ سرکاری اور سماجی تقریبات کے سوا ان کا لباس بہت سادہ ہوتا۔ ان کے جوتے ہمیشہ کینوس کے ہوتے کیوں کہ چمڑے کے جوتے استعمال کرنے میں ان کے نزدیک جانوروں کے ساتھ بے رحمی کا پہلو تھا۔

جمشید کے کردار کی ایک اہم ترین خصوصیت اپنے رابطے میں آنے والے ہر موضوع پر پوری طرح حاوی ہونے کی عادت تھی۔ حیدرآباد میں ہونے والی سندھ بمبئی کانفرنس میں ان کی تقریر نے عوام کو درپیش تمام مسائل کا بڑی عمدگی سے احاطہ کیا۔ جب وہ پہلی بار کراچی میونسپلٹی کے صدر منتخب ہوئے تو انھوں نے میونسپلٹی کے انتظامی معاملات کی ایک ایک تفصیل اور شہر کے چپے چپے سے پوری طرح واقف ہونے کو اولین ترجیح دی اور اپنی دریافتوں کو اخباری مضامین کے ایک سلسلے کی صورت میں پیش کیا۔ یہ مضامین ڈیلی گزٹ میں شائع ہوئے اور انہیں بعد میں ایک کتاب میں جمع کیا گیا۔ اسی طرح سندھ کی بمبئی سے علیحدگی کے حق میں مہم شروع کرنے سے پہلے جمشید نے مسئلے کے اقتصادی، سیاسی، معاشرتی، انتظامی ہر پہلو کا پوری طرح مطالعہ کیا اور اس موضوع پر بھی سلسلہ وار مضامین لکھے جو بعد میں پمفلٹ کے طور پر چھاپے گئے۔ جمشید کے ان مضامین نے لندن میں آئینی اصلاحات کمیٹی کے چیئرمین کو قائل کرنے میں بہت حصہ لیا۔ مجھ سے اس بات کا ذکر چیئرمین کے سیکرٹری پروفیسر ہیرلڈ لاسکی نے ۱۹۳۰ میں امریکا کی ییل یونیورسٹی میں ملاقات ہونے پر کیا۔ جمشید کا دل خدمت کے کاموں میں لگا رہتا اور ان کا دماغ ایک عمدہ آلے کے طور پر حقائق کی جستجو میں مصروف رہتا۔ حقائق کو احتیاط سے دریافت کرنا، ان کو قائل کرنے والے انداز میں ترتیب دینا اور نرم، سلجھے ہوئے اسلوب میں پیش کرنا جمشید کے لیے ایک فطری عمل تھا۔

جمشید کی نجی اور عوامی زندگی کو روح کی بلند یک جہتی سے تقویت حاصل ہوتی تھی۔ ان کے خیالات

نہایت شفاف تھے، اپنے فرض کا احساس بے حد قوی تھا اور ذات پات، برادری، صوبے وغیرہ کے تعصبات کا شائبہ تک نہ تھا۔ کسی اختلاف رائے کا سامنا ہونے پر جمشید کا طرز عمل ایک نرم خو معقولیت اور مفاہمت پر مبنی ہوتا تھا، لیکن اگر فرض شناسی کا تقاضا کسی بات پر ڈٹ جانے کا ہوتا تو ان کا قدم پیچھے نہ ہٹتا۔ جب کراچی کے آرٹلری میدان کے مسئلے پر کراچی میونسپلٹی اور حکومت بمبئی کے درمیان تنازعہ پیدا ہوا اور اس کے حل ہونے کی کوئی صورت نہ رہی تو حکومت نے آرٹلری میدان کے پلاٹ بیچنے کے لیے ایک عوامی نوٹس لگوا دیا۔ جمشید نے اس نوٹس کے بالکل ساتھ دوسرا نوٹس لگوایا جس میں لوگوں کو پلاٹ خریدنے سے باز رہنے کے لیے انتباہ کیا گیا تھا۔ جب بمبئی کے گورنر سر لیسلی ولسن کو جمشید کے لگوائے ہوئے نوٹس کی خبر ملی تو وہ سیخ پا ہو گئے اور پہلی ٹرین میں سوار ہو کر کراچی پہنچے۔ انھوں نے جمشید کو گورنمنٹ ہاؤس میں بلوایا اور اپنی سخت برہمی کا اظہار کیا۔ جمشید نے بڑے مہذب لہجے میں جواب دیا کہ پھر مجبوراً انھیں یہ معاملہ برطانیہ کی پریوی کاؤنسل میں لے جانا پڑے گا اور وہاں کروڑوں روپے کے معاوضے کے لیے دعویٰ دائر کرنا پڑے گا، اور یہ کہ انھیں پورا یقین ہے کہ وہ مقدمہ جیت جائیں گے کیوں کہ ان کا موقف انصاف پر مبنی ہے۔ آخر حکومت بمبئی کو ان کا اصولی موقف مان کر مفاہمت پر راضی ہونا پڑا۔

کراچی اور بمبئی دونوں کے سرکاری حلقوں میں جمشید کے لیے بہت احترام پایا جاتا تھا۔ ایک کے بعد ایک آنے والے کئی گورنروں نے بمبئی کی کابینہ میں ایگزیکٹو کاؤنسلر کے عہدے اور نائٹ کے خطاب کی پیش کش کی ــــــ اس قسم کی آخری پیش کش انھیں حکومت سندھ کی کابینہ کے رکن مکھی گوبندرام کی وساطت سے کی گئی ــــــ مگر جمشید نے ہر بار نرمی سے انکار کر دیا۔ انھیں نائٹ کا خطاب قبول کرنے میں خاصا تامل تھا کیوں کہ اس سے ان پر عام شہریوں سے میل ملاپ کے سلسلے میں کچھ پابندیاں عائد ہوتی تھیں جو انھیں بالکل گوارا نہ تھیں۔ اس خطاب کی غیر موجودگی میں ہر شخص انھیں جمشید (یا آخری زمانے میں جمشید جی) کہہ کر مخاطب کر سکتا تھا، ان تک بلا تکلف رسائی حاصل کر سکتا تھا، ان کے گھر ملنے آ سکتا تھا، ان کی گاڑی میں بیٹھ سکتا تھا، ان کے دفتر میں داخل ہو سکتا تھا اور ان کے برابر کی کرسی پر بیٹھ سکتا تھا۔ خطاب ملنے کے بعد انھیں لوگوں سے ایک مخصوص فاصلہ برقرار رکھنا پڑتا جس کے خیال سے جمشید کا دم گھٹتا تھا۔

تاہم بمبئی اور سندھ کی حکومتوں نے جمشید کی خدمات کا اعتراف کئی طریقوں سے کیا۔ گورنر، کمشنر، وزیر اور سرکاری افسر کسی نجی یا عوامی معاملے میں جمشید کے کام آنے کو اپنے لیے اعزاز سمجھتے۔ حکومت نے ان کی صلاحیتوں کا کارآمد استعمال کیا۔ جمشید کو بینکنگ کمیشن، ایکسائز کمیشن، کوآپریشن کے کمیشن اور رائل کمیشن آف ایگریکلچر کا رکن بنایا گیا، اور جمشید نے ان میں سے ہر موضوع پر ایک تجربہ کار عملی کارکن کے طور پر اپنے خیالات کا عمدگی سے اظہار کیا۔

جمشید نے صوبہ سندھ کی زندگی کو اس قدر گہرائی سے متاثر کیا کہ فطری طور پر ان کا نام گھر گھر کی

نام پر آ گیا۔ خاص طور پر غریب کسان طبقے کے لوگوں میں انھیں بہت مقبولیت حاصل ہوئی کیوں کہ
جمشید نے سندھ میں کوآپریٹو تحریک کا آغاز کیا اور کوآپریٹو بینکنگ کی بنیاد ڈالی۔ جمشید کی شروع کی
ہوئی ان تحریکوں سے ناخواندہ اور بے شعور کسانوں کو بے رحم بنیوں اور مہاجنوں اور چالاک زمینداروں کے
مقابلے میں خاصی تقویت حاصل ہوئی۔ صوبے بھر میں پھیلے ہوئے کسانوں تک جمشید کا نام ایک دردمند
مسیحا کے طور پر پہنچتا اور وہ انھیں اپنے تشکر کے پیغامات بھیجا کرتے۔ اس عوامی مقبولیت کا اظہار سندھ
لیجسلیٹو اسمبلی کے پہلے انتخابات کے موقعے پر ہوا۔ جمشید کے دوست انتخاب لڑنے کے لیے انھیں آمادہ
کرنے کی سخت کوشش کرتے رہے لیکن جمشید نے ان کوششوں کا کچھ اثر نہ لیا۔ وہ اپنے مزاج کے اعتبار
سے گوشہ گیر تھے۔ انھیں کام کرنے کا یقیناً شوق تھا لیکن شہرت کا خیال ان کے لیے ناگوار تھا۔ انتخاب
لڑنے کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ اپنی خدمات گنواتے اور اس کے بدلے میں ووٹ کے انعام کا تقاضا کرتے، اور
یہ بات ان کے مزاج اور رویے کے بالکل منافی تھی۔ جب نامزدگی کے کاغذات جمع کرانے کی آخری تاریخ
آئی تو جمشید کے دوست وفد کی صورت میں ان کے گھر پہنچے کہ انھیں آمادہ کرنے کی آخری کوشش کر
سکیں۔ جمشید آخرکار رضامند ہو گئے لیکن اس شرط پر کہ ان کے کارکن ان کی ہدایات پر پوری ایمان داری
کے ساتھ عمل کریں گے۔ ہدایات یہ تھیں کہ ان کی طرف سے ووٹ کی استدعا نہیں کی جائے گی، انتخابی
اخراجات کا حساب کتاب بالکل دیانت داری کے ساتھ مرتب کیا جائے گا، یہ اخراجات مقرر کردہ حد سے
بڑھ کر تجاوز نہیں کریں گے اور یہ کہ خود ان سے انتخابی مہم کے لیے دو گھنٹے سے زیادہ وقت کا مطالبہ نہیں
کیا جائے گا۔ ان کی باتیں مان لی گئیں اور پولنگ سے پہلے کے دو ہفتوں میں جمشید نے اسی کار میں پورے
ضلع دادو کا دورہ کر کے اپنے ووٹروں سے ملاقاتیں کیں۔ دور دور کے علاقوں سے ہزاروں لوگ مقررہ جگہ پر
اس عظیم انسان کے درشن کے لیے پہنچنے لگے جو کسی غرض کے بغیر ان کی حالت میں بہتری لانے کے
لیے محنت کرتا رہا تھا۔ آنے والوں میں بوڑھے مرد اور عورتیں، غریب اور امیر، ہندو اور مسلمان، کسان
اور تاجر سب شامل تھے۔ عقیدت سے مغلوب ہو کر ہر شخص ان کے پاؤں چھونے کی کوشش کرتا ـــ جو
جمشید ہرگز نہ کرنے دیتے ـــ یا ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیتا۔ بڑی عمر کے لوگ انھیں سینے سے لگا کر رو
پڑتے۔ یہ کوئی انتخابی مہم نہیں تھی، ان میں سے ہر جلسہ کسی مذہبی تقریب کی صورت اختیار کر لیتا۔
انتخابات اور ووٹ کا نام تک نہ آتا۔ جمشید ان سے ان کی مشکلات دریافت کرتے تاکہ ان کے حل کے
لیے کچھ کر سکیں، خواہ انتخابات ہوں یا نہ ہوں۔ لیکن جمشید کی بات لوگوں کی بے پایاں محبت اور خلوص
کا اندازہ انتخابات کے نتیجے سے بخوبی ہو گیا۔ اگرچہ جمشید کے مخالف امیدواروں نے پارسی ہندو اختلاف
تک کو بروئے کار لانے کی کوشش کی تھی، جمشید کو ملنے والے ووٹ ان کے چاروں مخالف امیدواروں کو
حاصل ہونے والے ووٹوں کی مجموعی تعداد سے بھی زیادہ تھے۔ جبکہ جمشید نے اپنے کسی ووٹر کو ٹرانسپورٹ
فراہم نہ کی تھی؛ ان کے بہت سے ووٹروں کو میلوں پیدل چل کر قریب ترین پولنگ بوتھ تک پہنچنا پڑا۔
جمشید کی شخصیت اپنے وجود کی تمام سطحوں پر بے پناہ توانائی سے مالا مال تھی۔ اپنی بیماری

باوجود جمشید کی کام کرنے کی صلاحیت حیران کن تھی۔ ان کا دل گرمی اور محبت سے اور دماغ جستجو اور ذہانت سے لبریز تھا۔ ان کا مطالعہ نہایت وسیع تھا، اپنے ساتھی انسانوں کی زندگی اور فلاح سے تعلق رکھنے والا کوئی بھی موضوع ان کے لیے اجنبی نہ تھا۔ ہندوستانی اور غیر ملکی کتابیں خریدنے اور ہر قسم کے رسالے منگوانے میں پیسا خرچ کرنا ان کی واحد عیاشی تھی۔ زراعت، بینکاری، کوآپریشن، معاشیات، تعلیم، انشورنس، صحت، طب، میونسپل معاملات، مذہبیات، جسمانی کلچر، جیلوں کی اصلاحات، نفسیات، فلسفہ، سیاست، سائنس، جنسیات، عمرانیات، سماجی مسائل، شہری منصوبہ بندی اور بہت سے دوسرے موضوعات کی کتابیں ان کی ذاتی لائبریری میں موجود تھیں۔ لیکن جمشید نے اپنے مطالعے کو بے سمت اور بے مقصد کبھی نہ ہونے دیا۔ ان کے ذہن میں حقائق اور معلومات ان کی اپنی ترتیب کے مطابق جمع ہوتی رہتیں اور ان کا وجدان ان حقائق اور معلومات کو متواتر الٹتا پلٹتا رہتا، اس طرح انھیں کتابوں میں بکھرے ہوئے گوناگوں حقائق اور روزمرہ زندگی کے تجربات سے دانش اخذ کرنا آتا تھا۔ وہ محض لطف لینے یا مجرد جستجو کی تسکین کے لیے نہ پڑھتے تھے بلکہ ان کا اصل مقصد خدمت کی سرگرمیوں کو مزید پُراثر بنانا ہوتا تھا۔ ان کی لائبریری میں کتابیں اور رسالے بڑی تیزی سے جمع ہوتے رہتے اور وہ انھیں باقاعدگی سے کراچی کی مختلف لائبریریوں میں بھیجتے رہتے۔ کتابوں رسالوں کے بنڈل کے بنڈل روانہ کیے جاتے۔ جب ان کا کوئی واقف یا اجنبی شخص اپنا کوئی ذاتی یا اجتماعی مسئلہ لے کر ان کے پاس آتا تو وہ پوری توجہ سے اس کی بات سنتے، اسے مناسب مشورہ دیتے اور ساتھ ہی ایک آدھ کتاب بھی جسے پڑھ کر اسے اپنے مسئلے کے حل کی تلاش میں مدد مل سکے۔

مذہبی معاملات میں جمشید کا طرزِ عمل تھیوسوفیکل سوسائٹی کے رکن کی حیثیت سے وسیع النظر، لبرل خیالات پر مبنی تھا۔ اپنی روزمرہ کی نجی زندگی، اجتماعی تقریبات اور سماجی برتاؤ میں وہ اپنے زرتشتی عقائد پر کاربند تھے، لیکن ان کے دل میں دوسرے تمام مذہبوں اور ان کی مقدس ہستیوں کے لیے بھی اتنا ہی احترام موجود تھا۔ وہ کراچی کے کیتھولک چرچ کے سالانہ اجتماع میں شریک ہوتے، سکھ تہواروں کے موقعے پر گردوارے جاتے، رمضان میں مسلمانوں کے ساتھ روزے رکھتے اور ہندوؤں کی تقریبات میں شامل رہتے۔ یوں لگتا تھا کہ کسی مذہبی برادری کی تقریب اس وقت تک مکمل نہ سمجھی جاتی تھی جب تک جمشید اس میں شریک نہ ہوں۔

جمشید کے کردار کا سب سے مضبوط پہلو ان کی مراقبے کی عادت تھی۔ ان کے ہر دن کا آغاز اور اختتام طویل عبادت اور مراقبے پر ہوتا۔ مجھے محسوس ہوتا کہ انھیں اپنے وجود سے باہر آنے اور روزمرہ کی خارجی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے لیے خاصی کوشش کرنی پڑتی ہے۔ "God bless you" کی دعا ان کے مزاج کا مستقل حصہ تھی، لیکن یہ دعا خواہ بلند آواز میں دی جاتی یا دل ہی دل میں، یہ کوئی رسمی میکانیکی عمل نہ ہوتا بلکہ اس میں خلوص اور نیک نیتی شامل ہوتی تھی۔ ان کے کردار کی اندرونی روحانی کیمیا نے ہر انسانی کمزوری — خودپسندی، تندخوئی، تلخ کلامی — پر غالب آکر اسے ان کی شخصیت کی نرم خوئی میں

ڈھال لیا تھا۔ جمشید کا سلوک دکھی لوگوں کے زخموں پر مرہم کے نرم، سکون بخش پھاہے کا سا کام کرتا تھا۔ اپنے والد خان بہادر نسروانجی آر مہتا کی وفات کے بعد جمشید نے اپنا روایتی نام جمشید این آر مہتا سے بدل کر کے نسروانجی کر لیا تھا تاکہ ان کے والد کی یاد زندہ رہے۔

جمشید کی پاکیزہ زندگی پر کسی قسم کا کوئی دھبا نہ تھا۔ ان کی ذات میں سے ایک مقدس زندگی کی خوشبو پھوٹتی تھی۔ سیکڑوں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں دوستانہ احترام کے ساتھ ان کی گردن میں باہیں ڈال دینے کے لیے دوڑ پڑتے تھے۔ نامور شخصیات میں ڈاکٹر بیسنٹ، گاندھی جی، اوروبندو گھوش، رابندر ناتھ ٹیگور اور سروجنی نائیڈو کے دلوں میں جمشید کی شخصیت کے لیے حقیقی محبت اور احترام موجود تھا۔

یہ تھے جمشید نسروانجی جنھیں میں نے جانا اور انسانوں کے درمیان ایک دیوتا پایا۔

حاتم علوی

انگریزی سے ترجمہ اور تلخیص اجمل کمال

"دی پریزیڈنٹ"

کراچی میں جمشید نسروانجی کے ہم شہر باشندے انھیں ۱۹۲۱ سے ۱۹۳۳ تک کے بارہ سال کے عرصے میں اسی نام سے جانتے اور مخاطب کرتے تھے۔ یہ عرصہ اُن کی زندگی کا سب سے بارآور عرصہ تھا جس کے لیے قدرت انھیں نوجوانی ہی سے تیار کرتی رہی تھی۔

۱۹۲۰ کے میونسپل انتخابات میں جمشید این آر مہتا پہلی بار میونسپل کاؤنسلر منتخب ہوئے اور مرحوم سیٹھ غلام علی چھاگلا کراچی میونسپلٹی کے صدر بنے۔ چھاگلا نہایت ذی علم لیکن بے حد زود حس شخص تھے۔ انھوں نے ایک رکن کی طرف سے عدمِ اعتماد کی قرارداد پیش ہونے پر استعفیٰ دے دیا اور اپنے ساتھی ارکان کے پرزور اصرار کے باوجود استعفیٰ واپس لینے پر رضامند نہ ہوئے۔ یوں میونسپلٹی کے صدر کا عہدہ خالی ہو گیا اور کسی دوسری موزوں شخصیت کی تلاش شروع ہوئی۔ اُس وقت تک جمشید خاموشی کے ساتھ سماجی اور شہری شعبوں میں کام کرتے رہے تھے، لیکن تمام اہم لوگ ان کی خدمات سے واقف تھے۔ سب لوگوں کی نظریں صدر کے عہدے کے لیے انھیں پر آ کر رکیں۔ جمشید کو اتنی کم عمری میں اتنی بڑی ذمے داری قبول کرنے میں تامل تھا اور انھوں نے اپنے سے سینیئر کئی افراد کے نام اس عہدے کے لیے پیش کیے۔ لیکن تمام ارکان کی متفقہ رائے سے جمشید کو کراچی میونسپلٹی کا صدر چُن لیا گیا۔ ہندوستان کے ایک گوشے میں ہونے والا یہ چھوٹا سا ضمنی انتخاب آگے چل کر ہندوستان کی لوکل سیلف گورنمنٹ کی تاریخ میں ایک نمایاں باب کی ابتدا ثابت ہوا۔

تمھارے ہاتھ میں جو بھی کام آئے اُسے انجام دینے میں اپنے دل، اپنے دماغ اور اپنی روح کی تمام توانائیاں صرف کرو۔ جمشید نے بائبل کی یہ ہدایت سنی ہو یا نہ سنی ہو، لیکن انھوں نے عملی طور پر کراچی کو ایک بہتر اور بڑا شہر بنانے میں اسی پر عمل کیا۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا، قدرت انھیں اس کام کے لیے شروع سے تیار کر رہی تھی۔ وہ جوان اور صحت مند تھے، کنوارے تھے (اور عمر بھر کنوارے رہے)، مالی طور پر خوش حال تھے، ان کے پاس رہنے کے لیے ایک عمدہ گھر اور کام کرنے کے لیے ایک بڑھیا دفتر تھا، اور ان دونوں جگہوں پر ان کے وفادار مددگاروں اور دوستوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ جمشید کے کاموں

میں ہاتھ بٹانے کا شوق ان میں اس وجہ سے بھی بہت فراواں تھا کہ جمشید نے زندگی میں کبھی کسی سے اپنے لیے کچھ نہیں مانگا۔ وہ صرف ان بے شمار کاموں کے لیے لوگوں سے تعاون اور مدد طلب کرتے جن کا تعلق لوگوں کی بہبود اور شہر کی خدمت سے ہوتا۔

جب میں ۱۹۲۷ میں میونسپلٹی کا رکن منتخب ہوا اور پہلے ہی سال ہیمیننگ کمیٹی کا رکن مقرر کیا گیا تو میں نے جمشید کو میونسپلٹی کے کام میں سرتاپا غرق اور شہر کے معاملات کی ذرا ذرا سی تفصیل سے پوری طرح آگاہ پایا۔ اُس وقت تک وہ میونسپل انتظام کے موضوع پر ایک چھوٹی سی کتاب لکھ چکے تھے جس کا میں نے بڑے شوق اور توجہ سے مطالعہ کیا۔ ایک بار میں نے جمشید سے شہر کے معاملات سے ان کی مکمل واقفیت کا راز دریافت کیا۔ ان کا جواب تھا

دیکھو حاتم، مجھ میں کوئی غیر معمولی اہلیت نہیں ہے، میں عالم تو کیا، کوئی بہت اچھا طالب علم بھی نہیں ہوں، نہ قدرت نے مجھے کسی خاص صلاحیت سے نوازا ہے۔ مگر مجھ میں خود کو کارآمد بنانے کی ایک شدید لگن ہے۔ ہر صبح جب میں سو کر اٹھتا ہوں تو خدا سے اس کے سوا کچھ نہیں مانگتا کہ میں اس کی جانب سے لوگوں کی خدمت کا ایک زیادہ بہتر وسیلہ بن جاؤں۔ اور رات کو سونے سے پہلے میں اُسی چھوٹے سے معبد پر، جسے تم نے میرے گھر میں دیکھا ہے، ایک بار پھر خدا کے سامنے جھک کر ان تمام کوتاہیوں اور غلطیوں کی معافی مانگتا ہوں جو اُس دن مجھ سے سرزد ہوئی ہوں، اور دعا کرتا ہوں کہ میری نیند کے دوران ہی میرے جسم، دماغ اور روح میں سے وہ خامیاں دور ہو جائیں تاکہ میں ایسی غلطیوں کو دُہرانے سے باز رہ سکوں اور زیادہ جذبے اور لگن کے ساتھ اپنے شہر کی خدمت کر سکوں۔

جب خدا ساری دعائیں قبول کرتا ہے تو ایسی بے غرض دعا کی قبولیت میں کیا چیز مانع ہو سکتی تھی؟

کراچی میونسپلٹی کی صدارت کے اس بارہ سال کے عرصے میں جمشید نے، عمر خیام کے الفاظ میں، شہر کو یوں اپنے ہاتھ میں لیا جیسے کوزہ گر مٹی کو برتتا ہے تاکہ تیار ہونے والی شے دل کی آرزو سے قریب تر آ سکے۔ انھوں نے میونسپل معاملات سے متعلق اور شہر کی ترقی پر اثر انداز ہونے والے ہر مسئلے پر ایک ایک کر کے مکمل توجہ دی اور اپنی ذہنی توانائیوں اور ماہرین کی تنقید اور مشوروں کی روشنی میں حل کیا۔ سب سے پہلے انھوں نے شہر کے بڑے بڑے معاملات کے بارے میں اپنی متوازی ترجیحات متعین کیں۔ متوازی ترجیحات کی اصطلاح میں بظاہر تضاد معلوم ہوتا ہے لیکن یہ یاد رہے کہ یہاں ذکر ایک ایسے میونسپل سربراہ کا ہے جس کا ہمسر برصغیر ہندوستان نے کبھی نہیں دیکھا۔

نکاس

۱۹۲۲ میں کراچی کے کئی علاقے ایسے تھے (مثلاً گارڈن کوارٹر اور آرٹلری میدان) جہاں زیرِ زمین نکاس کا کوئی بندوبست نہ تھا۔ آرٹلری میدان، جس پر آج سندھ چیف کورٹ اور اسمبلی کی عمارتیں اور

سنٹرل سیکرٹیریٹ کی بیرکیں واقع ہیں، اُس وقت تک میونسپلٹی کو منتقل نہیں کیا گیا تھا۔ وہاں کراچی کا پرانا قلعہ قائم تھا اور ظاہر ہے کہ میونسپل کمیٹی کو فوجی کیمپ کے اس علاقے پر کوئی اختیار حاصل نہ تھا۔ کارڈن کوارٹر بھی شہر کے نکاس کے نظام سے منسلک نہیں ہوا تھا، اور جن میں کاؤنسلر سا تب تک ایک بیل گاڑی گندگی اٹھانے کے لیے آیا کرتی تھی۔ یہ صورت حال ایک جدید شہر سے مطابقت نہ رکھتی تھی۔ جمشید نے اس پر فوری توجہ دی۔ اور اس وقت کراچی پاکستان کا واحد شہر ہے جہاں زیرِزمیں نکاس کا مکمل نظام موجود ہے۔

جب آرٹلری میدان کے علاقے میں پانی کی فراہمی اور نکاس کی لائنیں پڑ گئیں تو چیف کورٹ کی عمارت کو بھی ان سے منسلک کر دیا گیا۔ اُن دنوں عمارت کی لاگت کا ۲ فیصد بطور ٹیکس میونسپلٹی کو ملتا تھا۔ چوں کہ حکومت نے چیف کورٹ کی تعمیر پر تقریباً تیس لاکھ روپے خرچ کیے تھے، اسے ایک عمارت کا اتنا بھاری بل ادا کرنے میں تامل تھا۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اُس وقت کی حکومت مکمل طور پر بیوروکریسی کے ہاتھ میں تھی اور اس کا خیال تھا کہ وہ میونسپلٹی کے اس بل کو نظر انداز کرنے کی طاقت رکھتی ہے۔ بہت دن اس موضوع پر مراسلت ہوتی رہی۔ آخر کار جمشید نے بل ادا نہ ہونے کی صورت میں چیف کورٹ کی لائنیں کاٹ دینے کی دھمکی دے دی۔ حکومتِ بمبئی کا ایک نمائندہ پونا سے دوڑا دوڑا آیا اور معاملے کا تصفیہ میونسپلٹی کی مرضی کے مطابق ہوا۔

پانی کی فراہمی

کراچی میں پانی کی فراہمی کا مسئلہ ہمیشہ سے نازک رہا ہے کیوں کہ اس معاملے میں شہر کا تمام تر انحصار ڈملوٹی کے کنووں پر تھا اور بارش کی کمی کی صورت میں (جو اکثر پیش آجاتی تھی) یہ کنویں تقریباً خشک ہو جایا کرتے تھے۔ اس بات میں قطعی مبالغہ نہیں کہ مشکل ہی سے کوئی دن جاتا ہو گا جب جمشید کو اس مسئلے پر ذاتی توجہ نہ دینی پڑتی ہو۔ اسی توجہ کا نتیجہ تھا کہ گھر کا نلکا کھولنے پر پانی بہنے لگتا تھا، ورنہ اُس زمانے میں لوگ نلکا کھولنے پر پانی کی دھار کے بجائے ہوا کی سنسناہٹ سننے کے زیادہ عادی تھے۔

شہر کو پانی کی مناسب فراہمی کا کوئی مستقل تسلی بخش انتظام جمشید کی صدارت کے زمانے میں نہ ہو سکا۔ سب سے بڑی رکاوٹ سرمائے کی کمی تھی۔ بمبئی پریزیڈنسی کے لوگ بمبئی کے مقابلے میں کراچی کی بڑھتی ہوئی طاقت سے حسد کرنے لگے تھے اور بمبئی کے کچھ نمائندے حکومت میں خاصا اثر ورسوخ رکھتے تھے، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ حکومت کراچی کے باشندوں کو پیاسا مرنے سے بچانے پر تو آمادہ تھی لیکن اس پھیلتے ہوئے شہر کے لیے وافر پانی کی فراہمی کی کوئی بڑی اسکیم شروع کرنے کو تیار نہ تھی۔

جب سندھ کو بمبئی سے الگ کیا گیا تو جمشید سندھ لیجسلیٹو اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور میونسپلٹی کے رکن نہ رہے۔ لیکن اس کی پروا نہ کرتے ہوئے انھوں نے کراچی میں پانی کی فراہمی کا مسئلہ حکومت سندھ کے سامنے اٹھایا۔ کابینہ کے تمام ارکان جمشید کا حد درجہ احترام کرتے تھے اور ان کے ساتھ

کام سے واقف تھے۔ مگر انھوں نے اس مسئلے پر الگ سے غور کرنے کے بجائے پورے سندھ میں لوکل اور منٹ کے موضوع پر ایک انکوائری کمیٹی قائم کر کے جمشید سے اس کا چیئرمین بننے کی استدعا کی اور مجھے اس کا رکن بنایا۔ ہم نے سندھ کے چپے چپے کا دورہ کر کے حقائق اور اعدادوشمار جمع کیے اور تفصیلی رپورٹ کی صورت میں اپنی سفارشات پیش کیں۔ اسی دوران، ستمبر ۱۹۳۹ میں، دوسری جنگ عظیم شروع ہو گئی اور سندھ میں تعمیر ہونے تمام کام پیش منظر سے ہٹ گئے۔ امریکیوں کے جنگ میں شامل ہونے کے ساتھ ہی ڈرگ روڈ پر امریکی فوج کا اڈا قائم ہوا اور کراچی میں پانی کی فراہمی کے مسئلے کو اب ایک نئے زاویے سے دیکھا جانے لگا۔ چوں کہ معاملہ اب تعمیر کا نہیں بلکہ تحریب (جنگ) کا تھا، اس لیے سرمایے کی کوئی دشواری پیش نہ آئی اور ہالیجی واٹر ورکس کی اسکیم نے، جو جنگ کے دوران ہی بنائی اور مکمل کی گئی، کراچی میں پانی کی کمی کے مسئلے کو خاصے معقول طور پر حل کر دیا۔

سڑکیں

جمشید کے صدارت سنبھالنے وقت کراچی میں ہمہ سڑکوں کی کل لمبائی ۱۴ میل تھی مگر ان سڑکوں پر کولتار کی تہہ نہیں تھی۔ ان کی سبک دوشی کے وقت تک کراچی میں کل ۷۲ میل کی سڑکیں موجود تھیں اور ان میں بیش تر کی سطح کولتار سے چمک رہی تھی۔ جمشید نے سڑکوں کی تعمیر کا دس سالہ منصوبہ تیار کیا اور ہر سال کے بجٹ میں سڑکیں اور فٹ پاتھ بنانے کی رقم مخصوص کی۔ سڑکیں پختہ کرنے کے پروگرام میں نہ صرف کچی سڑکوں پر کولتار کی تہہ بچھانے کا کام شامل تھا بلکہ یہ خیال بھی رکھا گیا تھا کہ ہر چار سال بعد سڑک کے ہر میل پر نئی تہہ بچھائی جایا کرے۔ تقسیم ہند کے وقت تک کراچی کی سڑکیں بالکل ہموار ہوتی تھیں اور گڑھوں اور کٹے پھٹے کناروں کا نام تک نہ تھا۔ آج ان سڑکوں کی جو حالت ہے وہ ہم سب کے سامنے ہے۔

عوامی پارک

۱۹۲۲ میں کراچی میں صرف دو عوامی پارک تھے ایک برنس گارڈن اور دوسرا گورنمنٹ گارڈن جس میں چڑیا گھر بھی واقع تھا۔ جمشید نے ایک اسکیم تیار کی کہ کراچی کے ہر کوارٹر میں ایک ایک پارک بنایا جائے۔ اس اسکیم پر سختی سے عمل کیا گیا، جہاں چہ جب جمشید رٹائر ہوئے تو کراچی میں بارہ پارک تھے جن میں بیش تر میں ایک گوشہ بچوں کے لیے مخصوص تھا جہاں ان کے کھیل، تفریح اور ورزش کے لیے بہترین سامان مہیا تھا۔ بعد میں اس سامان کی مرمت تک نہ کرائی گئی۔ شہر کا مرکزی پارک گورنمنٹ گارڈن تھا جس کا نام سول نافرمانی کی تحریک کے دوران بدل کر مہاتما گاندھی کے نام پر رکھ دیا گیا۔ یہ پارک ۱۸۶۰ میں لگایا گیا تھا۔ تب سے اس کا رقبہ وہی کا وہی ہے۔ کراچی کے بڑھتے ہوئے شہر کے لحاظ سے ضروری تھا کہ اس کی حدیں وسیع کی جائیں اور خیال یہ تھا کہ اس کے شمالی پھاٹک کے سامنے والے علاقے

کو بھی اس میں شامل کر لیا جائے۔ لیکن اس خالی جگہ پر اب حکومت نے اپنے ملازمین کے لیے مکانات بنا دیے ہیں اور یوں اب اس پارک کے وسیع ہونے کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔

میونسپل ٹیکس

جمشید کی صدارت کے زمانے میں ہاؤس، ڈرینیج اور واٹر ٹیکس ملا کر ۱۴ فیصد بنتے تھے۔ آج یہ شرح دگنی سے زیادہ ہو چکی ہے جب کہ اس کے عوض فراہم کی جانے والی سہولتیں نصف سے بھی کم رہ گئی ہیں۔ سیدھے سے حساب سے اب شہریوں کو ہر سہولت کی چار گنا سے زائد قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ واضح رہے کہ اس کا مہنگائی سے کوئی تعلق نہیں کیوں کہ ہم فیصد شرح کی بات کر رہے ہیں۔ نقصان کا تخمینہ آسانی سے لگایا جاسکتا ہے۔

جمشید کوارٹر

جمشید نے کوآپریٹو ہاؤسنگ کی تحریک کی بنیاد ڈالی اور اسے اس سطح تک پہنچا دیا جہاں تک اُس وقت ہندوستان کا کوئی اور شہر نہ پہنچا تھا۔ ۱۹۲۲ میں وہ پورا علاقہ جو اب جمشید کوارٹر کہلاتا ہے، بالکل ویران اور کسی ڈویلپمنٹ کے بغیر تھا۔ کراچی میں مال دار اور خوش حال لوگ تعداد میں کم تھے اور نہ صرف سب کے سب کلفٹن، فریئر اور گارڈن کوارٹر میں سما چکے تھے بلکہ وہاں بہت سے پلاٹ خالی پڑے تھے۔ اس کے برعکس اونچے اور نچلے درمیانہ طبقوں کے لوگ گنجان بستیوں کے چھوٹے چھوٹے مکانوں میں بھرے ہوئے تھے۔ اس گنجانی اور گھٹن کو کم کرنے اور سفید پوش لوگوں کو رہنے کی معقول جگہ فراہم کرنے کا کوئی نہ کوئی طریقہ نکالنا ضروری تھا۔ اس طبقے کے لوگوں کے لیے زمین خریدنا اور مکان بنانا ممکن نہ ہوتا تھا۔ جمشید نے فیصلہ کیا کہ زمین کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹیوں کو مفت فراہم کی جائے اور مکان بنانے کے لیے کوآپریٹو بینکوں کی طرف سے قرضے دیے جائیں۔ اُس زمانے میں کم آمدنی والے لوگوں کی حمایت میں اس حد تک جانے کا مطلب کُفر جا قرار پاتا تھا اور جمشید کو دولت مند زمینداروں اور تاجروں کی جانب سے اپنے اس منصوبے کی سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ میونسپل کاؤنسلروں کی اکثریت اگرچہ خود درمیانہ طبقے سے تعلق رکھتی تھی لیکن اپنے دولت مند سرپرستوں کے اس قدر اثر میں تھی کہ اس نے بھی اس اسکیم کی حمایت نہ کی۔ اس شدید مخالفت کے باوجود جمشید نے میونسپل کمیٹی اور حکومت سے اپنی اسکیم کی منظوری حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی۔

کراچی میں ہاؤس بلڈنگ کا پروگرام شروع ہوا اور چند ہی برسوں میں متعدد کوآپریٹو سوسائٹیوں نے اس علاقے میں اپنے ارکان کے لیے چھوٹے چھوٹے خوب صورت مکان تیار کر لیے جن میں سے ۹۵ فیصد اونچے اور نچلے درمیانہ طبقے کے لوگوں کی ملکیت تھے۔ اس بڑے کام کے اعتراف کے طور پر کراچی میونسپلٹی نے اس محلے کا نام جمشید کوارٹر رکھا۔

پرائمری تعلیم

جمشید کئی برس تک میونسپل اسکول بورڈ کے چیئرمین رہے۔ اُس وقت شہر کے مسلمان باشندوں کی اکثریت مزدور طبقے سے تعلق رکھتی تھی اور زیادہ تر مسلمان لیاری کوارٹر میں رہتے تھے۔ باقی شہر کی غیر مسلم آبادی کے برعکس جہاں تقریباً سب لوگوں کو کم از کم پرائمری تعلیم کی سہولت میسر تھی، لیاری کوارٹر میں تعلیم نہ ہونے کے برابر تھی۔ جمشید کے بعد میرے بڑے بھائی سیٹھ طیب علی بورڈ کے چیئرمین بنے اور انھوں نے محسوس کیا کہ لیاری میں لازمی پرائمری تعلیم کا انتظام کیے بغیر وہاں کی مسلمان آبادی کو فائدہ پہنچانا ممکن نہیں۔ سخت محنت اور لگن اور جمشید کی بھرپور عملی مدد، کے ساتھ وہ لیاری کوارٹر میں لازمی پرائمری تعلیم رائج کرنے میں کامیاب ہوئے۔

میونسپل بلڈنگ

جمشید کے صدر بننے کے وقت میونسپلٹی کے دفاتر میکلوڈ روڈ پر سٹی اسٹیشن کے پاس کرائے کی عمارتوں میں واقع تھے۔ جمشید کی پھولتی ہوئی سی شہری روح کا تقاضا تھا کہ اسے ایک ایسا ہی خوب صورت اور مستحکم مسکن بھی فراہم ہو۔ جمشید ہر شہری منصوبے کو فوراً ہی بنیاد پر عمل میں لانے کے قائل تھے چناں چہ انھوں نے فوراً میونسپل بلڈنگ کی تعمیر کے لیے پندرہ لاکھ کا قرض جمع کیا۔ آج تو کراچی کے بیسیوں شہری اس رقم کے چیک پر کسی خاص زحمت کے بغیر دستخط کرنے کے عادی ہیں، لیکن اُس وقت کے پندرہ لاکھ میں، آپ یقین کریں یا نہ کریں، وہ عظیم الشان عمارت بن کر تیار ہوگئی جس میں آج میونسپل کارپوریشن کے دفاتر واقع ہیں۔ جمشید کی صدارت کے زمانے میں یہ عمارت نہ صرف شہر کے میونسپل انتظام کا محور تھی بلکہ بہت سی شہری اور ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز بھی تھی۔

میٹرنٹی ہوم

جمشید کو اپنی والدہ سے بہت عقیدت تھی۔ اس عقیدت کا اظہار کراچی کی تمام ماؤں کی خدمت کی شکل میں ہوا۔ انھوں نے جہانگیر باغ کے قریب اپنی والدہ کی یاد میں ایک میٹرنٹی ہوم تعمیر کرایا۔ انھوں نے ایک اسکیم تیار کی کہ کراچی کے تمام علاقوں میں میٹرنٹی ہوم قائم کیے جائیں۔ اس مقصد کے لیے جمشید ہمیشہ یہ جاننے کی تاک میں رہتے کہ اس سال شہر کے کس شخص نے بہت دولت کمائی ہے اور پھر اُس شخص سے رابطہ قائم کرکے اسے ایک میٹرنٹی ہوم تعمیر کرانے پر قائل کرتے۔ دولت مند لوگوں کو اپنی دولت کے ایک حصے سے جدا ہونے پر راضی کرنا کوئی آسان کام نہ تھا، لیکن جمشید نے اس کے لیے باقاعدہ ایک تکنیک وضع کی تھی اور کوئی مال دار شخص ان کے جال میں آنے سے بچ نہ سکتا تھا۔ ایک بار کسی نے اُنھیں اطلاع دی کہ موت کا فرشتہ ایک مال دار اور بے اولاد بوہرہ تاجر پر بس جھپٹنے ہی کو ہے جس کے بہت سارے رشتے دار اس کے مرتے ہی اس کی جائیداد پر دعوے کردیں گے۔ جمشید نے کہا

کہ وہ کوشش کریں گے، اور میں نے انہیں متنبہ کیا کہ یہ صدر اور فرشتے کے درمیان ایک دوڑ ہوگی۔ بہرحال اس دوڑ میں صدر ہی کو کامیابی ہوئی جس کا نتیجہ آج عید گاہ میدان پر واقع سیٹھ اسمٰعیل امیجی ماتعالی میٹرنٹی ہوم کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔

اوپر پیش کی گئی فہرست میونسپلٹی کے صدر کے طور پر جمشید کی تمام سرگرمیوں کا احاطہ نہیں کرتی۔ ان کے جتنے کاموں کا کوئی مادی ریکارڈ موجود نہیں ہے وہ ان سے کہیں زیادہ ہیں۔ انہیں احساس تھا کہ تربیت یافتہ شہری شعور شہر کی ترقی کے لیے وہی حیثیت رکھتا ہے جو جسم کے لیے روح کی ہے۔ لہذا انہوں نے کراچی کے شہریوں میں ان کے شہری حقوق اور ذمے داریوں کا احساس بیدار کرنے کے لیے بہت کام کیا۔ ان کی صدارت کے زمانے میں مختلف سماجی اور سیاسی تنظیموں کی طرف سے ہزاروں لیکچروں کا بندوبست کیا گیا۔ صدارت سنبھالتے ہی جمشید نے نوجوان مردوں اور عورتوں کا ایک گروپ تشکیل دیا، جس میں میں بھی شامل تھا اور جو ہفتے میں ایک بار اُن کے دفتر میں جمع ہوتے تھے۔ وہ اس گروپ کو شہری معاملات کی تربیت دینے کے لیے خود اپنے ساتھ دورے پر لے جایا کرتے۔ کبھی وہ انہیں نکاس کے پمپنگ اسٹیشن پر لے جاتے اور اس شعبے کے اعلیٰ افسروں سے کہتے کہ وہ نکاس کے پورے نظام کا طریق کار ان نوجوانوں کو سمجھائیں۔ کبھی وہ ان نوجوانوں کو ڈملوٹی لے جا کر اچھی طرح سمجھاتے کہ شہر کو پانی کی فراہمی کا نظام کس طرح کام کرتا ہے۔ ان دوروں کا سلسلہ کوئی سال بھر جاری رہا۔ پھر انہوں نے ایک نیا گروپ تشکیل دیا اور اس کی اسی طرح تربیت شروع کر دی۔ ان گروپوں میں شامل کئی لوگ جب بعد میں میونسپل کاؤنسلر بنے تو اس تربیت کی بدولت انہیں اپنے شعبوں سے گہری واقفیت حاصل تھی جو کسی اور طرح حاصل نہ ہو سکتی تھی۔

جمشید کا معمول تھا کہ ہر صبح میونسپلٹی کے ایک یا زیادہ افسروں کو اپنے گھر پر طلب کرتے۔ وہ ان افسروں کو ساتھ لے کر معائنے پر نکلتے اور جن صورتوں میں موقعے پر ہی احکام جاری کرتے۔ ہر روز دو ایک گھنٹے جمشید کی مصروفیت ان گھروں کا دورہ کرنے کی ہوتی جہاں کوئی بیمار ہوتا۔ وہ بیمار کو تسلی دیتے، گھر والوں کو مشورے دیتے اور رحمت کی دعا کرتے۔ ان دوروں سے واپسی پر جمشید اپنی نوٹ بک میں ان لوگوں کے نام اور مکمل پتے درج کرتے جنہیں مدد درکار ہوتی۔ کیا کوئی شخص ٹائیفائیڈ میں مبتلا ہے اور اس کے گھر والے اس کے لیے پھل خریدنے سے قاصر ہیں؟ کیا کوئی حاملہ عورت ہے جسے ٹانک کی ضرورت ہے؟ کیا کوئی شخص کسی ذہنی بیماری کا شکار ہے کیوں کہ اس کے ذمے واجب الادا قرض ہے؟ وہ اپنی نوٹ بک میں ایسے تمام لوگوں کے ناموں کے آگے درکار رقم کا اندراج کرتے۔ ہر مہینے وہ ایسے تمام لوگوں کو لفافوں میں نقد رقم رکھ کر بھجواتے۔ لفافوں پر بھیجنے والے کا نام نہیں لکھا ہوتا تھا اور پانے والے کو کبھی معلوم نہ ہوتا کہ اسے اس بروقت مدد کے لیے کس کا ممنون ہونا چاہیے۔ سارے عطیات خدا کی طرف سے آتے ہیں، جمشید نسروانجی کا کہنا تھا۔

بورو (Boroughs) میونسپل ایکٹ، جس کے تحت کراچی میونسپلٹی قائم کی گئی تھی، میونسپلٹی کے تمام انتظامی اختیارات صدر کو سونپتا تھا۔ بمبئی کی لیجسلیٹو اسمبلی نے کراچی شہر کے لیے ایک خاص قانون منظور کیا جس کے تحت میونسپل کارپوریشن قائم کی گئی۔ یہ قانون ۱۹۳۴ کے آغاز میں نافذ کیا گیا اور اس کے تحت جمشید کراچی کے پہلے میئر بنے۔ لیکن میئر کا عہدہ زیادہ تر محض رسائشی اور تقریباتی تھا، اور کارپوریشن کے اجلاس کی صدارت کرنے کے سوا اسے کوئی انتظامی اختیارات حاصل نہ تھے۔ جمشید کو اس عہدے پر فائز ہو کر ایسا ہی لگا جیسے کوئی مچھلی پانی سے باہر محسوس کر سکتی ہے، چوں کہ وہ میونسپل کام میں ہمہ تن مصروف رہنے کے عادی تھے، اس لیے وہ اپنے اس عہدے سے مطمئن نہ ہوئے۔ انھوں نے کراچی میونسپل ایکٹ کے تحت ستمبر ۱۹۳۴ میں انتخابات کرائے گئے۔ جمشید نے اس بار میونسپل کاونسل کی نشست پر انتخاب نہیں لڑا، اور یوں اُن کا عظیم میونسپل کریئر اختتام کو پہنچا۔

**

حسن حبیب

انگریزی سے ترجمہ اور تلخیص: اجمل کمال

سماجی خدمت

اگرچہ جمشید جی نے زندگی کے کسی بھی شعبے کی ایسی خدمت کی ذمے داری کو بڑھ کر قبول کیا جس کا تعلق تعمیر اور ترقی سے ہو، لیکن سماجی خدمت کا شعبہ ان کے دل اور ذہن سے نہایت قربت رکھتا تھا اور وقت کی اہم ترین ضرورت بھی تھا۔ ان سے میرا تعلق، خصوصاً ان کی زندگی کے آخری چار برسوں میں، ایسے ہی کاموں کے سلسلے میں رہا اور ان لمحوں کی یاد میرے لیے ہمیشہ مسرت اور اعزاز کا قیمتی سرمایہ رہے گی جب مجھے بارہا ان سے ملاقات کا اور ان کی دلکش شخصیت اور اندرونی دانش سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا۔ ان سے پہلی بار ملنے کے بعد سے لے کر ان کی شخصیت میں قربانی اور خدمت اور فلاح کے عناصر سے میری واقفیت بڑھتی گئی جو ان کے ایک ایک احساس اور عمل سے ظاہر ہوتے تھے۔ ان کی ذات میں سماجی ضمیر ایسی زندہ حالت میں تھا کہ وہ ہر ایک کی تکلیف کو اپنی تکلیف اور ہر ایک کے زخم کو اپنا زخم محسوس کرتے تھے۔ جمشید جی میں وہ نادر عظمت تھی جس کا اظہار منکسر اور متکبر دونوں قسم کے لوگوں کے ساتھ ان کے عاجزانہ سلوک سے ہوتا تھا اور اس عمر کے ساتھ ساتھ ان کا دل آویز وقار ہمیشہ برقرار رہتا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ جب میں نے ان سے چند لوگوں کے ایک اجلاس میں شریک ہونے کی درخواست کی، جس میں سماجی بہبود کے ایک گروپ کے قیام پر غور کیا جانا تھا، تو وہ کتنے بے ساختہ اور منکسر انداز سے فوراً رضامند ہو گئے۔ یہ مارچ ۱۹۴۹ کی بات ہے۔ اجلاس کا نوٹس بھی بہت مختصر تھا، ہم لوگ اگلے ہی دن وائی ایم سی اے میں ملے اور یوں کراچی سوشل سروس گروپ قائم ہوا جس کی پہلی صدارت جمشید جی نے قبول کی۔ مجھے یقین تھا کہ اس گروپ کا آغاز تبھی کارآمد ہو سکتا ہے جب اسے جمشید جی کی رہنمائی میسر ہو۔ یہ گروپ اب خاصا مستحکم ہو چکا ہے اور ابھی کچھ عرصہ پہلے اسے سوشل سروس کوآرڈینیشن کاؤنسل قائم کرنے کا امتیاز حاصل ہوا ہے جس کے تحت کراچی کی ۶۰ فلاحی تنظیمیں مشترکہ عمل کے لیے اکٹھی ہو گئی ہیں۔ یہ بات اس لحاظ سے منفرد ہے کہ اس سے پہلے کراچی میں یا پاکستان بھر میں ایسی کوئی کوشش نہیں کی گئی اور اسے حاصل ہونے والی حوصلہ افزائی اور کامیابی ہماری توقعات سے کہیں

یاد دہ رہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جمشید جی کی روح اب بھی مصروفِ عمل ہے اور ہماری رہنمائی کر رہی ہے۔

مجھے اپنی بات میں اتنا اضافہ کرنا چاہیے کہ جمشید جی کو خراجِ عقیدت پیش کرنے اور ان کی محبوب یاد کو زندہ رکھنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ سماجی خدمت کے کاموں کی ضرورت کا احساس اور شعور ملک بھر میں بیدار کیا جائے۔ پاکستان کے کسی اور شہری نے اس احساس اور شعور کو بیدار کرنے میں جمشید جی سے بڑھ کر کام نہیں کیا۔

وہ پاکستان کے انتہائی سچے شہریوں میں شامل تھے۔ ان کا بیشتر وقت ایسے کاموں میں گزرتا جن کا تعلق پاکستان میں آنے والے مہاجروں اور دوسرے خستہ حال لوگوں کی حالت میں بہتری لانے سے تھا۔ یہاں تک کہ جس وقت وہ یوروپ اور امریکا کے سفر پر تھے ـــ اور یہ سفر تفریح کی غرض سے نہیں بلکہ ایک بیمار عزیز کے علاج کے سلسلے میں کیا گیا تھا ـــ ان کا دل اور دماغ مستقل کراچی کے مہاجروں کے ساتھ رہا جو ان کی متعدد فلاحی سرگرمیوں کا محور تھے۔ امریکا سے میرے نام ایک خط میں انھوں نے کراچی کی شدید بارش میں مقیم مہاجروں کی حالتِ زار کے بارے میں ایسا شدید ملال ظاہر کیا۔ انھوں نے خط میں اپنے اس ذاتی مسئلے کے بارے میں ایک لفظ تک نہ لکھا جس کے باعث وہ سفر پر نکلے تھے، بلکہ پورا خط کم لاگت کے مکانوں کی اسکیموں کی تفصیلات سے بھر دیا جن کا وہ بیرونِ ملک اس غرض سے مطالعہ کر رہے تھے کہ ان خطوط پر نے گھر مہاجروں کی رہائش کا کوئی بندوبست کیا جا سکے۔

جمشید جی کو، جہاں تک میں جانتا ہوں، کبھی برہمی کی حالت میں نہیں دیکھا گیا۔ وہ ایسے لمحات میں بھی ایسا ٹھہراؤ اور صبر برقرار رکھتے تھے جو کسی عام انسان کو مایوسی اور تلخی کے اظہار پر آمادہ کر دیں۔

**

اے کے بروہی

انگریزی سے ترجمہ اور تلخیص اجمل کمال

جمشید نسروانجی

میں جمشید نسروانجی کے وجود کی جوہری خصوصیت کو کس طرح بیان کروں؟ میرے خیال میں ان کی زندگی کی جوہری خصوصیت ان کا ہمیشہ مسرور اور پُرامید ہونا تھا۔ بدترین حالات میں بھی ان کا خدا پر ایمان کمزور نہ پڑتا تھا۔ وہ اس بات پر مکمل یقین رکھتے تھے کہ جن لوگوں کی زندگی خلقِ خدا کی خدمت میں بسر ہوتی ہو انھیں دل شکستہ ہونے کی قطعی ضرورت نہیں۔ جمشید زندگی کے کھیل میں اسی جذبے کے ساتھ شامل رہے۔

صرف ایک موقعے پر میں نے انھیں کسی قدر مایوس اور اُداس دیکھا، اور یہ موقع ان کی وفات سے تین ہفتے پہلے آیا۔ اُس وقت وہ مجھ سے مہاجروں کے مسئلے سے نمٹنے کے سلسلے میں حکومتِ پاکستان کے نامناسب طرزِ عمل کا ذکر کر رہے تھے۔ وہ ان بے شمار لوگوں کی امداد اور بحالی کے لیے کیے جانے والے اقدامات سے مطمئن نہیں تھے جو ایسے حالات کا شکار ہو کر پاکستان کی زمین پر آ پڑے تھے جن پر خود ان لوگوں کا کوئی بس نہ تھا۔ میں نے جمشید کو ایک ایسے شخص کے سے انداز میں بات کرتے دیکھا جس کی روح سخت اذیت کے عالم میں ہو۔ انھوں نے کہا

> بروہی! آنے والے چند درجن برسوں میں ہمیں نہ صرف محتاج، ناخواندہ اور سماج دشمن افراد کی ایک بڑی تعداد کا مسئلہ درپیش ہو گا بلکہ اس سے بھی بدتر حالات کا ہمارے سامنے بے شمار ذہنی اور نفسیاتی مریضوں کی دیکھ بھال کا مسئلہ بھی ہو گا۔ کیوں کہ اگر ہم احتیاط کے ساتھ اُس زندگی کا مطالعہ کریں جو مہاجر بچے گزارنے پر مجبور ہیں ـــــ کہ نہ ان کے بدن پر قمیص ہے اور نہ سر پر چھت جو انھیں تیز ہوا، دھوپ اور بارش سے بچا سکے ـــــ تو ہم یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ یہ نسل جو آج نشوونما کی ابتدائی منزل میں ہے، ہمیں مضبوط، صحت مند اور کارآمد شہری فراہم نہیں کر سکے گی بلکہ اس قسم کے افراد پیدا کرے گی جنھیں آنے والے سماجی نظام کا حصہ بنانا ایک ناممکن کام ہو گا۔

اور اس کے بعد، اپنے مخصوص پُرخلوص اور مستحکم تاثر کے ساتھ (جسے میں شایانِ شان طور پر بیان نہیں کر سکتا کیوں کہ وہ کسی غیر ارضی روشنی سے جگمگا رہا تھا) انھوں نے مزید کہا

ایسی بات نہیں کہ یہ مسئلہ حل نہ کیا جا سکتا ہو، اور نہ اس کے لیے کسی بہت بڑی رقم کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے کچھ درکار ہے تو بس ذرا تخلیقی اندازِ فکر اور ہمدردانہ فہم۔ میں نے ایک اسکیم تیار کی ہے جس کے ذریعے صرف ایک سال کے عرصے میں ان تمام مہاجروں کو ملک کی معاشی اور سماجی زندگی کا حصہ بنانا اور انھیں وہ اندرونی قوت اور بیرونی وسائل مہیا کرنا ممکن ہے جن سے یہ پرمسرت زندگی گزارنے کے قابل ہو سکتے ہیں۔ لیکن کوئی میری بات ہی نہیں سنتا۔

میں نے اس سے پہلے کبھی جمشید کو اتنے گمبھیر لہجے میں بات کرتے نہیں دیکھا تھا جیسا اُس دن دیکھا۔ یہ لہجہ ان کے عام لہجے سے مختلف تھا۔ میں ان کے ملال کے بوجھ تلے دب کر رہ گیا اور میری زبان گنگ ہو گئی، اور اگرچہ میرے ذہن میں خیال اُبھرا کہ ان کی اسکیم کی تفصیلات دریافت کروں لیکن انھیں دیکھ کر میرے ذہن کی اُس وقت ایسی حالت تھی کہ میں ان سے یہ سوال تک نہ کر پایا۔ اور افسوس، اب وہ دن آ گیا ہے کہ میرے پاس اس راز کو جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں رہا۔ جس دل میں یہ راز محفوظ تھا وہ اب فانی انسانوں کی طرح دھڑکنا بند کر چکا ہے اور جو روح اس دل کی حرکت کو جاری رکھے ہوئے تھی اُس غیر مرئی دنیا کا حصہ بن چکی ہے جہاں سے کوئی مسافر واپس نہیں آتا۔

**

۱۹۴۸ میں پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کے منظور کیے ہوئے ایک قانون کے ذریعے کراچی کو صوبہ سندھ سے جدا کر کے صوبائی دارالحکومت کو حیدر آباد منتقل کر دیا گیا۔ تب تک صوبائی اور وفاقی دونوں صدر مقام کراچی ہی میں واقع تھے۔ ۱۹۵۶ کے آئین کے تحت ملک کے مغربی حصے کے تمام صوبوں کی الگ حیثیت ختم کر کے انہیں مغربی پاکستان نامی صوبے میں ضم کر دیا گیا اور اس نئے صوبے کا دارالحکومت لاہور کو بنایا گیا۔ ۱۹۵۸ میں ملک میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا، اور مارشل لا حکومت نے وفاقی دارالحکومت کو کراچی سے راولپنڈی اسلام آباد منتقل کر دیا۔ ون یونٹ کا خاتمہ ۱۹۷۰ کے عام انتخابات سے ذرا پہلے ہوا، جس کے تحت سندھ کی بھی صوبائی حیثیت بحال ہوئی اور کراچی کو بائیس برس کی علیحدگی کے بعد دوبارہ سندھ میں شامل کیا گیا۔ تب سے یہ شہر صوبائی صدر مقام ہے۔

بائیس برس کے اس عرصے میں کراچی شہر کا ارتقا صوبہ سندھ سے الگ اپنے طور پر ہوتا رہا تھا۔ یہ مدت کراچی کی زندگی میں بے پناہ تغیرات سے عبارت تھی۔ ۱۹۵۰ کے عشرے میں ہندوستان سے مہاجروں کی اور ۱۹۶۰ کے عشرے میں پنجاب اور صوبہ سرحد سے وہاں کے باشندوں کی بڑی تعداد میں آمد نے اس شہر کا رنگ بنیادی طور پر تبدیل کر دیا تھا۔ وفاقی دارالحکومت ہونے کے زمانے میں ملک کے مغربی اور مشرقی حصوں کے بہت سے لوگ یہاں آ بسے تھے لیکن ملکی سیاست کے عوامل کے زیر اثر دیہی سندھ کے باشندوں کو کراچی کی زندگی میں زیادہ حصہ نہ مل پایا۔ ۱۹۷۰ کے قومی اور صوبائی انتخابات کے بعد دیہی سندھ کے منتخب نمائندوں کو اس شہر کے معاملات اور وسائل پر تصرف حاصل ہوا، اور دیہی اور شہری باشندوں کی باہمی رنجشیں، جو ۱۹۴۷ کے بعد سے متواتر پیدا کی جاتی رہی تھیں، شدید ہوتی چلی گئیں۔ نفرت کا کاروبار کرنے والے سیاست دانوں کی مہربانی سے اب سندھ کی آبادی کے یہ دونوں گروہ ایک دوسرے کے دشمن ہونے کا تاثر دینے لگے ہیں۔

آئندہ صفحات میں پیش کی جانے والی دو تحریریں بائیس سال کی جدائی کے اس عرصے کے آغاز اور خاتمے کے دنوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ پہلی تحریر انوار شیخ کے ایک انگریزی پمفلٹ کا ترجمہ ہے جو کراچی کو سندھ سے الگ کرنے کا قانون منظور ہونے کے کچھ عرصے بعد شائع ہوا تھا اور اس زمانے کی صوبائی اور ملکی سیاست کے نشیب و فراز پر روشنی ڈالتا ہے۔

دوسری تحریر ۱۹۷۰ میں "بس کراچی" کے عنوان سے سندھی میں شائع ہوئی تھی۔ یہاں اس کی تلخیص پیش کی جا رہی ہے۔ اگرچہ آج یہ بات ناقابلِ یقین معلوم ہوتی ہے، لیکن اس مختصر اور دل چسپ کتاب سے پتا چلتا ہے کہ ۱۹۷۰ میں ون یونٹ کے خاتمے کے موقعے پر دیہی سندھ میں دو رائیں موجود تھیں، ایک رائے کراچی پر سندھ کے حق پر اصرار کرتی تھی اور دوسری، بائیس برس کی جدائی کے عرصے میں آنے والی تبدیلیوں کے پیشِ نظر، کراچی کو صوبہ سندھ سے باہر رکھنے کی حامی تھی۔

ان دونوں تحریروں کے مصنفوں کے بارے میں معلومات حاصل نہیں ہو سکیں۔

انوار شیخ

انگریزی سے ترجمہ اجمل کمال

کراچی کی سندھ سے علیحدگی

، نے بعض حلقوں میں کچھ غلط فہمی پیدا کر دی ہے۔ یہ سیریز صرف اس خیال سے شروع کی گئی ہے کہ سندھ کے دانشوروں میں اُس فرض کا احساس پیدا کیا جائے جسے ادا کرنے کی موجودہ حالات میں ان کے عوام اور صوبے کی جانب سے اُن سے توقع رکھی جاتی ہے۔ یہ فرض کرنا غلط ہو گا کہ ان پمفلٹوں کا مقصد سندھ میں مقیم مہاجرین یا دوسرے غیر سندھیوں کی مخالفت کرنا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ سندھ میں مہاجرین واضح طور پر دو طبقوں میں منقسم ہیں ایک دقتیں اٹھاتی ہوئی اکثریت اور دوسرے ان کا استحصال کرنے والے لوگ۔ سندھیوں کے حقوق کی غیر منصفانہ پامالی کے خلاف ہمارے احتجاج کا رخ اسی مخصوص طبقے کی طرف ہے جو اپنے استحصال اور الگ تھلگ رہنے کے کرتوتوں کو مہاجرین کی حمایت کے پردے میں چھپاتا ہے۔ یہ افراد مہاجرین اور سندھیوں کے درمیان مکمل افہام و تفہیم اور اتحاد کی راہ میں رکاوٹ بن کر فائدہ اٹھاتے ہیں۔ چنانچہ یہ لوگ قومی سلامتی کے لیے خطرہ ہیں اور ان کی واضح طور پر اور پوری قوت سے مذمت کی جانی چاہیے۔

***

سندھی زبان میں بدو اور اونٹ کی مشہور کہانی کی مترادف ایک کہاوت ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ انگارے لینے کو آئی اور باورچی خانے کی مالک بن بیٹھی۔ یہ کہاوت کراچی کو آئینی طور پر غصب کرنے کے سلسلے میں مرکزی حکومت کے کردار کی بخوبی وضاحت کرتی ہے۔ جہاں تک غریب، اپاہج اور بدقسمت سندھ کا تعلق ہے، اس کی حالت ایک اور لوک کہاوت سے ظاہر ہوتی ہے جس میں ایک خاص چوپائے کا ذکر آیا ہے جو سینگوں کی تلاش میں نکلا تھا اور اپنے کان بھی گنوا بیٹھا۔

لیکن سندھ کے عام لوگوں کی یہ فلسفیانہ دانش اُس موقعے پر سندھی سیاست دانوں کی رہنمائی کرنے میں ناکام رہی جب انھوں نے اپنے علاقائی جوش و خروش سے مغلوب ہو کر مرکزی حکومت کو عارضی

طور پر کراچی میں مقیم ہو جانے کی دعوت دی۔ آج تک سندھ تقسیم کے موقعے پر سندھ لیگ کے رہنماؤں کو پڑنے والے اسلامی سخاوت کے اس شدید دورے کی قیمت ادا کرتا رہا ہے اور آئندہ بھی کرتا رہے گا۔ لیکن سندھ کی تقسیم کے معاملے میں پوری ذمے داری اپنے لوگوں پر ڈال دینا انصاف سے بعید ہو گا۔ درحقیقت یہ لوگ رحم اور دلاسے کے مستحق ہیں کیوں کہ ان کا کردار خوش، سادہ لوحی اور حماقت پر مبنی تھا نہ کہ سخت گیری اور ہوشیاری پر۔ ان بے چاروں کے پاس وہ ضروری قوت ہی نہ تھی کہ کراچی کے المیے میں موثر الذکر کردار ادا کر سکتے۔ کیوں کہ اگر ان کے پاس وہ قوت ہوتی تو اپنے ذاتی عزائم، اخلاقی جرأت کے فقدان، اقتدار کی پرستش، بزدلی، لالچ اور خودغرضی کے باوجود یہ لوگ اپنی مکروہ سیاسی زندگیوں میں پہلی بار اٹھ کھڑے ہوتے اور ۲۲ مئی ۱۹۴۸ کو صوبہ سندھ کو سنائی جانے والی اس سخت سزا کی سخت مزاحمت کرتے۔ یہ وہ تاریخ تھی جب اس ملک میں جمہوریت، پاکستانی پارلیمنٹ کے معزز ارکان کی وحشی اکثریت کے ہاتھوں، ایک غیرفطری موت مر گئی۔ تمام جمہوری، قانونی اور اخلاقی اصولوں کو بے رحمی سے پامال کرتے ہوئے، اور صوبے کے کونے کونے سے بلند ہونے والی احتجاج کی آوازوں اور انصاف کی اپیلوں کو نظرانداز کرتے ہوئے، کراچی کو سندھ سے جدا کر دیا گیا۔

اس ایکٹ کے آئینی اور قانونی پہلوؤں پر بحث کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ان محرکات کو واضح کیا جائے جن کے باعث اس ایکٹ کی ضرورت پیش آئی۔

کراچی کو غصب کرنے کے لیے خواجہ شہاب الدین کی پیش کردہ قرارداد کی پشت پر جو خیال کارفرما ہے وہ اُن تمام تصورات کی المناک طور پر نفی کرتا ہے جو تحریک پاکستان کی بنیاد تھے۔ اس قرارداد نے اسلامی اخوت کے تمام کھوکھلے دعووں کو بُری طرح ریزہ ریزہ کر دیا ہے جو خواجہ شہاب الدین اور ان جیسے دوسروں کی زبانوں پر رہتے تھے۔ اس قرارداد کی حمایت کرنے والوں کی خالص، وحشیانہ فرقہ پرستی نے سندھ کو اس سرزمین کے واحد گوہر سے محروم کر دیا۔

اس غیرقانونی تحریک کا واحد مقصد یہ تھا کہ پاکستان میں دولت، تجارت، طاقت اور اقتدار کے مرکز کو مفادات رکھنے والوں اور ان کی آئندہ نسلوں کے بلاشرکت غیرے استعمال کے لیے مخصوص کر لیا جائے خواہ اس سے نصف کروڑ فرزندانِ زمین کی حق تلفی ہی کیوں نہ ہوتی ہو۔ اس سلسلے میں اُس وقت کے مرکزی وزیرداخلہ خواجہ شہاب الدین اور کراچی میں مرکزی حکومت کے کٹھ پتلی اردو اور انگریزی پریس، خصوصاً روزنامہ ڈان، کا ادا کیا ہوا کردار خصوصی تجزیے کا مستحق ہے۔

سندھ کی تقسیم کی اس قرارداد کے حق میں دستورساز اسمبلی کے ایوان میں خواجہ شہاب الدین کی تقریر ترچھی منطق اور دانستہ مسخ کردہ حقائق کا ایک شاہکار ہے۔ کراچی کی علیحدگی کے سوال پر صوبے کی آبادی کے تمام حلقوں کی متفقہ ناراضگی پر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے خواجہ صاحب کہتے ہیں کہ کراچی کے وفاقی دارالحکومت بنائے جانے سے سب سے زیادہ فائدہ خود سندھیوں کو ہو گا۔ کیوں کہ جب ہندوستان کا دارالحکومت کلکتے میں تھا تو بنگال کے عوام کو اس سے بہت فائدہ ہوا تھا۔ لیکن جب ان سے

اس بات کی نشان دہی کی گئی کہ کلکتہ مرکزی دارالحکومت ہونے کے باوجود صوبائی حکومت کے انتظامی اختیارات لے تحت تھا، تو انھوں نے کلکتے کا مذکورہ بالا حوالہ دینے کے بعد، اپنی اسی تقریر کے دوران، کہا کہ اس معاملے میں کلکتے کی مثال موزوں نہیں ہے۔ اپنی بات کی خود ہی تردید کر کے خواجہ صاحب نے گویا اعتراف کر لیا کہ تقریر کے شروع میں کلکتے کا ذکر محض ایک بے معنی بات تھی جس کا حقیقی صورت حال سے کچھ تعلق نہ تھا۔ باوجود اس کے کہ اُس وقت کراچی صوبائی حکومت کے ماتحت تھا، مرکزی سیکرٹیریٹ میں ہم سندھیوں کی قطعی نمائندگی نہ تھی۔ جہاں تک ہم اچھی طرح جانتے تھے کہ اس شہر میں ہمیں قوت کا جو واحد ستون میسر ہے اس کے گرنے کے بعد مرکز کے مقابلے میں ہماری حیثیت کیا رہ جائے گی۔ خواجہ صاحب اور ان کے حامی حضرات کسی ایک فائدے کی نشان دہی کریں جو کراچی کے جدا ہونے سے صوبہ سندھ کو پہنچا ہو۔ اس کے برعکس صوبے میں معاشی اور تعلیمی ترقی کا عمل بُری طرح متاثر ہوا ہے۔

اس کے بعد خواجہ صاحب نے ممبران کو وحدانی اور وفاقی طرز حکومت کے بنیادی حقوق سے آگاہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ وفاقی حکومتیں ہمیشہ ایسے دارالحکومت پر انتظامی اختیار رکھتی ہیں، اور اس سلسلے میں ریاست ہائے متحدہ امریکا اور آسٹریلیا کے دارالحکومتوں، واشنگٹن اور کینبرا، کی مثالیں پیش کیں۔ خواجہ صاحب کی یہ بات مجموعی اعتبار سے درست ہونے کے باوجود بنیادی طور پر ناقص ہے اور اس میں مغالطہ پایا جاتا ہے۔ انھوں نے ان دونوں شہروں کے مخصوص تاریخی پس منظر کو بالکل نظرانداز کر دیا۔ واشنگٹن اور کینبرا کی مثالیں خواجہ صاحب کی منطق سے عاری خطابت کو تقویت دینے کے بجائے ان کی دلیل کو رہین نوس کر دیتی ہیں۔ کینبرا کو آسٹریلیا کا دارالحکومت قرار دینے کے برسوں طویل عمل میں جن عناصر کو مدنظر رکھا گیا تھا وہ پاکستان کی مرکزی حکومت کی جانب سے کراچی کو مستقل دارالحکومت بنانے کے فیصلے کو بالکل غلط ثابت کر دیتے ہیں۔ ماہرین کی رائے شروع ہی سے اس شہر کو پاکستان کا دارالحکومت بنانے کے خلاف تھی اور اب تک ہے۔ علاوہ ازیں، جب امریکا اور آسٹریلیا جیسے وسیع اور طاقتور ممالک نے ایسی حکومتوں کا صدر مقام طے کرنے سے پہلے برسوں غور کیا تو اس نوزائیدہ ریاست کو، جس کی عمر تب صرف نو ماہ تھی، ماہرین کی رائے، عوام کے احتجاج اور قانونی اور اخلاقی اصولوں کو مسترد کر کے کراچی کو اپنے صدر مقام کے لیے حاصل کر لینے کی اس قدر جلدی کیوں تھی؟ ۱۷۸۷ میں جب ریاست ہائے متحدہ امریکا نے دارالحکومت کے لیے اپنی بیس سالہ تلاش شروع کی، تب فلاڈلفیا، جارج ٹاؤن اور نیویارک جیسے وسیع اور خوب صورت شہر ملک میں پہلے سے موجود تھے۔ لیکن امریکی حکومت کی یہ پالیسی نہیں تھی کہ وفاق کی کسی رکن ریاست کو اس کے ممتاز شہر سے محروم کر کے اسے ممکنہ مضر اثرات میں مبتلا کر دیا جائے۔ آسٹریلیا کا دارالحکومت قائم کرنے کے لیے نیوساؤتھ ویلز میں خالی جگہ حاصل کرنے سے پہلے بھی نیوساؤتھ ویلز کی حکومت کے نمائندوں کی رضامندی حاصل کی گئی اور اس جگہ کی قیمت ادا کی گئی تھی۔ لیکن پاکستان کی نو ماہ عمر کی بے دستور ریاست کے حکمرانوں کے پاس کراچی کی علیحدگی کے

سنے پر کسی کی خواہشات معلوم کرنے کا وقت نہ تھا۔ یہ الفاظ مسٹر لیاقت علی خاں کی جانب سے سندھ لیجسلیٹو اسمبلی، دستور ساز اسمبلی کے سندھی ارکان، سندھ صوبائی مسلم لیگ اور صوبے کی تقریباً ہر سیاسی اور غیر سیاسی تنظیم کے متفقہ احتجاج کا جواب تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ دستور ساز اسمبلی کے سندھی ارکان کو سندھ کی تقسیم سے متعلق مرکزی حکومت کی قرارداد کے بارے میں مشکل ۴۸ گھنٹے پہلے اطلاع دی گئی۔

کینبرا کی تاریخ بتاتی ہے کہ آسٹریلوی حکومت نے سب سے پہلے دستور تیار کرنے کا مشکل مرحلہ مکمل کیا اور اس کے بعد وفاق کے لیے موزوں صدر مقام کی تلاش شروع ہوئی جس کا حتمی فیصلہ بیس سال بعد کیا گیا۔ لیکن پاکستانی حکومت نے تمام اہم بنیادی مسائل اور سابقہ آئینی نظائر کو بالائے طاق رکھتے ہوئے سب سے پہلے دارالحکومت حاصل کرنے کا غیر اہم ترین کام نمٹانے کا فیصلہ کیا۔ اور اس کے باوجود خواجہ صاحب نے اپنی حکومت کے اس سیاہ کارنامے کا امریکا اور آسٹریلیا کی منصف مزاج اور جمہوری حکومتوں سے موازنہ کرتے ہوئے کوئی ندامت محسوس نہ کی۔ غالباً حکومت پاکستان کو کسی آئین کی ضرورت بھی نہیں، کیوں کہ اس ریاست کی خودمختاری کا سرچشمہ خدا کی ذات ہے اور بلاشبہ وہی اس ریاست کے قیام سے لے کر اب تک اسے چلا رہی ہے۔

اس کے بعد خواجہ صاحب ان لوگوں کی تردید پر کمربستہ ہوئے جنھوں نے کلکتے کی مثال پیش کرتے ہوئے مطالبہ کیا تھا کہ وفاقی دارالحکومت بننے کے باوجود کراچی پر حکومت سندھ کے انتظامی اختیارات برقرار رہیں۔ انھوں نے کہا، اس معاملے میں کلکتے کی مثال موزوں نہیں ہے۔ اس زمانے میں بنگال کی صوبائی خودمختاری نہایت محدود تھی اور اس صوبے کی عنان حکومت ایک لیفٹیننٹ گورنر کے ہاتھ میں تھی۔ یہ امر مشکوک ہے کہ خواجہ صاحب کی یہ بات خود ان کی بھی سمجھ میں آئی ہو۔ بنگال، اپنی محدود خودمختاری کے باوجود، اس کا مستحق اور اہل سمجھا گیا نہ ہندوستان اور بنگال کے مشترکہ دارالحکومت پر اپنا انتظامی اختیار برقرار رکھ سکے۔ لیکن مکمل صوبائی خودمختاری نے حامل صوبہ سندھ کو اپنی حدود میں آنے والے ایک ایسے شہر پر انتظامی اختیار رکھنے کا مستحق اور اہل نہیں سمجھا گیا جو ایک صدی سے زیادہ عرصے سے صوبائی حکومت کا صدر مقام رہا ہے۔

کراچی کی آبادی میں خطرناک اضافہ ایک اور عنصر تھا جس نے خواجہ صاحب کو اس کی سندھ سے علیحدگی کی قرارداد پیش کرنے پر مجبور کیا۔ انھوں نے کہا، مستقبل قریب میں کراچی کی آبادی بڑھ کر تیس چالیس لاکھ ہو جائے گی۔ جہاں چھ صوبائی حکومت کے لیے اس کا انتظام چلانا ناممکن ہو گا۔ فارسی میں کہا جاتا ہے کہ ببریں عقل و دانش باید گریست۔ معلوم ہوتا ہے کہ جغرافیہ خواجہ صاحب کے پسندیدہ مضامین میں شامل نہیں ہے۔ غالباً کلکتے اور بمبئی کے شہروں کے بارے میں اُن کی معلومات اس سے زیادہ نہیں جتنی مرکزی کابینہ میں وزارت حاصل کرنے کے لیے درکار ہوتی ہیں۔ لگتا ہے وہ بالکل نہیں جانتے کہ ان دونوں شہروں کی آبادی بالترتیب ۴۵ لاکھ اور ۲۵ لاکھ ہے۔ اس کے باوجود یہ دونوں شہر بنگال اور

بھی کی صوبائی حکومتوں کے زیرِ انتظام ہیں۔ اس قسم کے دلائل دینا حقائق کو مسخ کرنے کے مترادف ہے۔

اس کے بعد خواجہ صاحب نے کراچی کی تعمیر اور توسیع کا سوال اٹھایا۔ انھوں نے کہا کہ مرکزی حکومت ایک بھرپور تعمیراتی مہم شروع کرنے کا ارادہ رکھتی ہے جو، اس کا اصرار تھا، کہ صوبائی حکام کے بس کی بات نہیں ہوگی۔ اس کھوکھلے دعوے پر تبصرہ کرنا لاحاصل ہوگا۔ مرکزی حکومت نے کراچی کی توسیع کے اس عظیم خواجائی منصوبے کو عمل میں لانے کے لیے اب تک کیا کیا ہے؟ جدید تر اور عظیم تر کراچی کے منصوبے کا عملی روپ دیکھنے کی غرض سے اگر کوئی شخص لالوکھیت اور ناظم آباد کی مہاجر بستیوں میں داخل ہو تو اُسے نہایت شرمناک منظر دکھائی دے گا۔ وفاقی حکومت کے مرکزی علاقے میں سرکنڈوں کی جھونپڑیوں اور گارے کے کچے مکانوں میں رہنے والے مہاجرین اس عظیم تعمیراتی منصوبے پر عمل کرنے اور کراچی شہر کا انتظام چلانے کے معاملے میں مرکزی حکومت کی اہلیت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ اگر حکومت سندھ نے فوری اقدام نہ کیا ہوتا تو حکومت پاکستان اب تک خیموں میں اور درختوں کے نیچے کام کر رہی ہوتی۔ پارلیمنٹ کی پہلے سے موجود عمارت کے علاوہ حکومت سندھ نے مرکزی سیکرٹیریٹ اور اس کے عملے کو جگہ فراہم کرنے کے لیے بیرکیں اور مکانات بنوائے اور پہلے سے موجود مکان ان کے استعمال کے لیے مہیا کرائے۔ لیکن اس کے عوض سندھ کو میں اپنے قلب میں خنجر کا کاری وار برداشت کرنا پڑا۔ وقت نے ثابت کر دیا ہے کہ نام نہاد تعمیراتی منصوبے کے بارے میں خواجہ صاحب کے دعوے محض فریب تھے۔ اس کے برعکس کراچی کی علیحدگی نے شہر کو حکومتِ سندھ کے بعد از جنگ تعمیرِ نو کے منصوبے سے مستفیض ہونے سے محروم کر دیا جو ابھی عمل میں آنے ہی والا تھا کہ سندھ کو تقسیم کر دیا گیا۔

بیرونی ملکوں کے سفارت کاروں کی سلامتی اور آسائش کا نکتہ اس بات کی اگلی دلیل کے طور پر پیش کیا گیا کہ کراچی شہر کو مرکزی حکومت کے زیرِ انتظام ہونا چاہیے۔ ہم سفارتی نمائندوں کی دیکھ بھال کا کام صوبائی حکومتوں کے حوالے کیوں کر کر سکتے ہیں؟ خواجہ شہاب الدین نے پوچھا۔ اس دلیل میں واقعی کچھ وزن ہے۔ بظاہر حکومت پاکستان بعض مخصوص سفارتی نمائندوں کے آرام اور آسائش کے معاملے میں ضرورت سے زیادہ تشویش میں مبتلا ہے۔ کیوں کہ دوسری صورت میں ان ہستیوں تک ہمارے بارے میں ناسازگار رپورٹیں پہنچیں گی جن کی ناخوشی برداشت کرنے کا پاکستان کے حکمران تصور نہیں کر سکتے۔ لیکن اس کے لیے بھی کراچی کو سندھ سے جدا کرنا ضروری نہیں تھا۔ سفارتی نمائندوں کو کچھ ایسے قانونی اور روایتی حقوق حاصل ہوتے ہیں جو انھیں فراہم کرنے سے مرکزی یا صوبائی کوئی بھی حکومت انکار نہیں کر سکتی۔ علاوہ ازیں، سفارتی نمائندے صرف کراچی میں نہیں رہتے۔ بیرونی ملکوں کے متعدد نمائندے لاہور، ڈھاکہ اور پشاور میں بھی مقیم ہیں۔ لہذا یہ کہنا بالکل لغو ہے کہ سفارتی نمائندوں کو دیکھ بھال کے لیے صوبائی حکومتوں کے حوالے نہیں کیا جا سکتا۔

ان دلائل کے بعد خواجہ صاحب نے حکومت سندھ کو حکومت پاکستان کا مہمان بن کر کراچی میں مقیم رہنے کی فراخدلانہ پیش کش کی۔ اب تک آپ میزبان تھے اور ہم مہمان۔ اب ہماری باری ہے کہ آپ کی میزبانی کریں۔ اس بے حیائی اور ناشکر گزاری کی کوئی اور مثال نہیں مل سکتی۔ کوئی مہمان اپنے میزبان کو راتوں رات اس کے اپنے گھر میں اجنبی بنا دے تو اس سے یہی ایک نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ وہ مہمان دراصل ایک سفاک اور بے رحم حملہ آور تھا جسے کسی اخلاقی اور آئینی اصول کی قطعی پروا نہ تھی۔ اسی طرزِ عمل نے سندھ کے عوام کو مجبور کیا کہ وہ کراچی کی علیحدگی کو قانونی ڈکیتی کا نام دیں۔

خواجہ صاحب نے اس حقیقت کو تسلیم کیا کہ صوبائی اور مرکزی دونوں حکومتیں اپنے لیے نیا صدرمقام تعمیر کرنے کی استطاعت نہیں رکھتیں، لہذا حکومت سندھ کے لیے کراچی میں مقیم رہنا ناگزیر ہے۔ یہ بات مرکزی حکومت کے عظیم تعمیراتی پروگرام کی خود ہی قلعی کھول دیتی ہے۔ جب حکومت پاکستان کے پاس اتنے گراں تعمیراتی پروگراموں پر عمل کرنے کے مالی وسائل ہی نہیں ہیں تو پھر خواجہ صاحب ان پر کیوں کر اصرار کرسکتے ہیں؟ اور جب کہ حکومت پاکستان کی مالی حالت اب تک ویسی ہی ہے تو وہ سندھ کو کراچی کی پوری قیمت کب ادا کرسکے گی؟ علاوہ ازیں، یہ جانتے ہوئے کہ صوبائی حکومت اپنے لیے ایک نیا صدرمقام تعمیر کرنے کی استطاعت نہیں رکھتی، صوبے کے دارالحکومت کو غصب کرلینا کہاں کا انصاف تھا؟ جب سندھ اسمبلی اور سندھ کا پریس مرکزی حکومت کو کراچی میں مہمان رکھنے پر رضامندی کا اظہار کررہا تھا تو اس شہر کو صوبائی حکومت سے زور چھین لینے کی کیا ضرورت تھی؟

مختصر یہ کہ خواجہ صاحب اپنی تاریخی قلابازیوں کے ذریعے سندھ کی غیرمنصفانہ تقسیم کے حق میں ایک بھی معقول دلیل دینے میں بُری طرح ناکام رہے۔ اور اس سلسلے میں خواجہ صاحب کی پیش کردہ قرارداد کو بھی دنیا کی اس نے دستور ریاست میں غیر آئینی قانون سازی کی ایک منفرد مثال کا درجہ حاصل رہے گا۔ قرارداد میں کہا گیا تھا

کراچی کو وفاقِ پاکستان کا دارالحکومت قرار دیا جاتا ہے اور اس شہر اور اس کے نواحی علاقے کا (جس کی حد بندی مرکزی حکومت اپنی صوابدید کے مطابق کرے گی تاکہ وفاقی دارالحکومت کا انتظام مناسب طور پر چلایا جاسکے) مکمل انتظام مرکزی حکومت فوری طور پر سنبھال لے گی اور آئندہ سے شہر کے معاملات اسی کے اختیار میں ہوں گے۔ مستقبل میں قانون سازی کے اختیارات بھی مرکزی (وفاقی) اسمبلی کے پاس ہوں گے۔ حکومتِ پاکستان اس قرارداد کو، پہلے سے نافذ تمام قوانین سے قطع نظر، نافذ کرے گی۔

یہ بے نظیر قرارداد اپنی نوعیت کا واحد غیرقانونی قانون ہے۔ ایک پارلیمانی قرارداد کو نافذ کرنے کے لیے پہلے سے نافذ تمام قوانین کو کالعدم قرار دے دینے سے اس بات میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ قرارداد پیش کرنے والے لوگ اپنے اس اقدام کی غیرقانونی نوعیت سے بخوبی واقف تھے۔ کوئی مہذب اور جمہوری حکومت اپنے نافذ کردہ قوانین کو اس قدر تحقیر سے مسترد نہیں کرتی جیسے کراچی کی

علیحدگی کی قرارداد میں کیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قرارداد کی آئینی قدروقیمت کاغذ کے اس ٹکڑے سے بھی کمتر ہے جس پر اسے تحریر کیا گیا۔ اس قرارداد کو محض وحشی اکثریت اور مرکز کی بالادستی کے زور پر نافذ کیا گیا تھا نہ کہ کسی آئینی، اخلاقی یا جمہوری اصول کی روشنی میں۔

مرکزی حکومت کے اس اقدام کی حمایت میں کراچی کے کٹھ پتلی اردو اور انگریزی پریس کا شوروغوغا حکومت کے ڈھکے چھپے اظہار سے کہیں زیادہ بے باکانہ تھا۔ ان اخبارات نے کھل کر مہاجرین کے کراچی پر حکمرانی کرنے کے حق کی وکالت کی جہاں انہیں اکثریت حاصل ہے۔ سندھ اور سندھیوں کو اسلامی اخلاقیات اور احسان مندی کی ان مثالوں کو فراموش کرنے میں بہت طویل عرصہ لگے گا جو ملک میں درآمد کیے گئے معاندی گروہ نے قائم کی ہیں۔
اگرچہ بیشتر مہاجرین کو فریب دے کر اس معاملے میں سندھیوں کے موقف کی مخالفت کرنے پر آمادہ کر لیا گیا تھا، تاہم ہوش مند اور دوراندیش مہاجروں کے ایک اچھے خاصے حلقے نے، جس کی قیادت مولانا شبیر احمد عثمانی کر رہے تھے، اس وحشیانہ اقدام کی سخت مخالفت کی۔ پینتیس لاکھ سندھی پہلے سے پاکستان میں رہ رہے ہیں اور اب دس لاکھ اور سندھی ان کے ساتھ رہنے آئے ہیں۔ کراچی کی علیحدگی ان دونوں کی باہمی خیرسگالی اور دوستی کی راہ میں ایک خطرناک رکاوٹ بننے کے سوا کوئی مقصد پورا نہیں کرے گی، مرحوم مولانا نے اعلان کیا۔ لیکن اس بے دست و پا، سادہ اور خداترس انسان کا مقابلہ انسانی ہوس پرستی کی ایسی قوتوں سے تھا جنہیں حکومتی طاقت اور اقتدار کی سرپرستی حاصل تھی۔ چنانچہ ان کی آواز طاقتور لوگوں کے بے رحم شور میں گھٹ کر رہ گئی۔
پارلیمانی سرکس کے باہر اس قرارداد کو نافذ کرنے کے لیے حکومت نے جو طریقے اختیار کیے انہیں فاشسٹ کے سوا کوئی اور نام نہیں دیا جاسکتا۔ سندھ کے پسماندہ عوام کے احساسات کی ترجمانی کرنے والے واحد اخبار الوحید پر پابندی لگا دی گئی اور اس کے ایڈیٹر کو قید میں ڈال دیا گیا۔ کراچی میں مقیم سندھی طلبا پر فوجی پہرہ بٹھا دیا گیا۔ شہر میں دفعہ ۱۴۴ لگا دی گئی۔ سندھ صوبائی مسلم لیگ کے اُس وقت کے صدر آغا غلام نبی پٹھان کو قید اور مسٹر جی ایم سید کو ان کے آبائی گاؤں میں نظربند کر دیا گیا۔ صوبے کے وزیراعلیٰ محمد ایوب کھوڑو کو برطرف کر دیا گیا اور صوبے کو تباہ کرنے کے لیے ایک کٹھ پتلی وزارت قائم کر دی گئی۔ مختصر یہ کہ پاکستان کے رہنماؤں نے اقتدار اور اختیار کے ناجائز استعمال کا بدترین مظاہرہ کیا۔

سندھ کے دل کراچی کو ہمارے صوبے کے پہلو سے نوچ لیا گیا ہے۔ مشرق کا عروس البلاد اب ہمارا نہیں رہا۔ سندھ اب غلیظ، بدصورت اور پرانے قصبوں اور بے حیثیت دیہات کے ایک ڈھیر کی صورت میں باقی رہ گیا ہے۔

قانونی طور پر ہم اب بھی کراچی کی علیحدگی کو فیڈرل کورٹ میں چیلنج کر سکتے ہیں۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ (۱۹۳۵) اور انڈین انڈیپنڈنس ایکٹ (۱۹۴۷) دونوں میں سندھ کو ایک خود مختار صوبہ اور ایک الگ اکائی تسلیم کیا گیا ہے۔ جہاں تک اس کی سرحدوں میں کسی بھی قسم کا ردوبدل بالکل غیرقانونی ہے، خصوصاً اس صورت میں جب کہ یہ ردوبدل ریاست کا آئین تیار کرنے سے پہلے کیا گیا ہو۔ اس وقت فیڈرل کورٹ قائم نہیں کیا گیا تھا، لیکن اب اس مسئلے کو قانونی فیصلے کے لیے پیش کیا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں، کراچی کو سندھ کا حصہ ہونے کی حیثیت سے آئینی طور پر اس وقت تک صوبے سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا جب تک اس میں صوبے کے عوام کی رضامندی شامل نہ ہو۔ اس فیصلے کا واحد جائز طریقہ پورے صوبے میں ریفرنڈم کرا کے عوام کی رائے معلوم کرنا تھا۔ اگر اس طریقے سے کسی نتیجے پر نہ پہنچا جا سکے تو اس کا متبادل عدالتی فیصلہ ہو سکتا تھا۔ مرکز، محض وفاقی پارلیمنٹ میں مطلق العنان اکثریت کے بل پر، کسی بھی حالت میں صوبے کے عوام اور اسمبلی کی خواہشات پر آئینی بالادستی رکھنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ نظیر کے مطابق صوبے سے تعلق رکھنے والے کسی معاملے میں مرکز اور صوبے کے درمیان تنازعے کی صورت میں موزوں عدالت ہی فیصلہ کرنے کی مجاز ہے۔ عدالتیں آئین کی محافظ ہوتی ہیں، لہٰذا ہم اب بھی ان کی مدد سے اپنا حق حاصل کر سکتے ہیں کیوں کہ کراچی کی علیحدگی عدالتی اور آئینی نقطۂ نظر سے ایک ظلم سے کم نہیں۔

کراچی کی علیحدگی کے اقدام کے ذمے دار افراد کے پست عزائم کی مکمل شہادت (اگر مزید شہادت درکار تھی) بعد میں ہونے والے واقعات سے مل گئی۔ کراچی کو ایک الگ صوبے کا درجہ دینے کے حق میں مسٹر حسین امام کے شروع کیے ہوئے ایجی ٹیشن سے کراچی سازش کا پردہ پوری طرح چاک ہو گیا ہے۔ آخر مسٹر حسین امام جیسے افراد کو ان کی خدمات کے عوض وزارتیں اور پارلیمانی عہدے حاصل کرنے کے لیے کوئی الگ پلیٹ فارم تو ملنا ہی چاہیے۔ وہ کوئی واحد فرد نہیں تھے جو کروڑوں ہندوستانی مسلمانوں کو ہندو سیکیولرازم کے رحم و کرم پر چھوڑ کر ہندوستان سے دُم دبا کر بھاگ آئے۔ ان کے علاوہ بہت سے دوسرے بھی تھے جنہیں پاکستان آنے پر اقتدار اور اختیار کے اعلیٰ عہدوں سے نوازا گیا۔ تو پھر مسٹر حسین امام اور ان کے سیاسی ساتھی کیوں محروم رہیں جب کہ ہندوستان کی مسلمان اقلیت سے فریب کرنے کا انہیں جیسا عمدہ ریکارڈ رکھنے والے دوسرے لوگ یہاں دولت اور طاقت کے مزے لوٹ رہے ہیں؟ جہاں تک کراچی کو سندھ سے علیحدہ کرنا ضروری تھا تاکہ اسے مسلم لیگ کے ان مہم جوؤں کی اقتصادی اور سیاسی لُوٹ کھسوٹ کے لیے مخصوص کیا جا سکے۔ اگر اس اقدام سے ہمارے عوام کے قومی احساسات کے درمیان ایک مہلک خلیج حائل ہو گئی تو مسٹر حسین امام جیسے افراد اور کراچی کے کئی اخبارات کے ایڈیٹروں اور سرمایہ کاروں کو اس کی ذرہ برابر فکر کیوں ہو؟ ہم ان سے پاکستان اور پاکستانیوں کی بابت اتنی ہی ہمدردی کی توقع کر سکتے ہیں جتنی ہمدردی انہوں نے اپنے عزیزوں اور رشتے داروں سے دکھائی ہے

جنہیں وہ نہایت ذات دلی سے ٹنڈن، کرپی، کھرے اور تارا سنگھ صاحبان کی حفاظت میں دے کر چلے آئے ہیں کیوں کہ انھیں یہاں آنے اور پاکستان کی خدمت کرنے کی بڑی تمنا تھی۔

کراچی کی سندھ سے علیحدگی کے مسئلے پر مرکزی حکومت کا موقف محض اس بات کی رٹ پر مشتمل تھا کہ صوبائی اور مرکزی حکومتوں کے لیے ایک مشترکہ دارالحکومت میں، جس کا انتظام صوبائی حکومت کے پاس ہو، رہ کر کام کرنا ناممکن ہوگا۔ کراچی کے کٹھ پتلی پریس اور کراچی کی علیحدگی کی حمایت کرنے والے افراد نے بھی اپنی بحث کو کم و بیش اسی بنیاد پر استوار کیا تھا۔ چناں چہ اب، ان اخباروں اور لوگوں کو کراچی کو الگ صوبے کی حیثیت دینے کے حق میں وہی دلائل دیتے ہوئے دیکھنا جو سندھ نے صوبے کی تقسیم کے خلاف دیے تھے، بے اصول صحافت اور غلیظ سیاست کی مکروہ نمائش معلوم ہوتا ہے۔ مسٹر حسین امام اور کراچی پریس کے ایک حصے نے صاف صاف اعلان کیا ہے کہ ایک مشترکہ دارالحکومت میں، جس کا انتظام صوبائی حکومت کے پاس ہو، مرکزی اور صوبائی حکومت کا کام کرنا بالکل ممکن ہے چناں چہ کوئی وجہ نہیں کہ کراچی کو الگ صوبے کا درجہ نہ دیا جائے۔ خواجہ شہاب الدین کی اطلاع کے لیے یہ اضافہ کیا جانا چاہیے کہ مذکورہ بالا دونوں معادی گروہوں نے اس معاملے میں کلکتے کی مثال پیش کی ہے۔

مسٹر حسین امام نے اس تحریر کے حق میں ڈان میں سلسلہ وار مضامین لکھے ہیں جن میں انھوں نے کراچی کی سندھ سے علیحدگی کے مسئلے پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ مرکزی حکومت نے سندھ کو کراچی سے جدائی کا معاوضہ دینے پر رضامند ہو کر غلطی کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کراچی کی حدود کے اندر ایک ریفرنڈم کرایا جانا چاہیے تھا تاکہ یہ فیصلہ کیا جاسکے کہ یہ شہر صوبے کے زیرِ انتظام رہنا چاہتا ہے یا مرکز کے۔ ان کے نزدیک اس طریقے سے مرکزی حکومت سندھ کو کراچی کی قیمت ادا کرنے سے بچ سکتی تھی۔

یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اگر کراچی کے میونسپل علاقے کی حدود میں ریفرنڈم کرایا جاتا تو سندھ کے لیے اس میں کامیابی حاصل کرنا نہایت دشوار ہوتا۔ لیکن یوں تو صوبے کے بیشتر شہروں کی میونسپل حدود میں ایسا ریفرنڈم کرایا جائے تو اس بات کے نوے فیصد امکانات ہیں کہ سکھر، حیدرآباد، نواب شاہ، لاڑکانہ وغیرہ سندھ سے علیحدہ ہونے کے حق میں رائے دیں گے۔ اس کا واحد سبب یہ ہے کہ کراچی سمیت یہ تمام شہر تقسیمِ ہند کے بعد ہندوستان سے آنے والے مہاجرین کی یلغار کی زد میں آگئے ہیں، اور اب سندھ کے بیشتر شہری علاقوں میں مہاجرین کی تعداد مقامی آبادی کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ اور چوں کہ سندھ اور کراچی کو مسٹر حسین امام جیسی متعدد ہستیاں لاحق ہیں جو مہاجرین کے ذہنوں کو سندھیوں کے خلاف زہرآلود کرنے میں مصروف ہیں، چناں چہ وہ لامحالہ مہاجرین کو سندھ کے جائز حقوق کی مخالفت پر آمادہ کرلیں گے۔ لیکن مسٹر حسین امام اس حقیقت کو فراموش کر رہے ہیں کہ کراچی شہر کو سندھ کے ٹیکس گزاروں کی محنت کی آمدنی سے حاصل ہونے والے سرمائے سے تعمیر کیا گیا تھا۔ سندھی عوام کے سرمائے اور محنت ہی کی بدولت کراچی غریب ماہی گیروں کے ایک چھوٹے سے گاؤں سے بڑھ

کر مشرق کے عروس البلاد کے درجے تک پہنچا تھا۔ چنانچہ یہ حق پورے سندھ کے عوام کا ہے کہ ریفرنڈم کے ذریعے کراچی کی قسمت کا فیصلہ کریں۔ سندھ کو جو معاوضہ ادا کیا جانا تھا وہ صوبائی حکومت کی مملوکہ جائیداد کی قیمت اور محصولات کے اس نقصان کے برابر ہے جو شہر کی علیحدگی کے باعث صوبے کو برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔ یہ جائیداد صوبائی حکومت نے پورے صوبے کے ادا کیے ہوئے محصولات سے خریدی تھی لہذا پورے صوبے کے عوام کی رائے لی جانی ضروری تھی۔ یہ بات مضحکہ خیز ہے کہ جن لوگوں نے اس شہر کی تعمیر اور ترقی میں ذرا بھی حصہ نہ لیا ہو وہ اس کی ملکیت کے واحد دعوےدار بن بیٹھیں اور اس کی قسمت کا فیصلہ کرنے کا حق حاصل کر لیں۔

بہرحال، کراچی کے عوض صوبہ سندھ کو ادا کی جانے والی رقم کے بارے میں مسٹر حسین امام کے خیالات سے اس امر میں ذرا بھی شبہ نہیں رہتا کہ وہ سندھ اور پاکستان کے لیے کیسی خیرخواہی رکھتے ہیں اور حق، انصاف اور آئینی طریق کار کا کس درجہ احترام کرتے ہیں۔ یہ ایک معروف حقیقت ہے کہ کراچی کے جدا ہونے کے باعث سندھ کو معیشت، تجارت، سیاست اور تعلیم کے شعبوں میں کتنا سخت نقصان برداشت کرنا پڑا ہے۔ چنانچہ موزوں معاوضے کی ادائیگی صوبے کو مکمل تباہی سے بچانے کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ لیکن قوم دشمنی میں اندھے ہو جانے کے باعث مسٹر حسین امام اور ان کے ساتھی سندھ کو اس مہلک وار سے سنبھلنے تک کا موقع دینے کو تیار نہیں۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، کراچی کی علیحدگی کے ایکٹ کی آئینی حیثیت کا فیصلہ کرانے کے لیے اب فیڈرل کورٹ سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔ اس اقدام کے بعد ہونے والے واقعات بھی مرکزی حکومت کے خلاف کیے جانے والے اس مقدمے کو تقویت دے سکتے ہیں کیونکہ مرکز کراچی سے علیحدگی کے سلسلے میں اپنے وعدے اور سندھ کے عوام اور حکومت کو دی گئی ضمانتیں پوری کرنے سے قاصر رہا ہے۔ مرکزی حکومت کی طرف سے وعدہ کیا گیا تھا کہ سندھ کو کراچی کی جدائی کا مناسب معاوضہ دیا جائے گا۔ کراچی کی علیحدگی کو اب پانچ سال ہونے کو ہیں لیکن سندھ کو اب تک تانبے کا ایک سکہ تک نہیں دیا گیا اور نہ وفاقی بجٹ میں اس ادائیگی کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ دوسری طرف یہ افواہیں گرم ہیں کہ مرکزی حکومت ایڈووکیٹ جنرل پاکستان کے مشورے سے ان وعدوں سے بالکل ہی دست کش ہونے کا ارادہ رکھتی ہے۔ مزید یہ بھی وعدہ کیا گیا تھا کہ کراچی کی پچاس فیصد انتظامی ملازمتیں اور کاروباری مراعات سندھیوں کے لیے مخصوص رکھی جائیں گی۔ اس وعدے کی بھی دیدہ دلیری کے ساتھ خلاف ورزی کی گئی اور شہر کی زندگی کے کسی بھی شعبے میں مقامی باشندوں کو کوئی موقع فراہم نہ کیا گیا۔ مرکزی حکومت نے یہ بھی وعدہ کیا تھا کہ تعلیمی اداروں کو صوبائی حکومت کے زیر انتظام رکھا جائے گا۔ اگرچہ اس سے صوبائی خزانے پر بار پڑتا تھا، تاہم حکومت سندھ نے یہ پیش کش قبول کر لی تھی کیونکہ باقی صوبے میں موجود تعلیمی ادارے صوبے کی ضروریات کے لحاظ سے نہایت ناکافی تھے۔ لہذا حکومت سندھ کراچی کی علیحدگی کے باوجود یہاں کے شہریوں کی تعلیم پر اپنے خزانے سے خرچ کرتی رہی۔ لیکن اس وعدے کی بھی خلاف

وررى كى كسى اور سدھ يو سيور سٹى كو يہاں سے نقلِ مكانى ىر محسور كر ديا گيا تا كہ يہاں كراچى يو سيورسٹى قائم كى جا سكے جو ايك پارليمانى ايكٹ كے تحت قائم كى گسى- جہاں چہ اب صوبائى حرج كے چلائے جانے والے تعليمى اداروں كا حقيقى كنٹرول مركز كے پاس ہے- كراچى يو سيور سٹى كے قيام اور سدھ يو سيور سٹى كى حيدر آباد منتقلى سے مركز سے اس عہد كى بھى حلاف وررى ہوئى كہ كراچى كے تعليمى اداروں پر سدھ كا كنٹرول رہے گا-

باہمى معاہدے كى مندرجہ بالا حلاف ورريوں اور كراچى كى عليحدگى كے ايكٹ كى ميادى حاميوں كے باعث فيڈرل كورٹ سے مركزى حكومت كے حلاف فيصلہ آسانى سے حاصل كيا جا سكتا ہے- صوبے كے دانش وروں كو اپنى دمہدارى پورى كرتے ہوئے سدھ كى حكومت سے مطالبہ كرنا چاہيے كہ وہ كراچى كو سدھ ميں واپس لانے كے ليے مركزى حكومت كے حلاف فورى قانونى چارہ جوئى كرے- يا تو مركزى حكومت ايك طے كردہ ميعاد ميں صوبہ سدھ كو پورا مالى معاوضہ ادا كرے يا پھر فيڈرل كورٹ ميں كراچى كو غير آئينى طور پر غصب كرنے كے مقدمے كا سامنا كرے- يہ ہر تعليم يافتہ شخص كا فرض ہے كہ گورنر شيخ دين محمد كى غير نمائندہ حكومت كے ختم ہوتے ہى ہمارے منتخب نمائندوں كے سامنے پہلا مطالبہ يہى پيش كيا جائے معاوضے كى ادائيگى يا كراچى كى سدھ كو واپسى-

**

میر امداد علی

سندھی سے ترجمہ اور تلخیص فہمیدہ ریاض

مِس کراچی

بُری عورت کے بیچے بھی بہت اور یار بھی بہت!

گھوڑا رے گھوڑا! قہر ہو گیا!

بھاگ گئی... عمر بھر کو داغی کر گئی... کھسری داڑھیوں والے شہیری جوانوں کی لاج لُٹا دی... جس عزت، شرف اور شان کی بقا کے لیے سب کوشاں تھے، وہ عزت عورت نے رول دی۔ لٹھ سردار کو کیجیوں نے کتنا سمجھایا تھا کہ نگوڑی کو کچھ تمیز سکھا کہ حیا اور حجاب ہو۔ سب نے سمجھایا کہ اتنا مت پڑھاؤ، چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاؤ، سماج میں لڑکیوں کی تعلیم کے لیے ابھی حالات سازگار نہیں۔ ایک تو کریلا، اوپر سے نیم چڑھا۔ اوپر مخلوط تعلیم، فرنگی فیشن دیکھ کر اب کہاں رشتے داروں کے قابو میں آتی ہے! مانے، اب دنیا کیا کہے گی! لونڈیا نے سب کو خوار خراب کر دیا۔ پیڑھی کی محنت رائیگاں ہو گئی۔ اس سے تو پیدا ہوتے ہی مر جاتی۔ ماروی کی پیدائش کے ٹھکانے، سدر کاموں اور ماراروں کی شرافت اور سخاوت ملکوں ملک مشہور تھے، وہ بھی خاک میں ملا دیے۔

مگر کریں تو کیا کریں! کراچی کو تو خاندان والوں نے نہ چرخا چلانا سکھایا، نہ سُوت کاتنا، نہ ٹوکریوں میں مچھلیاں بھرنا اور لے جانا۔ لونڈیا اوٹ کی اوٹ ہو گئی اور دوپٹا اوڑھنے کی تمیز نہ آئی۔ ارے کان ناک تک تو چھدوائے نہیں کہ سنگھار ناک پہنتی۔ دودھ بلو تا تک تو آتا نہیں۔ ڈھیلے ڈھالے کنگھوں کی جگہ چُست لباس پہن کر دعوتِ گناہ دینا خوب آتا ہے۔ لڑکوں کی طرح بال کٹا کر کسمریوں کی طرح ناچنا خوب سیکھا ہے۔ اس کے باپ دادا کے دیس میں کسمریاں ناچتی تھیں، اب یہ آرٹسٹ بن کر سب خرافات کرتی ہے۔ اس کا تو اُٹھنا بیٹھنا، گھومنا پھرنا سب جیسے ناچ ہو۔ ہمارے یہاں جُوا کھیلنا، کھیلیں تب بھی معیوب، اور یہ بادشاہ زادی جُوا کھیلے تو اسکل گیم کہلائے۔ اس کا ماموں مولو مسافر باہر سے پاس سے سلے سلائے کپڑے لے آیا تو سب نے کہا کے گوروں کی اُترن سیلامی کپڑے لایا ہے، اور یہ سلے سلائے کپڑے لائے تو کہیں، یہ تو ریڈی میڈ ہیں۔ پہلے غیر تو کجا اپنے بھی بدن نہ چھوتے تھے، اس عورت ذات کو دیکھو کہ آگا پیچھا نپوا رہی ہے۔ مصنوعی رشتے جوڑ رکھے ہیں، مصنوعی ماں بھی ہے، مصنوعی

باپ ڈیڈی ہے اور یہ خود ہر وقت کلفٹن جانے کو ریڈی ہے۔

لونڈیا نے قہر کیا۔ لڑکی ہو کر الھڑ جوانی میں کیسے کالے کرتوت کیے۔ اب تو جتنے منہ اُتنی باتیں۔ مسافر، سوداگر اور سمندری لوگ تو کہتے ہیں کہ یہ اس کی پُرانی فطرت ہے کہ اپنوں کو غیر کر دیتی ہے اور جانی جدا کر دیتی ہے۔ اس کے اشارے پر دولہہ دریا (سمندر) نے سوڑے کا جوڑا دھکیر او کر کے عمر بھر کے لیے سوڑے کو پلیے سے جدا کر دیا۔

ہاں، لیکن کہتے ہیں نہ حسن کی اس پر خطر پڑی سو وہیں دل مار بیٹھا۔ اسے پالنے پوسنے میں دیسی بیوپاری بھی پورا زور لگاتے ہیں، کیوں کہ پرائی اولاد اپنے پیلے سے خرچ کر کے بھی جوان کرنا غیروں کی پرانی فطرت ہے۔ اس کو سجانے اور سنوارنے میں کسی نے کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی۔ اس کی جھلک اور فلک اس حد تک پہنچی ہے کہ بڈھے کھوسٹ بھی اس پر جوانوں کی طرح عاشق ہو گئے ہیں۔ بے چاری بالی کے بخت بالا کرنے کے لیے بڑے چلے کاٹے ہیں۔ رشتہ داروں نے نام بھی تو عجیب رکھا ہے۔ ترک بیوپاریوں کا خیال تھا کہ کراچی لفظ کے معنی ہیں پتھر ـــــ اب چاہے کراچی کسی ملاح عورت کا نام ہو یا کسی لٹیرے کا۔

بہر حال کراچی کی فرعونیت، شوخی اور افعال واقعی پتھر دل ہیں۔ خاندانی عزت کو طاق پر رکھ کر دیوار پھاندنے کی مثال اس کے بعد ڈھونڈنے نہ ملے گی۔

واہ ری زمانے کی ٹھوکریں کھا کر بڑی ہونے والی لونڈیا ـــــ تیرے گرگٹ جیسے بدلتے رنگ۔ جس سے نیہہ لگایا اس سے نہ نبھایا۔ کیوں کہ کسی بھی دولہے سے سردیوں بعد یا رُت بہار آنے پر پوچھا نہ شادی کی تھی؟ ، تو یہی جواب ملا کہ بھاگ بھی گئی! تو نے عرب دیکھے، قلاتی بلوچ دیکھے، کلھوڑے دیکھے، ٹالپر خاندان دیکھا، انگریز دیکھے، ملتانی، مکرانی، ہندو، پارسی، کرسچن، بنگالی، سندھی، پنجابی، پٹھان، بلوچ، مہاجر، بہاری، گجراتی، کاٹھیاواڑی اور میمن ـــــ تو نے سب کو پالا۔ سب طرح کا عروج و زوال دیکھا۔ تو نے کئی تہذیبیں دیکھیں اور اُنھیں نگل گئی۔ اور کئیوں نے تیری پرانی تہذیبوں اور رسموں رواجوں کو نگل لیا۔ خیر ـــــ پھر بھی سلکوں کی اولاد ہے، سندھ کا اٹوٹ انگ ہے، جان و جگر ہے، مگر کیوں کہ تجھ میں وفا نہیں، اعتبار نہیں، تو بہت نازک ہے، بوجھ اُٹھانے کی تجھ میں سکت نہیں، اس لیے سب کا دل تجھ سے کھٹا ہو گیا ہے، ورنہ سونے کی چڑیا کون چھوڑتا ہے۔ خدا نہ بھلائے، جب چمڑے اور کپڑے کے بیوپاریوں نے ہند اور سندھ کو قینچی سے آدھوں آدھ کیا تو لاکھوں کی تعداد میں بے سارو سامان قافلوں کا آنا تیرے لیے کاری ضرب تھا۔ تیری جنم پتری نکالیں تو معلوم ہو گا کہ ایک ہی تہذیب والے اتنی بڑی تعداد میں، ایک ہی دور میں، کبھی بھی ہجرت کر کے نہیں آئے تھے۔ بس کراچی کی چھاؤں میں پناہ تو لی، مگر آگ لیے آئے تھے تو آگ ہی بن بیٹھے۔

درحقیقت کہاوت تو یہ ہے کہ روم میں ہو تو رومیوں جیسے ہو، جیسا دیس ویسا بھیس۔ ہجرت کی

ابتدا سے یہی اصول ہے اور مذہب و اخلاق کا بھی یہی تقاضا ہے کہ جس پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھو اُس کی جڑ مت کاٹو۔ رسول خدا نے مکے سے مدینے ہجرت کی تو مدنی کہلائے۔ اسی طرح سندھ میں آباد ہونے والے پہلے عربی ہوں کہ عجمی، سب کچھ بھلا کر سندھی ہو گئے۔ خود کراچی نے ہر دور میں ایک نیا بھیس بدلا۔

لیکن افسوس کہ ہجرت کی تاریخ میں یہی ایک مثال ہے کہ نئی آبادی پرانوں کو جاہل، مفلس اور اچھوت تصور کرنے لگی۔ اپنے آپ کو آریا، تہذیبی تمدنی لحاظ سے اونچا سمجھ کر اپنی الگ کھچڑی پکانے لگی۔ اور اونٹ اور عرب کی مثال، اونٹ کی طرح خیمہ باہر کرنے کا منصوبہ بنانے لگی۔ اونٹ تو تب ہی چیخ پکار کر رہا تھا جب پورا بسایا جا رہا تھا۔ بعض قابل شخصیتوں نے تو ابتدا ہی میں کہہ دیا تھا کہ مارو بڑے ایسے پیروں پر آپ کلہاڑی مار رہے ہیں۔ لڑکی تو ہضم کریں سو کریں گے، اس کے خاندان کی بھی مٹی پلید کریں گے۔ جن کی آنکھیں اتنی اندھی ہیں کہ اپنا وطن چھوڑ کر ایسی جگہ جانے کو تیار ہو گئے جس کا اُنہیں ابھی کچھ بھی علم نہ تھا، ان اندھوں کو کیا شناخت! اندھے پن میں چھلانگ ماری اور اصلی آبادی سے غافل رہے۔ اگر انھوں نے اسلام اور متحد مسلمان قوم کے لیے ہجرت کی ہے تو اس اسلامک آئیڈیالوجی کی قدر اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتی تھی کہ پناہ دینے والی زمین کی مٹی کو تبرک سمجھ کر آنکھوں سے لگاتے جہاں اسلام، متحد اسلام، کی ابتدا ہوئی۔ ان ہی لوگوں سے لڑنا کہاں کا اسلام اور کہاں کا انصاف تھا؟

کلجگی لڑکی کراچی بے چاری اب کرے تو کیا کرے! یہ تو اس کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ اس کے اور میکے والوں کے درمیان ایسے فاصلے حائل ہو جائیں گے۔ کراچی کے نئے رشتے داروں نے کراچی کی عادتیں ہی بدل ڈالیں۔ اب یہ سسرالی کہاں اس کے مارواڑوں اور سانیسٹروں سے پیچہ لگاتے ہیں۔ شہر کی بیٹی بھی کیسی، حملہ بھی شہر پر! حکومت ایسی بیٹیاں کہ میکے والوں کو بُرے دن دکھائیں۔

مہران وادی کے لوگ تو پہلے ہی کہتے تھے کہ بُری عورت کے بچے بھی بہت اور یار بھی بہت۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کے تعلیم یافتہ سگوں سوتوں بھائیوں کا یہی کہنا ہے کہ مس کراچی آوارہ نکلی! بھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان۔ اگر ایک انگلی خراب ہو جائے تو اس کا کاٹ دینا بہتر ہے، مبادا پورے بازو کو خراب کرے۔ یہ حسین و جمیل کراچی مارُووں کو نہیں چاہیے۔ وہ اس سے بڑھ کر حسین کتنی ہی باعصمت کراچیاں پیدا کر سکتے ہیں جو دکھ سکھ میں ایسی ہی رہیں گی۔

محترمہ مس کراچی کی ۱۹۶۱ میں اولاد اور لے پالک بچوں اور وارڈوں کی کل تعداد بیس لاکھ چونتیس ہزار کے لگ بھگ تھی۔ اس میں میکے والے صرف ایک لاکھ چوہتر ہزار آٹھ سو بیس تھے۔ ان میں بھی اکثریت مقامی ماحول سے متاثر اور بے ماڈرن انٹرنیشنلزم اور یونیفیکیشن کے قائل ہیں۔ باقی اولاد اس طرح ہے

لکھنوی بارہ لاکھ ایک ہزار سات سو چوہتر

لاہوری دو لاکھ ساٹھ ہزار سات سو سینتالیس

قلاتی ایک لاکھ آٹھ ہزار چوبیس
قندہاری ایک لاکھ پانچ ہزار چار سو بیاسی
گجراتی ایک لاکھ ساوں ہزار چار سو اکہتر، وغیرہ۔

مسماۃ کراچی کی گود تو اب سالوں اس سعود کی طرح ایسی ہری ہوئی ہے کہ نہ اپنی اولاد کو پہچانتی ہے نہ میکے والے اسے پوچھتے ہیں۔ اس کے میکے کے سیاسی سوداگر تو برسوں بعد بھی اس بات پر متفق ہیں کہ اپنی لڑکی کے سر پر ہاتھ رکھیں، مگر چند تعلیم یافتہ بھائی اسی موقف پر قائم ہیں کہ کشتی پلی جو مالسدڈورا ہی بھلا۔

سیاسی سوداگروں اور وڈیروں نے کراچی کو کنٹسٹ میں ضم کرنے کے لیے یہ دلیلیں دی ہیں
(۱) سرحدوں کی ہمیشہ حفاظت کی جاتی ہے، ان پر سودا بازی نہیں ہوتی۔
(۲) زن، زر، زمین کو قیامت تک قابو میں رکھنا غیرت مندی ہے۔
(۳) کراچی ملنے سے وڈیرا شاہی ختم ہو گی۔
(۴) پڑھے لکھے طبقے کے ساتھ میل ملاپ سے مقابلہ ہو گا اور کامل لکوں میں مقابلے کا جذبہ پیدا ہو

(۵) اقتصادی اور معاشی حالت سُدھرے گی کیوں کہ کراچی نے خوب کمایا ہے، کالا دھن بھی خوب ہے اور حرام حلال کی دولت اور زیورات سے مالامال ہے۔
(۶) اپنے ملک کا قدیمی حصہ تحفے یا خیرات میں کسی کو کبھی نہیں دیا جاتا۔
(۷) احساس کمتری میں مبتلا نہ ہوں اور بزدلی نہ دکھائیں۔ مرد بن کر مقابلہ کریں۔
(۸) اقلیت اور اکثریت کے مسئلے کو دائی ناسور نہ بننے دیں۔
(۹) آج شہری اکثریت کے ڈر سے کراچی سے ہاتھ اٹھاو گے تو کل ہر شہر سے دست بردار ہونا پڑے گا۔،
(۱۰) کراچی کو سندھ میں شامل کرنے کے خلاف سرکاری ملازم ہیں کیوں کہ ان کو اپنی نوکریوں کا خطرہ ہے۔ عوام کو کوئی خطرہ نہیں۔
(۱۱) کراچی تاریخی، جغرافیائی، اقتصادی، سماجی اور ثقافتی لحاظ سے سندھ کا حصہ رہی ہے۔
(۱۲) اس وقت سندھ کے بوہرے، میمن، خوجے، گجراتی، پٹھان، بلوچ اس لیے غیر سندھی رہاں اختیار کر رہے ہیں کیوں کہ باگ غیروں کے ہاتھ میں ہے۔ سندھ میں شامل ہونے پر یہ سب سندھی بولیں گے، سندھی پڑھیں گے۔
(۱۳) ملازمتوں میں مارو ئڑوں کے لٹھ سردار حق تلفی نہیں ہونے دیں گے، اور موجودہ کوٹا سسٹم یا ڈومی سائل نہ رہا تب بھی شہری اور دیہاتی کوٹا ضرور قائم رکھیں گے۔
(۱۴) کراچی میں جمع شدہ سرمائے کو دیہات کی صنعتی ترقی کے لیے استعمال کیا جا سکے گا، جیسے

بچھڑے ممالک امریکا، انگلینڈ وغیرہ سے امداد لیتے ہیں۔

(۱۵) معاشرے کے استحکام کی ضمانت باہمی مفاد میں مضمر ہے۔

(۱۶) اقلیت ابتدا میں کتنی ہی ترقی یافتہ کیوں نہ ہو، اکثریت اس پر فتح پا کر اس سے آگے نکل جاتی ہے۔

(۱۷) خدانخواستہ ملک پر نحوست کا سایہ پڑا، یا بدقسمتی سے مشرقی پاکستان کی سیاسی صورت حال اتنی سنگین ہو گئی کہ وہ جدا ہونے پر آمادہ ہو جائے، تو بندرگاہ کے طفیل سندھ ہی ملک بن جائے گا۔

(۱۸) وہ صوبہ یا ملک جس کے پاس بندرگاہ ہو ہمیشہ اپنے مطالبے منوا سکتا ہے، خاص طور پر جب پانی کا بہاؤ لمبا یا ٹیڑھا ہو۔ سوہنی کو چناب میں مگرمچھ چیر پھاڑ ڈالیں، ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیں تو وہ کیسے خوش رہ سکتی ہے؟ میکا اور بیٹی الگ ہو کر خوش حال نہیں رہ سکتے۔

(۱۹) کراچی بندر ملنے سے دریائے سندھ کے پانی پر حق ثابت کرنے میں دشواری نہیں ہو گی۔

(۲۰) کراچی کی مچھلیاں ملنے سے وادی مہران سب سے زیادہ متمول اور خوش حال ہو جائے گی۔

(۲۱) ایشیا کے اہم ترین اڈے اور مشرق کی ملکہ کو گھر بیٹھے چھوڑ دینا حماقت ہے۔

(۲۲) پرانے آنے والوں کو اس سرزمین نے جذب کر لیا۔ اسی طرح کچھ عرصے میں نئے آنے والے بھی جذب ہو جائیں گے اور سب سے پرانے ایک ہو جائیں گے۔

(۲۳) ۱۹۵۴ میں سندھ اسمبلی نے متفقہ طور پر کراچی کو سندھ سے ملانے کا مطالبہ کیا تھا۔

(۲۴) بیٹی نے اقتصادی ترقی، صنعت و حرفت، ہوائی اور سمندری بندرگاہیں، پڑھنے اور سیکھنے کے جدید ترین طریقے سب مہیا کر رکھے ہیں۔ گاؤں والوں کو اس کا فائدہ پہنچے گا۔

بہرحال، اس کے برخلاف، پڑھے لکھے سانگیوں کا خیال ہے کہ

(۱) جو انگلی خراب ہو چکی اُسے کاٹ دینا بہتر ہے۔

(۲) اسلامک آئیڈیالوجی ختم ہو چکی۔ اب وہ دوسرے ہیں اور ہم دوسرے ہیں۔

(۳) کرسچین بھی پرانے پناہ گیر ہیں۔ آج تک انھوں نے سندھی طور طریقے نہیں اپنائے تو کٹر پانی پتی کہاں اپنائیں گے۔

(۴) ہجرت کرنے والے آج تک خود کو لکھنوی، دہلوی کہتے ہیں۔ آئندہ کیا بدلیں گے۔

(۵) مہاجروں کا بھی ایک صوبہ ہونا چاہیے۔

(۶) قائداعظم کا قول تھا کہ کراچی الگ ہو۔

(۷) کراچی میں آمدنی بندرگاہ، ہوائی اڈے، صنعت و حرفت اور ایکسائز سے ہوتی ہے۔ یہ سب مرکز کے ٹیکس ہیں، ان میں سے سندھ کو زیادہ سے زیادہ دس فیصد مل سکتا ہے۔

(۸) غربی صوبے کو توڑنے کا ایک سبب یہ ہے کہ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھا جاتی ہے۔ کراچی

میں اسی فیصد تعلیم یافتہ اور تجربہ کار لوگ ہیں۔ سندھی اسی فیصد ناخواندہ اور ناتجربہ کار ہیں، وہ ہمیشہ احساس کمتری میں مبتلا رہیں گے۔ سینٹ پیٹرز کے لڑکے ٹنڈو قیصر اور ٹنڈو مستی خان کے لڑکوں کو ہر مقابلے میں شکست دیں گے۔ اسی وجہ سے پہلے پنجاب کے ڈر سے مقابلہ ہی نہیں ہوتا تھا۔ اب بھی اگر کھلا مقابلہ ہو تو مارُو فقط دارو جو، تپیدار اور ماسٹر کی ملازمتوں تک محدود رہیں گے۔

(۹) جب کراچی کو جدا کیا گیا، اس وقت اس کی آبادی تقریباً سات لاکھ تھی اور اب تقریباً بیس لاکھ ہے۔ سندھی یہاں پہلے بھی کم تھے، اب تو ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے۔

(۱۰) کھوکھرا پار سے آنے والوں کی ڈھائی لاکھ درخواستیں ۱۹۶۵ میں وزارت آبادکاری میں اجازت کے لیے آئی ہوئی تھیں۔ مشرقی پاکستان کے بہاری وہاں بنگالیوں سے خوف زدہ ہیں۔ یہ ایک کروڑ دس لاکھ اردو بولنے والے کراچی آرہے ہیں۔ حال ہی میں اسے بہاری طلبا آئے ہیں کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جگہ نہیں رہی ہے۔

(۱۱) یہاں سندھی آبادی بڑھنے کا کوئی راستہ نہیں۔ یہاں دیر سے شادیاں کرنے کے سبب شرح پیدائش کم ہے۔ مارو بڑوں کی تیز اور شوقین زندگی کے باعث ان کی عمر بھی کم ہوتی ہے اور دیہی اولاد پیدا نہیں ہوتی۔ کراچی میں غیر سندھی اتنی بڑی تعداد میں ہیں کہ ان کو اور اندرون سندھ غیر سندھیوں کو ملا کر، جن میں بہاری بھی شامل ہونے والے ہیں، تو ان کی پورے سندھ میں اکثریت ہو جائے گی۔

(۱۲) کراچی میں مسلسل غیر سندھی آرہے ہیں۔ اس حساب سے آج کی اکثریت، جو ناخواندہ ہے، کل کی ناخواندہ اقلیت کہلائے گی۔

(۱۳) کراچی کو سندھ کی ضرورت ہے نہ کہ سندھ کو کراچی کی

(الف) پینے کا پانی سندھ سے چاہیے۔

(ب) کارخانوں کے لیے کچا مال چاہیے۔

(ج) کارخانوں کے مال کے لیے سندھ کی منڈی چاہیے۔

(د) نئے انجینیروں اور ڈاکٹروں کو نوکری چاہیے۔

(ہ) بیٹی کو خوراک اور دودھ بھی سیکھے والے مہیا کرتے ہیں۔

(۱۴) آنے والوں کی اکثریت پکّے مکانوں میں، دھندے بیوپار میں، صنعت و حرفت میں ہر طرح آباد ہے جب کہ دیہات میں مارُوا بھی تک کچی جھونپڑیوں میں رہ رہے ہیں۔

(۱۶) شیر کی طرح خود شکار کر کے کھائیں۔ پرایا شکار کیا کھانا۔ نیا شہر بسائیں، نئی چہل پہل ہو۔ کراچی میں بڑی بندرگاہ ہے، رونق ہے، تو بدین میں نئی بندرگاہ کیوں نہ بنائیں۔ اچھا ہے، ملک میں دو تین بندرگاہیں ہو جائیں۔

(۱۷) کراچی کے پیسے والے صنعت کار یا بیوپاری سندھ کے خستہ حال مسروں کو خرید لیں گے۔

علاوہ اس کے، وڈیرا اور کم پڑھالکھا دیس اور نوکرشاہی کا ڈرایادھمکایا دیس کراچی والوں کے حرفتی دیس کا مقابلہ کہاں کر سکتا ہے۔

(۱۸) کراچی کو جدا ہوئے ایک پیڑھی ہو گئی، یعنی اس جدائی کو بائیس برس ہو گئے۔ اس عمر کے لڑکے لڑکیوں کی بھی اولادیں ہو گئی ہیں۔ یہ تو ایک بھولی داستان ہے۔ ایک طرف تو ہندوستانیوں سے کہا جا رہا ہے کہ ہندوستان کو بُھلا دو، دوسری طرف مارُو کراچی تک کو بُھلانے کے لیے تیار نہیں۔

(۱۹) کراچی کی معیشت صنعت اور تجارت پر مشتمل ہے، سندھ کی معیشت زراعت اور ملازمت پر۔ دونوں کی عینت میں تضاد ہے۔

(۲۰) سب سے بڑا نقصان زبان اور ثقافت کو ہوگا، کیوں کہ سب کراچی والے ــــ سندھی ہوں یا غیر سندھی ــــ اردو بولتے ہیں۔ زبان سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ کراچی میں جو ایک لاکھ ساٹھ ہزار سندھی ہیں اُن کی اولاد ہی سندھی نہیں بولتی، دوسرے کیا بولیں گے۔ اردو قومی زبان ہے اور سندھی صرف علاقائی، ہر ایک قومی زبان کو ترجیح دے گا۔

(۲۱) سادہ لوح لاہوریوں نے تمرافت اور اسلامی بھائی چارے میں ہمیشہ چوٹ کھائی ہے۔ جب تک اسی فیصد جاہل ہیں دھوکے اور دھکے کھاتے رہیں گے۔

(۲۲) اندرونِ سندھ ہی مہاجر اپنے آپ کو دیسی طور پر سندھیوں کا بھائی اور سندھی نہیں سمجھتے جہاں وہ ظاہر طور اقلیت میں ہیں۔ کراچی میں، جہاں اُن کی اکثریت ہے، وہ کہاں خود کو سندھی سمجھے لگے۔ وہ تو اُلٹا سندھیوں کو زیادہ متنفر نظروں سے دیکھیں گے۔

(۲۳) سندھ کی وسیع اراضی اور نوکریاں نوواردوں کے قبضے میں ہوں گی کیوں کہ ان کی کافی تعداد تعلیم یافتہ، کلیمنٹ اور ساتھ ساتھ بےروزگار ہے۔ ظاہر ہے نوکریاں تعلیم یافتہ لوگوں کو ملیں گی۔ ان پڑھ تو گھیں نہیں بھریں گے۔ اسی طرح زمیں بھی پیسے والے خریدیں گے۔ اور مارُووں کی اتنی حیثیت کہاں ہے کہ مالی طور پر مقابلہ کریں۔ صنعت و حرفت کی بھی اُنھیں زیادہ سُدھ بدھ ہے۔ سانگیوں کی اکثریت مسکیں اور کم سدھ بدھ والی ہے۔ کراچی کے صنعت کار انکم ٹیکس سے بچنے کے لیے بھی زمیں خریدیں گے۔ وہاں بھی مارُووں کو نقصان پہنچے گا۔

(۲۴) کراچی اور سندھی بیلے کے صنعتیں سب غیر سندھیوں کے قبضے میں ہیں، اس لیے اقتصادی صورتِ حال بھی ان کی حرفتی تدبیروں کی محتاج رہے گی۔

(۲۵) کراچی بڑا شہر ہے، تعلیم یافتہ لوگوں کا شہر، صنعتی شہر۔ ہوائی اڈے اور سمندری بندر والے شہر کو یقیناً اہمیت حاصل ہے۔ ہوائی، بری اور بحری فوجوں کی چھاؤنیاں بھی کراچی میں ہیں۔ ان سب اداروں میں غیر سندھیوں کی اکثریت ہے۔ اس لیے سرکاری یا سیاسی نقطۂ نگاہ سے غیر سندھیوں کے خلاف صحت مند فیصلہ بھی ہنگامہ آرائی یا عوامی ہلچل کی صورت اختیار کر سکتا ہے۔

(۲۶) کراچی کے اردو والے کہاں سندھی کو صوبائی زبان مانیں گے۔ وہ کہاں سندھی، اردو اور

انگریزی کو یکساں درجہ دے کر سندھی کو فضیلت دینے والے ہیں۔ اس طرح سندھی زبان کو وَن یونٹ ٹوٹنے کے بعد بھی شاید چین نہ ملے۔

(۲۷) کالجوں یونیورسٹیوں کے یا چھوٹے، بنیادی جمہوریت والے، انتخابات میں تجربہ بتاتا ہے کہ ماسوا اصل نسل سندھیوں کے کسی غیر سندھی نے سندھی امیدوار کو ووٹ نہیں ڈالا ہے۔ دوسرے، کاٹھیاواڑی، قائم خانی، پٹھان، میمن اور گجراتی لوگوں نے کبھی ظاہر طور ساتھ نہیں دیا؛ وہ بھی اُس وقت جب کراچی سندھ کا حصہ نہیں تھا۔ سندھ میں شامل ہو جانے کے بعد کون سی وجہ بدل ہو گی جو یہ سندھیوں کا ساتھ دیں گے یا سندھی بولنے لگیں گے۔ ہاں، البتہ کراچی کی علیحدہ حیثیت میں دوسری سب قومیں لکھنویوں کے خلاف متحد رہ سکتی ہیں۔ اس وقت تو یہ سب لکھنویوں کے ساتھ مل کر ماروُوں کا مقابلہ کر رہی ہیں۔

(۲۸) اگر سرحدوں پر سودا بازی یہ کرنا ہی سیاسی دلیل ہے تو پھر ملتان کو کیوں چھوڑیں؟ یہ بھی سندھ وادی کا حصہ ہے۔ ہندوستان کو کیوں چھوڑیں؟ ہزار سال وہاں مسلمانوں کی حکومت تھی۔ اسپین کو کیوں چھوڑیں؟ اُمویوں نے سالوں سال وہاں حکومت کی۔

(۲۹) اگر یوں ہے کہ کراچی چھوڑنے سے ہر شہر چھوڑنا پڑے گا تو جواب یہ ہے کہ کراچی پہلے ہی بائیس برس الگ رہی ہے۔ دوسرا تو کوئی شہر جدا نہیں ہوا۔ دوسرے ہر شہر میں سندھی سوسائٹی موجود ہے، ہوٹلوں وغیرہ میں بات چیت سندھی زبان میں ہوتی ہے۔ کراچی میں آج بھی سندھی خود کو اجنبی محسوس کرتا ہے، کل اور بھی اجنبی محسوس کرے گا۔ کراچی کی نمائندگی کبھی کسی سندھی نے نہیں کی ہے۔ آج تک غیر سندھی منتخب ہوتے آئے ہیں اور ان پر سندھی ہونے کا لیبل چپکایا گیا ہے؛ مثال کے طور پر ہارون خاندان جس کا سندھیوں میں آیر ہے نہ پَیر۔ دوسری طرف سندھ کے شہروں میں بائیس برس سے سندھیوں اور غیر سندھیوں دونوں کی نمائندگی سندھی کرتے ہیں۔ حیدرآباد اور سکھر میں سیاست کے علاوہ دھندے بیوپار پر بھی سندھیوں کا قبضہ ہے، کراچی میں کسی کاروبار پر نہیں۔ کراچی میں سندھیوں کی وہی حالت ہے جو میڈرڈ میں مسلمانوں کی، ہانگ کانگ میں چینیوں کی، اور قبرص میں ترکوں کی۔ مطلب یہ کہ سندھ کی کراچی کہنا اتنا ہی مضحکہ خیز ہے جیسے چمن کے انگور، کیوں کہ چمن میں نہ انگور بکتے ہیں نہ پیدا ہوتے ہیں۔

(۳۰) کراچی، حیدرآباد اور خیرپور کے سی ایس پی صاحبان کی لسٹ دیکھیں تو مشکل سے کوئی چار پانچ میکے والے ہوں گے، باقی سب اردو مادری زبان والے۔ اور سندھ کے جو صاحب بھی ہوں گے وہ کھلے مقابلے والے نہیں بلکہ کوٹے والے ہوں گے۔ یعنی بائیس برس کے عرصے میں کوئی بھی سانگی مقابلے میں سی ایس پی نہیں بنا، سب کوٹے کی پیدائش ہیں۔ کوٹا سسٹم ختم ہوا تو سمجھو سندھیوں کی نمائندگی بھی ختم۔

(۳۱) سندھ یونیورسٹی اور کراچی یونیورسٹی کے استادوں کے معیار، لائبریریوں کے معیار اور علمی

شوق و ذوق کے معیار میں بہت فرق ہے۔ اس لیے خواہ مخواہ معتبر ی کرنا خود فریبی ہے۔

(۳۲) ملی تش میں خوش ہے کہ ہماری زبان قدیمی ہے، ہماری ثقافت موئنجودڑو کی ہے۔ یہ خود سے دھوکا کرنا ہے، کیوں کہ اگر ثقافت موئنجودڑو کی ہے تو دین بھی تو موئنجودڑو کا ہے، سیاست بھی تو موئنجودڑو کی ہے۔

(۳۳) اگر محض عیش اور ظاہری حسن کے لیے کراچی کی کشش ہے تو کڑوا کریلا بڑا خوبصورت سہی، پکا کر تو نہ کھا سکو گے۔ یہ یاد رکھو کہ اب اس عیش کا اسکیل بہت بڑھ چکا ہے۔ روٹی، گیہوں اور چاول کی ثانی کا صنعت کاروں کی پیداوار سے کیا مقابلہ۔ کراچی والے عیش پر بھی خرچ کرتے ہیں تو کراچی کا پیسا کراچی میں رہتا ہے۔ گاؤں والے دیہات میں کمائی رقم نہ دیہات میں خرچ کرتے ہیں اور نہ دیہات پر۔

(۳۴) ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والے، آٹے میں نمک برابر لوگ، ہماری ثقافت پر غالب آنے میں یا ہم ان کی ثقافت پر۔ اس کا جائزہ لو تو معلوم ہو گا کہ حقیقت کیا ہے۔ مندرجہ ذیل باتیں پہلے سندھیوں میں نہیں تھیں جن میں اب سندھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں

* پان کا استعمال
* عید کارڈوں کا فضول خرچ
* کالا برقع
* سحری اور افطاری کے اضافی نام
* یادگار برسیاں
* عید میلادالنبی (خاص طور پر عورتوں میں)
* مجلس عزا، شام غریباں
* نکاح کی رسمیں (بیچ میں دولھا، اسٹیج، لاؤڈاسپیکر، مٹھائی کی پڑیاں)
* لڑکیوں اور لڑکیوں کے چھوٹے چھوٹے نفیس نام (ندیم، شکیل، روبینہ، شبانہ وغیرہ)
* بے حیائی اور بے شرمی
* خرافات، عریانی، بداعمالی
* یکی، بک بک، یاوہ گوئی
* ملاوٹ

ان سب باتوں کے باوجود سائیں نواب شاہ، سائیں دادن شاہ، وڈیرا الاڑکانہ، سائیں سکھر، سائیں ٹھٹھہ وغیرہ سب لڑ رہے ہیں، جلیبے اور وریر سب مس کراچی کو لینے کے لیے راضی ہیں۔ ہاں پڑھے لکھے بھائی اور چچازادوں ماموں زادوں کی اکثریت کراچی کے خلاف ہے۔ ان کا بس چلے تو لونڈیا کو زندہ جلا دیں، مگر اتنی طاقت نہیں ہے کیوں کہ وہ بھی اب ماڈ کی ماڈ ہو گئی ہے۔ چڑ کر کہتی ہے

ان بے داڑھی والوں، بچارا رو صاحبوں، دودھ پیتے چھوکروں اور کھسروں کو بھلا کیوں مجھ پر اتنا غصہ آتا ہے؟ یہ کیوں مجھ سے بیر رکھتے ہیں؟ ابا صاحب اور سارے بچارادوں تایارادوں نے تین تین شادیاں کی ہیں۔ داشتائیں بھی رکھتے ہیں۔ کبھی کبھی چوری چھپے میری سسرال کی لڑکیوں کو بھی لے جاتے ہیں۔ بیسا بی کی طرح بنا کر، مونچھیں منڈا کر بیٹھے ہیں۔ مگر میں بیٹی ہوں تو میری شادی نہیں کرائیں گے، کیوں کہ ملکیت کا بٹوارا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ ہمارا کوئی تائی شریک تھوڑا ہی ہو سکتا ہے! میں کس وجہ سے حرام ہوں؟ شریعت محمدی کے مطابق نکاح کیا ہے، گناہ تو نہیں کیا جو کلہاڑیاں تیکھی کی جا رہی ہیں۔

میں پڑھی لکھی، سلجھی ہوئی لڑکی ہوں، دھوبی بار بھومیاں نہیں کروں گی۔ اس کے بدن اور منہ سے باس آتی ہے۔ برسوں میں تو دو لوٹے سر پر نہیں ڈالتا۔ سر میں جوؤں کا انبار ہے۔ ابا مجھے جانوروں کی طرح ہنکانا چاہتے ہیں۔ میں خاندان کی اندھی عقل پر نہیں چلوں گی۔ ان کے حکم پر گونگی بہری نہیں بن جاؤں گی۔ دیکھ بھال کر رشتہ کروں گی۔

رہا یہ سوال کہ جس سے اٹکی ہوں وہ بھی نہ جانے حلالی ہیں یا نہیں — کیوں کہ انگریزوں کے بعد یہاں کے لوگ سرحد سے آباد ہونے والے پر شک کرتے ہیں — یہ میرا ساتھ نبھائیں گے یا نہیں؟ کام نکال کر رفوچکر تو نہیں ہو جائیں گے؟ مگر میں نے ایسے سگے بچے، نک بک کھٹمل اور مڈسے تو مار مار میں بیچ دیے ہیں۔ موئے کی داڑھی منڈوا کر ایسی آنکھیں پھیروں گی کہ سارے پیر یاد آ جائیں گے۔ اندازہ تو کچھ مجھے بھی ہے کہ ان کی نسل میں ملاوٹ ضرور ہے۔ شکل سے بھی چور لگتے ہیں۔ اگر پوچھو کہ آپ کی تعریف؟ تو شیر شاہ کی اصلاحات کی طرح الف بے سے شروع کر کے پوری رامائن سنانے لگتے ہیں میں تو نواب تھا، ہزاروں ایکڑ میں تھی، اسلام کی خاطر لٹ پٹ کر آیا ہوں وغیرہ۔

یہ تو میں سوچتی ہوں مگر اپنے بارے میں سوچوں تو ضمیر ملامت کرتا ہے۔ میں بھی تو محض نکاح کی وجہ سے حلالی ہوں۔ میرے ابا نے بھی تو اماں کے ساتھ بڑے ظلم کیے۔ وہ بھی تو شرافت، وفاداری اور حلالی پن کے اوصاف نہیں تھے۔ میری کتنی معصوم خالاؤں، پھوپھیوں کو کارو کاری کر کے مار ڈالا۔ بعض اوقات صرف اپنے عیش کے لیے ان معصوموں کا خون کیا۔ گاؤں والے اس پر مبارک باد دیتے تھے۔ کہتے تھے واہ بڑے، مردانگی دکھا دی! کاری ماری ہے، کارے کو بھی نہیں چھوڑنا تھا! (کارا ہوتا تو مارتے۔ یہ تو زیادہ تر الزام تراشی تھی۔) بی بی کا اندر جلا کسی نے نہ دیکھا، باندی کا سر پھٹا دنیا نے دیکھا۔ ابا کو یہ سارے قتل ہضم ہو گئے۔ نوکر شاہی کو پیسے کھلاتے رہے۔ کبھی کیس سیشن کورٹ تک بھی نہ پہنچا۔ کبھی کبھی میں کہتی ہوں، یہ سب ابا کے اعمال کی شامت ہے جو آج میکے کے غریب غربا اپنے گھر میں اجنبی ہیں۔

ابا نے کسانوں مزدوروں کو تو چھوڑو، میرے ماموں کو بھی فصل کی پوری بٹائی نہیں دی۔ ماسٹر مولاداد کا کھڑا کھیت سکھا دیا۔ ڈنڈے کے زور پر پانی بند کر دیا۔ خود تو نہند میں لگا کر بھی پانی لے جائیں اور ماسٹر کو اور دوسروں کو لوٹا بھر پانی بھی نہ نہیں۔ داروغے اور تپے دار سے لے کر چھوٹے موٹے سرکاری ملازم کے گھر بوری بھر چاول اور بوری بھر گیہوں ضرور پہنچے۔ باقی خلق اگر سسکتی، آہ و زاری کرتی

رہے تو بھلے ہے!

میری ماں نے اصیل مرغی کے انڈے سے کر بچے بڑے بھی نہیں کیے ہوتے کہ کوئی نہ کوئی سرکاری ملازم آن دھمکتا اور ساری مرغیاں جھاڑ لیتا۔ میری پھوپھیوں کا روٹی ٹھوکتے ٹھوکتے اور سالن پکاتے پکاتے رنگ دھواں ہو گیا، پیاز کاٹتے کاٹتے ہتھیلیوں اور انگلیوں میں گھاؤ پڑ گئے۔ کبھی اُن پر ترس آیا؟

میں گھر سے بھاگی تو ہوں مگر شہر میں آ کر یوں لگ رہا ہے جیسے بھوکے پیاسے کے آگے طعام رکھ دیے گئے ہوں، جیسے قید سے رہائی مل گئی ہو۔ آج ہر ایک اپنی طرف کھینچتا ہے۔ گاؤں میں تو کوئی پوچھتا بھی نہ تھا۔ وڈیرا کبھی کبھی گھوڑے پر گزرتا تھا۔ میں موکھے سے جھانک کر دیکھتی تھی تو اچھا لگتا تھا۔ مگر وڈیرا کہاں میری طرف دیکھنے والا تھا! یہاں تو جو ملتا ہے خود کو نواب، خان، میر اور پیر کہتا ہے۔ میری تعریفیں کرتا ہے۔ ایسے ایسے شعر کہتا ہے کہ میں ہوا میں اڑتی رہتی ہوں۔ گاؤں میں نہ کسی نے نہ پڑھایا نہ سنایا۔ بس دل جلایا۔

مس کراچی کے سندیس اور راگ راگنیاں کچے والوں کے کان میں پڑیں تو سوٹ بوٹ والے بھائی مس کراچی کی فلک بوس عمارتیں اور جاہ و جلال دیکھ کر مصالحت کرنے کو کچھ کچھ تیار ہوئے۔ مگر ہوشیار اور حرفتی سپوتوں کا کہنا تھا، ہمارے پاس آتی ہے تو آئے، مگر ماریں گے ضرور!

مارُوڑوں نے کارو کاری کے سلسلے میں کتنے ہی بہادر مار کر پھینک دیے۔ بے شمار کیس کرائے۔ گھوڑا بھی تھان پر شوخی میں لوٹتا ہے۔ سہیروں کا تاؤ، باپ کی پگڑی، خُرمُر کرتے نوٹ، ایک سے ایک بڑھیا کپڑے۔ پروا ہی نہیں تھی۔ اصل میں تو تھان پر لوٹنے کی شوخی تھی۔ اسی گلی میں ملی بھی نیرا شہر کے راستوں پر اور ہوٹلوں میں تو سوکھے حسن پوری کے سامنے بھی یوں جیسے ملی کے سامنے چُوہا۔ راستے پر ایسے چلیں گے جیسے لاوارث عورت پھاٹک پر بیٹھے۔ ان کی غیرت صرف ذاتی زر، زن اور زمین تک محدود ہے نہ کہ اجتماعی اور قومی۔ دوسروں کی ان کو پروا نہیں۔ بس افسر شاہی کی خوشامد میں پورے ہیں۔ یوں تو مرتے کے حلق میں پانی نہ ڈالیں، پڑوس میں کوئی مر رہا ہو تو جھوٹا تک نہ دیں، مگر جب ایوب خان جیسا سخت حاکم آئے تو شغل اور شکار کا خوب بندوبست کریں گے۔ ایک دو دن میں ساٹھ ہزار سے زیادہ اُڑا دیں گے۔ کچھ تو دوستی کے نبھانے مہمانوں کی خوشی کی خاطر ہر قسم کی دلالی کرنے کو بھی تیار ہو جاتے ہیں۔ ایسے مہمان تو نامراد بس ایک جملہ کہہ کر چلتے ہیں کہ یہاں آ کر ہمیں ایسا محسوس ہوا گویا یہ ہمارا دوسرا گھر ہے۔ محفل میں تو اس جملے پر واہ واہ ہو گئی۔ ابھی یہ محفل جاری تھی کہ جنوب کی سمت سے شور اٹھا مس کراچی اپنے آبائی وطن واپس آ رہی تھی کہ اس کے بھائیوں نے ملیر کے پاس راستے میں کلہاڑیوں سے وار کر کے موقعے ہی پر مار ڈالا۔ اس کا دھڑ ایک نالے میں پھینک دیا اور اب سر لے کر آنے والے ہیں۔

مس کراچی کاری بنا کر مار ڈالی گئی اور فخر سے مارُوڑوں کا سر اونچا ہو گیا۔

ماں، پہاڑوں سے یہ کوبح صرور سنائی دی نوحواں ساتھیو! سدھ کے وار تو! ساتھ چلتا رہے! لاٹ حلتی رہے! سدھ حیتا رہے! اب نہ کوئی بیٹی حاگے گی نہ مارُو ماییں رس چپلیں گھسیٹتے، پگڑیاں حھولیوں میں ڈالے رُلتے پھریں گے اور نہ شرافت میں دھوکا کھائیں گے۔ آسدہ سر احسی کو سوچ سمجھ کر ساہ دیں گے۔ اس رمیں کے بیری، حاسد اور بعصی کو یا لوٹنا پڑے گا یا لیٹنا پڑے گا، یا اُلٹا پڑے گا یا لبیک کہہ کر جھکنا پڑے گا!

**

اگلے صفحات میں ایک مقالے کی تلخیص پیش کی جا رہی ہے جو عبدالحمید شیخ نے ۱۹۹۰ میں داؤد کالج آف انجینیئرنگ، کراچی، کے آرکیٹیکچر اینڈ پلاننگ ڈپارٹمنٹ کے لیے بیچلر آف آرکیٹیکچر کے کورس کے ایک حصے کے طور پر تیار کیا تھا۔ اس مقالے کا عنوان *Informal Sector Housing Study of Goths in Karachi* تھا اور اس میں شہر کے دیہی علاقے کے باشندوں کے رہائشی اور دیگر مسائل کی تفصیلات اور ان مسائل کے ممکنہ حل پیش کیے گئے تھے۔ کراچی کی آبادی کا یہ ایک ایسا حصہ ہے جو عموماً لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہتا ہے۔ علاوہ ازیں اس مقالے میں کچھ ایسی تفصیلات کا بھی تذکرہ آیا ہے جو کراچی شہر کے معاملات کو سمجھنے میں کارآمد ہو سکتی ہیں۔

عبدالحمید شیخ

انگریزی سے ترجمہ اور تدوین: اجمل کمال

کراچی کے گوٹھ

پاکستان کے متواتر پھیلتے ہوئے شہری مراکز کے ارد گرد دیہی بستیاں قائم ہیں۔ شہروں کے تیزی سے پھیلنے کے عمل میں یہ دیہی بستیاں شہری علاقوں میں شامل ہوتی جا رہی ہیں۔ کراچی شہر کے گردونواح میں بھی سندھ کی دیہی بستیاں یا گوٹھ واقع ہیں۔ تمام سمتوں میں شہر کے پھیلاؤ کے باعث یہ دیہی علاقے شہری محلوں میں تبدیل ہوتے جا رہے ہیں اور اس عمل میں ان کے باشندوں کو ایسی سماجی اور ثقافتی اقدار میں تیز رفتار تبدیلیوں یا اپنی جگہ سے اکھڑ کر کہیں اور منتقل ہو جانے کے درمیان انتخاب کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

پاکستان کے قیام کے بعد کراچی کو ملک کا دارالحکومت قرار دے کر صوبہ سندھ سے علیحدہ کر دیا گیا۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں سے مہاجروں کی آمد کے باعث اس شہر کا پھیلاؤ بہت تیز رفتاری سے ہوا۔ اس بے پناہ تبادلہ آبادی نے شہر کے طبعی اور معاشرتی حالات پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ شہر میں موجود جائیدادوں کی ملکیت تبدیل ہوئی۔ حکومت کی بیشتر توجہ آنے والے مہاجروں کی آبادکاری اور انھیں سہولتوں کی فراہمی پر مرکوز رہی جبکہ مقامی گوٹھوں کو مکمل طور پر نظرانداز کیا گیا۔ آزادی کے بعد کے برسوں میں بھی کراچی شہر میں موجود معاشی مواقع پاکستان کے مختلف خطوں کے افراد کو یہاں آ بسنے پر مائل کرتے رہے۔ شہر میں مکانات اور ڈویلپ کیے ہوئے رہائشی پلاٹ اس تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کی ضروریات کے لیے ناکافی تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آنے والے لوگ کسی منصوبہ بندی کے بغیر شہر کے کھلے میدانوں، چراگاہوں اور زرعی زمینوں پر آباد ہونے لگے۔ مختلف سماجی اور ثقافتی رویوں کی حامل ان آبادیوں نے گوٹھوں کے باشندوں پر اثرانداز ہونا شروع کیا۔

آزادی سے پہلے کے معاشرتی حالات میں کراچی کے گوٹھ معاشی طور پر خود کفیل تھے؛ ان کی معاشی سرگرمیوں میں ماہی گیری، باغات اور زراعت شامل تھی۔ شہر کے تیز رفتار پھیلاؤ کے باعث ان گوٹھوں کی چراگاہیں اور زرعی زمینیں کچھ تو مختلف سرکاری ترقیاتی اداروں نے اپنی رہائشی اسکیموں کے لیے حاصل کر لیں اور کچھ پر بے گھر مہاجروں کا قبضہ ہو گیا۔ ان تیز رفتار تبدیلیوں کے باعث گوٹھوں کا طبعی نظام سمت

متاثر ہوا۔ شہر میں شامل ہونے والے گوٹھوں کے بیشتر باشندوں کو اپنی بگڑتی ہوئی معاشی حالت کے پیشِ نظر زمینیں فروخت کر کے مزید باہر کی طرف منتقل ہونا پڑا۔ بعض باشندوں نے شہر میں شامل ہونے کو معاشی اعتبار سے بہتر محسوس کیا۔

کراچی ڈویژن میں اس وقت بھی کم از کم ۱۲۰۰ گوٹھ موجود ہیں۔ ان میں ایک ہزار سے زیادہ گوٹھ کراچی کے شہری علاقوں کی سرحدوں پر واقع ہیں۔ یہ گوٹھ بڑھتے اور پھیلتے ہوئے شہر کے لیے کھلی ہوا کے علاقوں کا کام دے سکتے ہیں جن کی شہر کو اشد ضرورت ہے۔ ان گوٹھوں کی آبادی تقریباً سات لاکھ ہے۔ ان گوٹھوں پر مناسب توجہ دینے کی اور بہتر منصوبہ بندی کے ذریعے ضروری سہولتیں فراہم کرنے کی ضرورت ہے تاکہ یہاں کے باشندوں کو مضر حالات سے محفوظ رکھا جاسکے۔

اس مطالعے کا مقصد ان اثرات کا جائزہ لینا اور ان گوٹھوں کے غائب ہوتے چلے جانے کے عمل کی وجوہ متعین کرنا ہے۔ اس کے علاوہ اس ضمن میں سرکاری ترقیاتی پالیسیوں اور کراچی کے گوٹھوں پر ان کے اثرات کا بھی جائزہ لیا جائے گا اور اس تجزیے کی روشنی میں ایسی تجاویز مرتب کی جائیں گی جن کے ذریعے ان گوٹھوں کی حالت کو بہتر بنایا جاسکے۔

تمام معاشروں کی طرح سندھ میں بھی دیہی بستیوں یا گوٹھوں کا ارتقا زرعی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ہوا۔ یہ گوٹھ زرخیز زمینوں اور پانی کی دستیابی کے اعتبار سے مختلف علاقوں میں قائم ہوئے۔ زراعت کی بنیادی اہمیت کے باعث کاشتکاروں کو اس معاشرے میں اہم ترین مقام حاصل تھا اور ان کی ضروریات کے مطابق مختلف کاریگر پیشوں ـــــ بڑھئی، حجام، حمال، جُلاہے وغیرہ ـــــ نے جنم لیا اور زراعت پر مبنی سماجی نظام پیدا ہوا۔ اس نظام میں طاقت رفتہ رفتہ زرخیز زمین کے بڑے بڑے رقبوں کے مالک افراد اور خاندانوں میں مرکوز ہوگئی جس نے آگے چل کر زمینداری یا جاگیرداری کے ادارے کو جنم دیا۔ آبادی میں اضافے کے ساتھ مختلف قسم کے سماجی قصبے پیدا ہونے لگے جن کے باعث معاشرے میں مذہب کے اثرات اور مذہبی رہنماؤں کی سماجی اہمیت میں اضافہ ہوا۔ ان گوٹھوں کے مستحکم ہونے کے بعد سندھ سے باہر کے لوگ یہاں آبسنے پر مائل ہونے لگے۔ اس کے علاوہ سندھ کی زرخیز زمینوں کی کشش سے پٹھان، بلوچ، بروہی، جاٹ، ارغون اور متعدد دوسرے قبائل آکر سندھ میں آباد ہوئے۔ ان لوگوں کی آمد سے سندھ میں گوٹھوں کے قیام کا عمل تیز ہوا اور ان نے مختلف قبائلی پس منظر کے باعث بہت سے سماجی، سیاسی اور مذہبی مسائل بھی پیدا ہوئے۔

زراعتی معاشرے کے ارتقا اور تجارتی سرگرمیوں کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ ان دیہی بستیوں نے رفتہ رفتہ قصبوں اور روایتی شہروں کی صورت اختیار کی۔ اس طرح سندھ کے مختلف شہر سکھر، شیروں کوٹ، حیدرآباد، دیبل، ٹھٹھہ، کراچی وغیرہ وجود میں آئے۔ کراچی ایک زمانے میں ماہی گیروں کا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جو کلاچی جو گوٹھ کہلاتا تھا اور ماہی گیری کے ایک مقام کے قریب واقع تھا جسے گوٹھ کی

سمت سے کلاچی جو کُن کہا جاتا تھا۔ ماہی گیری کے اس مقام کے بارے میں شاہ عبداللطیف بھٹائی کے رسالے کی ایک کہانی بھی مشہور ہے جس میں مورڑو نامی ایک شخص کے ماہی گیر بھائیوں کو مگرمچھ نے نگل لیا تھا اور اس نے اپنی ذہانت اور کاریگری سے کام لے کر اس مگرمچھ کو مار ڈالا تھا۔ مورڑو کے بھائیوں کی لاشیں مگرمچھ کے پیٹ سے نکال کر کیماڑی کے قریب دفن کی گئی تھیں۔ یہ قبریں اب بھی ماری پور کے پُل کے قریب، لوکل ٹرین کے وزیر مینشن اسٹیشن کے سامنے کی طرف موجود ہیں۔ مورڑو کے وارث اب تک کراچی کے مختلف گوٹھوں ـــــ شمس، بابا بھٹ، ریڑھی میاں اور ابراہیم حیدری ـــــ میں رہتے ہیں۔ شاہ لطیف کے رسالے کے ایک سُر میں اس واقعے سے متعلق اشعار شامل ہیں۔ کراچی کا شہر قائم ہونے کے وقت اور اس سے پہلے بھی اس علاقے کے کئی گوٹھوں کے حوالے مختلف تاریخی دستاویزات میں آتے ہیں۔ ان میں ابراہیم حیدری، منگھوپیر، گڈاپ، ملیر، اورنگی، بابا بھٹ، شمس، عالمانو، لیاری اور ریڑھی شامل ہیں۔ چوکنڈی اور گڈاپ کے قریب بلوچوں کی پرانی قبروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ کراچی شہر کے ارد گرد کے علاقے میں بہت عرصہ پہلے بھی دیہی بستیاں موجود تھیں۔

۱۷۲۹ میں ایک ہندو تاجر بھوجومل اپنے خاندان کے ساتھ کھڑک بندر سے کراچی گوٹھ میں منتقل ہوا۔ اس کے علاوہ شاہ بندر سے بھی کچھ لوگ یہاں آ گئے۔ اس طرح بیس پچیس ماہی گیروں پر مشتمل بستی ایک چھوٹے سے تجارتی قصبے میں تبدیل ہو گئی۔ رفتہ رفتہ ایک فصیل تعمیر کی گئی اور شہر کے باشندے وہاں رہنے لگے۔ ۱۷۹۵ تک کراچی سندھ اور قلات کے حکمرانوں کے مابین ایک متنازعہ شہر تھا۔ آخرکار اس پر سندھ کے ٹالپر خاندان کا قبضہ ہو گیا جو انگریزوں کی فتح تک قائم رہا۔ ۱۸۱۸ میں کراچی کی آبادی تقریباً تیرہ ہزار تھی اور فصیل بند علاقے میں مکانوں کی تعداد ۳۲۵۰ تھی۔ ہنری پوٹنگر کا بیان ہے کہ آبادی میں اکثریت ہندو تاجروں کی تھی۔ ۱۸۳۰ میں چارلس میسن کراچی سے گزرا اور اس نے اسے ایک غلیظ شہر کے طور پر بیان کیا۔ جدید کراچی شہر کی تاریخ ۱۸۳۹ میں انگریزوں کی فتح کے وقت سے شروع ہوتی ہے۔ سندھ کی فتح کے بعد چارلس نیپیئر نے میروں کے دارالحکومت حیدرآباد کے بجائے کراچی کو سندھ کا صدر مقام بنایا۔ ۱۸۴۰ میں کراچی کی آبادی ۱۳۸۵۰ تھی جس میں نو ہزار ہندو اور باقی مسلمان تھے۔ ۱۸۴۶ میں شہر کی فصیل کو مکمل طور پر ڈھا دیا گیا۔ اس کے بعد فصیل سے باہر کے علاقوں میں بمبئی اور کچھ سے آنے والے تاجروں نے اپنے مکانات بنوانے شروع کیے، اور یوں رتن تلاؤ، رام باغ، رام سوامی اور نانک واڑا کے محلے وجود میں آئے۔ ۱۸۴۶ ہی میں کراچی کا کنزروینسی بورڈ قائم کیا گیا جو میونسپلٹی کی ابتدا تھی۔

۱۸۴۷ میں سندھ کو بمبئی پریذیڈنسی کا حصہ بنا دیا گیا اور اس کا انتظام کمشنر کے سپرد کیا گیا۔ ۱۸۵۱ میں کنزروینسی بورڈ کو میونسپل کمیشن کی شکل دے دی گئی اور اس کے سربراہ کے عہدے کو میئر کا نام دیا گیا۔ اس وقت کراچی کی آبادی ۲۳ ہزار تھی۔ ۱۸۵۲ میں کمشنر سندھ بارٹل فریئر نے کراچی میونسپلٹی قائم کی، شہر کی میونسپل حدود مقرر کی گئیں اور شہر میں ترقیات اور سڑکوں وغیرہ کا

منصوبہ تیار کیا گیا۔ ۱۸۵۹ کے دوران رام باغ کے کنووں سے پانی کی پائپ لائن صدر روڈ سے گزار کر پرانے کسٹم ہاوس تک پہنچائی گئی جس کی بدولت یہ علاقہ رہنے کے لیے پرکشش ہو گیا۔ اسی سال میونسپلٹی نے زمین کی فروخت کا سلسلہ شروع کیا۔ ۱۸۵۸ میں انگریزوں نے شہر کو دو حصوں ـــ میونسپل ایریا (۱۷٫۰۴۲ مربع میل) اور کنٹونمنٹ ایریا (۲٫۰۹۲ مربع میل) ـــ میں تقسیم کیا۔ اسی سال چارلس نیپیئر نے بندرگاہ کو وسعت دینے کا کام شروع کیا۔ ۱۸۶۱ میں کراچی سے کوٹڑی تک سندھ کی پہلی ریلوے لائن بچھائی گئی۔ ٹرانسپورٹ کی سہولتوں اور بندرگاہ کی سرگرمیوں میں اضافے کی وجہ سے لوگ زیادہ تعداد میں باہر سے آ کر کراچی میں آباد ہونے لگے اور ۱۸۷۲ تک شہر کی آبادی ۵۷ ہزار ہو گئی۔ یہ لوگ بیشتر میونسپل ایریا میں آباد ہوئے جس کے ایک طرف سمندر، دوسری طرف ریلوے لائن اور تیسری طرف کنٹونمنٹ اور چوتھی طرف دریائے لیاری واقع تھا۔ ۱۸۶۹ میں نہر سویز کے کھلنے کے بعد بندرگاہ کے طور پر کراچی کی اہمیت میں اضافہ ہوتا گیا۔ ۱۸۸۴ میں شہر میں ٹرام متعارف کرائی گئی جو کیماڑی سے صدر بازار تک جاتی تھی۔ بعد میں اسے کنٹونمنٹ اسٹیشن اور دوسرے علاقوں تک پھیلایا گیا۔ ۱۸۹۴ میں شہر میں زیرزمین نکاسی کا پہلا موثر نظام قائم کیا گیا۔ ۱۹۱۴ میں بجلی آئی۔ اس وقت تک کراچی برطانوی سلطنت میں غلے کی برآمد کی سب سے بڑی بندرگاہ بن چکا تھا۔ ۱۹۲۰ میں ٹیلی فون کی سہولت دستیاب ہوئی۔

۱۹۱۵ میں ہندوستان میں شہری منصوبہ بندی (town planning) کا تصور متعارف کیا گیا تاکہ شہروں کے مرکزی علاقوں کو گھٹن سے محفوظ رکھا جا سکے۔ حکومت نے میرمس (Mirams) نامی منصوبہ ساز اور سرویئر کو شہر کے بارے میں ایک منصوبہ تیار کرنے کا کام سونپا، یہ منصوبہ ۱۹۲۳ میں تیار کیا گیا۔ اس منصوبے میں شہر کے مضافات میں پھیلاو اور سڑکوں اور ریلوے لائن کی توسیع کی اسکیمیں پیش کی گئیں۔ شہر کے اس وقت کے مرکز ـــ آرٹلری میدان ـــ کے علاوہ گارڈن کوارٹر، صدر روڈ کی توسیع، میراں پیر وغیرہ کے علاقوں کی منصوبہ بندی بھی مسٹر میرمس ہی نے کی تھی۔ ۱۹۲۴ میں برصغیر کا پہلا ایروڈروم کراچی میں تعمیر کیا گیا جسے بعد میں بین الاقوامی ایرپورٹ کی حیثیت دی گئی۔ ۱۹۲۵ میں شہر میں تعمیراتی سامان کی فراہمی کے لیے پہلی سیمنٹ فیکٹری قائم ہوئی۔

۱۹۳۷ میں سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کر کے صوبہ بنایا گیا اور کراچی اس کا صدر مقام بنا۔ اس کے بعد متعدد اہم عمارتیں ـــ اسمبلی بلڈنگ، گورنر ہاوس، چیف کورٹ بلڈنگ ـــ تعمیر کی گئیں۔ انھیں دنوں شہر کے مرکزی علاقے میں ۴۰ ایکڑ کے رقبے پر زولوجیکل گارڈن قائم کیا گیا۔ ۱۹۴۲ میں کراچی میں پانی کی فراہمی ناکافی ہو گئی، فراہمی بہتر بنانے کے لیے ملیر اسکیم تیار کی گئی جو ۱۹۴۴ میں مکمل ہوئی۔ ۱۹۴۶ میں ایک انگریز منصوبہ ساز ہوبن تھامس نے کراچی کا ماسٹر پلان تیار کیا لیکن ہندوستان بھر میں تحریک آزادی کے باعث اسے عمل میں نہ لایا جا سکا۔ انگریزوں کے قبضے میں آنے کے بعد سے شہر کی منصوبہ بندی اور ترقی انھیں کے ہاتھوں ہوئی، یہی وجہ ہے کہ ان کے رہائشی علاقے کے آس پاس

یوروپی طرز تعمیر ملتا ہے۔ آزادی کے وقت، جب شہر کی آبادی ساڑھے چار لاکھ تھی، اسے ہندوستان کا سب سے صاف ستھرا شہر سمجھا جاتا تھا۔ برطانوی طور میں کراچی میں بہت توسیع ہوئی لیکن یہ توسیع مرحلہ وار اور منصوبے کے تحت تھی۔

کراچی شہر کی توسیع اور ترقی کا خاکہ دنیا کے دوسرے صنعتی اور تجارتی شہروں سے مختلف ہے۔ مغربی ملکوں میں بڑے شہروں کے تاریخی پھیلاو کا ایک اہم عنصر صنعتی انقلاب تھا، جس کی کراچی کے پھیلاو کے سلسلے میں کوئی اہمیت نہیں تھی، بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کراچی کا پھیلاو صنعت کاری کی ترقی کے بغیر ہوا۔ کراچی کے معاملے میں بنیادی اہمیت وادیٔ سندھ اور پنجاب کے علاقے سے کپاس اور غلے کی برآمدی تجارت کو حاصل تھی، ان علاقوں میں ۱۸۶۰ کے بعد نہری آبپاشی کا نظام تعمیر ہونے کے بعد یہ تجارت تیزی سے بڑھ گئی۔ اس طرح یہ ایک مثالی نوآبادیاتی بندرگاہ تھی جسے غیرملکیوں نے بنایا تھا تاکہ یہاں سے اجناس مغربی ملکوں کو برآمد کی جا سکیں۔ ۱۹۴۷ تک کراچی شہر کی اہمیت بمبئی اور لاہور کے مقابلے میں ثانوی رہی۔

۱۹۴۷ میں کراچی پاکستان کا دارالحکومت بنا۔ اس وقت کراچی کا رقبہ ۲۳۳ مربع کلومیٹر تھا۔ ملک کا دارالحکومت ہونے اور قریبی کھوکھراپار کی سرحد کے کھلنے کے باعث ہندوستان سے مہاجروں کی سب سے بڑی تعداد یہاں منتقل ہوئی۔ ۱۹۵۱ تک شہر کی آبادی دس لاکھ سے زیادہ ہو چکی تھی۔ ۱۹۴۷ سے ۱۹۵۸ تک کے عرصے میں ۱۴ لاکھ لوگ کراچی میں رہائش اختیار کر چکے تھے۔ ان میں سے چھ لاکھ لوگ ہندوستان سے آئے تھے اور باقی دوسرے پاکستانی علاقوں سے۔ آبادی کی اس تیزرفتار منتقلی نے شہر کے سماجی اور طبعی ماحول میں گہری تبدیلیاں پیدا کر دیں۔ ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی جائیدادیں کلیم کے طریق کار کے مطابق مہاجروں کو دی گئیں۔ مہاجروں کی بہت بڑی تعداد جو اس طریق کار سے رہنے کی جگہ حاصل نہ کر سکی تھی، شہر کی جگہوں پر قابض ہو گئی۔ ان جگہوں میں غیررہائشی عمارتیں، مثلاً اسکول، لائبریریاں اور کلب وغیرہ بھی شامل تھے۔ انھوں نے شہر بھر کے خالی میدانوں میں بےشمار جھگیاں ڈال لیں۔ چوں کہ مہاجر مقامی آبادی کے مقابلے میں زیادہ پڑھے لکھے تھے، اس لیے درمیانہ طبقے کی ملازمتیں، جو ہندوؤں کے جانے سے خالی ہوئی تھیں، انھیں مل گئیں۔

آزادی کے بعد، ۱۹۴۸ میں، حکومت پاکستان نے ۱۹۴۰ کی قرارداد پاکستان کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کراچی کو وفاق کے زیرانتظام علاقہ قرار دے دیا۔ (وفاقی حکومت کے انتظام میں آنے کے وقت کراچی میں لس بیلہ کا علاقہ بھی شامل کر لیا گیا۔) سندھ اسمبلی نے اس اقدام کے خلاف قرارداد منظور کی اور صوبے بھر میں احتجاج ہوا، لیکن وفاقی حکومت کا فیصلہ برقرار رکھا گیا۔ چوں کہ وفاقی حکومت کے اہلکاروں کی بڑی تعداد مہاجروں پر مشتمل تھی اس لیے حکومت کی تمام توجہ مہاجروں کی آبادکاری پر مرکوز رہی اور وفاقی انتظام کے تحت آنے والوں گوٹھوں کو مکمل طور پر نظرانداز کر دیا گیا۔ ذریعۂ تعلیم اردو ہونے کے باعث ان گوٹھوں کے لوگ اپنی مادری زبان میں تعلیم پانے کے حق سے محروم کر دیے گئے۔

کم از کم ۱۳۰۰ سندھی میڈیم اسکول یا تو بند کر دیے گئے یا انہیں اردو میڈیم اسکول بنا دیا گیا۔ سندھ یونیورسٹی کو کراچی سے حیدر آباد منتقل کر دیا گیا اور یہاں کراچی یونیورسٹی قائم کی گئی جس کے سنڈیکیٹ نے سندھی زبان میں امتحان دینے کی ممانعت کر دی۔ اس صورت حال نے مقامی دیہی آبادی کے لیے ترقی کے راستے بند کر دیے، کیوں کہ اردو ان کے لیے ایک اجنبی اور اوپر سے نافذ کی گئی زبان تھی۔ دیہی آبادی کے لیے تعلیم حاصل کرنا، اور نتیجتاً بہتر ملازمت حاصل کرنا، ممکن نہ رہا۔ دوسری طرف ان کے ذریعۂ معاش، یعنی زرعی زمین، پر مہاجروں کی آبادیاں قائم ہو گئیں یا اسے حکومت نے اپنی رہائشی اسکیموں کے لیے تحویل میں لے لیا۔ ۱۹۵۵ میں مغربی پاکستان کے صوبوں کی جداگانہ حیثیت ختم کر کے اس پورے خطے کو ون یونٹ بنا دیا گیا، جس کے بعد سندھ کے باہر سے آ کر کراچی میں بسنے والوں کی تعداد تیزی سے بڑھنے لگی۔

۱۹۶۰ کی دہائی میں پنجاب میں سبز انقلاب برپا ہونے سے زراعت سے فارغ ہونے والے مزدور بڑی تعداد میں کراچی کا رخ کرنے لگے۔ چوں کہ وہ اپنے خاندانوں کو پنجاب میں چھوڑ کر آتے تھے، اس لیے مقامی دیہی مزدوروں کے مقابلے میں کم اُجرت پر کام کرنے کو تیار تھے۔ (یہی معاملہ آج کل ماہی گیری کی صنعت میں کام کرنے والے بنگالیوں کا بھی ہے۔) اس طرح گوٹھوں کے باشندوں کے ہاتھ سے معاش کا یہ ذریعہ بھی نکل گیا۔ یوں ان کی معاشی حالت سخت خراب ہو گئی اور معاشی دباؤ کے تحت انہیں گوٹھوں میں اپنی زمینیں نہایت سستے داموں بیچنی یا کرائے پر دینی پڑیں۔ اس طرح گوٹھوں کی آبادی میں مختلف لسانی گروہوں کے لوگ شامل ہو گئے، اور پرانے باشندوں کو اپنی جگہ سے اکھڑ کر پھیلتے ہوئے شہر کی بیرونی سرحدوں پر نئی بستیاں بسانی پڑیں۔

کراچی کے گوٹھوں کی آبادی میں سندھ اور بلوچستان کے مختلف قبائل ـــ بُرفت، کلامتی، خاصخیلی، جوکھیو وغیرہ ـــ کے لوگ شامل تھے۔ یہ لوگ برطانوی دور سے پہلے سے آ آ کر ساحل کے ارد گرد بستیاں بسا کر رہنے لگے تھے۔ برطانوی دور میں تجارت وغیرہ کی غرض سے آنے والے بھی شہر کے باہر دو ایک جھگیاں ڈال کر رہنے لگتے تھے۔ بعد میں ان کے خاندانوں کے آ جانے سے رفتہ رفتہ یہ آبادی ایک گوٹھ کی شکل اختیار کر لیتی۔ کراچی کے ارد گرد کا علاقہ آج کی طرح پہلے بھی زیادہ تر بنجر تھا۔ زیادہ تر آبادی کی گزر بسر ماہی گیری پر تھی۔ کراچی کے تاجروں کی تجارتی کوٹھیاں کاٹھیاواڑ، بمبئی، مالابار اور زنجبار تک پھیلی ہوئی تھیں۔ یہاں سے خشک مچھلی اور شارک کی ہڈیاں بمبئی، مسقط وغیرہ بھیجی جاتی تھیں۔ ماہی گیری اس قدر عام تھی کہ گھوڑوں تک کو کھانے کے لیے خشک مچھلیاں دی جاتی تھیں۔ مچھلیوں کی چربی سے تیل بنایا جاتا جو کشتیاں بنانے کے کام آتا تھا۔ پرانے زمانے میں کراچی کے علاقے میں کوئی قدرتی کھاڑی نہیں تھی۔ لیکن انڈس ڈیلٹا کے علاقے میں، جہاں دریائے سندھ کئی شاخوں میں بٹ کر سمندر میں گرتا تھا، دریائی بندرگاہیں قائم تھیں جہاں سے کشتیاں اور جہاز سمندری بندرگاہوں کو جاتے تھے۔

ڈیلٹائی میں بھی نہایت زرخیز تھی اور وہاں کے گوٹھوں میں رہنے والے سب سے باشندوں کا پیشہ کاشت تھا۔

برطانوی دور میں کراچی کے صدر گاہ بننے کے بعد آبادی میں اضافے کے باعث یہاں گوشت، سبزیوں اور پھلوں کی مانگ میں بھی اضافہ ہوا۔ چنانچہ انگریزوں نے شہر کے ارد گرد کے زرخیز قطعوں میں باغبانی اور زراعت کی حوصلہ افزائی کی۔ گوٹھوں کے باشندے انگریزی حکومت کے دفتروں میں چپراسی وغیرہ کے طور پر بھی کام کرنے لگے۔ ۱۸۸۵ میں کراچی کے گوٹھوں کا سروے کیا گیا اور اس وقت موجود گوٹھوں کو نقشے پر ظاہر کیا گیا۔ ہر گوٹھ کی رہائشی (یا سکنی) زمین کی حد بندی کی گئی اور وہاں کاشت کرنا ممنوع قرار دیا گیا جبکہ باقی زمین پر کاشت کاری کی اجازت تھی۔ بعد میں گوٹھوں کے باشندوں نے شہر کی ضروریات میں اضافے کے پیشِ نظر چراگاہوں کی زمین پر بھی سبزیوں اور پھلوں کی کاشت شروع کر دی۔

گوٹھوں کے لوگ بار برداری اور سفر کے لیے اونٹ، گھوڑے، گدھے، بیل گاڑیاں وغیرہ استعمال کرتے تھے، اور جن لوگوں کے پاس یہ جانور نہیں تھے وہ پیدل چلتے تھے۔ مکان کچے اور بے ترتیبی سے ساتھ ساتھ بنے ہوتے تھے، اور ان کی تعمیر میں گارا، شہتیر اور سرکنڈے وغیرہ استعمال ہوتے تھے اور ان کے گرد ببول کی باڑ لگی ہوتی تھی۔ زیادہ تر گوٹھ ذات برادری یا قبیلے کی بنیاد پر آباد ہوتے تھے۔ بڑے گوٹھوں میں مکانوں کے درمیان ایک وسیع میدان ہوتا تھا جو عورتوں اور بچوں کی سرگرمیوں اور برادری کی تقریبوں وغیرہ کے کام آتا تھا۔ زیادہ تر گوٹھوں کے ارد گرد ببول یا کیکر کی کانٹے دار باڑ کھنچی ہوتی تھی، بعض صورتوں میں کچی دیوار بنائی جاتی تھی۔ بیشتر گوٹھوں میں رہائشی مکانوں سے کچھ فاصلے پر ایک بڑی سی اوطاق یا بیٹھک کا ہونا لازمی تھا جسے باقی مکانوں ہی کے انداز میں گارے وغیرہ سے بنایا جاتا تھا۔ مرد مسافروں اور مہمانوں کو یہیں ٹھہرایا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ اوطاق شام کے وقت گوٹھ کے مردوں کے بیٹھنے اور برادری کے معاملات پر بات چیت کرنے کے کام آتی تھی۔ گوٹھ کے ایک کونے پر مسجد بنی ہوتی تھی۔ اگر کسی گوٹھ میں اوطاق نہ ہوتی تو مسجد اوطاق کا کام سرانجام دیتی۔ مکانوں کی دیواروں اور چھتوں کے لیے بنی ہوئی چٹائیاں بھی استعمال ہوتی تھیں۔ مکانوں کا نقشہ گوٹھ کے معاشرتی حالات اور اس کے باشندے کی مالی حالت پر منحصر تھا اور ایک کمرے، برآمدے اور چھوٹے صحن سے لے کر کئی کمروں اور بڑے صحن تک پر مشتمل ہو سکتا تھا۔ مکانوں کے اندرونی حصے کو استعمالی اعتبار سے تقسیم کرنے کا رواج نہیں تھا بلکہ اٹھنے بیٹھنے، سونے اور کھانا پکانے کا کام ایک ہی حصے میں کیا جاتا، جس سے مکان اندر سے کھلا کھلا معلوم ہوتا تھا۔ ایک ہی مکان میں پورے خاندان کے ساتھ رہنے کا رواج تھا۔ گوٹھ کے بیشتر مکانوں کا رخ جنوب کی طرف رکھا جاتا تھا تاکہ جاڑوں میں شمال کی سمت سے آنے والی سرد ہوا سے بچاؤ ہو سکے۔ جاڑوں میں لوگ اندر کمرے میں سویا کرتے۔ برآمدہ دن میں اٹھنے بیٹھنے کے کام آتا۔ صحن اس تعمیر کا سب سے اہم حصہ ہوتا اور سال کے بیشتر حصے میں گھر بھر کی زیادہ تر سرگرمیاں یہیں انجام پاتی تھیں۔

صحن کے باہر کی طرف اونچی دیوار ہوتی تھی اور اسے باہر سے نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔ کچھ مکانوں میں یہاں ایک آدھ پیڑ بھی لگایا جاتا تھا۔ صحن کو مویشی باندھنے، کپڑے دھونے اور گرمی کے موسم میں کھانا پکانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ مکانوں میں غسل خانے الگ سے نہیں ہوتے تھے بلکہ صحن ہی میں تین یا چار پلنگ کھڑے کر کے نہانے کی عارضی جگہ بنالی جاتی تھی۔ پردے کے لیے پلنگوں پر رلیاں ڈال دی جاتی تھیں۔

کراچی کا حصہ رقبہ بلدیہ عظمیٰ (KMC) اور ضلع کاؤنسل کی حدود میں آتا ہے۔ اس میں تقریباً بارہ سو گوٹھ موجود ہیں۔ ان گوٹھوں کو تین قسموں میں بانٹا جاسکتا ہے ساحلی، دیہی اور شہری گوٹھ۔ ساحلی گوٹھ بیشتر مچھلی اور جھینگے پکڑنے کی موزوں جگہوں کے قریب واقع ہیں۔ ان گوٹھوں میں تقریباً کوئی بھی شہری سہولت موجود نہیں ہے۔ کراچی کے ساحل پر یہ گوٹھ صدیوں سے قائم ہیں، انہیں کراچی شہر کا پیش رو بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس قسم کے گوٹھ بلدیہ اور ضلع کاؤنسل دونوں کی حدود میں موجود ہیں۔ اس وقت ان گوٹھوں کا سب سے بڑا مسئلہ بنگلادیش، برما، سری لنکا اور ہندوستان سے آنے والے غیر قانونی تارکین وطن ہیں جنھوں نے ان گوٹھوں کے آس پاس اپنی بستیاں قائم کر لی ہیں۔ دیہی گوٹھ کراچی کے شہری علاقے کی بیرونی سرحدوں پر واقع ہیں اور ان کے باشندوں کا بنیادی ذریعہ معاش کھیتی باڑی ہے۔ اس کے علاوہ ان گوٹھوں کی آبادی کے کچھ لوگ شہری علاقوں میں مزدوری بھی کرتے ہیں۔ یہ گوٹھ شہر کے متواتر پھیلاو کی وجہ سے عدم تحفظ کا شکار ہیں۔ یہ لوگ بہتر شہری سہولتوں کے ساتھ اسی قدیم جگہ پر قائم رہنا چاہتے ہیں۔ شہری گوٹھ ایک زمانے میں خود کفیل دیہی گوٹھ تھے، لیکن شہر کے رہائشی اور صنعتی علاقوں کے پھیلنے کے ساتھ ساتھ ان کے درمیاں گھر کر رہ گئے ہیں۔ ان کی زراعتی زمیں بالکل ختم ہو چکی ہے اور اب ان کی حیثیت صرف ان باشندوں کی رہائشی بستی کی رہ گئی ہے جو اپنے روایتی ذریعہ معاش سے مکمل طور پر محروم ہو چکے ہیں۔ شہری گوٹھوں میں سے کچھ کی آبادی اب تک نسلی، مذہبی اور لسانی اعتبار سے ہم آہنگ ہے، جبکہ باقی میں مختلف پس منظر رکھنے والے لوگ آبسے ہیں۔ روایتی معاش کھو بیٹھنے کے بعد ان گوٹھوں کے باشندوں کے پاس ایک متبادل یہ ہو سکتا تھا کہ وہ اپنے بچوں کو تعلیم دلائیں تاکہ وہ بہتر آمدنی والے پیشے اختیار کر سکیں، لیکن کراچی کی حدود میں ذریعہ تعلیم کے اردو ہونے کی وجہ سے ایسا کرنا ممکن نہ رہا۔ ان حالات میں ان کے پاس یہی ایک راستا باقی تھا کہ شہر میں جا کر غیر ہنرمند مزدور کے طور پر کام کریں۔ اس طرح ان کی معاشی حالت سخت خراب ہو گئی۔ رفتہ رفتہ انھوں نے اپنی رہائشی زمیں بیچنی یا کرائے پر اٹھانی شروع کر دی۔

گوٹھوں کے رہنے والوں کی معاشی حالت عموماً خراب ہے، سوائے چند لوگوں کے جنھوں نے کوئی مستقل روزگار تلاش کر لیا ہے۔ مختلف قسم کے گوٹھوں میں یہ روزگار مختلف نوعیت کا ہے۔ شہری گوٹھوں میں رہنے والے عموماً مزدور یا نچلے درجے کے کارکن کے طور پر مختلف اداروں میں کام کرتے

ہیں۔ چند گوٹھوں میں لوگ اب بھی کچھ مویشی پالتے ہیں اور فاضل دودھ وغیرہ آس پاس کی شہری بستیوں میں فروخت کرتے ہیں۔ ان گوٹھوں کے کچھ باشندوں کے عزیز رشتے دار دوسرے ضلعوں، مثلاً ٹھٹھہ، دادو وغیرہ میں رہتے ہیں۔ گوٹھوں کی عورتیں رلیاں سانے یا کڑھائی کا کام کرتی ہیں۔ زیادہ تر باشندے ضرورت سے کم کماتے ہیں اور اپنے مکانوں کو پکا نہیں کرا سکتے۔ دیہی گوٹھوں کا بنیادی ذریعہ معاش اب بھی کھیتی باڑی اور مویشی پالنا ہے۔ کچھ لوگوں کے پاس سروے کی زمین اب بھی موجود ہے اور وہ اپنے ہاریوں سے کاشت کراتے ہیں۔ زیادہ تر لوگوں کی زمین دس سال کے پٹے (lease) پر ہے اور وہ بیلوں کے ذریعے یا ٹریکٹر کرائے پر حاصل کر کے خود کاشت کرتے ہیں۔ تعلیمی سہولتیں تقریباً مفقود ہیں۔ ان گوٹھوں کے باشندوں کی اکثریت شہر جا کر کام کرنا چاہتی ہے، لیکن تعلیم اور تکنیکی تربیت نہ ہونے کے باعث ایسا نہیں کر سکتی۔ بہت سے گوٹھوں کے لوگ روزگار کی تلاش میں خلیج کی ریاستوں میں گئے ہیں اور گوٹھوں میں اپنے خاندانوں کو رقم بھیجتے ہیں۔ ان کی بہت سی زمین رہائشی اسکیموں کے لیے یا مویشی پالنے، ناریل اگانے یا مرغبانی کرنے کے نام پر ان پیشوں سے غیر متعلق لوگوں کو الاٹ کی جا چکی ہے۔ ان گوٹھوں کا سب سے بڑا مسئلہ شہر کا غیر منصوبہ بند پھیلاو ہے۔ اس کے علاوہ انھیں ٹلی کے ٹمیوں سے پانی کھینچے جانے کے باعث پانی کی سطح نیچی ہو جانے اور دریا کے کناروں سے بجری وغیرہ کی مستقل کھدائی کے مسائل کا بھی سامنا ہے۔ ساحلی گوٹھوں کے کچھ لوگوں نے اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے مویشی پال رکھے ہیں۔ بنیادی ذریعہ معاش ماہی گیری ہے۔ لوگ سال کے چھ مہینے، اکتوبر سے مارچ تک، مچھلیاں وغیرہ پکڑتے ہیں اور باقی چھ مہینے شہر میں مزدوری کرتے ہیں۔ ان گوٹھوں کے ارد گرد کے علاقوں میں پولٹری فارم اور ناریل اگانے کے باغ واقع ہیں لیکن یہ سب باہر سے آنے والوں کی ملکیت ہیں۔ ماہی گیری قدیم طریقے سے، یعنی لکڑی کی کشتیاں سرمایہ کاروں سے کرائے پر حاصل کر کے، کی جاتی ہے۔ ان گوٹھوں کے باشندے اتنا کما لیتے ہیں کہ ان کی ضروریات پوری ہو جاتی ہیں۔ ساحلی گوٹھوں کے بڑے مسائل پینے کے پانی کی قلت اور ارد گرد واقع غیر قانونی تارکین وطن کی بستیاں ہیں، ان غیر ملکیوں کے پاس موٹر بوٹ اور دوسرے جدید طریقے موجود ہیں۔ حکومت کی طرف سے غیر ملکی مچھیروں کو ماہی گیری کے پرمٹ جاری کیے جانے کی وجہ سے بھی ان گوٹھوں کے باشندوں کے لیے مسائل پیدا ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ کے ڈی اے اور کے ایم سی بھی رہائشی اسکیمیں قائم کرنے کے لیے ان گوٹھوں کی زمین تحویل میں لیتے چلے جا رہے ہیں اور یہ گوٹھ سکڑ رہے ہیں۔

کراچی کے گوٹھوں میں کل سات لاکھ کی آبادی کے لیے کوئی باقاعدہ اسپتال موجود نہیں ہے۔ البتہ ۶۵ ڈسپنسریاں قائم ہیں جن میں ۲۲ ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہیں، باقی ڈسپنسریوں میں کمپاؤنڈر ہی علاج معالجے کا کام کرتے ہیں۔ کراچی کے دیہی گوٹھوں میں ۱۶۹ پرائمری اسکول، ۶۸ لوئر سیکنڈری اسکول، ۱۹ سیکنڈری اسکول اور ایک ہائر سیکنڈری اسکول موجود ہے۔ یہ سب سندھی میڈیم اسکول ہیں۔ اس کے علاوہ ڈائرکٹریٹ آف اسکول ایجوکیشن (کراچی ریجن) کے زیر انتظام سندھی میڈیم کے ۲۹۸

پرائمری، ۶۶ لوئر سیکنڈری، ۱۶ سیکنڈری اور ۵ ہائر سیکنڈری اسکول بھی ہیں۔
کراچی کے گوٹھوں میں مکانوں کی تعداد فی گوٹھ پانچ سے لے کر سیکڑوں تک ہے۔ شہری علاقے سے باہر کے ساحلی یا دیہی گوٹھوں میں پانی کی فراہمی، نکاس، کوڑا کرکٹ اٹھانے کا انتظام اور بارش کا پانی نکالنے کی سہولتیں سرے سے موجود نہیں ہیں۔ بیشتر شہری گوٹھوں میں بھی یہ سہولتیں ضرورت سے بہت کم ہیں۔ ساحلی گوٹھوں میں جھپر، سرکنڈوں اور ٹین کی چھتوں والے مکان عارضی سی رہائش معلوم ہوتے ہیں۔ دیہی گوٹھوں میں جھگیاں، کچے اور کچھ پکے مکان ساتھ ساتھ کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ شہری گوٹھوں میں جھگیوں اور سرکنڈوں اور ٹین کی چادروں سے بنے مکانوں کے ساتھ ساتھ کنکریٹ کے پختہ مکان بھی نظر آتے ہیں، لیکن آخرالذکر عموماً گوٹھ کے باشندوں کی ملکیت نہیں ہیں۔

کسی ایک چھوٹے علاقے میں واقع چھوٹے بڑے گوٹھوں کو مجموعی طور پر دیہہ کہا جاتا ہے، اور کئی دیہوں کا مجموعہ تپہ کہلاتا ہے۔ کراچی کی ضلع کاونسل کا علاقہ ۱۲۲۵ مربع میل پر مشتمل ہے۔ اس کی حدود میں ۱۱ یونین کاونسلیں اور ۹ تپے شامل ہیں۔ کراچی کے ضلع غربی کی حدود میں تین یونین کاونسلیں (گابوپٹ، منگھوپیر اور سونگل) اور ضلع شرقی میں آٹھ یونین کاونسلیں (موئیداں، کڈاپ، کونکر، درسانو چھنو، لانڈھی، ابراہیم حیدری، تھانو اور گھرو) واقع ہیں۔ یہ یونین کاونسلیں دیہوں اور پھر گوٹھوں میں تقسیم ہوتی ہیں۔ ان گوٹھ کی آبادی چند مکانوں سے لے کر سیکڑوں مکانوں پر مشتمل ہے۔
کراچی کے گوٹھوں کے زیادہ اہم مسائل یہ ہیں
(۱) سب سے بڑا مسئلہ عدم تحفظ کا ہے۔ گوٹھوں کے باشندوں کو خوف ہے کہ ان کی زمین کے ڈی اے کی کسی رہائشی اسکیم میں شامل کر دی جائے گی اور انہیں اپنی جگہ چھوڑ کر اٹھنا پڑے گا۔
(۲) زیرزمین پانی کے پمپوں کے ذریعے کھینچ لیے جانے کے باعث پانی کی سطح نیچی ہو گئی ہے اور ان کے کنووں کا پانی کھاری ہو گیا ہے۔
(۳) دیہی گوٹھوں میں پانی کی کمی وغیرہ سے زراعت متاثر ہوئی ہے اور شہری گوٹھوں میں بالکل ختم ہو گئی ہے، جس کے باعث گوٹھوں کے باشندوں کی معاشی حالت سخت خراب ہے۔
(۴) گوٹھوں میں سڑکیں، گیس، بجلی، نکاس وغیرہ کی سہولتیں ناپید ہیں۔
(۵) دیہی گوٹھوں میں ٹرانسپورٹ کی سہولت موجود نہیں ہے۔
(۶) بہت سے گوٹھوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کے سندھی میڈیم پرائمری اسکول، اور اکثر گوٹھوں میں سیکنڈری اور ہائر سیکنڈری اسکول نہیں ہیں۔
(۷) گوٹھوں میں علاج کی مناسب سہولتیں دستیاب نہیں ہیں۔
(۸) ایسے ادارے ناپید ہیں جو ان گوٹھوں کی مخصوص طرز زندگی اور ثقافت کو مٹنے سے بچا سکیں۔
(۹) ٹیلی کمیونی کیشن کی سہولتیں موجود نہیں ہیں۔

شہروں کا پھیلنا اور دیہی علاقوں سے لوگوں کا روزگار کی تلاش میں شہر منتقل ہونا کوئی نیا عمل نہیں ہے اور نہ ہی یہ دنیا کے کچھ خاص حلقوں تک محدود ہے۔ ۱۹۵۰ کی دہائی میں، نوآبادیوں کے ختم ہونے کے بعد، ترقی پذیر ملکوں میں یہ عمل بہت تیز ہو گیا۔ ترقی پذیر ملکوں کے شہروں کے پھیلنے کی شرح ۳.۵ سے ۴.۵ فیصد سالانہ تک تھی جبکہ ترقی یافتہ ملکوں کے بڑے شہر اوسطاً ۲ فیصد سالانہ کی شرح سے بڑھ رہے تھے۔ دنیا بھر کی شہری آبادی میں ترقی پذیر ملکوں کے باشندوں کی تعداد مسلسل بڑھتی رہی ہے اور اس رجحان کے آئندہ بھی برقرار رہنے کی توقع ہے۔ ۱۹۲۰ میں دنیا کی شہری آبادی کے سات فیصد لوگ ترقی پذیر ملکوں میں رہتے تھے، ۱۹۶۰ میں یہ تناسب ۴۲ فیصد اور ۱۹۸۰ میں ۵۴ فیصد تک جا پہنچا۔ پس ماندہ ملکوں میں، جہاں شہروں کے پھیلنے کا عمل نسبتاً دیر سے شروع ہوا ہے، دیہی آبادی کے ایک یا چند بڑے شہری مراکز میں جمع ہونے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ سابق نوآبادیات میں یہ رجحان خاص طور پر دیکھا جا سکتا ہے، کیوں کہ نوآبادیاتی طاقت نے انتظامی مرکز، برآمدی تجارت کے مرکز اور منڈی کے طور پر ایک یا دو شہروں کو ترقی دی جبکہ باقی علاقے شہری ترقی سے محروم رہے۔ کلکتہ، میکسیکو سٹی، قاہرہ، لاگوس، ریو ڈی جنیرو، شنگھائی اور کراچی اس کی مثالیں ہیں۔

کراچی شہر کے پھیلاؤ میں تین عناصر کام کر رہے ہیں (۱) آبادی میں فطری اضافہ، (۲) پاکستان کے دوسرے علاقوں اور پاکستان کے باہر سے لوگوں کی آمد، اور (۳) شہر کا رقبہ بڑھنے کے باعث ہونے والا اضافہ۔ آخرالذکر عنصر شہر کی بیرونی سرحدوں پر واقع دیہات کی آبادی کے شہر میں شامل ہونے پر مشتمل ہے۔

شہری پھیلاؤ کے عمل میں عموماً ٹیکنولوجی اور ہُنر زیادہ تیزی سے ترقی پاتے ہیں جبکہ سماجی تنظیم اور لوگوں کے خیالات میں تبدیلی سُست روی سے واقع ہوتی ہے۔ شہر اور گوٹھوں کے باہم رابطے میں آنے سے گوٹھوں کے باشندوں کو شہری زندگی کے کئی پہلوؤں سے مانوس ہونے کا موقع ملا ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ ساحلی اور دیہی گوٹھوں کو مختلف اور متعدد طریقوں سے شہر کے ساتھ رابطے میں آنے کا موقع ملتا ہے۔ وہ دوستوں اور رشتے داروں سے ملنے، خریداری کرنے، فلم دیکھنے یا کسی تہوار میں شریک ہونے کے لیے شہر میں آتے ہیں۔ ان گوٹھوں کے کچھ باشندے شہر میں مزدوری کرتے ہیں جس کے باعث انھیں روز شہر آنا اور واپس گوٹھ جانا پڑتا ہے۔ شہری گوٹھ چاروں طرف سے شہری محلوں میں گھرے ہوئے ہیں اور شہری عناصر ان کی معاشی، سماجی اور ثقافتی زندگی پر براہ راست اثرانداز ہوتے ہیں۔ تینوں قسم کے گوٹھوں پر ہونے والے اثرات ان کے معاشی حالات کے علاوہ ان میں آنے والی سماجی اور نفسیاتی تبدیلیوں میں بھی نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان اثرات سے پہلے یہ گوٹھ معاشی طور پر خود کفیل تھے، اب اپنے روایتی ذریعۂ معاش سے مکمل یا جزوی طور پر محروم ہونے کے باعث ان گوٹھوں کے باشندوں نے متبادل معاش کے لیے شہری ملازمتوں کی طرف دیکھنا شروع کر دیا ہے۔ ان ملازمتوں کے لیے تعلیم یا تکنیکی تربیت ضروری ہے، چناں چہ گوٹھوں میں تعلیم کی طلب پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔ لوگوں نے

یا سی گرمیوں میں بھی پہلے سے زیادہ حصہ لینا شروع کیا ہے۔ ایک بات یہ بھی نوٹ کی گئی ہے کہ ایسے قبا ا برادری کے باہر شادی نہ کرنے کا رواج رفتہ رفتہ کمزور پڑتا جا رہا ہے۔ شہری زندگی کے اثر سے سفر ار برداری کے طریقوں میں بھی تبدیلی آ رہی ہے اور روایتی طریقوں کے ساتھ ساتھ مشینی ٹرانسپورٹ استعمال بڑھ رہا ہے۔ شہر کے اندر اور باہر واقع کچھ گوٹھوں میں بجلی پہنچی ہے جس کی بدولت وہاں کے لوگوں کو الیکٹرانک ذرائع ابلاغ کے ذریعے باہر کی دنیا کی جھلک دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ بعض گوٹھوں م اخبار پڑھنے کا رواج بھی بڑھا ہے۔ اس سے ان کے سیاسی اور سماجی شعور میں اضافہ ہوا ہے۔

شہری ت کے باعث گوٹھوں میں ہاتھ کی بنی روایتی چیزوں کی جگہ مشینوں پر تیار کی گئی اشیا لے رہی ہیں۔ ا کے بجائے سگریٹ پیے جانے لگے ہیں اور دیسی دواؤں کی جگہ جدید دواؤں کا استعمال بڑھا ہے۔ زیادہ ٹھوں میں لوگ سر درد، کھانسی وغیرہ کے لیے سستی گولیاں استعمال کرنے لگے ہیں۔

گوٹھوں میں اجی تبدیلی کی رفتار تیز ہو گئی ہے۔ خاندانی رشتے تک، جنہیں مقدس سمجھا جاتا تھا اور جن کے ٹوٹنے ئی تصور نہ تھا، اب بعض موقعوں پر ٹوٹ جاتے ہیں۔ افراد کی سماجی اقدام کی آزادی میں اضافہ ہوا گو شادیاں اب بھی عموماً والدین ہی طے کرتے ہیں۔ روایتی تدریس کی جگہ بتدریج سست رفتاری سے اس لے رہے ہیں۔ کچھ دیہی گوٹھوں میں پنچایت وغیرہ کا طریقہ اب بھی موجود ہے، لیکن اکثر جھگڑوں رعات کے نمٹنے کے لیے لوگ عدالتوں سے رجوع کرنے لگے ہیں۔ سماجی، معیاتی اور تکنیکی تبدیلی کا اثر گوٹھوں میں مکانوں کی تعمیر پر بھی پڑا ہے اور اب جدید تعمیری مصنوعات، سیمنٹ، کنکریٹ، فولاد، ایسبسٹوس وغیرہ، استعمال کی جانے لگی ہیں۔

پاکستان کے قیام کے بعد سے لے کر حکومت نے کراچی کے گوٹھوں کی حالت بہتر بنانے پر کوئی توجہ نہیں دی جس کا اندازہ شہری گوٹھوں کی بدحالی سے کیا جا سکتا ہے۔ ضلعی کاؤنسل کے سوا کسی سرکاری ادارے کو گوٹھوں کی ترقی سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ تاہم، ۱۹۸۷ میں ایک ترقیاتی پروگرام شروع کیا گیا جس کا نام گوٹھ آباد اسکیم رکھا گیا۔ اس کے علاوہ ۱۹۷۶ میں قائم کی جانے والی سندھ کچی آبادی اتھارٹی کے کاموں میں بھی شہر کے گوٹھوں کی ترقی شامل ہے، کیوں کہ ۹۶ گوٹھوں کو، جو پاکستان کے قیام سے پہلے سے موجود ہیں، کچی آبادی قرار دے دیا گیا ہے اور ان کا ریگولرائزیشن کا حق تسلیم کر لیا گیا ہے۔ تاہم، ان دونوں اسکیموں نے اب تک گوٹھوں کی حالت بہتر بنانے میں کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں کی ہے۔ گوٹھ آباد اسکیم نے اب تک صرف ضلع شرقی کے ۳۵۰ گوٹھوں میں زمین کی ملکیت کے کاغذات تیار کیے ہیں۔

گوٹھوں پر اثر انداز ہونے والا ایک اور سرکاری ادارہ کے ڈی اے ہے جو دو پیش رو اداروں، کراچی جوائنٹ واٹر بورڈ اور کراچی امپروومنٹ ٹرسٹ، کے انضمام سے وجود میں آیا تھا۔ اس کا بنیادی کام

میں کو ڈویلپ کر کے رہائشی پلاٹ تیار کرنا اور فروخت کرنا ہے تاکہ لوگ ان پر اپنے مکان تعمیر کر سکیں۔ جہاں تک گوٹھوں کا تعلق ہے، اس ادارے کا کردار تعمیری کے بجائے تخریبی رہا ہے۔ اپنے قیام سے اب تک اس نے سینکڑوں گوٹھ مسمار کیے ہیں۔ نئی رہائشی اسکیمیں تیار کرتے ہوئے اس علاقے کی حدود میں آنے والے گوٹھوں کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ منصوبہ سازی کرتے وقت اس علاقے کا سروے کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ وہاں موجود گوٹھوں کو معدوم تصور کرتے ہوئے نقشے میں ان کا علاقہ بھی پلاٹوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے اور یہ پلاٹ بیچ دیے جاتے ہیں۔ جب پلاٹ خریدنے والا قبضہ حاصل کرنے کا مطالبہ کرتا ہے تو گوٹھ کو بُل ڈوزر کے ذریعے مسمار کر دیا جاتا ہے۔ بعض موقعوں پر گوٹھ کی آبادی کے سیاسی دباؤ اور ضلع کاؤنسل کے سخت احتجاج کی صورت میں گوٹھ کی حد بندی کر دی جاتی ہے لیکن اسے تمام شہری سہولتوں سے محروم رکھا جاتا ہے۔ ایسی ایک مثال کے ڈی اے کی اسکیم نمبر ۲۴ (گلشن اقبال) کی حدود میں آنے والا علی احمد اقبال گوٹھ ہے، جسے کے ڈی اے کے گلشن اقبال بلاک ۶ کے نقشے میں ۶۰۰ مربع گز کے کئی پلاٹوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ایک ۶۰۰ مربع گز کا بنگلہ گوٹھ کی حدود کے اندر تعمیر بھی کیا جا چکا ہے۔ اس قسم کی دیگر مثالیں کریم پاڑا، مجید پاڑا، شانتی نگر، کھنڈو گوٹھ، بلوچ پاڑا اور لاشاری گوٹھ ہیں۔ کے ڈی اے کی اسکیم ۳۳ کے محلوں، شاہ لطیف ٹاؤن، ملکانی ٹاؤن وغیرہ، کی حدود میں آنے والے بہت سے گوٹھ مسمار کیے جا چکے ہیں۔ ضلع کاؤنسل کے چیئرمین نے کے ڈی اے کو ایک سفید ہاتھی سے تشبیہ دی ہے جو گوٹھوں اور چراگاہوں کو نگلتا چلا جا رہا ہے۔

بلدیہ عظمیٰ کراچی (Karachi Metropolitan Corporation) کا کام بلدیاتی حدود میں آنے والے علاقوں کو شہری سہولتیں فراہم کرنا ہے۔ لیکن شہری گوٹھوں کو سہولتیں فراہم کرنے پر بلدیہ نے بالکل توجہ نہیں دی ہے۔ کچی آبادیوں کی اسکیم کے تحت بلدیہ کی حدود میں آنے والے گوٹھوں کو ریگولرائز کرنے یعنی ملکیت کے کاغذات فراہم کرنے کا کام بھی بلدیہ کے سپرد تھا۔ ان میں سے کسی گوٹھ کو آج تک ملکیت کے کاغذات نہیں مل سکے ہیں۔

گوٹھ آباد اسکیم کے قیام کا اعلان ۱۹۸۷ میں وزیراعظم محمد خان جونیجو کے دور میں کیا گیا تھا۔ اس اسکیم کا مقصد مکانوں کے موجودہ رقبے کے لحاظ سے ملکیت کے کاغذات فراہم کرنا تھا۔ کراچی کے ضلع کاؤنسل کے علاقے میں موجود گوٹھوں کا سروے کیا گیا۔ اب تک صرف ضلع شرقی کے ۳۵۰ گوٹھوں میں ملکیت کے کاغذات فراہم کیے گئے ہیں، جبکہ ضلع جنوبی اور غربی کے گوٹھوں کے سروے کا کام جاری ہے۔ ملکیت کے کاغذات گھرانے کے سربراہ کے نام پر ہیں، لیکن اس کی موت کی صورت میں ملکیت کی منتقلی کے لیے کوئی طریقِ کار بیان نہیں کیا گیا ہے جس سے مسائل پیدا ہونے کا امکان ہے۔

حکومت سندھ کے محکمۂ شماریات (Bureau of Statistics) نے چند سال پہلے سندھ کی دیہی آبادیوں کا ایک سروے شائع کیا جس کی جلد ۵ میں کراچی کے گوٹھوں کے اعداد و شمار دیے گئے

ہیں۔ ۱۹۸۶ کے سروے کے مطابق شائع کیے گئے یہ اعداد و شمار ناقابلِ اعتبار اور حیرت انگیز غلطیوں سے پُر ہیں۔ اس سروے میں گوٹھوں میں موجود جن سہولتوں کا ذکر کیا گیا ہے، وہ موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے شاید اکیسویں صدی کے آخر تک بھی نہ مل سکیں۔ مثلاً سروے کے مطابق گوٹھ امام بخش کی آبادی ۵۰۳ افراد اور مکانات کی تعداد ۷۰ ہے۔ اس گوٹھ میں ۷۰ گرلز پرائمری اسکول، ۷۰ بوائز ہائی اسکول، ۷۰ گرلز ہائی اسکول، ۹۹ ڈسپنسریاں، ۲۵ ڈاک خانے اور ۷۰ پبلک کال آفس دکھائے گئے ہیں! (بوائز پرائمری اسکولوں کی تعداد صفر ہے۔)

دیہی اور ساحلی گوٹھوں کو زیرِ زمین پانی کی سطح نیچی ہو جانے اور پانی کے کھاری ہو جانے کے مسائل درپیش ہیں۔ ضلع کاؤنسل نے اللہ بخش حماتی، ابراہیم حیدری، چشمہ، مارُو گوٹھوں اور گھگھر ریلوے پھاٹک اور ڈملوٹی کے کنووں کے قریب واقع گوٹھوں کو پینے کے پانی کی فراہمی کی اسکیمیں تیار کر کے کراچی واٹر اینڈ سیوریج بورڈ (KWSB) کے حوالے کیں، لیکن ان پر آج تک کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا گیا ہے۔

پاکستان کے قیام سے پہلے کراچی کے دیہی گوٹھوں کی نمائندگی کراچی لوکل بورڈ کرتا تھا۔ ۱۹۴۸ میں کراچی کے وفاقی انتظام کے تحت آ جانے پر لوکل بورڈ ختم کر دیا گیا۔ ۱۹۵۴ میں ون یونٹ بننے کے بعد اسے بحال کیا گیا لیکن اس کے نمائندے ۱۹۶۰ تک انتخابات کے بجائے نامزدگی کے طریق کار سے مقرر کیے جاتے تھے۔ کراچی کے معاملات میں دیہی علاقے کے لوگوں کی کوئی نمائندگی نہ تھی اور گوٹھوں کی حالت پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ گوٹھوں کے باشندوں کو ووٹ کا حق استعمال کرنے کا موقع پہلی بار ایوب خان کے دور میں بنیادی جمہوریت کے نظام کے تحت ملا۔ اس نظام میں دیہی اور شہری علاقوں کے نمائندے ضلع کاؤنسل میں ساتھ ساتھ ہوتے تھے اور ڈپٹی کمشنر کاؤنسل کا سربراہ ہوتا تھا۔ ۱۹۶۶ میں کراچی کی پہلی منتخب ضلع کاؤنسل وجود میں آئی جس کا سربراہ غیر منتخب ڈپٹی کمشنر اور نائب سربراہ حاجی داد رحیم بلوچ تھے۔ یہ کاؤنسل ۳۰ ارکان پر مشتمل تھی اور ۱۹۷۱ تک قائم رہی۔ پیپلز پارٹی کے دورِ حکومت میں بھی بدقسمتی سے ضلع کاؤنسل پر سرکاری افسروں کا غلبہ رہا، گوکہ اس کا نام بدل کر پیپلز ڈسٹرکٹ کاؤنسل کر دیا گیا تھا۔ منتخب نمائندوں کو کسی فیصلے کا اختیار نہ تھا، جہاں تک سرکاری افسروں نے گوٹھوں کی حالت پر کوئی توجہ نہ دی۔ ۱۹۷۹ کے بلدیاتی انتخابات میں حاجی شفیع محمد جاموٹ ضلع کاؤنسل کے چیئرمین منتخب ہوئے۔ ان کے دور میں گوٹھوں کی حالت بہتر بنانے کے سلسلے میں کچھ عملی اقدامات کیے گئے۔ ضلع کاؤنسل کے ڈی اے اور کے ایم سی کی جانب سے گوٹھوں کو مسمار کرنے کے خلاف آواز اٹھاتی رہی ہے۔ کاؤنسل کا کام اپنے علاقے میں واقع گوٹھوں کو پانی، علاج سڑکوں وغیرہ کی سہولتیں مہیا کرنا ہے، جبکہ اسکولوں کا قیام صوبائی محکمہ تعلیم کے اختیار میں ہے۔ جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے، کاؤنسل نے گوٹھوں کو پینے کے پانی کی فراہمی کے سلسلے میں کئی اسکیمیں تیار کی ہیں لیکن ان پر عمل نہیں ہوا۔ کاؤنسل نے چند دیہی اور ساحلی گوٹھوں میں ڈسپنسریاں قائم کی ہیں، لیکن ان کا انتظام بیشتر صورتوں میں کمپاؤنڈروں کے سپرد ہے جو سستی گولیوں کے ذریعے علاج کرتے ہیں اور

اکثر کام سے شہر جا کر رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ کمیونٹی ہال، کنویں اور ندیوں نالوں پر چھوٹے بند تعمیر کیے گئے ہیں۔ چند ایڈمنسٹریل موم بھی سامنے کیے ہیں۔ اس کے باوجود اکثر گوٹھ اب تک بنیادی سہولتوں سے محروم ہیں۔

علاقے کی حدود میں آنے والے دیہی اور ساحلی گوٹھوں میں ترقیاتی کام کاؤنسل کی ذمے داری ہے، لیکن اس کی کارکردگی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے پاس گوٹھوں کے محلِ وقوع کی نشان دہی کے لیے کوئی نقشہ موجود نہیں ہے۔ مجھے اسی ریسرچ کے دوران کاؤنسل کے پبلک ریلیشنز آفیسر سے ملنے کے لیے بیس مرتبہ جانا پڑا اور صرف ایک بار ملاقات ہوئی۔ مجھے معلوم ہوا کہ وہ علاقے کے رکن صوبائی اسمبلی عبدالحکیم بلوچ کا رشتے دار ہے، اس لیے اسے کوئی دفتر میں حاضر رہنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ اس مثال سے بھی گوٹھوں کی ترقی کے سلسلے میں کاؤنسل کے کردار کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

کراچی کے گوٹھوں کے سلسلے میں کوئی لائحہ عمل تجویز کرنے سے پہلے مندرجہ ذیل سوالوں کے جواب طے کرنا ضروری ہوگا

(۱) آیا ان گوٹھوں کا تحفظ کیا جانا چاہیے؟ کیوں؟
(۲) آیا ان گوٹھوں کے لوگ دیہی زندگی برقرار رکھنا چاہتے ہیں؟
(۳) آیا ان گوٹھوں میں دیہی زندگی برقرار رکھی جا سکتی ہے؟

کسی بڑے شہر کے ارد گرد ایک کھلا سرسبز علاقہ شہر کے لیے وہی کام سرانجام دیتا ہے جو انسانی جسم میں پھیپھڑوں کا کام ہے۔ ان سرسبز علاقوں کے بغیر شہر کا ماحول آلودہ اور مضرِ صحت ہو جاتا ہے۔ یہ سرسبز علاقہ شہریوں کے لیے سبزیوں کی فراہمی کا بھی کام کر سکتا ہے۔ چناں چہ کراچی کے ارد گرد واقع ان گوٹھوں کا تحفظ شہر کی بھی ضرورت ہے۔ بلدیہ اور کے ڈی اے جیسے اداروں کی ذمے داریوں میں ان سرسبز علاقوں اور پارکوں کی تخلیق، تحفظ اور دیکھ بھال بھی شامل ہے، لیکن بدقسمتی سے ان اداروں نے اس ذمے داری پر بالکل توجہ نہیں دی۔ کے ڈی اے نے زمین کے ایسے قطعات بھی پلاٹ بنا کر نیلامی کے ذریعے یا کسی دوسرے طریقے سے فروخت کر دیے جنھیں منصوبے میں سرسبز علاقوں کے لیے مخصوص رکھا گیا تھا۔ ان پلاٹوں پر اب کثیر منزلہ عمارتیں بنائی جا رہی ہیں کیوں کہ ان علاقوں میں زمین کی قیمت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ بلدیہ نے بھی شہر کی حدود میں آنے والے سبز قطعوں کے ساتھ بے توجہی کا رویہ اختیار کیے رکھا ہے۔

کراچی کے گوٹھوں کے باشندوں نے ماضی میں شہر کے ارد گرد ان کھلے سرسبز علاقوں کو قائم رکھنے کا اہم کام انجام دیا ہے؛ اب بھی ان میں سے متعدد گوٹھ شہر میں سبزیاں، پھل اور دودھ فراہم کر رہے ہیں۔ ان گوٹھوں کا شہر کی معاشی زندگی سے رشتہ قائم ہے۔ علاوہ ازیں، کراچی کے ارد گرد کے گوٹھوں

کی آبادی سات لاکھ سے زیادہ ہے، اور شہر کے متواتر پھیلاؤ سے اتنی بڑی آبادی کے اپنی جگہ سے اکھڑنے کا خطرہ ہے۔ ان گوٹھوں کے قائم رہنے سے یہ آبادی بھی، جو اس وقت سخت عدم تحفظ کا شکار ہے، اکھڑنے سے محفوظ رہے گی۔

گوٹھوں کے باشندوں کی اکثریت وہیں رہنا چاہتی ہے لیکن اپنی معاشی سرگرمیوں کو زراعت اور مویشی پالنے تک محدود نہیں رکھنا چاہتی۔ یہ لوگ شہر میں ملازمت اور مختلف پیشے بھی اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ انھیں زراعت اور مویشی پالنے کے جدید طریقوں سے واقف ہونے کی بھی خواہش ہے تاکہ ان کے یہ روایتی پیشے زیادہ منافع دے سکیں۔ ان باشندوں کو تعلیم، شہری سہولتوں کی سخت ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ یہ اپنی رہائشی اور زرعی زمینوں کا باقاعدہ حق ملکیت بھی حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اپنی جگہ چھوڑ کر کہیں اور نہیں جانا چاہتے۔

جوں جوں شہر پھیلتا جائے گا، ارد گرد کے گوٹھ شہری آبادیوں سے کٹ کر خود بخود شہری زندگی کا حصہ بنتے جائیں گے۔ اس عمل کو روکنے کا مطلب شہر کو پھیلنے سے روکنا ہے، جو فی الحال اور مستقبل میں ممکن نظر نہیں آتا۔ چناں چہ گوٹھوں کو شہری زندگی میں شامل ہونے سے روکنا ممکن نہیں۔ شہر کے پھیلنے کے ساتھ ساتھ گوٹھوں کے ارد گرد کی زمین کی قیمت بڑھتی جائے گی اور یوں گوٹھ ختم ہوتے چلے جائیں گے۔

ہمارے تجزیے کے مطابق گوٹھوں کے تحفظ کے لیے مندرجہ ذیل اقدامات کیے جانے چاہییں

(۱) شہر کے ارد گرد ان کھلے سرسبز قطعوں کو محفوظ رکھنے کے لیے گوٹھوں کے لیے رہائشی اور زرعی زمین مخصوص کر دی جائے؛ اس کے علاوہ اس میں آبادی کے قدرتی اضافے اور شہری سہولتوں، مثلاً اسکول، اسپتال وغیرہ کی بھی گنجائش رکھی جائے۔ اس رہائشی اور زرعی زمین پر شہری تعمیرات کی اجازت نہ ہو۔ گوٹھ کی رہائشی زمین اور شہری محلوں کے درمیان یہ زرعی علاقہ گوٹھ کو محفوظ رکھنے کا اور شہر کو سانس لینے کی جگہ بھی فراہم کرے گا۔

(۲) گوٹھوں کے گرد کی زرعی زمین کی دیکھ بھال کے لیے ہر گوٹھ کی آبادی پر مشتمل کوآپریٹو سوسائٹی قائم کی جائے جس کی وساطت سے اس زمین کی ملکیت گوٹھ کے باشندوں کے نام کی جائے۔ ان سوسائٹیوں کو سرسبز زمین کی بہتری کے لیے کوآپریٹو بینکوں وغیرہ سے قرضے لینے کا حق حاصل ہو۔

(۳) گوٹھ آباد اسکیم اور کچی آبادی اتھارٹی کے کام کی رفتار بہت کم ہے، اور گوٹھوں کے باشندے عدم تحفظ کے احساس کا شکار ہیں۔ ملکیت کے حقوق دینے کی غرض سے سب سے پہلے تمام موجودہ گوٹھوں کی آبادی کو کوآپریٹو سوسائٹی کا درجہ دے دیا جائے اور رہائشی ملکیت کے کاغذات ان سوسائٹیوں کی وساطت سے مہیا کیے جائیں۔

(۴) گوٹھوں کی معاشی حالت بہتر بنانے کے لیے سب سے پہلے اندرونی اور بیرونی وسائل کا اندازہ لگانے کی ضرورت ہے جو گوٹھوں میں تکنیکی ترقی کے لیے استعمال کیے جا سکیں۔ اندرونی وسائل میں

زرخیز زمین، مویشی اور گوٹھ کے باشندوں کے روایتی ہنر شامل ہیں۔ بیرونی وسائل میں بین الاقوامی اداروں سے آنے والی مالی امداد، غیر سرکاری تنظیموں (NGOs) کی اعانت اور حکومت کی طرف سے مالی امداد شامل ہیں۔ گوٹھوں کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ زرعی استعمال اور پینے کے لیے پانی کی کمی ہے۔ پانی کے وسائل بڑھانے پر سب سے زیادہ توجہ دی جانے، اور گوٹھ کے باشندوں کی کوآپریٹو سوسائٹیوں کے ذریعے ڈیری اور پولٹری فارم قائم کرنے کی حوصلہ افزائی کی جانے اور اس کے لیے زمین مہیا کی جائے۔ تکنیکی امداد غیر سرکاری تنظیمیں فراہم کریں۔ گوٹھ کی عورتوں کی روایتی دستکاریوں کے فروغ کے لیے کوشش کی جائے۔ اس کے لیے کسی انڈسٹریل ہوم وغیرہ کی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ یہ ہنر ان کے پاس پہلے سے موجود ہے۔

(۵) معاشی ترقی کے لیے سب سے اہم عنصر تعلیم، خصوصاً تکنیکی تعلیم، ہے جس سے گوٹھوں کے باشندوں کا مستقبل روشن ہو سکتا ہے۔ کراچی کے گوٹھ بہت بڑے رقبے میں پھیلے ہوئے ہیں اور مختلف سطح کے اسکولوں کی تعداد بہت کم ہے۔ یہ اسکول بیشتر گوٹھوں سے بہت دور واقع ہیں۔ بچوں کے علاوہ استادوں کو بھی وہاں تک پہنچنے میں سخت دقت ہوتی ہے جس کی وجہ سے غیر حاضریوں کا تناسب بہت زیادہ ہے۔ تکنیکی تعلیم کے لیے کوئی درس گاہ موجود نہیں ہے۔ اس صورت حال پر توجہ دینے اور تعلیمی سہولتوں میں اضافہ کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ چوں کہ گوٹھوں میں رہنےوالوں کی مادری زبان سندھی ہے، اس لیے ان کی تعلیم سندھی میں ہونا ضروری ہے۔ اس صورت حال کو بہتر بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ سندھی میڈیم پرائمری اسکول ہر گوٹھ میں قائم ہو، سیکنڈری اور ہائر سیکنڈری گوٹھوں کے درمیان موجود اسکولوں کی عمارتوں میں توسیع کر کے قائم کیے جائیں اور طلبا کو ہاسٹل اور استادوں کو رہائش کی جگہ وہیں فراہم کی جائے۔ ان اسکولوں میں زراعت، ڈیری فارمنگ، حفظانِ صحت وغیرہ کے مضامین بھی نصاب میں شامل ہوں۔

(۶) گوٹھوں میں صحت سے متعلق مسائل کے دو پہلو ہیں اسپتالوں اور علاج معالجے کی دیگر سہولتوں کی شدید کمی، اور حفظانِ صحت کے اصولوں سے باشندوں کی عدم واقفیت۔ ان مسائل کو حل کرنے کے لیے سرکاری اداروں کو غیر سرکاری تنظیموں کا تعاون حاصل کرنا چاہیے۔ مبادی علاج کا مرکز ہر گوٹھ میں اور ایک باقاعدہ اسپتال قرب و جوار کے گوٹھوں سے مناسب فاصلے پر قائم کیا جائے۔ اس سلسلے میں عالمی ادارۂ صحت (WHO) سے مالی امداد حاصل کرنے کی کوشش ہونی چاہیے اور منصوبے پر عمل کرنے کے لیے صوبائی محکمۂ صحت اور ضلع کاؤنسل کو مل کر کام کرنا چاہیے۔

**

اگلی دو تحریریں اردو کے دو ادیبوں کی یادداشتوں پر مشتمل ہیں۔ حسن منظر اور اسد محمد خاں، دونوں اردو کے ممتاز فکشن نگار ہیں اور انھوں نے ہماری درخواست پر اس انتخاب کے لیے یہ مضامین خاص طور پر لکھے ہیں۔

حسن منظر ڈاکٹر کے طور پر پاکستان اور باہر کے ملکوں کے متعدد شہروں میں رہے ہیں اور اب برسوں سے حیدرآباد میں مقیم ہیں۔ لیکن ان کی زندگی کا ایک مختصر مگر اہم دور کراچی میں بھی گزرا ہے۔ ان کی تحریر میں کراچی کے ایک ایسے گوشے کا تفصیلی ذکر آیا ہے جسے اردو یا کسی اور زبان کے ادیبوں کی توجہ حاصل نہیں ہو سکی۔

ہندوستان سے ہجرت کرنے کے بعد اسد محمد خاں کی پوری زندگی کراچی ہی میں گزری ہے؛ انھوں نے اپنی تعلیم اسی شہر میں مکمل کی اور کراچی پورٹ ٹرسٹ میں اپنی ملازمت کی پوری مدت یہیں بسر کی۔ انھوں نے کراچی کو تبدیل ہوتے ہوئے دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ ان کی یادیں مرکزِ شہر — صدر — سے تعلق رکھتی ہیں جو ان کی طالب علمی کے زمانے میں کراچی کی تہذیبی زندگی کا واقعی مرکز تھا۔

حسن منظر

۲۵ شمال ۶۷ مشرق

۱

موری پور اُن دنوں میرے نزدیک کراچی کا حصہ نہیں تھا جب وہاں میں نے اپنا پہلا گھر بسایا تھا۔ اب ہے۔ کیوں کہ جس طرح فربہی گردن اور کمر کی تعمیر کو ختم کر دیتی ہے اور جسم سر سے لے کر رانوں تک ایک پھولا ہوا بستر بند بن جاتا ہے، کراچی کے وہ تمام متصل علاقے جن کی کبھی اپنی شخصیت تھی، اپنا کردار تھا، بڑھتی ہوئی آبادی کی لپیٹ میں آ کر اپنی شناخت کھو چکے ہیں۔ ملیر، منوڑا اور سد مراد خاں کی طرح موری پور بھی اب کراچی کا حصہ ہے۔ پہلے ان علاقوں کو جاتے ہوئے سڑک ویرانوں اور کھلی ہوا سے گزرتی تھی۔ اب آبادی کا سلسلہ کہیں نہیں ٹوٹتا، نہ ہی ہوا کی کثافت کہیں کم ہونے کا نام لیتی ہے، حتیٰ کہ کیماڑی اور منوڑا کے درمیان کے لیکوں پر بھی جہاں دن میں بھی دھند چھائی رہتی ہے اور جس کا پانی تیل کے نشانات ہر اُس چیز پر چھوڑ جاتا ہے جس سے وہ ٹکراتا ہے۔ یہی حال دنیا کے ہر بڑے شہر کا ہے، اس لیے اگر کراچی نے موری پور کو ہڑپ کر لیا تو کوئی عجوبہ نہیں ہوا۔

موری پور کو وہاں کے رہنے والے ماڑی پور کہتے ہیں۔ ان کی اپنی علیحدہ دنیا تھی — شاید اب بھی ہو گی۔ ایئر فورس اور سینٹرل ایکسائز اینڈ لینڈ کسٹمز کے محکمے سے تعلق رکھنے والے اسے موری پور کہتے اور لکھتے تھے۔ ان کی اپنی دنیا تھی۔ وہ اردو، گجراتی، بنگالی، پنجابی، سندھی اور پشتو بولنے والے تھے، اپنی نوکری کے سلسلے میں وہاں آتے تھے، کچھ ماہ یا کچھ سال وہاں گزارتے تھے اور موری پور والوں کو بہت کچھ دیے یا اُن سے کچھ لیے اپنی دنیاؤں کو واپس لوٹ جاتے تھے۔ پوسٹ آفس کے پاس Maurypur کا بورڈ لگا تھا اور اس کے نیچے کراچی پوسٹ کوڈ نمبر درج تھا جس سے میرا واسطہ رہتا تھا۔ میرا خیال ہے موری پور کو یہ نام اور ہجے انگریزوں نے دیے ہوں گے جن کا دور ختم ہوئے تب بمشکل دس بارہ سال ہوئے تھے۔ ان کی چھوڑی ہوئی بستی کی چھوٹی چھوٹی عمارتیں اور بنگلے جوں کے توں تھے اور آبادی کا نام بھی سرکاری خط و کتابت میں اُنھی کے تلفظ میں لکھا جاتا تھا۔ یہ بھی اچھا تھا، کیوں کہ اگر ممبئی والوں نے

جہاں کراچی اور سندھ میں اکثر عمارتوں پر اپنے اثرات چھوڑے ہیں، اگر انگریزی میں موری پور لکھنے کی کوشش کی ہوتی تو وہ ماڑی پور پڑھا جاتا، جس طرح تقسیمِ ہند سے پہلے کی ایک فلم کا نام انگریزی ہجے کے ہاتھوں انمول گھڑی بن گیا تھا اور جو سر اُس نام کا حشر ہوتا ہے جس میں بد قسمتی سے ڑ آجائے۔ یہ خوش قسمتی ہی تو ہے کہ رواڑی رواڑی اور روسڑی روڈی بننے سے رہ گیا۔ جو لوگ مجھے خط لکھتے تھے اور اس علاقے کی سوجھ بوجھ رکھتے تھے، اُن کا اصرار ہوتا تھا صحیح ہجا Mauripur ہے۔ کبھی کبھی لفافے پر Maripur بھی تحریر ہوتا تھا، لیکن مجھے دُھڑکا سا رہتا تھا کہ یہ خط تو خیر آ گیا، اگلا خط اس ہجے کے ساتھ کراچی صدر ڈاک خانے سے نہ جانے کہاں جائے۔

کراچی سے موری پور جانے والی سڑک کو بھی کراچی کی دہشت نے نگل لیا ہے۔ پہلے میرے لیے راستا آسان تھا۔ شہر سے آتے ہوئے بندر روڈ سے سیدھے ہاتھ کو مڑ کر کھڈے کی مچھلی اور رُکے ہوئے سمندر کے پانی کی بُو سے گزرتے ہوئے سڑک ایئرفورس کی چیک پوسٹ میں سے ہوتی ہوئی ساحل کے ساتھ ساتھ وہاں تک چلی گئی تھی جہاں اُسے دو بار برساتی ندیوں کے اُتھلے تلے پار کرنے پڑتے تھے جن کے بعد اصلی موری پور تھا —— چند دکانوں، ایک یا دو چائے اور کھانے کے ریستورانوں، ایک مسجد، ایک مندر اور مکرانیوں کے گوٹھ (گاؤں) کا موری پور۔ وہاں بجری کے میدان کے ایک طرف نمک کی کالونی کا ہسپتال تھا، دو چھوٹی چھوٹی پتھر کی یک منزلہ عمارتوں پر مشتمل، اسی طرح کا اس سے متصل میرا گھر تھا، اور میرے گھر کے بازو میں ویسے ہی کوارٹروں کی ایک لائن۔ میدان کے دوسری طرف تقریباً ویسا ہی برطانوی دور کا بنگلہ تھا اور کسٹم کا دفتر، اور سڑک کے نزدیک ڈاک خانہ۔ کچھ اور کوارٹر بھی تھے جن میں سے شام کو ملازم پیشہ لوگوں کے بچے نکل کر عمارتوں کے درمیان کے میدان میں کھیلتے تھے اور مغرب کی اذان ہوتے ہی گھروں میں بلا لیے جاتے تھے۔ افسر وہاں چند ہی تھے۔ ان کے بچے گھر ہی میں کھیلتے ہوں گے، اور جن کا ایئرفورس والوں سے ملنا جلنا تھا وہ اُن سوکھی ندیوں کے پار شام کو ایئرفورس کلب میں بلیرڈ کھیلنے یا پکچر دیکھنے چلے جاتے تھے۔

مکرانیوں کے بچے اپنے گوٹھ میں کھیلتے تھے۔ ان کے کھیل بھی مختلف تھے۔ مکرانی گوٹھ سے پرے سیول کالونی کے کوارٹر تھے۔ درمیان میں ایک برساتی ندی پڑتی تھی اور جب وہ بہہ رہی ہوتی چل رہی ہو تو وہاں سے آنے والی بس ایسی چیلیں ہاتھ میں سامنے کام پر آتی تھی اور جب گھنٹوں میں ندی اُتر جائے تو چیلیں پھر کر واپس جاتی تھی۔ اسی طرح کراچی سے آنے والی بس بھی اگر ندیاں خشک ہوں تو مسافر کو ریستورانوں کے سامنے چھوڑتی تھی ورنہ اُسے اس کنارے اسی قسمت پر کھڑا چھوڑ کر واپس چلی جاتی تھی۔ مجھے کھڈے کے علاقے میں سمندر کے رُکے ہوئے پانی کی بُو بھی پسند تھی کیوں کہ وہ سمندر سے نزدیکی کا پتا دیتی تھی، اور سڑک کے ساتھ ساتھ چلنے والے نمک کے خشک سفید تالاب اور جگہ جگہ انسان کی بنائی ہوئی نمک کی سفید پہاڑیاں بھی۔ سمندر اگر دوستی پر آمادہ ہوتا تو بس سے جگہ جگہ نظر آ جاتا تھا۔ اگر اس کا پانی کنارے سے دور چلا گیا ہوتا تو میری نظریں اُسے ڈھونڈھتی رہتی تھیں اور موری پور کی آبادی میں پہنچ

کر تو اسے دیکھنے کے لیے کبھی کبھی میلوں چل کر جانا پڑتا تھا۔

جہاں صدر، ساؤتھ چائنا کیفے کے سامنے، سے چلنے والی بس موری پور کی آبادی میں پہنچ کر مسافروں کو اتارتی تھی، اُترنے والے کی پہلی نظر تقدیر ریسٹورنٹ کے بورڈ پر پڑتی تھی۔ یہ نام آج بھی اسی طرح انگریزی میں لکھا ہوا ہے، ٹی ایچ اے کے سے۔ پتا نہیں ریستوراں کے موجودہ مالک کو، یعنی اگر اصلی صاحب چل بسے ہیں، یہ علم ہے بھی یا نہیں کہ یہ لفظ کس لفظ کی خرابی ہے اور کیوں اسے اور سب ناموں کو چھوڑ کر چُنا گیا تھا۔ ۱۹۵۸ میں اُس نام کی ایک مشہور فلم تقدیر کو بمشکل تیرہ چودہ سال ہوئے تھے اور اس کی ہیروئن لوگوں کے دل کے راج سنگھاسن پر اس وقت تک بیٹھی تھی۔ صدر روڈ پر ایک برقعے کی دکان کا بہت بڑا اشتہار سال بسال ایسے قدِ حوا سے سوا برقعے کو ویسے کا ویسا ہی رہنے دیتا تھا، صرف اُلٹے ہوئے نقاب کے پیچھے بھارتی اداکارہ کا چہرہ خریداروں کی بدلتی ہوئی پسند کی تائید میں بدلتا رہتا تھا؛ شاید اس میں تاجر کی اپنی پسند کو بھی دخل ہو۔ مجھے تقدیر ریسٹورنٹ کے نام کو پڑھ کر کچھ اسی قسم کی مالک اور گاہکوں کی فلمی دنیا میں دل چسپی کا احساس ہوا تھا۔ ویسے یہ ریسٹورنٹ اور آس پاس کی دکانیں اتنی شور شرابے کی جگہیں نہیں تھیں اور وہاں سے آنے والی موسیقی کی آواز اتنی بلند نہیں ہوتی تھی کہ پاس کے کوارٹروں والے صبح کو قرآن شریف نہ پڑھ سکیں اور رات کو سو نہ سکیں۔ دکانوں کے آس پاس چہل پہل ضرور رہتی تھی اور یہ چہل پہل اُس وقت اور بھی بڑھ جاتی تھی جب ہاکس بے اور سینڈ اسپٹ (Sandspit) تفریح کے لیے آنے والے اندھیرا پڑنے سے پہلے موری پور سے ہوتے ہوئے کراچی کو لوٹ چکے ہوتے تھے اور آخری بس بھی واپس جا چکی ہوتی تھی۔ اُس وقت تھوڑی دیر کے لیے موری پور جاگ اُٹھتا تھا۔ اس سے پہلے وہ ایک گزرگاہ ہوتا تھا۔

مکرانیوں کا گوٹھ میرے لیے ہمیشہ دل چسپی کا باعث رہتا تھا۔ بس اسٹاپ سے اتر کر وہاں کو جانے والے میرے گھر کے سامنے سے گزرتے تھے کیوں کہ گوٹھ اُس میدان کے ایک سرے پر تھا جس کے دوسرے سرے پر تقدیر ریسٹورنٹ تھا اور جہاں کراچی سے آنے والی بس مسافروں کو اُگل کر واپس چلی جاتی تھی۔ اور اگر میں رات کا کھانا کھا کر اپنے جافری کی دیوار میں بنے ہوئے دروازے کی چوکھٹ میں کرسی ڈال کر بیٹھ جاؤں تو سامنے سیدھے ہاتھ کو بہت دور ہٹ کر اس کی جھونپڑیوں کی روشنیاں نظر آتی تھیں۔ کبھی کبھی وہاں سے عورتوں کے گانے کی آوازیں بھی اُٹھتی تھیں اور آس پاس ہی کے اندھیرے اور سناٹے میں کہیں سے وہ آوازیں بھی آتی تھیں جن کے بارے میں مجھے مقامی لوگوں نے ہمیشہ چہرے پر ایک عجیب تاثر کے ساتھ بتایا تھا کہ ذکریوں کی ہیں۔

بعد میں جب میرا سفر مکران کے ساحل پر یا موری پور سے بندر مراد جاتے ہوئے ویرانے میں سے ہوا تو مجھے ذکریوں کی عبادت گاہیں بھی نظر آئیں یا دکھائی گئیں جو صاف کی ہوئی ناہموار زمین پر پتھر کے ٹکڑوں سے نشاں زدہ کچھ گول، کچھ مربع شکل کی ہوتی تھیں اور جو اتنے قطعہ زمین کو ارد گرد کے لق و دق ویرانے سے بس عبادت کے لیے میسر کر سکتی تھیں، ورنہ نہ وہ حد بندی کتوں کی آمدورفت کو روک سکتی

بھی نہ اتنی جگہ کو گندگی اور دھول سے بچا سکتی تھی۔ بعد میں مجھے ایسی ہی نشان کردہ مسجدیں سندھ اور بلوچستان میں نظر آئیں اور زیارت سے سنڈیمن تنگی کو جاتے ہوئے ایک میں بچھی ہوئی چٹائی پر صنوبر کی چھاؤں میں مَیں نے ایک کتے کو سوتے دیکھا۔ میرے خیال میں انسان نے گیان دھیان اور عبادت کے لیے بے نشان ویرانوں اور میدانوں کو ہمیشہ نامناسب پایا ہے اور ایک کے لیے گپھاؤں اور غاروں کا متلاشی رہا ہے اور دوسرے کے لیے حدود بستہ جگہوں کا۔

ہسپتال میں کام شروع کرنے کے چند ہی دن بعد مجھے مکرانیوں کے گوٹھ جانا پڑا۔ اس سے پہلے میرا واسطہ کبھی اس نسل کے باشندوں سے نہیں رہا تھا ـــــ نہ صوبجات متحدہ میں، جس کا نام اب اتر پردیش ہے، نہ پنجاب میں۔ پہلے جب جب میں لاہور سے کراچی آیا تھا، میں نے مکرانیوں کو بس دو تین ہی کام کرتے دیکھا تھا ـــــ یا وہ ٹیکسی ڈرائیور تھے یا اونٹ اور گدھا گاڑی چلانے والے۔ کہا جاتا تھا ان کا تعلق جرائم کی دنیا سے گہرا ہے اور جسے درکار ہو اُسے رات کو آتش سیال اور آتشِ جسم ہر دو بہم پہنچاتے ہیں۔ شروع کے ان چند دنوں میں جب میں موری پور رستے جا رہا تھا، میرے ملنے والوں میں سے کسی نے مکرانیوں سے میری اس نزدیکی کا سن کر تعجب کا اظہار کیا تھا کہ جو ہے وہ بھی گنوا آؤ گے۔ لیکن میں نے یہی کہا کہ میرے پاس ہے ہی کیا جسے کوئی چھینے آئے گا۔ ویسے بھی انسانوں کے کسی گروپ کی جملہ آبادی کو فرشتہ یا شیطان سمجھنے میں مجھے ہمیشہ تامل رہا ہے، اور یہ آگاہی بھی میری فہم کا حصہ رہی ہے کہ آبادی کا ہر گروپ ہر اُس گروپ کے بارے میں جو اس کے اتصال میں آئے بُری سی رائے رکھتا ہے۔ ایران کے باشندوں سے سندھ کے باسیوں کو کوئی پرخاش نہیں ہے، مہاجروں سے ہے، جس طرح بلوچوں اور پٹھانوں کو ایک دوسرے سے ہے۔ بہرحال بات اُس صبح کی ہو رہی تھی جب مجھے مکرانیوں کے گوٹھ میں بلایا گیا تھا اور لینے آنے والا دروازے کے باہر میرا منتظر کھڑا تھا۔

میرے نوکر نے جو کلکتے کا تھا مجھ سے دبے الفاظ میں کہا، صاحب چلے جائیں، ورنہ یہ لوگ دشمن ہو جاتے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم اس کا یہ تجربہ کتنے سالوں کے وہاں قیام پر مبنی تھا، لیکن تھا میرے لیے بے مصرف کیوں کہ جتنا مجھے لے جانے والا بے تاب تھا اس سے زیادہ میں اُس دنیا کو دیکھنے کے لیے بے تاب تھا جو میرے لیے بالکل نئی تھی اور جہاں سے اُٹھنے والی گانے کی آوازوں کو میں نے راتوں میں سنا تھا۔

میرے گھر سے باہر نکلتے ہی وہ مکرانی یا شیدی یا نیگرو یا بلالی یا اُسے جو کچھ بھی کہیں، بغیر دو لفظ منہ سے نکالے اپنے گوٹھ کی سمت تیزی سے چل پڑا۔ اُس کے چہرے کی کھال تنی ہوئی تھی اور ماتھے سے لے کر ٹھوڑی تک اس میں سلیٹی اور سیاہ کے کئی شیڈز تھے۔ اس نے پلٹ کر یہ بھی نہیں دیکھا کہ میں اس کے ساتھ چل بھی پا رہا ہوں یا نہیں، نہ ہی اُسے اس کی پروا تھی کہ اونچی نیچی زمین پر چلتے ہوئے میری سانس پھول رہی ہے۔ بالآخر ہم گوٹھ کی حدود میں داخل ہوئے جہاں، جیسا کہ دنیا بھر میں دیکھنے میں آتا ہے، جھونپڑیوں کے احاطوں اور گلیوں میں انسانی بچے، پلے، چوزے اور بزیچے بے وجہ دوڑ دوڑ کر خود کو

بھکار رہے تھے اور ان سب کے پڑے یا آرام کر رہے تھے یا سست روی سے اپنی کھٹ کھٹ میں لگے تھے۔

مجھے دیکھ کر ہر طرف سے ایک خلقت امڈ آئی اور ان کے بولنے نے کتوں کے شور کو بھی دبا دیا۔

ایک جھونپڑی کے اندر کھاٹ پر مریضہ بیٹھی تھی۔ یہ مجھے بعد میں پتا چلا کہ وہ مریضہ ہے، ورنہ پہلی نظر میں اس کا لڑکی یا لڑکا ہونا میرے لیے ایک ہی بات تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں، جسم گرمی کے باوجود کاٹن کی موٹی چادر سے ڈھکا ہوا تھا، اور سر ایک سفید کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا جو مجھے بعد میں اندازہ ہوا اس کا دوپٹہ تھا۔ میں نے بخار کا اندازہ کرنے کے لیے اس کے ماتھے کو چھوا جو دھوپ میں تپتے ہوئے مسجد کے صحن کے پتھروں کی طرح جل رہا تھا۔ پھر میں نے اس کی گردن کی لچک کا اندازہ کرنے کے لیے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور مجھے ایسا لگا جیسے کسی عجیب و غریب چیز کو چھو بیٹھا ہوں کیوں کہ جو لمس مجھے ہوا وہ ایسا تھا جیسے گھنگروں کو ململ میں لپیٹ کر اس کے سر پر باندھ دیا گیا ہو اور میرے ہاتھ لگانے سے اُن میں کڑکڑ ہو رہی ہو۔ دروازے پر جمع شیدی عورتوں اور بچوں نے اتنی دیر میں جھونپڑی میں اندھیرا کر دیا تھا اور میرے چہرے پر پیدا ہونے والی بوکھلاہٹ کو کوئی نہ دیکھ سکا۔ سپرنگ بالوں کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ بعد میں ایسے بالوں والے ان گنت سر میرے دیکھنے اور چھونے میں آئے ــــ کراچی کے ساحل پر بھی اور عرب اور افریقی ممالک میں بھی ــــ لیکن اس ایک سر کے لمس نے جیسے اس نسل سے میری اجنبیت ہمیشہ کے لیے ختم کر دی۔ اس کے بعد گوٹھ والے میرے دوست ہوتے چلے گئے۔

میرا کام اس پہلی ملازمت میں نمک کے کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں، ان کے بیوی بچوں اور کسٹم کے عملے کا علاج تھا۔ ساتھ ہی میں میرا کام مجھے موری پور سے دور، دوسرے کارخانوں میں بھی لے جاتا تھا جو شہر کے جنوبی اور جنوب مشرقی ساحل پر تھے اور ان دنوں سب کے سب بند پڑے تھے، سوائے ایک کے جس کا مالک شاہ شراب (The Wine King) کہلاتا تھا اور جس کارخانے کے بعد کے ایک مالک نے باوجود تونگری کے کافی سال بعد پستول یا ریوالور سے خودکشی کر لی۔ اُدھر کے چار کارخانے کیا، خود موری پور کے پانچوں کارخانے، جتنے دن میں وہاں تھا، بند پڑے رہے۔ اس کے پیچھے جو کہانی تھی وہ پڑھے لکھے کلرکوں اور کسٹم کے عملے کے افراد نے مجھے کئی بار سنائی۔

پہلے تو کے نو کارخانوں میں نمک بنتا تھا اور مزدوروں کو روزگی آسان تھی۔ پھر ایک وزیرِ اعلیٰ نے، جو خوش پوش، خوش خور و نوش، ذہین اور صاحبِ تدبر تھے اور جن کے بارے میں بعد میں سننے میں آیا ان کے ہم عصر گورنر جنرل ایک لڑکی کے پیچھے سب کارِ مملکت بھول کر انھیں اپنا رقیب سمجھنے لگے تھے، شاہ شراب سے کہا، ہمارا نمک ساری دنیا میں جاتا ہے اور چوں کہ یہ منڈی لامحدود ہے اس لیے نمک سازوں میں باہم مسابقت درست نہیں۔ کیا یہ بہتر نہیں رہے گا کہ ترسیل کے لحاظ سے کارخانوں میں نمک درآمد کرنے والے ملک بانٹ دیے جائیں۔ اگر ایسا ہو جائے تو ہر ایک کارخانے کے مالک کو اندازہ رہے گا کہ اس کا نمک کہاں جائے گا، کتنے کی وہاں ضرورت ہے اور اس لیے کتنا بنانا چاہیے۔

اغلب یہی ہے کہ اس گفتگو کے وقت وزیرِاعلیٰ شاہ ثمرات کے مہمان ہوں گے۔ انھوں نے تجویز سے اتفاق کیا اور اس کے حاصلِ مد یہی سے تھی کہ جاپان کو نمک آئندہ صرف شاہ ثمرات کے کارخانے سے جائے گا۔

اُن دنوں امریکی کار شیو (Chev) بہت بڑی چیز سمجھی جاتی تھی اور کسی کا پی ای سی ایچ ایس کے ایک بنگلے کا مالک ہونا ایسا ہی تھا جیسے فرینچ ریویرا میں ایک ساتو کا مالک ہونا۔ قصہ مختصر، کہا یہی جاتا تھا کہ پی ای سی ایچ سوسائٹی میں ایک بنگلے اور ایک شیو کے التفات (قانونی جارگن میں consideration) میں وزیرِاعلیٰ نے جاپان اُنھیں بخش دیا تھا۔ وزیرِاعلیٰ خود بیرسٹر تھے۔ لکھا پڑھی عدالتی زبان میں ہوئی ہو گی، ایسی جسے بعد میں کوئی ملا نہیں پایا۔

جب دوسرے کارخانے والے احتجاج کرنے وزیرِاعلیٰ کے پاس پہنچے کہ جاپان سے انھیں کیوں محروم کیا گیا ہے، تو موصوف نے کہا اتنے ملک پڑے ہیں، جس کو جس کا اجارہ درکار ہو لے لے۔ مغرب کے جن ملکوں کی طرف اُن کا حوالہ تھا ان کی ضرورت عدن پوری کرتا تھا، اور پاکستانی نمک کا سب سے بڑا خریدار جاپان تھا جہاں لوہے سے آمیز کیا ہوا کھانے کا نمک کپڑے کی صنعت میں کام آتا تھا۔

جہاں جب میں موری پور پہنچا تو کارخانوں میں آخری دفعہ سے ہوئے نمک کی ڈھیریوں کے اوپر دھول کی سیاہی بیٹھ چکی تھی۔ وہ حوض سوکھے پڑے تھے جن میں مد کے وقت سمندر کا پانی لیا جاتا ہے، اور آگے بڑھ کر وہ گھرے تالاب بھی جن میں سورج کی بے نوک کرنوں سے اس پانی کی کثافت بڑھائی جاتی ہے۔ یہی حال اُن کھیتوں کا تھا جن میں بالآخر سوکھنے کے لیے اس پانی کو چھوڑ دیا جاتا ہے اور بعد میں آہستگی سے جن میں اتر کر مزدور عورتیں اور مرد آرٹسٹک مشاقی سے نمک کو اس طرح کھیت کی زمین اور دیواروں سے کھود کر جدا کرتے ہیں کہ فرش میں خراش آئے نہ دیوار میں۔ ان مزدوروں کا سالٹ ورکس سے رشتہ اُتنا ہی استوار تھا جتنا کسانوں کا اپنے کھیتوں سے ہوتا ہے ___ نہ مالک وہ ہوتے ہیں نہ مالک یہ تھے۔ نمک کی ڈھیریوں پر جمی ہوئی دھول ان کی محنت پر پڑی ہوئی دھول تھی۔ میرے حصے میں ان مزدوروں کے پیروں کے صرف زخم آئے جن کے لیے وہ ہسپتال دھک کالم (جیوٹ کا مرہم) لیپے آتے تھے، کیوں کہ کارخانے بند ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا اور زخم اُس وقت تک سوکھے نہیں تھے۔ یہ زخم ٹانگوں اور پیروں پر ہوتے تھے، یعنی جسم کے اتنے حصے پر جو نمک کے گاڑھے پانی میں ڈوبا رہتا ہے۔ کبھی کبھی ہاتھوں پر بھی ہوتے تھے۔ دیکھنے میں گول، درمیان میں آتش فشاں کے دہانے کی طرح گھرے اور اُسی کی طرح خود میں آتش صفت۔ اُس گڑھے کو مرتی ہوئی کھال کی ایک سفید پٹی اپنے حلقے میں لیے ہوتی تھی۔ کارخانوں کے مالکان یوں بھی ان مکرانی اور دوسری ذات کے مزدوروں سے بیزار تھے، کیوں کہ انھیں نمک کے ہسپتال کے لیے کچھ رقم ایک معاہدے کے تحت ہر سال ادا کرنی ہوتی تھی جو وہ کم ہی ادا کرتے تھے، اور اب تو کارخانے بند پڑے تھے اور مزدوروں سے ان کی بیزاری سوا ہو گئی تھی۔ ایسے میں وہ میری تجویز کو کیا خاک خاطر میں لاتے کہ زخم کے لیے بوٹس نمک کے پانی میں اتر کر کام کرنے کے لیے دیے

جائیں۔

اِن مالکان کے سینٹرل ایکسائز اینڈ لینڈ کسٹمز اور متعلقہ وزارت کے اعلیٰ عہدے داروں سے بڑے اچھے تعلقات تھے۔ دونوں ایک دوسرے پر کسی قسم کا دباؤ ڈالتے ہوئے جھجکتے تھے۔ یوں ہسپتال بس رواروی میں چلایا جا رہا تھا اور ایکسائز اور کسٹمز کے نچلے عملے سے زیادہ اس کی افادیت بڑے لوگوں کے لیے تھی۔ یونیسیف سے جو دو فوکس ویگن ایمبولینسیں ہسپتال کو ملی ہوئی تھیں اُن میں سے ایک میرے وارد ہونے سے پہلے کسی کے ڈرائیونگ سیکھنے کے تصرف میں تھی اور ایک دن، جیسا کہ ہوا کرتا ہے، سیکھنے والے کے ہاتھوں اپنا وقار کھو کر فوکس ویگن کی ورکشاپ میں پہنچ گئی۔ دوسری ایمبولینس کے سپرد بہت سے کام تھے ہسپتال کی انچارج کو شہر سے لینے جانا، اُن کے بچوں کو یہاں اور وہاں چھوڑنا، پھر اُن کی پہلی حاضری کلکٹر کسٹمز کے گھر پر ہوتی تھی جہاں سے وہ یا تو بارہ ایک بجے تک ہسپتال آتی تھیں یا وہیں سے گھر لوٹ جاتی تھیں۔ اگر آتی تھیں تو چائے کے بعد، جو مریضوں کی دو دو آنے پرچی بنوانے کی فیس سے جمع ہونے والے فنڈ سے بنتی تھی، مریضوں کی باری آتی تھی۔ ایک لمبی قطار ـــ عورتیں اپنے کولھوں پر ناک بہتے ہوئے بچوں کو لیے، مکسچر کے لیے شیشیاں بوتلیں سنبھالے ہوئے لڑکیاں اور کھانستی ہوئی بوڑھی عورتیں ـــ میگھوار، کچھی، مکرانی، اردو بولنے والی، سبھی جو کراچی کے بڑے ہسپتالوں سے دور تھیں۔

مریض صبح سے وہاں آن کھڑے ہوتے تھے اور دھوپ اُنھیں کاٹتی بھی نہیں تھی کیوں کہ ان میں سے اکثر کی رنگت سیاہ ہوتی تھی جسے دھوپ کی برداشت ہوتی ہے۔ دروازے پر کھڑی ہوئی آیا ایک ایک کر کے اُنھیں اندر بلاتی تھی اور ایک ایک منٹ سے بھی کم میں وہ باہر آتے جاتے تھے کیوں کہ جتنی دیر میں ایک بچی یا بوڑھی بتاتی کہ اُسے کیا تکلیف ہے، کاغذ کی ایک پرچی اُس کے ہاتھ میں تھما دی جاتی تھی جس پر کچھ بھی لکھا ہو سکتا تھا ـــ ملیریا کا مکسچر، دستوں کی دوا، سر درد کا پاؤڈر، علیٰ ہذا القیاس۔ اب جنھوں نے تھوڑی سی بھی اسٹیٹسٹکس (statistics) پڑھی ہے وہ امکان کے اصول کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ نہیں کہیں گے کہ ایسے نسخے یکسر بے معنی اور بے محل ہوتے ہیں۔ کسی نہ کسی کے مرض اور اُس نسخے میں لکھی ہوئی دوا میں مطابقت تو ہوتی ہی ہو گی، ورنہ کیوں مریض اُس در پر لوٹ لوٹ کر آتے رہتے۔ یہاں نفسیات کا وہ گہرا اصول کارفرما نظر آتا ہے، operant conditioning، جو گھورے میں کُٹ کُٹ کرتی ہوئی مرغی کو، باوجود ہر ٹھونگ پر کچھ نہ پانے کے، اپنے عمل کو جاری رکھنے پر آمادہ رکھتا ہے کیوں کہ کسی کسی بار اُس کی چونچ میں کچھ آ بھی جاتا ہے۔ کبھی کبھی کسی مریض کو اُس واحد دوا سے افاقہ بھی ہو جاتا ہو گا۔ مرض کی تشخیص اور نسخے کے لیے باریابی کے تھوڑی سی دیر بعد یہ بھیڑ چھٹ جاتی تھی۔ مریض اُس دوسری عمارت کے احاطے میں چلے جاتے تھے جو مردانہ تھا اور جہاں دو ڈسپنسر بڑی مستعدی سے اُن سے پرچیاں لے لے کر پھاڑتے جاتے تھے اور اُن کے ہاتھوں میں جو جس کی قسمت میں لکھا ہوتا تھا تھماتے جاتے تھے۔

میرا کام دوردراز کے ممک کے کارخانوں کا دورہ تھا اور سہ پہر کو جب میں اپنے گھر لوٹتا تھا تو ہسپتال کے باہر، جہاں مریضوں کی لائن صبح کو لگی ہوتی تھی، اکثر بچوں کے ریت پر چھوڑے ہوئے کھیل کے نشانات ہوتے تھے۔ اتنی دیر وہ کیسے کچھ کیے بنا رہ سکتے تھے۔ کبھی کبھی دو تین بجے بھی واپس لوٹنے پر میں مریضوں کو اپنا منتظر پاتا تھا۔ میرا نوکر اُن سے ہمدردی بھری خفگی سے کہتا،

دیکھتے نہیں ہو، ابھی ڈاکٹر تھکا ہوا ہے۔

مریض بڑی فراخ دلی سے مجھے کچھ دیر اَور تازہ ہونے کے لیے دیتے اور میرے دروازے کے سامنے سے ادھراُدھر ہو جاتے تھے۔ کچھ گھر اور ہسپتال کے درمیان کی چھاؤں میں جا بیٹھتے، کچھ ہسپتال کے مردانہ حصے میں اپنے لیے ٹھنڈی جگہ ڈھونڈھ لیتے۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد، جو عموماً بینگن کے تلے ہوئے قتلوں اور دال پر مشتمل ہوتا تھا یا دال میں ڈوبے ہوئے انہی قتلوں یا آملیٹ کے مستطیل ٹکڑوں پر، میں ہسپتال کے مردانہ حصے میں جا بیٹھتا تھا جہاں شروع کے دنوں میں، جب ایک ایمبولینس ورکشاپ میں تھی اور دوروں پر جانا ممکن نہ تھا، میں آوٹ پیشنٹ ڈپارٹمنٹ کنڈکٹ کیا کرتا تھا اور اگر ہوں تو اِن پیشنٹس کو بھی دیکھتا تھا۔

میرے اردگرد یہ گھرے سانولے یا سیاہ چہرے باوجود بیمار ہونے کے مجھ سے بات کرتے ہوئے کھِلے ہوتے تھے اور یوں انھوں نے مجھے اپنا گرویدہ کر لیا تھا۔ کبھی کبھی نسخے سے مطمئن نہ ہو کر کوئی مکرانی عورت شکایتاً کہتی

سُوئیں نہ دیہی؟

یعنی سوئی نہیں لگائے گا؟ میں بتاتا جو گولی اس میں میں نے لکھی ہے وہ انجکشن سے مہنگی ہے، لیکن اعتراض کرنے والی اِس توجیہ سے مطمئن نہ ہوتی۔

ان لوگوں کو کبھی ایمبولینس کا مرہونِ منت ہوتے میں نے نہیں دیکھا۔ اول تو وہ کراچی جانے کا سوچ ہی نہیں سکتے تھے، اور اگر سوچتے بھی تو مریض کو بس میں کیسے لے جاتے۔ ٹیکسیاں موری پور میں بس کبھی کبھار کسی کو لے کر آتی تھیں، کھڑی رہتی تھیں اور اُسے واپس لے کر جاتی تھیں۔

ہسپتال کی فولاد، وٹامن بی کامپلیکس اور کیلسیم کی گولیوں، اے ایسڈ ڈی کے کیپسول اور دو ایمبولینسوں کے علاوہ یونیسیف کی طرف سے ایک اَور بہت بڑا عطیہ بھی تھا ـــــ ایک امریکی پاور ویگن۔ وہ اتنی چوڑی تھی کہ کراچی کے لیے اُسے روڈ لائسنس نہیں مل سکا۔ لیکن اس مشکل کا حل سپرنٹنڈنٹ کسٹم نے، جو نہایت دلکی انسان تھے اور جن کی بات کو حکام بالا بھی نہیں ٹال سکتے تھے، یہ نکالا کہ اُسے قلات کا رجسٹریشن دلوا دیا۔ دیکھا جائے تو ایسی دھاندھلی سے وہ ہسپتال کے بھی سپرنٹنڈنٹ تھے۔ اس پاور ویگن کا اپنا الیکٹرک جنریٹر تھا، ٹینٹ تھا اور پچھلا حصہ بیک وقت ڈسپنسری اور آپریشن تھیئٹر تھا۔ اکثر تصور میں میں نے اُسے مکران ساحل کے کسی گوٹھ میں اس طرح کھڑے دیکھا کہ ویرانے میں ایک گاؤں کے باہر روشنی ہو رہی ہے، یا اگردوں نے تو ٹینٹ لگا ہے، اور گاؤں والے، مچھیرے، عورتیں، مرد اور بچے اس

چلتے پھرتے ہسپتال کے ارد گرد علاج کے لیے جمع ہیں — جیسا کہ بارہا افریقا کے جنگلات میرے اور وہاں کی خلقت کے درمیان ہوا۔

امریکن پاور ویگن بہت بڑی تھی، اتنی بڑی کہ جب سدمرادھاں کے آفیسرز ٹریننگ کیمپ میں کوئی فنکشن ہوتا تھا اور خاص طور سے جب وہاں وہ مدعو ہوتے جنھیں آج کل کے محاورے میں سیورو کریٹس کہا جاتا ہے، تو اس میں رکھ کر بریانی اور قورمے کی چھ چھ دیگیں دریا پار کی پہاڑی پر پہنچائی جاسکتی تھیں اور پوری اسپورٹس ٹیم اس کے آپریشن تھیئٹر میں سما جاتی تھی۔ موری پور کے ہماشما کا تعلق نہ سدمراد کے آفیسرز ٹریننگ کیمپ سے تھا نہ ان ایمبولینسوں اور آپریشن تھیئٹر بردار پاور ویگن سے۔ وہ اتنی سی دوا سے مطمئن تھے جتنی انھیں مل جاتی تھی۔ اُن کا تعلق اُس کپڑے سے بھی نہیں تھا جو سیزر (seizure) کا مال کہلاتا تھا یعنی اسمگلروں کے ہاتھوں سے چھینا ہوا کپڑا جس کا بہترین حصہ چھپواں چوری بڑے دکاں دار اور شہ زوری سے افسر لے جاتے تھے اور جس میں سے وہ جو کنڈم مال کہلاتا تھا، یعنی جسے اسمگلروں نے پکڑے جانے پر پانی میں پھینک دیا ہو، وہ نچلے درجے کے ملازمین کو پرمٹ سے ملتا تھا۔ لیکن ایسا کپڑا نمک چشیدہ ہونے کی وجہ سے چلتا کم ہی تھا۔

ایک انسپکٹر نے ازراہ تلطف مجھے ایسے ہی کپڑے ڈیکروں کا ایک ٹکڑا پتلون کے لیے دیا اور میں نے اُسے اپنی حیثیت سے بڑے ایلفنسٹن یا وکٹوریا کے ایک ٹیلرنگ ہاؤس میں سلوایا۔ مجھے امید تھی وہ میرا بہترین پتلون ہوگا لیکن پہلی ہی بار دھونے پر میرے نوکر نے کہا، صاحب اب کسٹم کا کپڑا مت لیجیے گا۔

میں نے پوچھا، کیا ہوا؟

اُس نے اس کی کریز میرے سامنے کر دی جو پرانے جستہ کاغذ کی طرح اوپر سے لے کر نیچے تک چٹخ گئی تھی۔ حقیقت میں وہ کسٹم کا سپاہی تھا اور اُسے مجھے گھر کے کام کے لیے دیا گیا تھا۔ میں نے اپنی طرف سے اُس کی تنخواہ پچاس روپے ماہانہ مقرر کی۔ یوں وہ میرے بڑے ماموں کے کہنے کے مطابق وہ لوئر ڈویژن کلرک کی تنخواہ لے رہا تھا۔ ویسے اُس کے میرے لیے کام کرنے پر کسی کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ایکسائز اینڈ لینڈ کسٹمز کے محکمے میں میں نے کسی کو ایسا کام کرتے نہیں دیکھا۔ وہ جو ہر فنکشن پر ہیڈ ماسٹر ہوتا تھا شاید کلرک تھا، جو مالی بھرتی ہوا تھا گنگ تھا، اور جو گنگ تھا وہ کسی کا ڈرائیور تھا۔ کچھ لوگ صرف مصاحبی میں تھے۔

نوکر کا کوارٹر میرے گھر کے پچھواڑے ہی کہیں تھا۔ وہ مکرانیوں کے گوٹھ میں اکثر میرے لیے انڈے اور کبھی کبھی مرغی کے فراق میں جاتا تھا اور وہاں کی خبریں لے کر آتا تھا اور کبھی کبھی کسی کی فرمائش بھی یا ترمیم کے لیے کسی کا نسخہ۔ موری پور میں گوشت کی دکان نہیں تھی۔ اگر کوئی کسٹم کا سپاہی بکری ذبح کرتا تھا تو اپنے لیے ضرورت بھر رکھنے کے بعد وہ باقی گوشت فروخت کر دیتا تھا جسے لینے کے لیے گوٹھ والے اور کسٹم کا عملہ سبھی جمع ہو جاتے تھے۔ اگر کوئی مہمان ہو تو میرا نوکر مجھے وقت سے پہلے ہی ناشتہ

کرا دیتا تھا کیوں کہ گوشت لینے کے لیے اُسے ایرفورس کیمپ جانا پڑتا تھا جہاں دیر سے پہنچنے پر گوشت ختم ہو جاتا تھا۔

عام طور سے مجھے دوپہر کا کھانا کھلا کر وہ سینڈز پٹ جانے والے راستے پر سے ہوتے کسی پُل پر جا بیٹھتا تھا اور جب اندھیرا ہونے سے پہلے لوٹتا تھا تو پکڑی ہوئی مچھلیوں سے لدا پھندا ہوتا تھا۔ کوارٹروں میں سے لوگ اُسے میرے گھر کے سامنے کے میدان میں گھیر لیتے اور وہ ان میں زائد مچھلیاں بانٹ دیتا۔

ایک دن میں نے اُسے ایک بہت بڑی مچھلی کسی کو دیتے دیکھا اور پوچھا

تم نے وہ کیوں نہیں رکھی؟ ہمیشہ چھوٹی مچھلیاں ہی گھر کے لیے رکھتے ہو؟

اس نے کہا، صاحب وہ گدھا مچھلی تھا۔ پک کے بالکل پانی جیسا ہو جاتا ہے۔

میں نے اکثر کہا، تمھاری بیوی اور بچہ دونوں کمزور ہیں، انھیں بھی تو مچھلی کھلایا کرو، اور اس نے ہر بار کہا، صاحب وہ ایک دم بےوقوف عورت ہے، یہ گوشت مچھلی انڈا خود کھاتا ہے نہ بچے کو کھانے دیتا ہے۔

بغیر کسی یادگار تبدیلی کے میں نے موری پور میں سوا سال تک رات کو ہمیشہ مچھلی کھائی۔ سوائے اُن موقعوں کے جب وہ صبح صبح سمندر سے لوٹتے ہوئے مچھیروں سے وہیں پُل پر جھینگے خرید کر پاتا تھا۔ عام کھانا مجھے کراچی میں ایسے ایک دوست کے گھر ملتا تھا جو اَب لوڈیئم (Laudıum)، جنوبی افریقا، کے قبرستان میں سو رہا ہے، یا ریستورانوں میں جب وہاں پکیر دیکھنے جاتا تھا۔ لیکن اُس کے لیے میں ترسا ہوا نہیں تھا۔ ایسی صبح کو جب میں نے رات کھانا گھر نہ کھایا ہو میرا نوکر صبح ناشتے پر وہی کھانا میرے سامنے رکھ دیتا تھا اور اُس کا ایک بار کا کہا مجھے کافی ہوا کہ مفت کا نہیں ہے، اس پر پیسہ لگا ہے۔ میں نے پہلی بار اسے نےجوں و چرا نادم ہو کر کھا لیا تھا اور پھر ہمیشہ کھاتا رہا۔

۲

میں جن دنوں لاہور چھوڑ کر کراچی جانے کی تیاری کر رہا تھا ایک دن میں نے ریلوے اسٹیشن پر خود کو فیض صاحب کے سامنے کھڑا پایا۔ وہ کسی کو وہاں چھوڑنے آئے ہوئے تھے اور میں بھی کسی کو خدا حافظ کہنے۔ انھوں نے اپنی مدھم آواز میں غالباً یہی کچھ کہا ہوگا، کیسے ہیں؟ کیا لکھ رہے ہیں؟ کیا کر رہے ہیں؟ آئندہ کیا کرنے کا ارادہ ہے؟

میں نے کہا، کراچی جا رہا ہوں۔

گھومنے؟ انھوں نے پوچھا۔

میں نے کہا، جی نہیں، ملازمت کروں گا یا پرائیویٹ پریکٹس۔

بولے، چھوڑیں جی، کراچی بھی کوئی شہر ہے۔

کراچی آنے سے پہلے میں کراچی کو بڑا غریب پرور شہر کہتا تھا کیوں کہ میری دنیا غریبوں کی دنیا تھی، اُن معدودے چند کی نہیں تھی جو غیر منقسم ہندوستان کے ہر صوبے میں بھی بڑے تھے اور پاکستان بن جانے کے بعد بھی بڑے رہے، اور امیری اُن کی پیڑھی در پیڑھی چلی، جن کی رشتے داریاں ہندوستان سے لے کر پاکستان میں آنے والے ہر صوبے میں تھیں۔

میری پہچان والے بیک وقت پڑھ بھی رہے تھے اور نوکریاں بھی کر رہے تھے۔ انھیں اپنے باپوں کی زندگی میں اپنے پیروں پر کھڑا ہونا تھا۔ یہاں آ کر انھیں آگے چل کر جو کچھ ملنا تھا، ایسی محنت سے۔ میرے دو تین خوش قسمت ساتھی اکاؤنٹنٹ جنرل آف پاکستان ریوینیوز (AGPR) کے دفتر میں ملازم تھے جہاں وہ صبح جا کر حاضری لگواتے یا لگاتے تھے، جس طرح آج کل بیشتر حکومت کے ملازمین کرتے ہیں، پھر کسی فرم کی نوکری کے لیے نکل جاتے اور شام کو کوئی کورس اٹینڈ کرتے۔ حتیٰ کہ پروفیشنل کالجوں کے بھی ایسے طلبا جن کے باپ خود دُہری نوکریاں کرنے پر مجبور تھے، کسی نہ کسی طرح تعلیم اور کسبِ معاش دونوں کو نباہ رہے تھے۔ مجھے یہ لوگ پسند تھے۔ یہ دنیا لاہور کی دنیا سے مختلف تھی جہاں طلبا نہ نوکریاں کرتے تھے نہ اُن کے لیے نوکریاں تھیں۔ میرا ذہنی رشتہ کراچی کی اس محنت طلب دنیا سے تھا جہاں جسے پاکستان بھر میں اگر کچھ کرنے اور خود کو زندہ رکھنے کا کوئی راستا نظر نہیں آتا تھا تو پہنچ جاتا تھا۔ میرے منہ سے کراچی کے لیے غریب پرور شہر کا لقب سن کر میرے ایک مرحوم دوست پھڑک اٹھے تھے کہ یہ تم نے بہت صحیح بات کہی ہے۔ میرے تمام رشتے داروں، دوستوں، واقفوں کی طرح وہ صاحب بھی ۱۹۴۷ تک اترپردیش میں متوسط طبقے کی پُرسکون زندگی اپنے خاندانی مکان میں گزار رہے تھے، اور اگر یہ برِصغیر نہ بٹا ہوتا تو گزارتے رہتے۔ ان میں سے جو زیادہ باہمت تھے ـــ جیسے میں ـــ اعلیٰ تعلیم کے لیے الٰہ آباد یا لکھنؤ جاتے، ممکن ہے علی گڑھ، کچھ آئی سی ایس کرتے اور مختلف صوبوں میں زندگی گزارتے۔ کسی کسی کو بمبئی اور کلکتے کی دنیا بلاتی، بالکل ایسے ہی جیسے فضا اور سمندر، یا برطانیہ اور امریکا۔ یہ سب کچھ ۱۹۴۷ سے پہلے سے ہوتا آ رہا تھا۔ لوگ دکھنی اور پوربی افریقا اور گیانا اور ملایا جاتے تھے اور اُن ملکوں کو اپنی زندگی کا مفید حصہ دے کر اپنے آبائی شہروں، قصبوں اور گاؤوں کو لوٹ آتے تھے جہاں اُن کی غیر حاضری میں اُن کے مکان ایسے دن اُن کے آنے کی راہ دیکھا کیے ہوتے اور بزرگوں کی قبریں بھی ان کے دعا کے لیے اٹھے ہاتھوں کی۔

میں ۱۹۵۰ میں پہلی بار کراچی آیا اور اترپردیش اور دلی میں بسنے والے اُن خاندانوں میں سے کسی کو میں نے جیکب لائن کے ایک کوارٹر کے نصف میں کرائے پر رہتے ہوئے دیکھا اور کسی کو جہانگیر روڈ پر۔ بعضوں نے جھگیاں ڈالی تھیں، جیسے میرے ایک استاد مکرم نے۔ یہ لوگ مجھے دیکھ کر خفیف نہیں ہوتے تھے کیوں کہ اتنی سرعت سے آنے والی زندگی کی اتنی بڑی تبدیلی نے ان کی شخصیت اور فکر کو یکسر بدل کر رکھ دیا تھا اور اس کی جگہ ایک ہی حقیقت نے لے لی تھی ـــ کام، کام اور کام۔ جس طبقے کا

میں ذکر کر رہا ہوں، اور کاروبار چھوٹا یا بڑا جس کی میعاد میں نہیں تھا، اس کے نوجوانوں کو معلوم تھا اس کی پشت پناہی کرنے والا اِن تنک کام کے سوا کوئی اَور نہیں ہے۔ ان میں سے بعض، جو قریبی رشتے داروں کے بھارت میں نہ رہ جانے کی وجہ سے پاکستان کچھ سال بعد آئے تھے اور جن کے پاس اسناد اور اسکول چھوڑنے کے سرٹیفکیٹ سندی میں تھے، شروع میں بوکھلائے ہوئے رہتے تھے، لیکن بہت جلد ایسے رشتے داروں سے اردو سیکھ کر ایسے لڑکے لڑکیاں اسکولوں میں پڑھانے لگے تھے یا کوئی اَور کام کر رہے تھے۔

میں نے بھی کراچی پہنچ کر اپنا جائزہ لیا اور اس شہر کا حسن کے لیے فیض صاحب نے کہا تھا، چھوڑیں جی، کراچی بھی کوئی شہر ہے۔ یہ بات گو ربط بیاں کو رسم کر رہی ہے لیکن یہیں کہی جانی چاہیے۔ کئی سال بعد جب میں باہر کے کسی ملک میں تھا اور مجھے پتا چلا فیض صاحب خود کراچی آ گئے ہیں، اور کسی مشاعرے میں شرکت کے لیے نہیں بلکہ کام کرنے اور رہنے کے لیے، تو مجھے اپنی رائے کی صحت کا اندازہ ہوا کہ کراچی نہ صرف یہ کہ غریب پرور شہر ہے بلکہ ان کے لیے بھی اپنے بازو کھلے رکھتا ہے جو اسے پسند نہ کرتے ہوں اور ان کی حسب حیثیت سیوا بھی کرتا ہے۔ میرا خیال ہے کراچی کا حسن اور اس کی وسعت چیونٹیوں کی طرح صبح سے شام تک مصروف انسانوں کے دم سے ہے۔

مجھے کراچی نے موری پور میں جگہ دی۔

میرے لیے لاہور سے کراچی پہنچ جانا اتنی عجیب بات نہیں تھی جتنی وہاں چار سال جہاں کوئی ملنے والا کبھی کبھار ہی آتا تھا۔

کراچی میں سبزہ کم ہی لیکن کہیں کہیں تھا ضرور۔ موری پور میں پیلی بکری کا میدان تھا اور پیلے ہی پتھر کے مکان۔ ٹریفک کا شور بھی متعین تھا جس کا میں یوں بھی گرویدہ نہیں ہوں۔ لیکن اس خاموشی کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ میں دور دور کی آوازوں کو سن سکتا تھا۔ گاؤں کی عورتوں کی گانے، لڑنے اور رونے کی آوازیں، گھر کے سامنے سے گزرنے والوں کی باتیں اور اُس ترانے کے نزدیک سی ہوئی مسجد سے اذان کی آواز جہاں سے ایک راستا ماکس نے کو جاتا ہے اور دوسرا سینڈز اسپٹ کو۔ اذان کی آواز لاؤڈ اسپیکر کا سہارا لیے بغیر آتی تھی ـــــ صاف اور مدھم اور ویرانے میں پھیلتی ہوئی۔ یہ آوازیں اُن علاقوں میں جنھیں جھل بہل کے علاقے کہا جاتا ہے، غائب ہو جاتی ہیں۔ اگر شور نہ ہو تو انسان کھلے سمندر میں پانی سے ہوا میں اُچھل کر دوبارہ سطحِ آب پر مچھلی کے گرنے کی آواز تک کو سن سکتا ہے۔ مجھے بہت جلد موری پور کا یہ سناٹا بھانے لگا۔

تقریباً روزانہ ہی رات گئے جب پورا موری پور سویا ہوتا تھا، مجھے اپنے گھر کے سامنے سے گزرتے ہوئے کسی کمرائی کی آواز سنائی دیتی تھی۔ وسیع اور عمیق گلے سے نکلتی ہوئی آواز جو مجھے پال رابسن (Paul Robson) کی یاد دلاتی تھی اور جو صرف نیگرو حلق ہی سے نکلتی ہے۔ دور اُدھر سے جدھر سڑک دو سوکھی ہوئی ندیوں میں سے گزرتی ہے، پھیلتی ہوئی نغمے کی لہریں میرے کانوں سے قریب ہوتی جاتی

تھیں اور پھر گاؤں کی طرف جاتے ہوئے قدموں کے ساتھ ساتھ دور ہونے لگتی تھیں۔ لیکن مجھے کبھی پتا نہیں چلا رات اتنی دیر گئے کون میرے گھر کے سامنے سے گاتا ہوا گزرا تھا، کیوں کہ موری پور میں میں جتنے دن رہا نہ وہاں کوئی کنسرٹ ہوا اور نہ ایسا کوئی اور ہی موقع آیا جہاں میں اُن رات کی تنہائی میں گانے والوں کو اپنے سامنے گاتے ہوئے دیکھتا۔ نمک کے کارخانوں میں کام کرتے ہوئے جو گانے وہ گاتے ہوں گے کارخانوں کے ساتھ بند ہو چکے تھے اور سمندر پر ماہی گیری کے سفر میں اپنے ساتھ آنے کی دعوت مجھے کسی نے نہیں دی جو میں سنتا کہ کبھی یہ گلے وہاں بھی بے اختیار لہروں کی ہم نوائی میں کھلتے ہیں یا نہیں۔ آخر کو خاموشی اور وسعت میں صحرا اور سمندر ایک جیسے ہوتے ہیں اور اگر خطرہ نہ ہو تو اپنے چاہنے والوں پر ایک ہی طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔

جیسا کہ اوپر کہہ آیا ہوں، شروع کے دنوں میں میرا دور نمک کے کارخانوں کے دورے پر جانا نہیں ہوتا تھا۔ ہسپتال کا کام ڈھائی تین بجے ختم ہو جاتا تھا۔ ملنے والے کوئی تھے نہیں — صرف مجھے ملنے کے لیے شہر سے روز روز کون آتا۔ ایک شام چائے کے بعد دروازہ بھیڑ کر میں اس طرف کو چل پڑا جدھر مسجد ہے اور اس سے آگے ایک راستا ہاکس بے کو جاتا ہے اور دوسرا سینڈز اسپٹ کو۔ کسٹم کے دفتر میں کام کرنے والے جن کے گھر کراچی میں تھے، واپس جا چکے تھے۔ اتوار نہ ہونے کی وجہ سے سڑک پر پکنک کے لیے آنے والوں کا ٹریفک بھی نہیں تھا۔ تکندر ریسٹورنٹ اور آس پاس کی دکانوں کے پاس کچھ بھیڑ تھی لیکن اتنی جتنی ایک باکس آفس پر پہلے ہی شو میں فیل ہو جانے والی فلم کے لیے ٹکٹ کی کھڑکی پر رہ جاتی ہے۔ محلّی گھر اور مسجد کے پاس سے گزرتے ہوئے مجھے وقفے وقفے سے سلام کی آواز سنائی دی اور لوگ مجھے تعجب سے آبادی سے دور جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔

میرا ارادہ سمندر کو دیکھنے کا تھا، خواہ کتنی ہی دور سے ہو، اور اگر ممکن ہو تو اس کی آواز کو سننے کا بھی تھا۔ سینڈز اسپٹ کی راہ پر جہاں بیریئر ہے، اُن دنوں پہرے پر دو باوردی سپاہی ہوتے تھے، ایک نیوی کی طرف سے دوسرا کسٹم کی۔ علاقے سے دونوں ہی کو سروکار تھا۔ بیریئر کے بعد ہی سمندر سے نکالے ہوئے نمک کی پہاڑیاں تھیں اور آگے کہیں نیوی کا حساس علاقہ تھا۔ شاید اب بھی ایسا ہی ہو۔ مجھے دیکھ کر کسٹم کے سپاہی نے سلیوٹ کیا اور اس کی دیکھا دیکھی نیوی کے سپاہی نے بھی۔ مجھے خوشی ہوئی ان چند ہی دنوں میں میں یہاں والوں کے لیے اجنبی نہیں رہا تھا۔ بیریئر کے بعد میں اکیلا تھا۔ سیدھے ہاتھ پر میں نے دلدل کی آواز سنی اور اس کی سطح پر دوڑتی ہوئی نیوٹ (Newt tailed amphibians) جیسی مخلوق کو دیکھا۔ دلدل میں متواتر چھوٹے چھوٹے گڑھے بن اور مٹ رہے تھے اور ان سے بے پروا اس پر اس مخلوق کا کھیل جاری تھا۔

الٹے ہاتھ پر دور تک پھیلا ہوا موری پور کا سب سے بڑا نمک کا کارخانہ تھا۔ شام کے سورج کی کرنیں نمک کی ڈھیریوں پر پڑ رہی تھیں، لیکن مٹی کی جمی ہوئی تہہ کی وجہ سے نمک جگمگا نہیں رہا تھا۔ آخری بار کا نمک کھیتوں سے نکالا بھی نہیں گیا تھا۔ مد کے وقت سمندر کا پانی لینے کے حوض اور کثافت بڑھانے کے

تالاب سب خشک پڑے تھے، سب پر مٹی جم چکی تھی۔ نمک اور نمک کو جھار تک لے جانے والی ریلوے لائن اور ٹرالیاں ایسے کھڑی تھیں جیسے کام چلتے چلتے ایک دم روک دیا گیا ہو اور اس دن کی بیگار دے کر مزدور عورتوں اور مردوں کو اگلے دن کام پر آنے سے منع کر دیا گیا ہو۔ پتا نہیں اُن مچھلیوں کا کیا ہوا تھا جو نمک سے لوحمل پانی کے تالابوں میں پہنچ کر دم توڑنے لگتی ہیں اور بہ آسانی پکڑلی جاتی ہیں۔ مجھے امید تھی آخری دن کے مزدور جاتے ہوئے انھیں اپنے ساتھ لیتے گئے ہوں گے، وہاں تڑپنے کے لیے انھیں نہیں چھوڑا ہو گا۔

لیکن میں اب تک صرف سمندر کے پیچھے رہ جانے والے پانی کو لیگوں اور کھاڑیوں اور شاخوں میں دیکھ رہا تھا۔ خود سمندر کہاں تھا؟ راستے میں پڑنے والے پہلے پُل کے سیمنٹ کے بیلسٹریڈز (balustrades) کافی چوڑے تھے۔ میں الٹے ہاتھ والے پر بیٹھ گیا اور دیر تک بیٹھا رہا۔ کچھ دیر بعد مجھے سمندر کی آواز سنائی دی، جس طرح سیپی میں خاموش وقفے کے بعد پہلے مدھم ہوٹس تحت الثریٰ سے اُبھرتے ہیں اور جن کے لیے ہمیں کان لگائے رہنا پڑتا ہے۔

پھر میں بیلسٹریڈ پر لیٹ گیا۔

اندھیرا ہونے کے بعد میں جب گھر پہنچا تو میرے نوکر نے مجھ سے کہا، آپ اُدھر کدھر چلے گئے تھے؟

میں نے کہا، کدھر؟

وہ بولا، اُدھر سینڈز پٹ والے بیریئر سے آگے۔ ہم تو گھبرا گئے تھے۔ آپ بغیر بتائے چلے گئے ورنہ ہم روک دیتے۔

کیوں؟ میں نے پوچھا۔

صاحب یہ علاقہ ٹھیک نہیں ہے۔ ڈاکوؤں کا علاقہ ہے۔ ہم آپ کی کھوج میں ہوٹل تک گئے۔ لوگوں نے بتایا آپ اُدھر اکیلے میں گئے ہیں۔ پھر پھرے پر کسٹم کے سپاہی سے جا کر پوچھا۔ جب اُس نے کہا کوئی بات نہیں ہے تب ہم گھر آئے۔ اب آپ اُدھر مت جائیے گا۔

اُن دنوں بادل ڈاکو کا بہت شہرہ تھا۔ اتنی سی شہرت بہت جلد میرے شام کو اکیلے سمندر کی طرف نکل جانے کی ہو گئی، کیوں کہ اس قسم کا خبط وہاں شاید پہلے کسے میں نہیں آیا تھا۔ سمندر روزی روزگار کی جگہ تھی یا دوستوں کے ساتھ سیر و تفریح کی؛ رات کو سناٹے میں اس کے کنارے جا کر بیٹھ رہنے کی نہیں۔

میں نے ہر ایک نصیحت کرنے والے سے یہی کہا، بھائی اگر ڈاکو مجھے مار دیں گے تو خود اپنا نقصان کریں گے۔ یہاں رہنے کے لیے پھر دوسرا ڈاکٹر نہیں آئے گا۔

میرا خیال ہے ڈاکوؤں کو میرا یہ مشورہ مضمون سمیت پہنچ ہی گیا ہو گا کیوں کہ جانا تو میرا اُس پل پر بارہا ہوا اور کتنی ہی بار رات کو اس بس سے اتر کر جو ایئرفورس کیمپ پر پہنچ کر ختم ہو جاتی تھی، مجھے اندھیرے میں میل بھر اکیلے پیدل گھر جانا پڑا لیکن کسی ڈاکو قسم کے آدمی سے معانقہ نہیں ہوا۔

جاڑے میں ایک بار جب میں لاہور کے گھر سے اپنے گھر لوٹا تو زبردست سائنوسائٹس (sinusitis) کی گرفت میں تھا۔ پہلی ہی رات بارش ہوئی اور کھڑکیوں میں جیوں کہ شیشے کہیں تھے کہیں نہیں تھے، برفانی ہوا بے دریغ کمرے میں آتی رہی۔ کوئٹے کی ہوا سے یہ شاید میری پہلی شناسائی تھی۔ اُن دو تین دن میں ہسپتال میں مریض آتے رہے لیکن بخار، کمزوری اور ٹھٹھرن کی وجہ سے میرا پلنگ سے اترنا مشکل تھا جو ہسپتال کی دین ہونے کی وجہ سے یوں بھی لوہے اور اسپرنگ کا تھا اور خاصا اونچا۔ اگر اس کے لوہے کے فریم سے میرا ہاتھ چھو جاتا تھا تو پورے جسم میں سردی کی لہر دوڑ جاتی تھی۔ کبھی جب اپنے کمرے میں بُوٹوں کی چاپ سن کر لحاف منہ سے ہٹا کر دیکھتا تو ہسپتال کے بوڑھے کمپاؤنڈر کو اپنے پلنگ کے پاس کھڑا دیکھتا تھا جو وہاں کسی زیادہ بیمار مریض کے بارے میں کچھ پوچھنے آئے ہوتے تھے۔ عام طور سے میرا نوکر لوگوں کو گھر کے پاس جمع ہو کر بولنے سے روکتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب بیمار ہیں، کل آئے گا۔

لیکن ایک صبح جب میرا بخار کچھ زیادہ ہی تھا اور سر کے ساتھ گُردوں میں بھی درد تھا، وہ میرے پلنگ کے پاس دبے قدموں آیا حالاں کہ اس کی مطلق ضرورت نہیں تھی، میں جاگ رہا تھا، اور مجھ سے دبی آواز میں بولا، صاحب بادل ڈاکو اپنے باپ کو لے کر آئے ہیں۔ وہ کچھ سٹ پٹایا ہوا تھا۔ میں بھی سٹ پٹا گیا اور سمجھ میں نہیں آیا کیا کہوں۔

پھر اُس نے کہا، کل سے چکر لگا رہے ہیں۔ آپ کو گھر لے جانے کو آئے تھے۔ اب جب پتا چل گیا آپ خود پڑے ہیں تو باپ کو لے کر آئے ہیں۔

یہ میرے لیے اتنی بڑی عزت کی بات تھی جیسے اب بیسویں صدی کی آخری چوتھائی میں کوئی مریض کسی معروف یا بدنام سیاسی لیڈر یا ورکر کا خط لے کر میرے پاس آتا ہے اور اوپر سے اُس مریض کی پارٹ (سفارش) میں ٹیلی فون آنے شروع ہوتے ہیں۔ لیکن بادل کے اپنے دروازے کے باہر ٹھنڈی گیلی ہوا میں باریابی کے لیے منتظر کھڑے ہونے نے مجھے خوف زدہ نہیں کیا۔ مجھے اندازہ تھا وہ ملتجی ہے، جبر پر آمادہ نہیں۔ یہ بات کسی کے سیاسی پارٹ سے آنے والے کے لیے، اب جب بیسویں صدی ختم پر ہے، نہ کوئی معالج کہہ سکتا ہے نہ علم، تاوقتے کہ اس میں خود دوسروں پر جبر کرنے کی طاقت نہ ہو۔

میں نے سر کو دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں کو دو تین بار ہلا کر دماغ کو کچھ صاف کیا اور کہا، "اپنے باپ کو اندر لے آئیں۔ خود میں پلنگ پر اوڑھے لپیٹے لیٹا رہا۔

دو چار مرد ایک بوڑھے کو اٹھا کر میرے کمرے میں لائے اور اُسے فرش پر لٹا دیا۔ میری طرح وہ بھی لپٹا لپٹایا تھا۔

میں نے لیٹے لیٹے بوڑھے کمپاؤنڈر سے سارا حال پوچھا۔ پھر پھُرتی سے فرش پر اتر کر اس کا معائنہ کیا اور جتنی جلدی ہو سکا پھر سے اپنے لحاف میں گھُس گیا۔ اتنی ہی دیر میں میری کپکپی چھُوٹ گئی۔

جب وہ لوگ بوڑھے کو لے کر جا چکے تھے اور میں اس لائق ہوا کہ منہ لحاف سے باہر نکال سکوں تو میں نے اپنے نوکر کو خوش خوش باہر سے کمرے میں آتے دیکھا۔ غالباً اُن لوگوں سے چلتے چلتے اس کی دو ایک دوستانہ باتیں ہوئی ہوں گی۔

میں نے پوچھا، ان میں سے بادل کون سا تھا؟

اس نے کہا، کوئی سا بھی نہیں صاحب۔ وہ تو باہر کھڑا سگریٹ پیتا رہا۔

خطرہ اگر یہ ٹلا ہوتا اور فریقین میں بھائی چارے کی بنیاد نہ پڑ گئی ہوتی تو یہی بات اس نے یوں کہی ہوتی وہ تو باہر کھڑے سگریٹ پیتے رہے۔

میرے ٹھیک ہونے کے ساتھ ہی موری پور کی ہوا کچھ اور ٹھنڈی ہو گئی۔

چند ہفتے بعد مجھے اطلاع ملی اپنے رشتے داروں کے ساتھ بادل کہیں آس پاس ہی ہے اور اس نے کہلوایا ہے، ہم لوگ اپنے باپ کے ٹھیک ہونے کی خوشی آپ کے دروازے پر منانا چاہتے ہیں۔ اگر ڈاکٹر صاحب اجازت دیں تو لا کر مکرانی کریں اور ناچ گانا ہو۔

میں نے جافری میں سے جھانک کر دیکھا۔ دو ایک مکرانی گاؤں کی طرف کھڑے ضرور تھے لیکن عین میرے گھر کے دروازے پر کوئی نہیں تھا۔ میرے انکار پر نہ وہ خوش ہوا نہ میں نے بادل کو دیکھا۔

پھر گرمیاں آ گئیں اور سینڈ اسپیٹ کے پُل پر میرا جانا بڑھتا گیا، یعنی جن شاموں کو میں تھکا ہوتا تھا اور کراچی جانے کا بھی پروگرام نہیں ہوتا تھا۔ جتنے بھی ملنے والے اُس دور میں موری پور آئے میں اُنہیں ایسی ویرانے اور خاموشی اور تنہائی میں ڈھونڈھی ہوئی جگہ ضرور لے جاتا تھا جہاں پہنچ کر آبادی میں رہ کر اکیلے ہونے کا احساس مٹ جاتا تھا اور لگتا تھا طبیعت سے گھٹن غائب ہو گئی ہے۔ کبھی پل کے نیچے لیگون میں پانی چڑھا ہوا ہوتا تھا، کبھی کم۔ سمندر کی آواز کبھی صاف سنائی دیتی تھی کبھی کان لگا کر سننے سے اس کا پتا پڑتا تھا۔ جب پانی زیادہ ہوتا تھا تو دلدل چھپ جاتی تھی، جب پانی اترتا تھا تو اس پر بیوٹ جیسی مخلوق کا زندگی کا کھیل پھر سے جاری ہو جاتا تھا۔

میرے مہمانوں کے لیے اس طرح سمندر پر شام کو یا اندھیرا پڑنے پر آنا، اور وہ بھی پیدل، ایک عجیب سی بات ہوتی تھی۔ اُن میں سے اکثر کا سمندر سے بس ایک ہی طرح کا واسطہ رہا ہوتا تھا صبح کھانے کے سامان، دریوں، تولیوں، چڈھیوں، تاش کی گڈیوں اور کرکٹ بَیٹ اور بال سے لدے پھندے کاروں میں سمندر کے ساحل پہنچنا، نہانا، کھیلنا، کھانا اور اندھیرا ہونے سے پہلے وہاں سے نکل لینا۔ انھوں نے نہ پانی کو گھُپ اندھیرے میں دیکھا تھا نہ اس پر پھیلی ہوئی شدید چاندنی کو جب سمندر کی ہر لہر کے منہ میں ایک تصویر گویا کی طرح رواں آ جاتی ہے۔ میرے ساتھ وہ اُن لیگونر کو دیکھتے تھے جن کے لیے پکنک کی سڑکیں سمندر کو جاتے ہوئے ان کے پاس وقت ہی نہیں ہوتا تھا۔ میرے افریقا میں جا سونے والے دوست کی بیوی کو سب سے زیادہ یہ بات پسند تھی کہ جانے ہم لوگ پیدل ہوں جانے اُس دوست کی بے چھت لے لی آسٹن میں، ہمیں کسٹم اور بیوی دونوں کے سپاہیوں کا سلیوٹ ملتا تھا۔ اگر اتفاق سے

بیریئر پر دونوں میں سے ایک بھی نہ ہو تو میرے دوست کے بیوی بچے سخت مایوس ہوتے تھے۔ پہلی دفعہ سلیوٹ ملنے کے بعد اس کے بچوں نے ایک بار پھر سے بیریئر سے گزرنے کا مطالبہ کیا تھا اور اُسے پورا کرنا میرے لیے ایسا ہی ہوتا جیسے اسٹیج پر شدید جذباتی کرب سے بھرے مکالمے کے بعد کسی کا مر کر گرنا اور دیکھنے والوں کا ونس مور کے نعرے لگانا۔

جب میرے مہمان زیادہ حوصلے والے ہوں تو میں اُنھیں اس لمبی سڑک پر دور تک لے جاتا تھا جو سیدھی ساحلِ سمندر کو جاتی ہے، اور جس پر اتنی شام کو کبھی کوئی نہیں ملا تھا۔ نہ ہی اندھیرا ہو جانے پر ساحل پر کسی نے ہمیں ٹوکا۔ میرے نوکر کا واپسی پر مجھے ٹوکنا بادل کے باپ کے علاج کے بعد ختم ہو چکا تھا۔

اکثر ایسا بھی ہوا میں اپنے دروازے کی چوکھٹ میں بیٹھا ہوں، کوئی کسٹم کا بہت ہی چھوٹے درجے کا ملازم یا گاؤں والا راہ چلتے چلتے رُکا، جھجکتا ہوا میرے پاس آیا اور ایک روپے کا طلب گار ہوا۔ مجھے معلوم تھا نے وردی عملے کو تنخواہ وقت پر نہیں ملتی تھی اور نمک کے کارخانوں کے مزدوروں کے تو پیروں اور پنڈلیوں کے زخم تک کام نہ ملنے سے سُوکھ چلے تھے۔

ایک بار دروازہ کھلا تھا، میں میز پر کام کر رہا تھا۔ ایک مکرانی بُڑھیا ایک بچے کو ہاتھوں میں لیے برآمدہ پار کر کے کمرے میں داخل ہوئی اور میرے پاس آ کر خاموش کھڑی ہو گئی۔ نوکر پیچھے باورچی خانے میں تھا، اُسے بھی اس کے آنے کی اطلاع نہیں ہوئی۔ میں نے غالباً پوچھا ہوگا، کیا بات ہے؟ لیکن وہ چپ رہی۔ مجھے خبر نہیں تھی کہ وہ دور کے کسی گاؤں سے مُردہ بچے کو دکھانے کے لیے لے کر آئی ہے۔ وہ رو نہیں رہی تھی اور اس کے ساتھ کے لوگ، جن میں بچے کی ماں بھی تھی، دروازے کے باہر صبر سے خاموش کھڑے تھے۔ میں نے بچے کو دیکھا اور اس میں زندگی کی کوئی علامت نہ پا کر سر اور آنکھوں سے بُڑھیا کو آگاہ کیا کہ کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ اُس نے بچے کو میری میز پر پھیلے ہوئے کاغذات پر رکھا، برآمدے کی طرف دو قدم بڑھی اور کسی کو آواز دی

بانو ٹونسیا۔

جیسے وہ بات کو ماننے کو تیار نہ ہو اور اپنے کسی ساتھ والے کو میری بات سمجھنے کو بُلا رہی ہو۔ میری سمجھ میں یہی آیا کہ بانو اس کا بیٹا ہے۔ اُسے میری بات سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ پھر بوڑھی عورت نے بانو سے کہا، بچہ بگیر! جیسے اب یہی ایک کام کرنے کو رہ گیا تھا۔

ماں، بیٹے اور مُردہ پوتے کے باہر نکلتے ہی لوگوں نے بین شروع کر دیا، جسے سن کر کسٹم کے کوارٹروں کی عورتیں اپنے دروازوں سے جھانکنے لگیں جیسے میت میرے گھر سے نکلی ہو۔ جہالت سے میں کمرے میں لوٹ آیا، اور میرے نوکر نے جو بوڑھی دادی کے بیٹے کو بلانے کی آواز پر وہیں آ گیا تھا باہر نکل کر رونے والوں کو رام کیا کہ اتنی دور سے مرے ہوئے بچے کو لے کر آئے ہو اور تمھیں ہوش تک نہیں کہ مرا ہوا ہے۔ یہ پیغام کوارٹروں سے جھانکنے والی عورتوں کے لیے بھی تھا، اور کافی ثابت ہوا۔

بڑھیا کا خاموشی سے میرے پاس کھڑے ہو جانا میرے لیے عرصے تک معما رہا۔ وہ شاید راستے میں سراہیوں سے کہتی آئی تھی، بچہ ٹھیک ہے، سو گیا ہے، اور اسی بات کا مطلب انھوں نے باوجود اس کے کہ راستے بھر بچے نے کوئی کاں نہیں کی ہو گی، یہ لیا ہو گا کہ بچ جائے گا اور ابھی رونے کا وقت نہیں آیا۔ پھر اُس کے ایک ہی اطلاعی جملے نے جیسے رونے کا اذن دے دیا ہو، اور گاؤں پہنچ کر اغلب یہی ہے کہ یہ گریہ اجتماعی صورت اختیار کر گیا ہو گا جیسا میرے کانوں تک قریب کے گاؤں سے پہنچتا تھا۔ ہر پری میٹو (primitive) سوسائٹی کی طرح ان کے بھی تمام کام اجتماعی نوعیت کے تھے ـــــ عبادت، خوشی منانا، گریہ، حتیٰ کہ گھریلو لڑائیاں لڑنا اور ٹڈیاں پکڑنا۔

ضبط کی صفت کے ساتھ ساتھ بعد میں مجھے تجربے نے بتایا کہ یہ لوگ ایسی بات کو لاجواب کر دینے والے طریقے سے کہنے کا فن بھی جانتے ہیں، یہ نہیں کہ لٹھ مار دیا، اور ایک بار بات شروع ہو جانے تو چپ ہونا بھی نہیں جانتے۔

میں مایار سے پچھلے رمانوں کی باتیں سن رہا تھا۔ اُس کا چہرہ اور رنگ، اب سوچتا ہوں تو پتا چلتا ہے، عام مکرانیوں سے کم اور سوڈانیوں سے زیادہ ملتا جلتا تھا۔ وہ میرے پاس کے گاؤں کا تھا، اس لیے میرا پڑوسی تھا اور اسی حق کی بنا پر وہ کبھی کبھار ایک روپیہ قرض مانگنے کی غرض سے یا کسی کے لیے نسخہ لکھوانے کے لیے وقت بےوقت میرے پاس آ جاتا تھا۔ باتونی آدمی تھا، اس کی زبان میں ملا کی کاٹ تھی۔ اس کے بارے میں میری رائے تھی کہ اگر پھر سے نمک کے کارخانوں یا کھیتوں یا تالابوں میں، وہ جو کچھ بھی تھے، کام شروع ہو جائے اور مزدور اپنی ٹریڈ یونین بنائیں تو اس سے موزوں آدمی اُنھیں دوسرا نہیں مل سکتا تھا۔ وہ ٹریڈ یونین لیڈر رہ چکا تھا لیکن کامیاب نہیں، ناکام۔

اُس کے ایک جملے میں تمام نمک کے کارخانوں میں کام کرنے والوں کے بارے میں اُس کی رائے چھپی تھی

صاحب ادھر کا لوگ بہت حرامی ہے۔

میں نے کہا، کیسے؟

بولا، اگر ایسا نہیں ہوتا تو اتنے دن کارخانے بند ہونے پر خاموش کیسے رہتا۔

میرا خیال تھا اس خاموشی میں پیسہ ملوث ہو گا جو کچھ لوگوں کو مل رہا ہو گا اور وہ دوسروں کو خاموش رہنے پر مجبور کر رہے ہوں گے۔ لیکن مایار نے کہا، ان لوگوں میں اب ہمت نہیں رہا ہے۔ کلکٹر کے سامنے بات کرنے سے ڈرتا ہے۔ لوڈ [لورڈ] کے ممبروں تک ایسا بات کیسے لے کر جائیگا، اور ان بڈھوں سے وہاں بات کرے گا کون۔ حرام کا مال ان کے پیٹ میں پڑ گیا ہے۔ ایسے حق کا بات کرنے ہوئے ان کا ماں مرتا ہے۔

پہلے بھی ان میں ہمت؟ میں نے پوچھا۔

ہاں، مایار نے کہا، پاکستان بننے سے پہلے تھا اور اُس ٹائم کا مزدور ڈپٹی کلکٹر، کلکٹر کے سامنے

بھی بات کرتے ہوئے نہیں ڈرتا تھا۔ سیٹھ کو اپنا جیسا آدمی سمجھتا تھا، زرق دینے والا نہیں۔ پھر اُس سے کیا ڈرتا۔

پھر اُس نے کبھی پہلے کا قصہ سنایا کہ جب جنگ کی وجہ سے آٹا چاول ہر چیز بہت مہنگی ہو گئی اور مزدوری اُتنی کی اُتنی ہی رہی تو لوگوں نے فریاد کرنا شروع کیا کہ پیٹ نہیں بھرتا۔ منیجر لوگ اُن دکھیاروں کی بات کو سیٹھوں تک پہنچاتے ہی نہیں تھے اور سیٹھوں کے کانوں میں جب ان کے مطالبے کی بھنک پڑی تو انھوں نے کارخانوں کو آنا بند کر دیا کہ آئیں گے تو یہ لوگ گلا کرنے کو راستا روک کے کھڑے ہو جائیں گے۔ مزدور کام چھوڑ کر بیٹھ رہتے تو اتنی بیگار بھی نہیں ملتی۔ چھوٹے گورنمنٹ افسروں کے ہاتھ میں کچھ تھا نہیں۔ منیجروں کی طرح وہ بھی ان کی فریاد کو آگے نہیں پہنچاتے تھے۔

اُس ٹائم انگریزوں کا راج تھا، دوسری قوم کا آدمی انگریز کے سامنے بولتے کان پکڑتا تھا۔ پر یہ لوگ حرام کا مال نہیں کھاتا تھا، ان میں ہمت تھا۔ ایک دن ایک بڑا انگریز افیسر ادھر معائنے کو آیا۔ کلکٹر ہوئے گا یا لوڈ کا ممبر، میرے کو اتنا یاد نہیں۔

میں نے کہا، اتنا پتا نہیں کہو۔ یہ بات تم سے پہلے کی ہو گی۔

وہ اپنی رو میں بولتا رہا۔ اُس ٹائم انگریز افیسر بھی ان جگہوں کا راؤنڈ کرنے کو آتا تھا، یہ نہیں کہ اُدھر آفیس میں کرسی پر بیٹھا اینا — گھسٹا رہے، جیسے آج کل کا افیسر لوگ کرتا ہے۔ سب کارخانے بند ہو گئے پر ان اپنی ماں کے یاروں میں سے ایک نے بھی آ کر نہیں پوچھا کہ مزدور کہاں سے کھاتا ہے، کہاں سے اس کے پاس پہننے کو کپڑا آتا ہے۔ اِدھر پانی پینے تک کو نہیں ہے، پر تمھارے سامنے کوئی حال پوچھنے کو آیا؟

میرے منھ سے نکلا، نہیں۔

لیکن میرا نہیں کہنا غیر ضروری تھا۔ وہ اپنی بات کی تائید سننے کے لیے رکا ہی کب تھا۔

جیسے ایک دن وہ بڑا انگریز افیسر دورے کو آیا۔ سب مزدوروں نے اسے گھیر لیا۔ پن وہ ڈرا نہیں۔ ان پاکستانی افیسروں سے ایسا کرو، سمجھیں گا اس پر حملہ ہو رہا ہے اور دھمکی دیں گا کہ تمھارے کو گرفتار کرا دوں گا۔ کون ہے تمھارا لیڈر؟ اُس کو دیکھ لوں گا۔ اور اس سے پہلے کہ مزدور کے منھ سے دو لفظ نکلے اپنی موٹر میں بیٹھ کر ہوا ہو جاتا ہے، کیوں کہ اندر سے تو گیدڑ کا مافق ڈرا ہوا ہوتا ہے۔ پھر پلٹ کر نہیں آتا۔ پن وہ انگریز تھا۔ سیٹھ اُس کے پیچھے ایسا کھڑا تھا جیسے کارخانے کا مالک نہیں ٹھگی ہوئے۔ بارش میں بھیگے کوے جیسا۔ اور آج کل جب گورنمنٹ افیسر راؤنڈ پر آتا ہے تو وہ سیٹھ سے دو قدم پیچھے رہتا ہے جیسے سیٹھ اُس کا مائی باپ ہو۔ سیٹھ اُسے دور سے نمک کی ڈھیریاں دکھاتا ہے جیسے سیر کرانے کو آیا ہو۔ پھر افیسر کو ریسٹ ہاؤس میں لے جاتا ہے جہاں جانے کا افیسر کو بھی تکڑ [جلدی] ہوتا ہے کیوں کہ وہ بھی ادھر اسکوچ پینے کو آیا ہوتا ہے، اِن ٹکے ٹکے مزدوروں سے اپنا ماں —— کرانے کو نہیں۔

میں نے کہا، گالی مت بکو یار۔ میں اس سے ایک حد سے زیادہ فری ہونے کو تیار نہیں تھا۔

اُس نے تعجب سے کہا، کون سا گالی؟
میں نے کہا، کچھ نہیں۔ ایسی بات کہو۔
وہ بولا، آج کل کے ان ماں کے ---- کے سامنے اُس ٹائم کا افیسر افیسر ہوتا تھا۔ کام کے ٹائم سیٹھ اُس کو پیسے کو بولتا تو الٹا اُس کا جوں پی جاتا۔ مزدوروں سے بولا کیا مانگتا ہے؟ مزدوروں میں، ان میں مرد بھی تھے عورتیں بھی، ایسے پیٹ پر سے کپڑا اٹھا کر اُسے دکھایا کہ لو، یہ دیکھ لو۔ یہ بات اُنھیں کرنے کا پہلے سے کسی نے بولا نہیں تھا۔ خود جیسا ان کی سمجھ میں آیا ویسے انھوں نے کہا۔ اس نے پھر پوچھا کیا بات کرنا مانگتا؟ ڈرو مت، بولو۔ مزدوروں نے اب منھ سے فریاد کیا کہ اِدھر پیٹ کو دیکھو، مہنگائی ہے، بھرتا نہیں۔ اُس نے کہا، پیٹ ہمارا بھی ہے۔ ہمارا پگار تو نہیں بڑھا، پن ہمارا پیٹ ہو بھ جاتا ہے۔ ایک مزدور نے جو دیکھنے میں بھی بھینسا لگتا تھا، اپنے پیٹ کو طبلے کی مافق بجاتے ہوئے کہا صاحب تو گوپ، مں کامینں۔ تو کما جوری ما بیش۔ [صاحب تُو گاے ہے میں بھینس۔ تو کم کھاتا ہے میں زیادہ۔] تیرا پیٹ اتنی ہی پگار میں بھر جاتا ہوگا جتنی پہلے تھی۔ ہمارا نہیں بھرتا۔ رات کو خالی پیٹ پر نیند بھی نہیں آتا۔ بچہ الگ روتا ہے۔ ایسی تی تی سے بات کرو تو کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ وہ لاجواب ہو گیا اور ہنسنے لگا۔ پھر اس نے اپنے کلارک کو جو ساتھ آیا تھا کچھ انگریزی میں لکھوایا اور مزدوروں کے سامنے ایسے سر ہلایا جیسے ان کی بات کو سمجھ گیا ہو اور مانتا بھی ہو۔ پھر اس نے دو ایک مزدوروں سے ہاتھ ملایا اور جب چلنے کو ہوا تو مزدور اس کے لیے راستا چھوڑ کر ایسے کھڑے ہو گئے جیسے جیسے
مثال اُس کی سمجھ میں نہیں آئی۔
میں نے کہا، جیسے بادشاہ کی سواری گزر رہی ہو۔
مایار نے تعبیر رُکے ہوئے کہا، اب اول تو افیسر اِدھر آنے کا نہیں۔ آنے کا تو ریسٹ ہاوس میں بیٹھ کر اپنا منھ کالا کر کے چلا جانے کا۔ اور جو کوئی مزدور اس سے بات کرنا چاہے تو وہ اپنی ماں کا یار سمجھیں گا اُس کا راستا روک رہا ہے۔
مایار تھوڑا بہت پڑھا لکھا آدمی تھا۔ میں نے پوچھا، یہ نتیجہ کیا نکلا؟
بولا، مزدور لوگ بزدل ہو گیا ہے۔
میں نے کہا، یا یہ کہ حاکم وہ نہیں رہے جو ان کی بات سنتے تھے۔
وہ اپنی بات پر قائم رہا۔ ادھر کا لوگ حرامی ہے۔ حرام کا مال کھا کے بزدل ہو گیا ہے۔
لیکن میرے لاکھ پوچھنے پر بھی کہ جب اُنھیں جیب رہنے کی پگار نہیں مل رہی ہے تو کون سا حرام کا مال ان کے پیٹ میں جاتا ہے، وہ چپ رہا۔ یہ بولا، ادھر سب طرح کا دھندا ہے۔ تم نہیں سمجھے گا۔
مجھے وہ شام یاد آئی جب کسٹم کا ایک ڈرائیور، جو کسی اَور کوٹھے کا تھا، میرے کمرے میں چہرے پر خجالت لیے آیا تھا۔ میں نے پوچھا، کیا بات ہے حسین؟ اُس نے بے شرمی کی ہنسی ہنسنی چاہی لیکن اسی کوشش میں ناکام ہو کر سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

ساتھ ہی اُنٹے کا پیڑا لیے میرا نوکر جو اُس لمحے جا ساماں تھا، بات سننے کے اشتیاق میں صحن والے دروازے میں آن کھڑا ہوا۔ تھوڑے توقف سے حسین نے نوکر سے کہا، صاحب سے کچھ پرائیویٹ میں بات کرنے کا ہے۔ میں نے بھی سر کی جنبش سے اُسے جانے کو کہا، اور جب وہ چلا گیا تو حسین نے سر اٹھائے اٹھائے کہا، صاحب غلطی ہو گئی۔

کیسی غلطی؟ میں نے کہا۔ پہلے کتنے بچے ہیں؟

وہ بات نہیں ہے، اس نے کہا۔ دوا چاہیے۔

مجھے دوسرا خیال آیا، کہیں سے بیماری لگا لایا ہے، اور فوراً ہی اپنے کالج کے متعلقہ شعبے کے انچارج کی اسٹریٹیجی یاد آئی جو ایسے مریض کو پینسلین کے ایک ہی ٹیکے سے بیماری سے چھٹکارا دلانے کے قائل نہیں تھے۔ داڑھی رکھتے تھے، شعر کہتے تھے، یہ پتا نہیں مولانا صفت تھے یا نہیں۔ سزا کے طور پر کچھ عرصے مریض یا مجرم کو چند ہفتے اینٹی منی (antimony، سُرمہ، کُحل) کے سیاہ انجکشنوں پر رکھتے تھے اور جب سمجھتے تھے کہ اس کا نفسِ امارہ نفسِ لوامہ میں بدل چکا ہے تو پینسلین، جو اُن دنوں نئی دوا تھی اور دوافروشوں کے کاؤنٹر پر نہیں بکتی تھی، لگواتے تھے۔ جی میں آیا حسین کو بھی وہی سزا دوں۔ مگر اس میں ایک خدشہ یہ تھا کہ تالیفِ قلب ہونے تک وہ اپنی بیوی کے جسم کا قلع قمع نہ کر دے۔ دوسرے یہ کہ اس سیم روحانی طریقۂ علاج سے متفق نہ ہوتے ہوئے بھی اگر میں اس پر عمل کرنا چاہتا تو ہسپتال میں اینٹی منی کا انجکشن تھا کب۔

میرے منھ سے نکلا، اپنے لیے؟

اُس نے کہا، نہیں صاحب۔ غلطی ہو گئی۔ اُس کے لیے۔

کس کے؟

میری بی بی کا چھوٹا بہن ہے۔

میرا خیال تھا میرے پاس سے ناکام جانے کے بعد اگلی دفعہ جب وہ کہیں نظر آئے گا تو انتقاماً مجھے سلام نہیں کرے گا۔ لیکن چند دن بعد جب وہ ملا تو بجلی بے حیائی سے بولا، صاحب کام ہو گیا۔

میں کہتے کہتے رک گیا، مبارک ہو۔ وہ کھلکھلاتا ہوا اپنی راہ پر ہو لیا۔

میں نے یہ بھی سنا تھا کوٹھوں میں سر جیسیر سے نکلنے والا دھواں چولھے سے نکلا ہوا نہیں ہوتا تھا۔ اس میں کچھ ایسے دھویں بھی ہوتے تھے جو حشیہ کشید خانوں سے اُٹھتے تھے۔

اور ہوری یور آنے سے پہلے یہ تو میں سن ہی چکا تھا کہ شہر میں چلنے والی لمبی امریکن کاروں کو ٹیگرو ڈرائیور دن میں مسافروں کو یہاں سے وہاں پہنچانے کے کام میں لاتے تھے اور رات کو کچی آبادیوں سے عورتوں اور لڑکیوں کو متمول علاقوں کو ڈھونے کے۔

ماپار کی بات کچھ کچھ میری سمجھ میں آئی تو، لیکن پوری آبادی ان دھندوں پر چل رہی ہو میرے لیے یہ باور کرنا مشکل تھا۔

جیسی رائے مایار کی ایسے لوگوں کے بارے میں تھی کچھ ویسی ہی رائے مایار کے بارے میں دوسرے
لیڈر قسم کے لوگوں کے منھ سے میں نے بعد میں سنی۔

۳

پہلے آندھی آئی اور کئی دن بغیر تھمے ہوئے، بغیر رُکے، چلتی رہی۔ اتنی شدید کہ چلتے ہوئے قدم
اُکھڑتے تھے اور دھول کی وجہ سے دو تین فٹ دور کی چیز بھی نظر نہیں آتی تھی۔ کلینک میں بیٹھ کر میز
کے دوسری طرف کھڑے ہوئے مریض کی شکل پہچانی نہیں جاتی تھی۔ کوئی بھی کام کرنا دشوار تھا۔ اُن
دنوں بال پوائنٹ پین عام نہیں تھے، اور قلم کاغذ پر چلتے ہوئے کھس کھس کرتا تھا۔ دانتوں تلے، آنکھوں
میں، کاغذ پر، کھانے میں، پلنگ کی چادر پر، ہر جگہ ریت ہی ریت تھی۔ آدمی پانی کی قلت سے نہا بھی
نہیں سکتا تھا۔ کئی وقت میرے یہاں کھانا بھی نہیں پک سکا اور تندور یا ہوٹل سے منگوانا پڑا، جس کا سب
سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ اس کے ساتھ جگ بھر کر پانی آتا تھا۔ ہسپتال میں مکسچر کا بنانا دشوار ہو گیا اور اس کا
حل یہ ڈسپنسری کے عملے اور مریضوں نے یہ نکالا کہ مریض اپنے گھر سے شیشیوں میں پانی لانے لگے —
بس اتنا جتنا اُن کی دوا کو کافی ہوتا، زیادہ نہیں، اور اپنے حصے کی دوا لے کر چلے جاتے۔ اُن دنوں وہاں
واٹر ٹینکر بھی نہیں آتا تھا جس کے پیچھے میں نے گاؤں والوں کی لائن لگی میں نے اکثر دیکھی تھی۔

ہر مارشل لا حکومت کی طرح ۱۹۵۸ کی حکومت بھی شروع کی سرگرمی کے بعد عام لوگوں کی
ضروریاتِ زندگی کو کب کا بھلا چکی تھی اور اب فوجی افسر اپنی مالی حالت کو مستحکم کرنے میں لگے ہوئے
تھے۔ یوں بھی مارشل لا حکومت کے پاس سویلین کے مسائل کے لیے ہمیشہ بہت چھوٹا اور معصوم سا منشور
ہوتا ہے: کھانے پینے کی چیزوں کو مکھیوں سے محفوظ نہ رکھنے والے خوانچہ فروشوں اور دکان داروں پر
جرمانہ، سگریٹ کے ٹکڑے سڑک پر پھینکنے پر جرمانہ، سنیما ہال میں سگریٹ پینے پر جرمانہ، سڑک کے کنارے
پیشاب کرنے پر جرمانہ، اور اسی طرح کی چند اور دلچسپیاں۔ پبلک یوٹیلٹیز بنوانے اور انھیں سالہا سال میں
ٹھیک کرنے کی ذمے داری کس پر ہے، یہ اُن کا دردِ سر نہیں ہوتا ہے۔ اُن کے خیال میں پورا ملک اور اس
میں پھیلے ہوئے ان گنت گاؤں، قصبے اور شہر بھی کنٹونمنٹ ہوتے ہیں جن میں صفائی ستھرائی رکھنے کے
لیے فنڈ بھی اتنے ہی وافر ہوتے ہیں جتنے خود اُن کے لیے۔ ۱۹۵۸ کے مارشل لا کے ہاتھ میں کراچی شہر
میں پانی کی قلت دور کرنے کے لیے بڑا سستا اور آسان نسخہ آ گیا — لوگوں نے شہر کی بے رنگی دور
کرنے کے لیے اپنے کوارٹروں اور گھروں کے سامنے جو چھوٹی چھوٹی کیاریاں لگائی تھیں یا باغیچے کھلا لیے
تھے انھیں ختم کر دیا گیا اور حکومت کو اپنی طاقت کا اندازہ ہوا۔ موری پور کو اس کا فائدہ بھی نہیں پہنچایا جا
سکتا تھا کیوں کہ نہ وہاں کیاریاں تھیں نہ باغیچے، اگر ہوتے تو اُن میں پانی کی کھپت کو روکا جا سکتا تھا اور وہ

پانی موری پور میں پانی کی قلت کو دور کرنے کے کام آتا۔
میں نے آدمی سے اُکتا کر لوگوں سے پوچھا، کبھی کب تک چلے گی؟ اور جب انھوں نے کوئی یقینی جواب نہیں دیا تو سوچنے لگا کراچی کچھ دن کے لیے اپنے بڑے ماموں یا دوست کے گھر چلا جاؤں، لیکن اس میں مجھے سُبکی نظر آئی۔ پھر اس کا حل ایک ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کسٹم نے یہ نکالا کہ میں پاکستان ٹوبیکو کمپنی ان کے فلیٹ میں نہانے دھونے کے لیے آجایا کروں۔ وہ پہلے موری پور ہی میں تھے اور میرے اُن کے مراسم ہو گئے تھے۔ اُن کے گھر مجھے صبح صبح نہانے کے لیے پانی سے کچھ زیادہ ہی ملا جو اپنے گھر میں ملتا تو تھا لیکن عورت کے ہاتھ کا نہیں ہوتا تھا۔ عورت کے ہاتھ کا کھانا تاعمر مرد کی کمزوری رہتی ہے جسے صبح بچپن ملا ہو۔
بالآخر ہوا اپنی رفتار پر لوٹ آئی اور اس میں سے گرد بھی غائب ہو گئی۔ لیکن پانی کی قلت جوں کی توں رہی۔ مارشل لا حکومت، جیسا کہ ہر ملک میں ہوتا ہے، اپنی پہلے سے مقررہ نشوونما کی منزلیں بہت تیزی سے طے کر رہی تھی۔ انسان کے بچے کی طرح انتہائی سست رفتاری سے نہیں، مچھلی، مینڈک اور پرندے کی طرح ہفتوں اور مہینوں میں۔ ۱۹۵۸ کا انقلاب بھی گیسٹیشنل (gestational) اسٹیج یعنی رحم سیاست، میں عام نظروں سے اوجھل رہا تھا جیسے ناپسندیدہ حمل کو چھپایا جاتا ہے۔ ایک صبح اس کا ظہور ہوا، بالکل ویسے ہی جیسے صبح سو کر اُٹھنے پر گھر کے بچوں کو پتا چلتا ہے رات ایک ننھا آیا ہے یا ننھی آئی ہے، اور جب وہ اُسے دیکھنے کے لیے لپکتے ہیں تو پہلے ماں نظر آتی ہے ــــ نحیف اور پیٹ بیٹھا ہوا ــــ بعد میں وہ جس کی آمد اُن سے پوشیدہ رکھی گئی تھی اور جس کے آنے سے غریب گھرانے میں کھانے کی چیزوں کا توڑا پڑ جاتا ہے اور تھوڑی رہتی، سمجھدار لڑکیاں سمجھ جاتی ہیں بہت جلد اب ایک اَور بہن یا بھائی کو کولھے پر چڑھانے چڑھانے پھرنا ہوگا۔ تیسرے درجے کے ملکوں میں ہر سیاسی وضعِ حمل کے بعد عوام کی زندگی پہلے سے زیادہ نحیف ہو جاتی ہے، اُسے دیکھنے کا اشتیاق چند دن میں مٹ جاتا ہے اور سمجھنے والے سمجھ لیتے ہیں یہ نیا بوجھ اور ڈھونا پڑے گا۔ ۱۹۵۸ کے انقلاب سے چیزوں کی قیمتیں گریں، کچھ لوگ گرفتار ہوئے، ٹرینیں وقت پر چلیں، شہروں میں کچھ دن کے لیے صفائی ستھرائی ہوئی اور دکانوں اور دفتروں پر چھاپے پڑے۔ پھر حالات معمول پر آ گئے، جیسے نادر شاہ نے حملہ کیا ہو آیا اور آ کر لوگوں میں سے ہوتا ہوا اپنے ملک کو لوٹ گیا۔ لوگ کچھ دن خوف زدہ ہوئے، پھر اپنے کاموں میں لگ گئے۔
میرے ہسپتال کا چارج لینے کے دوسرے دن جب میں سینٹرل گورنمنٹ اسٹور سے دوائیں لینے گیا ہوا تھا، کیوں کہ ہسپتال میں یونیسیف کی عطا کی ہوئی وٹامن اور فولاد کی گولیوں اور سلفا آئنٹمنٹ کے سوا کچھ نہیں تھا، ایک کرنل ہسپتال کو چیک کرنے کے لیے آیا اور میرے بارے میں پوچھ کر کہ ڈاکٹر کہاں ہے؟ کیا اکثر غائب رہتا ہے؟ اگلے دن آنے کو کہہ کر چلا گیا۔
اگلے دن وہ اُس وقت آیا جب دوائیں اسٹور روم میں لگائی جا رہی تھیں۔ اس کے پاس مجھے کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا، اس لیے چلتے وقت اپنا نام اور پتا بتا کر چلا گیا کہ کوئی پریشانی ہو، اسٹاف وقت پر ڈیوٹی پر

نہ آتا ہو تو میں اُسے مطلع کروں۔

لیکن آگے چل کر جب اس کا وقت آیا تو ملٹری کی دلچسپی موری پور میں ختم ہو چکی تھی۔ دکانوں میں اسمگلنگ کا مال، جو مارشل لا کے آنے پر وہاں سے غائب کر دیا گیا تھا، واپس لوٹ آیا۔ کسٹم سپرنٹنڈنٹ کی بیوی کے نام سے صدر روڈ کی دکان میں جو کپڑا تھا اور جو مارشل لا کے شروع کے چند ہفتوں کے کپڑے کی دکانوں پر چھاپے کی وجہ سے کسٹم کے مال گودام میں پہنچا دیا گیا تھا، خطرہ ختم ہونے پر کب کا دکان میں واپس پہنچ چکا تھا۔

آہستہ آہستہ حکومت کی مشینری کے پرانے پُرزے اس نئی مشین میں فٹ ہوتے چلے گئے۔ پورے ملک کو کنٹونمنٹ کی طرح چلانے کے لیے فنڈ واقف نہیں ہوتے، اور کم قیمت پر ملک پھونکٹ میں ملک کو چلانے کے فن سے تیسری دنیا کے ملکوں میں پرانے سیاست داں ہی واقف ہوتے ہیں۔ ان کا اشتراک ملٹری کے لیے بہت جلد ناگزیر ہو جاتا ہے اور اس عمل میں بڑی تیزی سے حکومت کے دونوں شیئر ہولڈرز کے مزاج بدلنے لگتے ہیں۔ عسکری مزاج اور طنطنہ سویلین حکام کے دل میں جا کر لیتے ہیں اور سویلین جینئس کوشی عسکری دماغ میں گھر سا لیتی ہے۔

موری پور میں مارشل لا صرف اُتنی دیر کے لیے آیا جتنی کا میں نے ذکر کیا ہے۔

ناچار مجھے کسی کے مشورے پر کراچی میونسپل کارپوریشن واٹر انجینئر کے پاس جانا پڑا۔ اچھے آدمی نکلے۔ ادبی ذوق بھی رکھتے تھے۔ یہ سن کر کہ مریض دوا کے لیے گھر سے شیشیوں میں پانی لے کر آتے ہیں، ان کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل گئی۔ وہ موری پور سے ماڑی پور یا سینڈز اسپٹ جاتے ہوئے گزرے ضرور تھے لیکن اس سے زیادہ ان کی وہاں کی آبادی سے شناسائی نہ تھی۔ یہ طے ہو گیا کہ کل سے ٹینکر پانی لے کر آیا کرے گا، شاید ہفتے میں دو بار۔ میں وہاں سے اٹھا تو ان کے پاس بیٹھے ہوئے ایک گلوکار، جو اتنی دیر میں میرے دوست بن چکے تھے، اٹھ کر میرے ساتھ ہو لیے۔ ان کے پاس کرنے کے لیے کچھ اور تھا نہیں، نہ کسی فلم کا کنٹریکٹ۔ میرے ساتھ میرا خالہ زاد بھائی بھی تھا جو کالج میں پڑھ رہا تھا۔

اُس شام میں اُن دونوں کو لے کر ایسی بےدیوار، بےچھت، یوں کہئے پر گیا۔ ہم پل کی اُسی سیلسٹر یڈ پر بیٹھے۔ کہنے پر اُنھوں نے دو ایک گانے سنائے اور ایسا مشہور نغمہ "تیری رسوائیوں سے ڈرتا ہوں، جب ترے شہر سے گزرتا ہوں" بھی۔ میں نے راستے میں اپنے خالہ زاد بھائی سے کہا تھا، "آپ شرافت علی صاحب ہیں، گلوکار۔" تعارف کے وقت اُس نے نہ خوشی کا اظہار کیا تھا نہ گرم جوشی کا۔ اس وقت ان کے منھ سے وہ مشہور گانا سن کر اس کے منھ سے بےاختیار نکلا، "آپ نے وہ گانا گایا تھا؟"

میں نے کہا، "کیوں کیا ہوا؟ یقین نہیں آ رہا؟"

وہ جھینپ گیا۔ "نعیر آرکیسٹرا کے اچھا نہیں لگا؟" میں نے پوچھا۔

اُس نے میری بات پر اچانک خود میں جرأت پاتے ہوئے کہا، "نہیں، یہاں انھوں نے سینما ہال

سے اچھا لگایا ہے۔ میں نے ماحول پر ایک نظر ڈالی اور اٹھ کھڑا ہوا۔
اگلے دن سے واٹر ٹینکر ہسپتال آنے لگا۔ اس کی آواز سنتے ہی عورتیں اور بچے کوٹھ میں سے ایسے اُمل پڑتے جیسے پانی کی چھینٹا پڑنے پر چیونٹیاں، چھوٹے اور بیر بہوٹیاں زمین سے۔ لیکن وہ صبر سے ٹینکر کے پاس کھڑے رہتے تھے۔ جب ہسپتال کی پانی کی ٹنکی چکاس ہو جاتی تھی تو ان کی باری آتی تھی۔ اس طریق کار سے وہ مطمئن تھے۔
میرے لیے زندگی موری پور میں دن بدن دشوار ہوتی جا رہی تھی۔ نمک کے کارخانوں میں کام کرنے والوں کی طرح ہسپتال کے عملے کو بھی ایک وقت آیا کہ تنخواہ ملنی بند ہو گئی۔ وہ بھی مجھ ہی سے آ کر اپنا رونا روتے تھے۔ مجھے گلاسگو ایک مقررہ تاریخ پر پہنچنا تھا اور سفر کے لیے جن روپیوں پر سال بھر سے تکیہ کیے بیٹھا تھا کہ سالٹ ورکس کے ٹوُرر کے ڈیلی الاؤنس کے طور پر ملیں گے، ان کی طرف سے بھی مایوسی ہونے لگی۔ پرانی خاتون ڈاکٹر پر اس صورت حال کا اثر شروع ہی سے نہیں پڑا تھا۔ نہ وہ عملے کے دنوں میں معاملتی پھرتی تھیں نہ اُن سے کوئی اپنا دکھڑا رونے آتا تھا۔ میں نے شروع سے ایک لحیم شحیم صاحب کو اُن کے ساتھ ایمبولینس میں کبھی کبھی ہسپتال آتے دیکھا تھا، یعنی اُن صبحوں کو جب وہ کسٹم کے اعلیٰ ترین افسر کی بیگم سے گپ شپ کے بعد اپنے گھر نہیں لوٹ جاتی تھیں۔ وہاں کی حاضری اُن کی پہلی منزل ہوتی تھی۔ جب وہ دونوں ہسپتال آتے تھے تو وہ صاحب ایمبولینس پر کری کے میدان میں کار چلانا سیکھتے تھے، میٹرنٹی ونگ کی لیبوریٹری کو استعمال کرتے تھے اور کبھی کبھی جب موسم ابر آلود ہو دونوں اس سے متاثر ہو کر پیدل اُس سمت میں گھومنے نکل جاتے تھے جدھر دور بیول کوار ٹرز میدان کے جاتے پر نظر آتے تھے۔
پھر دونوں کی شادی ہوئی، لیکن مشکل یہ آ رہی کہ دونوں نیا گھر بسانے کے لیے کہاں جاتے۔ نکاح کسٹم کے اعلیٰ ترین افسر کے گھر میں ہوا تھا؛ وہی چند دنوں کے لیے ان کی سسرال سا۔ پھر انھیں اعلیٰ ترین افسر نے دونوں کی مشکل کا حل یہ نکالا کہ میٹرنٹی ہوم کو مردانہ ہسپتال کے نصف میں منتقل کر دیا گیا اور میٹرنٹی ہوم میں نئے دولہا دلہن منتقل ہو گئے۔
اس عجیب صورت حال کے بارے میں کسی نے تعجب کا اظہار نہیں کیا کہ وہیں عورتیں دردزہ سے چیخیں گی، وہیں گتے کے پارٹیشن کے دوسری طرف مریض مرد اور بچے بیٹھے ہوں گے اور نووارد کی پہلی چیخ پر اُن میں سے بہت سے اُچھل پڑیں گے اور بہت سے خود رونے لگیں گے۔ نہ ہی کہیں سے صدائے احتجاج بلند ہوئی۔ نئے ملک میں حاکمیت نے، riding roughshod دوسروں کے خیالات اور احساسات کی پروا کیے بغیر اپنی من مانی ہر قدم پر کر کے، بہت جلد اپنا لوہا منوا لیا تھا اور رعیت میں بھی تسلیم کی خُو آ چلی تھی۔
پھر سننے میں آیا ان کے شوہر انھیں لے کر کسی دوسرے شہر جا رہے ہیں جہاں دونوں پریکٹس کریں گے۔ حقیقت یہ تھی کہ اُن کے مربی افسرِ اعلیٰ باہر جا رہے تھے اور غالباً انھوں ہی نے خاتون ڈاکٹر کو

نوکری چھوڑنے کا مشورہ دیا تھا۔ سرپرستی نہ رہنے پر کسٹم کا بڑا عملہ، جسے انھوں نے کبھی درخورِ اعتنا نہ سمجھا تھا، یقیناً مخاصمت پر اتر آتا اور چھوٹے لوگ جن کی زباں اُن کے سامنے نہیں کھلتی تھی، وہ بھی ایسی بے عزتی کا بدلہ لینے لگتے۔ وہ دونوں ایک ادھیڑ عمر باریش ڈرائیور سے جو ان کی خدمت میں رہتا تھا تُو کر کے بات کرتے تھے، اور یہی طرزِ تخاطب اَوروں سے بھی تھا۔ ہسپتال کا جہاز مالی اعتبار سے جن ڈوبل ڈرم میں کھڑا تھا، کہ لہریں نہ ہونے کے سبب نہ آگے بڑھ سکتا تھا نہ واپس لوٹ سکتا تھا، اس کی بس گن بھی انھیں عرصے سے تھی۔ ایک حکم کے تحت کہ چونکہ وہ استعفیٰ دے چکی ہیں اور فلاں تاریخ سے ہسپتال نہیں آئیں گی اس لیے اس تاریخ سے پہلے ان کے تمام بقایاجات اور حقوقِ استعفیٰ (benefits) ادا کر دیے جائیں۔ بقایاجات تو جیسے تھے نہیں، دیگر حقوق انھیں فوراً ادا کر دیے گئے اور باقی اسٹاف ٹُھن ٹُھن گوپال بنا رہ گیا۔

ایک عجیب سناٹے کا عالم تھا۔ ہسپتال کے عملے کے چہروں پر مُردنی تھی۔ ان کے مقابلے میں مکرانی گوٹھ والوں کو بارش نہ سہی شاید کچھ اَور دھندے مل گئے تھے اور وہ ذہنی تشنج کے اتنے شکار نہیں تھے۔ ہسپتال دوائیوں سے خالی تھا اور ایمبولینسیں ہمیشہ کی طرح نصاب سے باہر کے کاموں میں مصروف تھیں۔

کبھی کبھی دو کسٹم انسپکٹر میرے پاس آتے تھے جن پر مارشل لا کی تطہیر کی بجلی گری تھی۔ ایک کی بیوی بیمار رہتی تھی اور جب میں اُس کی پوسٹنگ کے بالٹ ورکس کیا، جو دھابے جی کی طرف تھا، اُسے بدحال پایا۔ دوسرے کی پوسٹنگ کی جگہ کو راستا ابراہیم حیدری سے جاتا تھا جو مچھیروں کی بستی تھی۔ وہ بھی عُسرت کا شکار تھا۔ کسٹم کے پورے عملے میں تطہیر کرنے والی کمیٹی کے ہاتھ بس یہی دو فرد آئے تھے۔ میرا خیال ہے دونوں ہی کو نہ جی حضور کہہ کر اپنے سے اوپر کے افسر کے ہر حملے کا جواب دینا آتا تھا، نہ ان کی خاطر مدارات، نہ چلتے وقت اُن کی کار میں راستے کے لیے دو پیکٹ سگریٹ رکھنا جو وہ خود اس ویرانے میں کسی آتے جاتے سے منگواتے تھے۔ یہ دونوں سگریٹ بھی نہیں پیتے تھے، یا نہیں پی سکتے تھے۔

بعد میں جب دونوں معطل کر دیے گئے تو نہ معلوم کیسے میرے پاس اس امید میں آنے لگے کہ میں ڈاکٹر ہوں، اعلیٰ حکام سے میرے مراسم ہوں گے اور میرے کہنے سے وہ دونوں واپس نوکری پر لے لیے جائیں گے۔ میں نے باتوں باتوں میں اُنھیں ایسا خیال سا پایا لیکن یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آ سکی۔ جتنی دوری اُن میں اور اعلیٰ حکام میں تھی، اتنی ہی مجھ میں اور اُن کے بزعمِ خود اَن داتاؤں میں تھی۔ اُن کی دُوری وردی اور پوشش کے فرق کی بنا پر تھی، میری مزاج کے۔

میرے گلاسگو جانے کی تاریخ نکل گئی۔ تمام عملے میں بے چینی بڑھ رہی تھی۔ ایک دن میں نے ہاسپٹل کمیٹی کے چیئرمین سے، جو اسسٹنٹ کلکٹر کسٹم تھے، کہا، ہسپتال کا عملہ تنخواہ نہ ملنے کی وجہ سے پریشان ہے۔

پھر ۹ انھوں نے بے زاری سے کہا۔
میں نے چڑھ کر کہا، وہ لوگ اسٹرائیک کرنے کی سوچ رہے ہیں۔
بولے، کریں۔ میں سب کو نکال باہر کروں گا۔
پھر اس خیال سے کہ بات کی بھنک مارشل لا حکام کو نہ پڑے اور وہ خود نااستعدی (inefficiency) کا ہدف نہ بن جائیں، انھوں نے کہا، آپ ہاسپٹل کمیٹی کی میٹنگ بلائیے۔
اور یہ بھی حقیقت تھی کہ ہسپتال کو سالٹ ورکس کے مالکان سے فنڈ نہ ملنے کی وجہ سے دواؤں کی جس قلت کا سامنا تھا اُس کا تھوڑا بہت اثر متعلقہ جاننے پڑے، بڑے اور بہت برے۔ کسٹم افسروں پر بھی پڑ رہا تھا۔ ایمبولینسوں کو پٹرول نہیں مل رہا تھا تو وہ کیسے گوشت ترکاری لینے جاتیں اور کیسے بچوں کو اسکول چھوڑتیں اور وہاں سے واپس لاتیں۔ ڈوج پاور ویگن سب سے زیادہ اس صورت حال کا شکار ہوئی۔ اُسے ایمبولینسوں سے زیادہ پٹرول چاہیے ہوتا تھا۔ یہ عجیب بات ہے، یونیسیف قسم کے عالمی ادارے ایسی چیزیں کسی ضرورت مند ملک کو عطا کر کے ان کا ریکارڈ نہیں رکھتے کہ کون سی چیز کل کہاں تھی، آج کہاں ہے، کل کہاں جائے گی۔ ہسپتال کے بجٹ میں جو رقم معاہدے کے تحت ایکسائز اور کسٹم کے محکمے کو داخل کرنا چاہیے تھی وہ شاید اس کا حد تک محدود تھی جس پر وہ معاہدہ لکھا گیا ہو گا۔
میں کسٹم کے کراچی کے صدر دفتر میں اُس رجسٹر کو دیکھ رہا تھا جس میں ہسپتال کے اخراجات دکھائے گئے تھے۔ دفتر کے سپرنٹنڈنٹ کو وہ رجسٹر مجھے نہیں دکھانا چاہیے تھا۔ اُسے پڑھ کر مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ ہسپتال میں تین نرسیں ہیں اور ہسپتال کے عملے کو سالِ گزشتہ میں یونیفارم ملی تھی۔ میری بد قسمتی تھی کہ ان میں سے دو نرسوں اور یونیفارم کو میں نے نہیں دیکھا تھا۔ اسی طرح کے کچھ اَور اخراجات تھے۔ میں نے ہسپتال کمیٹی کے چیئرمین سے رجوع کیا۔ مارشل لا حکومت دیکھنے میں کم آتی تھی پھر بھی تھی موجود۔ انھوں نے تشویش کا اظہار کیا اور کہا ہاسپٹل کمیٹی کی میٹنگ میں اس کا جائزہ لیا جانا چاہیے۔
اور واقعی چند ہفتوں بعد جائزہ لیا گیا۔
شام کا وقت تھا۔ کرسیاں کسٹم آفس کے سامنے میدان میں ڈال دی گئی تھیں۔ سمندر سے آنے والی ہوا ٹھنڈی اور صاف تھی۔ چند اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد کسٹم سپرنٹنڈنٹ جو ہسپتال کے فنڈ کو کنٹرول کرتے تھے اور جن سے اُن کے افسرانِ اعلیٰ بہت مرعوب تھے اٹھ کر کھڑے ہوئے کہ فنڈز کے استعمال کے بارے میں کچھ اعتراضات کیے گئے ہیں۔ یہ رجسٹر ہے، میں ہسپتال کمیٹی کے سامنے پڑتال کے لیے رکھتا ہوں۔ وہاں موجود اعلیٰ ترین کسٹم آفیسر نے کہا، چھوڑیے فلاں صاحب، آپ پر کسے اعتراض ہو سکتا ہے، اور یہ کہہ کر رجسٹر بند کر دیا۔
اور وہ واقعی کیا دیکھتے، وہاں دیکھنے کے لیے تھا کیا۔ یہ مجھے بعد میں پتا چلا۔
جب ہسپتال کے عملے میں نے چینی حد سے زیادہ بڑھ گئی اور ہسپتال میں مریضوں کو دینے کے لیے

کچھ نہیں رہا تو ہسپتال کمیٹی کی ایک میٹنگ رکھی گئی جس میں سالٹ ورکس کے مالکان کو بھی بلایا گیا تھا۔ ہوا یہ تھا کہ پیشنٹس کافی تھا اور کڑوی بحث کی توقع تھی۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ سالٹ ورکس کے مالکان کو بقایاجات ادا کرنے پر مجبور کیا جائے گا۔ ظاہر ہے وہ چوں چراں کرتے کہ پروڈکشن سی کیک سے جو مزدوروں کے علاج پر خرچ کے لیے رقم آئے۔ اس پر کسٹم کے حاکمِ اعلیٰ کی تیوری پر بل پڑ جاتے کیوں کہ خود اُس کے عملے کو بھی یہ علاج میسر تھا نہ تنخواہیں دی جا سکتی تھیں۔ سالٹ ورکس کے مالکان کی کوشش ہوتی کہ ہسپتال کو سرے سے بند کر دیا جائے۔ اور اس بحث کے درمیان مجھے بھی کہیں ایسے عملے کی زبوں حالی کے بارے میں کچھ کہنا تھا۔

شروع سردی تھی اور میٹنگ اس نوساختہ ہال میں رکھی گئی تھی جس میں صادقین کی پینٹنگز رکھی گئی تھیں جن کا صلہ میں نے دیکھا اور سنا تھا موصوف کو چند جسمانی راحتوں کے سوا، جن کے وہ خود شیدائی تھے، کچھ نہیں دیا گیا تھا۔ جب میں اور بنی جاتون ڈاکٹر ہال میں داخل ہوئے تو میں نے دیکھا جو افسرِ اعلیٰ میٹنگ کی صدارت کرنے جا رہے تھے اور جنھیں قہرِ خدا سمجھا جاتا تھا، دس میں سے جو میں سالٹ ورکس کے مالکان آئے تھے اُنھیں وہ پینٹنگز دکھا رہے تھے جس طرح معروز ٹرز کو آرٹ کی نمائش گاہوں میں پینٹنگز دکھائی جاتی ہیں۔

میں میٹنگ میں اکتایا ہوا بیٹھا رہا کہ اُن تیتا تیت (tete-a-tete) اور راز و نیاز کی غیر ضروری باتوں (small talk) میں جو قہرِ خدا اور سیٹھوں کے درمیان ہو رہی تھیں اور جن میں مناسب موقعوں سے اُن کے ماتحت افسران اعلیٰ بھی حصہ لے رہے تھے، میرے پاس اضافہ کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔

آخر میں سوال اٹھا کہ کیا سالٹ ورکس کے مالکان کو ہسپتال سے کچھ شکایت ہے۔ ان صاحب نے جو ایک مہنگا پرائیویٹ اسکول چلا رہے تھے اور جن کی کتنی ہی اَور وجوہات کی بنا پر بھی شہرت تھی، صرف ایک اعتراض کیا کہ ہسپتال کا فائدہ صرف موری پور کے کارخانوں کے مزدوروں کو تھا، دوسرے علاقوں کے مزدوروں کو نہیں۔ جب انھیں بتایا گیا کہ ہفتے میں دو بار ان کے کارخانے میں کلینک ہوتا ہے تو انھوں نے کہا، لیکن مجھے تو ڈاکٹر کے آنے کا پتا ہی نہیں چلتا۔ آ کر باہر باہر ہی سے چلے جاتے ہیں۔ حقیقت یہ تھی کہ مجھے بھی ان کے کارخانے میں ہونے کا کبھی پتا نہیں چلا تھا اور یہ ہم دونوں کے حق میں اچھا تھا ـــــ نہ اُنھیں مجھ سے فیس بھیجنا نہ میں اُن سے فیس اٹھاتا۔

میٹنگ کے بعد ایکسائز اینڈ کسٹمز کے افسرانِ اعلیٰ نے تینوں سیٹھوں کو خدا حافظ کیا اور وہ اپنی امریکی کاروں میں بیٹھ کر تقدیر ہوٹل کے پاس پہنچ کر اُدھر مڑ گئے جدھر سڑک کراچی کو جاتی ہے۔ سیٹھوں سے گفتگو کے بعد قہرِ خدا کا مُوڈ بہت اچھا تھا اور اُن کی چھوت لگ جانے سے ان کے ماتحت افسروں کا بھی۔ میرا کچھ کہنے کا ارادہ نہیں تھا۔

ایمنڈ ے پر اگلی چیز ہسپتال کا معائنہ تھا جہاں دیکھنے کے لیے کچھ نہیں تھا نہ وارڈوں میں مریض تھے نہ کوٹھوں سے دکھانے کے لیے آنے والے۔ صرف گفتگو سے علاج کرانے کے مریض قابل نہیں

تھے۔ میٹر سٹی ہوم دوبارہ اپنی بلڈنگ میں آ چکا تھا، لیکن اس امر میں انھیں بہت ہی دلچسپی ہوتی جب
پورے کلکٹریٹ کے عملے اور گوٹھ والوں کے سامنے ایک تقریب میں وہ اس کے دروازے پر آر پار باندھا
ہوا ربن کاٹتے، جو پہلی حاملہ عورت کے لیے اس میں داخلے کا پروانۂ راہداری ہوتا۔ پرانی چیزوں کی تقریبِ
رونمائی کا بھی اس ملک میں ایک رواج ہے۔

میں معائنہ کمیٹی سے دو قدم پیچھے چل رہا تھا اور ہسپتال کا اسٹاف مجھے بار بار اپنی تکالیف کو قہرِ خدا
کے گوش گزار کیے جانے کے لیے اشارے کر رہا تھا۔ اُن کی اس کھُسر پھُسر سے قہرِ خدا کے چہرے کی
کھال تن گئی اور عین اس وقت جب میں نے اسٹاف سے اپنی تکلیف خود بیان کرنے کا اشارہ ہاتھ سے کیا
انھوں نے پلٹ کر ہمیں دیکھا۔ اُسی وقت اسٹاف میں اچانک قوتِ گویائی آ گئی لیکن اتنی نہیں کہ وہ
پیٹ سے قمیص کے دامن اٹھا کر بتاتے کہ یہ حالی میں اور اگر تو گوپ ہے تو کم سے کم میری کُرسی کی
حیثیت کو تسلیم کر۔ وہ اگر ایسا کرتے تو شاید آسمان زمین پر آ گرتا لیکن نیچے درجے کی اس مخلوق کا ایسے
ارد گرد جمع ہونا بھی قہرِ خدا کو کھَل گیا۔

میں نے اُن کے ماتحت افسروں کو جو اُن سے ترقی کے زینے پر دو تین ہی سیڑھیاں نیچے تھے اُن
سے فون پر جی حضور کہہ کر بات کرتے سنا تھا، پھر وہ ان دو کوڑی کے آدمیوں کی، جن کی روزی ان کے
ہاتھ میں تھی، براہِ راست گفتگو کیسے برداشت کرتے۔ رہا میں تو میرا تعلق اُس پیشے سے تھا جسے اختیار
کرنے کے لیے ایک طویل مدت تک دماغ سوزی کرنی پڑتی ہے اور جس کا مقدر وہ تن آسانی اور عز و جاہ
نہیں ہوتی جو بہ آسانی اور بہت کم مدت میں سِول حکام اور اُن جیسوں کے حصے میں آتی ہے۔

قہرِ خدا نے ہسپتال کے اسٹاف پر وہ نگاہ ڈالی جس کے لیے وہ مشہور تھے، اور مجھ سے انگریزی میں
بولے، تم نے ان لوگوں کو اشتعال دلایا ہے۔ پھر وہ کچھ اَور کہنے کو ہوئے لیکن انھیں معلوم تھا میں
استعفیٰ دے رہا ہوں اس لیے انھوں نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا، میں تمھاری رپورٹ کروں گا۔

کس سے؟ یہ خود اُنھیں معلوم نہیں تھا۔

یہی بات اُنھوں نے آخری ملاقات میں بھی کہی جب مجھے ان کے پاس سال بھر کے اپریزر کے
لیے جانا پڑا تھا۔ جس آدمی کے پاس کھونے کو کچھ نہ ہو وہ بلالحاظ مرتبہ اپنے پر ظلم کرنے والے سے جو
چاہے کہہ سکتا ہے۔ میں کہنے کو ہوا، کس سے رپورٹ کریں گے؟ لیکن خاموش رہا۔ موصوف ریٹائر
ہونے والے تھے۔ اُن کا گوشت کا دل پہلے ہی سے بیمار تھا جس کے لیے وہ اپنے زیرِ نگیں قلیل وسائل
والے ہسپتال کے ذریعے بھی دوائیں حاصل کرتے رہے تھے۔ اور اگر یہ سب نہ بھی ہوتا تو مجھے اُن کی عمر
کا پاس تھا۔

میں ان کی بے بسی پر ترس کھا کر ان کے کمرے سے باہر نکل آیا۔ ان کے حصے میں سوائے اُس
خوشی کے کیا آیا تھا جو انھیں میرے بقایاجات کی درخواست کو رد کرنے پر ملی تھی۔

جس دن میں نے عشا کے وقت گھر اور موری پور کو چھوڑا کوارٹروں اور قریب کے گاؤں میں

خاموشی تھی۔ گھر کے اندر میں نے وہ تمام سامان چھوڑ دیا جس کے بارے میں مجھے امید تھی میرا نوکر، جسے گھر لے جائے گا یا ہسپتال کے غریب عملے میں بانٹ دے گا اور جو میرے ساتھ نہیں جا سکتا تھا۔ میرے پوچھنے پر کہ یہ چیزیں تم لینا چاہتے ہو؟ وہ بھی غربت نفس کے ساتھ انھیں لینے سے انکار کر دیتا۔ اُس سامان کے پاس ہی ایک کھڑکی میں وہ دیسی خوب صورت مُرغ کھڑا تھا جو دو تین دن پہلے کوئی گاؤں والا یا کسٹم کا سپاہی میرے لیے چھوڑ گیا تھا۔

نوکر نے پوچھا، صاحب اس کا کیا ہوگا؟

میں نے کہا، اسے گھر لے جاؤ۔

اُس نے کہا، صاحب ہماری بی بی گوشت نہیں کھاتا۔

میرے ذہن میں مرغ سے متعلق کوئی اَور تجویز نہیں آئی کیوں کہ وہ خود بھی مچھلی کے سوا کسی اَور قسم کا گوشت نہیں کھاتا تھا۔ ہو سکتا ہے بعد میں اُس نے اسے پال لیا ہو۔

مجھے خدا حافظ کرنے کے لیے ہسپتال کا عملہ میرے گھر کے سامنے آ گیا تھا اور اُن کے ساتھ ہی سرکاری ملازمین بھی کھڑے تھے۔ پچھلے چند ہفتوں میں ان دونوں گروپس میں تھوڑی بہت نوک جھونک رہی تھی کیوں کہ اسٹاف اسٹرائیک پر تو نہیں تھا لیکن دوا کے لیے آنے والے سرکاری ملازمین ہی پر اپنے غصے کا بخار تھوڑا بہت اتار لیتا تھا۔ آخر کو تو وہ اُسی مشینری کے پرزے تھے جس کے بڑے بڑے کرشرز (crushers) اُن کو پیس رہے تھے اور لوہے کی سی ہوئی سرچیر کی طرح ان کے درد کو محسوس نہیں کر سکتے تھے۔

لیکن ہسپتال کے عملے کو یہ کریڈٹ جاتا تھا کہ ایک اچھی گرہستن کی طرح جو شوہر کے بے وقت مہمانوں کو گھر لے آنے پر بھی ان کے لیے کھانا کہیں سے پیدا کر دیتی ہے، وہ بھی اس نوک جھونک کے بعد کیسے نہ کیسے ان کی ضرورت پوری کر دیتے تھے خواہ وہ اتنی بڑی ہو جیسے نہ رُکنے والا خون، خواہ اتنی چھوٹی ہو جیسے دھنک کا غم۔

سرکاری ملازمین جن کا ہسپتال بن گزارا نہیں تھا وہ بھی موقع ملنے پر چُوکتے نہیں تھے۔ اسٹاف سے کہتے، ماما تمھاری دوا کون لے، گورمنٹ کا غصہ ہم پر نکالو گے۔ ہو سکتا ہے زہر ہی ملا کر دے دو۔

ان لوگوں کے درمیان کھڑے ہوئے میں نے ایک نظر گاؤں پر دوڑائی کہ شاید اس کے کسی حصے سے گانے یا رونے کی آواز سنائی دے۔ لیکن سرگاؤں کی طرح وہاں والے بھی سرِشام سو چکے تھے۔

سرکاری ہوری پور جاگ رہا تھا۔ وہ شہری زندگی کا انگ تھا۔

۴

اُن دنوں کو سینتیس سال ہونے کو آئے۔

موری پور اپنا اکیلاپن کھو کر کراچی کے بھیڑ بھڑکّے میں مدغم ہو چکا ہے۔ وہاں جانے کے راستے بھی بدل چکے ہیں۔ اب وہاں پہنچنے کے لیے ایئرفورس کی آرچ آف ٹرایمف نما محراب سے نہیں گزرنا پڑتا ہے جہاں ایک سپاہی رائفل لیے پہرے پر ہوتا تھا۔ راہ کی ندیوں پر پُلیاں بن گئی ہیں اور تقدیر ہوٹل اب دکانوں کی لمبی قطار میں سے ایک ہے۔ اس کے سامنے وہی بھیڑ ہر وقت جمع رہتی ہے جو قصبے کے مصروف بازاروں میں دیکھنے میں آتی ہے۔ اس کے سامنے سڑک کے پار ایک بدنما دیوار اٹھا دی گئی ہے جو سالٹ کالونی اور گوٹھ کو سڑک کے ٹریفک سے کسی قدر دور رکھتی ہے۔ جہاں دیوار نہیں ہے وہاں سے گوٹھ نظر آتا ہے، کوارٹروں کی قطار اور ہسپتال۔ میگھواڑوں کا مندر مجھے دُور سے نظر نہیں آتا۔ پتا نہیں شمبھو کا بیٹا کرم شی کہاں ہے جو خود کو چندروَنشی بتاتا تھا اور ہسپتال میں جھاڑو لگاتا تھا۔ پتا نہیں تاریخ میں کب اُس کے لوگوں سے راج چھین کر انھیں نیچ جاتی بنایا گیا ہوگا۔

میں کراچی جب بھی جاتا ہوں — خواہ یہ جانا چند گھنٹوں ہی کے لیے ہو — میرے پروگرام میں سمندر ضرور شامل ہوتا ہے، بالکل اسی طرح جس طرح میرے لیے چند اہم گھر جہاں جائے بغیر میرا کراچی جانا نہ جانا برابر ہوتا ہے۔ لیکن سمندر تک پہنچنے کے سب ہی راستے بدل چکے ہیں۔ لگتا ہے وہ انسانوں سے اُکتا کر بہت دور چلا گیا ہے۔ اب خود ڈرائیو کر کے سمندر پر جانا میرے بس کی بات نہیں رہا ہے۔ وہاں لے جانے کے لیے مجھے ایسے چھوٹوں کی منت سماجت کرنی پڑتی ہے جنھیں پہلے مَیں سمندر پر لے جایا کرتا تھا۔ اب وہ وقت نہ ہونے کا بہانہ کرتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے پندرہ بیس سالوں میں ایک یکسر مادی زندگی کا حصہ بن کر وہ فطرت اور نہ جانے کن کن چیزوں سے لگاؤ کھو بیٹھے ہیں۔ لگتا ہے سمندر ان سب کے لیے جھیل کے کناروں اور پہاڑی مقامات کی طرح محض پکنک کی جگہ بن کر رہ گیا ہے جہاں پہنچ کر آئس کریم کے خالی ڈبے، کوڑ، اچار کے چکنائی سے آلودہ اوراق، پولیتھین کی تھیلیاں اور کھائی ہوئی ہڈیاں اپنے پیچھے جگہ جگہ چھوڑ آنا ہی ایک کام ہوتا ہے۔ کبھی کبھی جب وقت بہت کم ہوتا ہے میں اپنے کرم فرما سے، جو مجھے سمندر پر لے جانے کے لیے بادلِ ناخواستہ راضی ہوتا ہے، اُس کی جھلک وہاں سے دکھلا لانے کو کہتا ہوں جہاں نئے نئے فلیٹس سمندر کے کنارے تک جا پہنچے ہیں اور جہاں ایک جہاز اپنے دن رات کے سفر کو بھول کر کنکریٹ میں پھنسا پڑا ہے۔

سمندر کا آرکیسٹرا سن کر میرا کراچی کا سفر مکمل ہو جاتا ہے اور میں کسی حد تک مطمئن ہو کر دنیوی کاموں کے لیے آبادی کی طرف لوٹ آتا ہوں، جیسے کسی کی شادی میں شرکت۔

موری پور چھوڑنے کے تیس سال بعد میں نے بادل کو دیکھا۔ آبنوس کی ایسی قدِ آدم مورت نے

رسوں ہوا اور پانی کے رحم و کرم پر رکھا گیا ہو۔ اُسے ایک چھوت دار مرض تھا جس میں اس کے سارے جسم کے عدود متاثر ہوئے تھے۔ لگتا تھا انفیکشن کی وجہ سے عجلت میں ہے۔ میں نے اس سے مذاق کیا نہیں، لیکن مذاق کرنے کا خیال ضرور ذہن میں آیا، کہ اتنے دن تمہارے علاقے میں رہا دیکھنے میں نہیں آئے اور اب میرے تعاقب میں میرے علاقے میں گھس آئے ہو۔ اس کے ساتھ کی عورتوں نے اگر مجھے پہچان لیا تھا تو بھی انھوں نے اس کا اظہار نہیں کیا۔ اُسے دیکھ کر میں دوسرے مریض کی طرف بڑھ گیا۔

لیکن ناول کے کچھ اصول رہے ہوں گے۔ وہ میری حفاظت کرنا چاہتا ہو گا۔ موجودہ دور کے ناولوں پر یہ مجھے اعتماد ہے یہ اُن نوجوانوں کو جو بڑی ٹال مٹول سے میرے ساتھ سمندر پر جانے کو تیار ہوتے ہیں۔ نئے ناول کوں میں سب جانتے ہیں لیکن ان کے نام نہیں لے سکتے۔ پچھلے دس سالوں میں یہ بھی ایک رواج بن گیا ہے کہ قاتل کا نام نہیں لیا جاتا۔ وہ شہروں میں دندناتا پھرتا ہے۔ اُسے گرفتار نہیں کیا جاتا۔ اس کے نام کے ساتھ حساب لکھا اور بولا جاتا ہے۔ ایسے میں ادیبوں کی تحریریں ایسی بن گئی ہیں جیسے موسکو پر فرانسیسیوں کے ۱۸۱۲ کے حملے کی کہانی تو لکھی جائے لیکن اس میں نپولین کا نام نہ آئے، بربریت کا ذکر ہو لیکن اُسے فرانسیسی فوج سے منسوب نہ کیا جائے۔ یا اگر فاشسٹ حکومت پھر سے جرمنی میں آ جائے تو اس سے خوف کھانے والے ادیب دوسری جنگ عظیم کی ہولناکیوں کا ذکر تو ایسی کہانیوں، ایسی نظموں، ایسے ڈراموں اور ناولوں میں کریں لیکن ایسے جیسے کوئی ان دیکھے ہاتھ تھے جو گھروں سے کھینچ کر نوجوانوں کو لے جاتے تھے اور پھر اُن تشدد کی علامات سے پُر لاشوں کو ان کے علاقوں کے لوگوں کو دہشت زدہ کرنے کے لیے گلی کوچوں میں ڈال کر چلے جاتے تھے۔ وہ ادیب یہ نہ کہہ سکیں کہ انھیں لے جانے اور ان کے مُردہ جسموں کو واپس لا کر پھینک جانے والے یونیفارم میں تھے اور اُن پر سواستکا ٹنکا ہوا تھا۔ ادیب، شاعر اور صحافی آؤشوٹز (Auschwitz) جیسے کنسنٹریشن کیمپس کی منظر کشی کریں، اُن آہوں کا بیان کریں جو اُن آتش خانوں (holocausteriums) میں گونجتی تھیں، انسانی ہڈیوں کے انبار دکھائیں اور یہ نہ کہیں کہ مرنے والے ایک اقلیتی قوم کے بچے، عورتیں، نوجوان اور بوڑھے تھے، جس قوم نے جرمنی کو علم اور فنونِ لطیفہ بخشے تھے اور جن کی ضرورت اُن سے ایک عرصہ فیض اٹھانے کے بعد جرمن قوم کو نہیں رہی تھی اور انھیں قتل گاہوں میں بھیجنے والے ہٹلر، اس کا پروپیگنڈا چیف گوئبلز اور فیلڈ مارشل ہرمن گورنگ جیسے فاشسٹ رہنما تھے اور مغضوب قوم میں سے اُن کی پیدا کی ہوئی غداروں کی ایک مختصر جماعت۔

حیدرآباد سندھ کے ایک کہانی کار نے ۳۰ ستمبر ۱۹۸۸ کے قتلِ عام کے تعلق سے ایک افسانہ لکھا تھا جس میں ایک بوڑھے باپ کو اپنے نوجوان بیٹے کی لاش بہت رات گئے بڑے انتظار سے ملتی ہے۔ وہ سمجھ نہیں سکتا اس کے بیٹے کا قتل کیوں ہوا کیوں کہ وہ تو کسی کام سے گھر سے نکلا تھا، او جب اسے پتا چلتا ہے وہ اکیلا نہیں مرا اس کی طرح ان گنت بڑوں اور چھوٹوں کا اس دن م سے نہ ری ہیں ۔ مد

سٹ کے اندر اندر، ایک ہی وقت میں، شہر کے مختلف علاقوں میں گولیوں سے شکار کھیلا گیا ہے تو وہ سوچتا ہے یہ شہر اس کا شہر تھا، اسے کس کی نظر لگ گئی۔ اور یہ آخری جملہ ہی افسانے کا سب سے کمزور حصہ تھا، کیوں کہ سب کو علم تھا کس کی نظر لگی ہے اور کس نے لگوائی ہے لیکن نام لینے کا کسی میں یارا نہیں تھا۔ مصنف کی یاد سے وہ خط بھی افسانہ لکھتے وقت محو ہو چکے تھے جن میں اُن مرنے والوں کے رشتے داروں نے بمبئی، آگرہ، اجمیر، پٹنہ، گوالیار اور حیدر آباد دکن جیسے شہروں سے اظہار تعزیت کیا تھا نام نہ نام بچوں اور بڑوں کی خیریت معلوم کی تھی کہ کوئی پوچھنے سے نہ رہ جائے اور لکھا تھا ہم یہاں خیریت سے ہیں، اللہ آپ سب کو اپنے حفظ وامان میں رکھے، آمین ثم آمین۔

کہانی اور نظم کا فن بھی عجیب چیز ہے جو مجاز (allegory) کے آئینے میں چاہے تو مٹلر کو خود اُس کی شکل افسانہ ضحاک میں دکھا سکتا ہے اور چاہے تو نے ماکی سے ایلی بیٹس کے روٹو بیارے وطن سن کر ایار تھینڈ کو للکار سکتا ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر جوش ۱۹۹۵ میں کراچی میں جی رہے ہوتے تو ایسے لوگوں پر ظلم ہوتے دیکھ کر صرف کڑھا کرتے، گھر گھر تلاشی ہوتے دیکھ کر یہ نہ کہہ پاتے

گھر میں درویشوں کے کیا رکھا ہوا ہے بدنہاد
آ مرے دل کی تلاشی لے کہ بر آئے مراد

اور نہ ہی وہ یہ مشورہ دے پاتے کہ

آپ کو آگاہ کرتا ہے یہ رند بادہ خوار
قلب انساں کو سزا دیتا ہے لیکن اقتدار
حاکموں کے در گرا دیتی ہے اٹھلا کر زمیں
خادموں کے جھونپڑوں کو زلزلے چھوتے نہیں

کیوں کہ جیسا کہ میں نے مایار سے کہا تھا، حاکم بدل گئے ہیں، اب انہیں اپنے پیٹ کھول کر نہیں دکھائے جا سکتے۔

اس دور میں پیٹ کھول کر دکھانے والوں کو دہشت گرد کردانا جاتا ہے۔

۱۹۳۹ میں جو نظم جوش نے انگریزی حکومت کے خلاف لکھی تھی اس کی تعزیر بس اتنی ہوئی تھی کہ ہندوستان کا وہ شمارہ ضبط کر لیا گیا تھا جس میں وہ نظم چھپی تھی۔ کراچی میں ایسی نظم لکھنے کے بعد ایک روز وہ گھر سے نامعلوم جگہ لے جائے جاتے، ان کے گھر والے جب زیادہ واویلا کرنے لگتے کہ ان کی زندگی خطرے میں ہے تو پتا لگتا اُن نے سینے میں، وہ جہاں تھے، درد اٹھا اور وہ ختم ہو گئے۔ او ٹوپسی پر پتا چلتا وہ انگلیاں نہیں ہیں جنھوں نے زندگی بھر قلم تھاما تھا، وہ آنکھیں نہیں ہیں جو صبح کی سیر میں اُنھیں فطرت سے ہمکلام کرتی تھیں۔ اور رپورٹ میں کہا جاتا، ملیح آباد سے ان میں اور ان کے رشتے داروں میں

دشمنی چلی آ رہی تھی۔ یہ قتل اُسی دشمنی کا نتیجہ ہے۔ اور اشرف جہاں بیگم اور سجاد حیدر قاتل ٹھہرائے جاتے، جن کی تلاش جاری ہوتی۔ ایسا ہی درد مولانا حسرت موہانی کے سینے میں اُٹھا ہوتا اور شبہے کی انگلیاں نشاۃ النسا بیگم کی طرف اٹھتیں۔

یہ نوجوان جو مجھے سمندر کے کنارے لے کر آتے ہیں، موری پور کے سامنے سے گزرتے ہوئے کہتے ہیں، یہاں کیا رکھا ہے جسے آپ دیکھنے آئے ہیں؟ انہیں نہیں معلوم انسان جہاں رہتا ہے، دوسروں کے کام آتا ہے، وہاں کا حصہ بن جاتا ہے۔ اُن کے ماں باپوں نے جھگیوں، جہانگیر روڈ اور ایسے سینیا لائن کے نصف کوارٹروں سے نئی زندگی کا آغاز کیا تھا جو اُن پر اچانک بغیر کسی پروگرام کے مسلط ہو گئی تھی۔ انھوں نے اس پہلی بجری کی زمین میں اپنی اور صرف اپنی محنت اور اُس ذہنی اثاثے سے جو اپنے ساتھ لے کر آئے تھے، سرمایہ پیدا کیا، ملیں اور ٹریڈیں چلائیں، عمارتیں بنائیں، دفتر اور کارخانے چلائے، درس گاہیں بنائیں، ہسپتال کھولے اور پھول کھلائے۔ وہ معدوم ہوتی ہوئی نسل جہاں سے وہاں کا جو دکو حصہ سمجھتی ہے۔ نئی پود پوچھتی ہے، یہاں کیا رکھا ہے؟

میں جتنی دیر سمندر پر رہوں گا میرے ساتھ آنے والے بچوں اور نوجوانوں کے ماں باپ گھروں میں اُن کے لیے آیت الکرسی پڑھتے رہیں گے۔ موسیٰ کی ماں کی طرح اگر اُن کا بس چلتا تو ان کی مائیں ان نوجوانوں کو پیدا ہوتے ہی فرعون کے ڈر سے صندوق میں ڈال کر پانی کے حوالے کر آتیں، یا فریدوں کی ماں کی طرح کھوسے میں چھپا آتیں۔ لیکن اس دور میں نہ فرعون کی بیوی جیسی کوئی عورت ہے جو بالک موسیٰ کی پرورش کرے نہ پرمایہ جیسی کوئی گائے جو بلکتے ہوئے فریدوں کو دودھ پلانے چلی آئے۔ کراچی میں نوجوان ہونا اب نے لکھا جرم ہے۔

ڈیوڈ لو (David Low) نے اپنے ۱۹۳۲ کے ایک کارٹون میں دکھایا تھا اونچی لہروں میں ایک کشتی ایک سرے پر پیندے میں چھید ہو جانے کے سبب ڈوب رہی ہے اور اُس سرے کے مسافر جو پانی سے اوپر اُٹھا ہوا ہے کہہ رہے ہیں، بہت بڑا چھید ہے، شکر کا مقام ہے کہ ہمارے سرے کی کشتی میں نہیں ہے۔ بعینہٖ کراچی اور حیدر آباد کے ادیب، شاعر، دانش ور، مذہبی رہنما مطمئن ہیں کہ بپتا اُن پر نہیں پڑ رہی ہے۔

جاگیردار سوسائٹی اپنی اساس میں قبائلی سوسائٹی ہوتی ہے اور کسی قسم کی ذہنی ترقی اُس کے دھرم سے باہر ہوتی ہے۔ جو اُس کی مخالفت نہیں کرتے ہیں وہ اس کے ہم راہی ہوتے ہیں، خواہ وہ خود کو دانش ور کہتے ہوں، وطن پرست، ادیب، مذہبی انسان یا سوشلزم اور جمہوریت کے علم بردار۔ کیوں کہ نمک کی کان کی طرح جاگیرداری نظام بھی ہر سماجی انسٹی ٹیوشن کو گلا کر اپنے میں ضم کر لیتا ہے۔ تمام انسانی سوسائٹیز کی اپنی اقلیتیں ہیں، اور جن اقلیت کی اپنی زمین نہ ہو اس میں اکثریت خود کو اپنے ضمیر سے بچانے کے لیے تمام وہ عیب ڈھونڈھ نکالتی ہے جو خود اُس کی روں او مدن میں ہیں۔ ہر فلسطینی میں دوسرے عربوں کو ایک چور، عیاش اور دہشت پسند نظر آتا ہے۔ کُردوں کو بھی ہر ملک میں دہشت گرد

سمحا جاتا ہے۔

سمدر کے ساحل پر شیدی اوٹ والوں کو دیکھ کر مجھے ہمیشہ ایک احساس ہوتا ہے کہ یہ میرے گاوں والے ہیں۔ لیکن کون سے گاؤں کے، یہ مجھے نہیں معلوم کیوں کہ حود موری یورا ت میلوں پھیلی ہوئی آبادیوں کا نام ہے۔ آبادیوں کے مسائل بدلتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ بھی اقلیت ہیں۔ یہ معلوم کب تیغِ مار کے شکار ہیں۔

پتا نہیں اب بھی کوئی اس بحری کے میداں میں سے رات کو یورے وسیع اور عمیق گلے سے گاتا ہوا گزرتا ہے یا نہیں۔

**

اسد محمد خاں

طوفان کے مرکز میں

میں اور میرے ہم عصر، ہم ایک طوفاں کے مرکز میں ہیں۔ اندر سے یہ دائرہ بالکل ثابت دکھائی دیتا ہے۔ سب کچھ جماجمایا اور unruffled ہے یہاں۔
ہاں طوفاں کا outer perimeter ایک ہیبت دینے والے فشار میں سنسناتا، گھمن گھیری کھاتا رہتا ہے۔ وہاں ہم رہتے ہیں، outer perimeter میں۔ مگر میں رہنے کی بات نہیں کرتا ـــــ وہ الگ کہانی ہے۔

میں طوفاں کے مرکز، اس ثبات دائرے، میں گزارے ہوئے وقت کو بیاں کر رہا ہوں، جہاں ہم رہتے نہیں تھے، جایا کرتے تھے۔

***

طوفاں کا مرکز صدر کا ریگزار میں راستے والا چوک ہوتا تھا (ریگزار میں راستا ابھی نہیں بنا تھا)۔ یہیں کار زار ـــــ جہاں اب گھڑیوں کی، فوٹو گرافی کی، بہت سی ونگر دکانیں ہیں ـــــ تیس تیس سیڑھیاں چڑھ کے ماؤنٹ اولمپس واقع تھا ـــــ انڈیا کافی ہاؤس ـــــ جو خداوند زیوس کی سیٹ تھی، جہاں دوسرے تمام دیوتاؤں کا جماؤ ہوتا تھا۔
اُس وقت تک طے نہیں ہوا تھا کہ خداوند زیوس کون ہے، دوسرے سبھی دیوتا طے شدہ تھے۔ یہ سر زور اکٹھا ہوئے، لمحہ لمحہ ایک نئی دنیا تخلیق کرتے اور، کمال ذہنیت سے، جاری دنیاؤں کی پرورش فرماتے۔
یہاں muses کھلے، چھوٹے پھرتے تھے، خاص طور پہ شاعری اور مصوری کے میوز۔
ایک بار لاہور سے سُرخ چُگی ڈاڑھی والا ظہیر کاشمیری تیس سیڑھیاں چڑھ کے یہاں پہنچا تو سیڑھیوں پر ہی سے پکارتا گھسا کہ روحانی بچو! میں آ گیا ہوں۔ میر احترام کرو۔ میں ظہیر کاشمیری۔

ہوں۔

اُس کی ہری آنکھیں، سُرخ چھٹی ڈاڑھی اور سرخ گھونگھریالے لمبے بال اور اُس کی aquiline ناک، اس کا مہنتوں کی طرح دوسروں کو روحانی بیوکھا، اُس کی لاف زنی، سبھی پسند آئیں۔ ویسے بھی بیوی نیو قمیص، جیو کلیٹی دھاری دار سوٹ اور سفید زرم ٹائی میں وہ مریخ کا باشندہ دکھائی دیتا تھا، جو بہت معقول بات تھی۔

سب نے اثبات میں سر ملانے اور اتفاقِ رائے سے اُسے (ظہیر کاشمیری کو) جیلِ اولمپس پر عارضی، اعزازی ریوس مقرر کر دیا۔ تاہم اُسے بتا دیا کہ دیوتاؤں کو تمہاری گلرا سکیم پسند آئی ہے، اس لیے تمہیں عارضی، اعزازی خداوند اولمپس مقرر کیا جا رہا ہے۔ ظہیر کاشمیری خوش ہوا، اس نے یہ منصب قبول کی، دوسروں کی نظمیں سنیں، اپنی نظمیں سنائیں۔ بہت اچھے تین گھنٹے گزارے۔ اُٹھنے سے پہلے سب دیوتاؤں نے اُسے properly معزول کیا۔

دو تین روز بعد وہ خوش خوش لاہور چلا گیا۔

انڈیا کافی ہاؤس (جبلِ اولمپس) کی بلندی سے نیچے فانی انسانوں کی دنیا پر نظر ڈالو تو سامنے Thomas & Thomas والا فٹ پاتھ شروع ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ ٹامس والے فٹ پاتھ پر چلو تو جہاں اب الیکٹر ونکس کا جنگل ہے اور کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی وہیں کہیں بائیں ہاتھ پر فیڈرکس کیفے ٹیریا اور کیفے جارج آ جاتے تھے۔

کیفے جارج اور فیڈرکس کیفے ٹیریا کو بالترتیب جارج اور کیفے ٹیریا کہا جاتا تھا۔ کیفے ٹیریا کا درجہ وہ تھا جو سیزروں کے روم میں فورم (Forum) کا ہوگا۔ سب کچھ جو قابلِ ذکر تھا، شہریوں کو یہیں عطا کیا جاتا تھا۔ سڑکوں پر اتنے ہی کم آدمی ہوتے تھے جتنے چار ایکٹ کی کسی تمثیل میں سما سکیں۔ فٹ پاتھ پر اس سے بھی کم آدمی ہوتے ہوں گے، کیوں کہ جو ہوتے تھے وہ کچھ دیر بعد وقار کے ساتھ اپنی کتابیں اور تمباکو کے ٹن اور پائپ سنبھالے کیفے ٹیریا کے صحن میں چلے جاتے تھے۔ زیادہ دیر تک باہر نظر آنا کوئی بھی پسند نہیں کرتا تھا۔

لوگ آہستہ چلتے تھے، اور جو کوئی دوڑتا ہوا آتا تھا تو اس کی کوئی پرشکوہ، کلاسیکل، بلکہ بِبلیکل (Biblical) وجہ ہوتی تھی۔ یعنی

ایسا ہوا کہ بستی کی سمت سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا۔ اُس نے پکار کر کہا کہ سنو، اُن عجیب ہوں پر توجہ کرو جو تم سے کبھی کچھ طلب نہیں کریں گے۔ سنو کہ فلاں ابنِ فلاں کیفے ٹیریا میں وارد ہوا ہے اور وہ اپنی نظم سناتا ہے۔ وغیرہ۔

***

لسوں کے شادی ٹائم کپیر لوگ کیسے ٹیر یا کی کرسیوں پر اکڑوں بیٹھنے کے لیے ابھی آمادہ نہیں ہوئے تھے، ان کے آنے میں ایک دو برس، ایک دو گندھارے، باقی تھے۔ اس لیے ابھی یہ لوئر مڈل کلاس اور لوئر لوئر مڈل کلاس کے پڑھے لکھے snob لڑکوں کی دنیا تھی، اور وہ کسی قیمت پر اپنی بائی برو مفلسی (بے زری) کو تیزی سے کمائی (یا ممتحیائی) ہوئی دولت سے متصادم ہوتے دیکھنے پر تیار نہیں تھے۔

ہم سب یہاں، طوفاں کے مرکز میں، موجود ہیں جہاں شانتی اور unruffled peace ہے۔ ابھی یہیں میں ہم ٹامس ایسٹ ٹامس کے فٹ پاتھ سے گئے ہیں۔

***

یہیں کہیں ایک پرانی (وکٹورین) ٹیلر شاپ تھی جس کا موجودہ مالک فلم نگار کے ہیرو (پرنس آف ہیروا) اداکار صادق علی کا فین تھا۔ اُس نے ڈھائی فٹ بائی دو فٹ کے گولڈ فریم میں جو کلیٹی رنگ میں اہلارح کی ہوئی اداکار صادق علی کی ایک huge تصویر لگا رکھی تھی جس میں وہ فیلٹ ہیٹ پہنے جھک کر سامنے دیکھتے ہوئے دکھائے گئے تھے۔

ٹھیک اُس وقت جب کوئی یہ تصویر دیکھ رہا ہوتا، جیتے جاگتے صادق علی (خود پرنس آف ہیروا ہوئی ٹوں) ٹیلر شاپ سے ہٹ کر دور کیپی ٹل والی گلی کے نکڑ پر، پان کی دکان کے برابر، ایک اونچے اسٹول پر بیٹھے اپنے سائل پرستاروں سے دو دو، پانچ پانچ، دس دس روپے مدد نامہ لے لے کر کوٹ کی جیب میں رکھتے جاتے تھے۔ عام طور پر ان کا شیو بڑھا ہوتا تھا اور فالج سے مڈھال ایک ہاتھ دوسری جیب میں پڑا ہوتا تھا۔

مدد نامہ دینے کا طریقہ یہ تھا کہ آنے والا صادق علی کو سلام کرتا اور ہاتھ ملانے کے بہانے مٹھی میں دبایا ہوا نوٹ اُن کے ہاتھ میں چھوڑ دیتا۔

ہمارے پاس ایسی صورت سے زیادہ پانچ پانچ دس دس کے نوٹ آتے رہتے تھے مگر کبھی ہمت نہیں پڑی کہ صادق علی کو سلام کر کے ہاتھ ملانے اور ایک نوٹ اُن کے ہاتھ میں چھوڑ کر ہٹ جاتے۔ شاید ہمارے حساب سے نگار کے ہیرو کو اس طرح نوٹ پکڑا دینا (تقریباً) sacrilegious تھا۔

***

ہم طوفاں کے مرکز میں ہیں۔

صدر کے زیریں راستے سے سنگر والوں کے موجودہ شوروم کی طرف جاؤ تو جھلمل کرتی، اُبلی پڑتی کاروں کے بیچ کہیں چھپی ہوئی ایک مسکین سی بیکری نظر آتی ہے ۔۔۔ پارسیاں بیکری۔ یہ بیکری کبھی نئے پاکستان کا حصہ ہوتی تھی۔ اِس وقت اسے تلاش کرنا پڑتا ہے۔ پہلے (ایک متواضع اور کریم النفس) کو د

مدا کی طرح یہ آپ کو خود پکار لیتی تھی۔ پارسیاں بیکری اور کیسے پارسیاں کو ایک فوری طور پر مہیا analogy سے سمجھا جا سکتا ہے

آج کی پارسیاں بیکری اسٹول پر بیٹھے ڈھیلے ڈھالے کوٹ والے صادق علی کی طرح ہے۔

اور جو پارسیاں بیکری تھے، میرے ہم عصروں کو یاد ہے وہ جومو کی ریت پر (دو گھنٹے کے لیے! Omygod پانچ ہزار میں خریدی گئی!) فیسی گھی چلاتے، ھکمگاتے، پرنس آف مسروا صادق علی جیسی تھی۔

O Mighty Caesar! Dost thou lie so low?
Are all thy conquests, glories (etcetera etcetera)
Shrunk to this little (etcetera etcetera)?

پارسیاں بیکری اس شہر کی (correction اس دنیا کی) بہترین بے ٹیر سب مناسب داموں پر فراہم کرتی تھی۔ اور یوں بھی تھا کہ اگر آپ ایسی جاسے والی لڑکی کے ساتھ پارسیاں میں داخل ہوئے ہیں اور آپ کے لیے کوئی فیملی کیبن خالی نہیں ہے تو یہ فوری طور پر اُن دو خوش مزاج ایرانی بھائیوں کا ذاتی مسئلہ بن جاتا تھا جو پارسیاں کے مالک تھے اور ہر گاہک کو عادتاً مسکرا کے وش کیا کرتے تھے۔

***

ہم طوفاں کے مرکز سے باہر نہیں آئے۔

موجودہ سنگر شوروم کے سامنے ایلفنسٹن اسٹریٹ پر ہی کتاب محل تھا کل تک تھا۔ آغا سرخوش قزلباش اور اُن کے شاپ اسسٹنٹ ہر promising شاعر ادیب مصور کو پہچانتے تھے اور اُٹھ کر مصافحہ کرتے، احوال پوچھتے تھے۔ کتابیں دکھاتے، ان پر باتیں کرتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ promising ادیب شاعر مصور اردو کتاب خریدنے کی تو بالکل استطاعت نہیں رکھتے، مگر وہ یہ سب کچھ کرتے تھے کیوں کہ وہ خود بھی اور ہم بھی اُس وقت آغا شاعر کے اسٹیبلشمنٹ میں ہوتے تھے ۔۔۔ ساٹھ ستر برس پیچھے کے کسی ٹائم زون میں۔

***

ریگل میں راستے والے ٹریفک سگنل اور سنگر والے چوک کے بیچ (پارسیاں بیکری کے سامنے) ایک پروٹسٹنٹ چرچ ہے۔ چرچ کا فٹ پاتھ طوطا فال والوں اور وزن کی مشین والوں کے سوا ہمیشہ سے خالی رہتا ہے۔ ایک وقت اس فٹ پاتھ پر ایسا آیا تھا کہ یہاں درجنوں makeshift بک اسٹال قائم ہو

گئے تھے۔

دراصل صدر کو آپر یٹو مارکیٹ بن رہی تھی تو وہاں کی دکانیں اور اسٹال وقتی طور پر یہاں آ گئے تھے جو بڑی یکسوئی سے چرچ والے فٹ پاتھ پر L-shape بناتے آگے امیریکا نو والی سڑک پر چلے گئے تھے۔ کچھ دن دھیرج میں گزار کے ان کنک اسٹالوں کی یونین کے عہدے داروں نے چرچ کے کرتا دھرتا فادر لوگوں کو تجویز پیش کی کہ حضرات اگر فٹ پاتھ کے ساتھ لگی چرچ کی زمین سے ایک دو قاشیں لے کر چند درجن فینسی ٹک شاپس بنوا دی جائیں تو ہزاروں ہزار روپے (اُس وقت بڑی رقم ہوتی تھی) چرچ کو ہر ماہ مل جایا کریں گے۔ منصوبہ یہ ہے کہ مدینت کیسیں مٹا کر ایک جیسی دکانیں تعمیر کی جائیں گی (نقشہ آپ حضرات پسند فرمائیے گا۔) تو ایک جیسی جدید دکانوں سے شہر کا چہرہ improve ہوگا، پھر مطالعے کے عمل میں، کہ جیرِ کتیر سے، چرچ کا تعاون خداوند کی خوشنودی کا باعث بھی ہوگا (N B خداوند شاہد ہے کہ ان makeshift اسٹالوں پر جیب فکس اور صالح عالمی ادب کے ساتھ ساتھ جیر سے پور نو کرائم بھی مہیا رہتی تھی۔)

چرچ والے فادروں نے کہا، آپ کا فرمانا بجا ہے۔ ہم اس اتوار کو چرچ کمیٹی (جیسی کہ اپنی مسجد کمیٹی ہوتی ہوگی) سے مشورہ کریں گے اور پیر کو جواب دیں گے۔ پیر کو یونین کے عہدے دار گئے۔ فادروں نے کہا، پیارے ہمسایو! ہم چرچ کے اخراجات پورے کرنے کے لیے کونگریگیشن میں طشتری گھماتے ہیں، مسیحی بھائی حسبِ توفیق چرچ کے لیے طشتری میں کچھ ڈال دیتے ہیں۔ اگر ہم نے ایسے چرچ کو خود کفیل بنا دیا تو اس ضمن میں اجماعِ فادراں ہے کہ ہمارے مسیحی بھائی (آخر کو بندہ بشر ہیں) رفتہ رفتہ چرچ کی کفالت میں تساہل برتنے لگیں گے۔ کتنے ہی بھائی، جو اس معصوم خوش فہمی میں اتوار کے اتوار چلے آتے ہیں کہ اُن کی آمد سے چرچ کی امداد ہوجاتی ہے، آنا چھوڑ دیں گے۔ آپ کی تجویز سے پیسے تو بہت مہیا ہوجائیں گے تاہم بھائی کم ہوتے جائیں گے جو یہ ہمیں خوش آئے گا نہ خداوند کو۔ اس لیے عزیزو! ہم دکانیں نہیں نکالیں گے، طشتری گھما کے گزارا کریں گے۔ وماعلینا الاالبلاغ۔

***

کوآپریٹو مارکیٹ بنانے کے لیے پلاٹ سے کتابوں کی کیبنیں، اسٹال مٹائے گئے تو مہینوں تک یہ حصہ دیہات کے شاملات کی طرح ہر ایک کے کام آتا رہا۔ موالیوں چرسیوں سے لے کر سانڈے کا تیل بیچنے والوں، بچہ جمورا آنے گا؟ آ گیا! کا کھیل دکھانے والوں اور بغیر تکلیف کے محض ایک رومال سے دانت نکالنے والوں تک کا جماوڑا رہنے لگا۔ ٹھٹ کے ٹھٹ لگے رہتے۔

ایک بار ہم نے ایک متدین شکل وصورت کے صحت مند آدمی کو دیکھا جو بار بار جتا رہا تھا کہ وہ عطاءَ اللہ شاہ بخاری کی آنکھیں دیکھے ہوئے ہے اور ابھی کینٹ اسٹیشن پر اُتر کے سیدھا چلا آرہا ہے۔ وہ یہ بھی

سنا رہا تھا کہ اُس کا کوئی مشن ہے جس کی تکمیل کے لیے اس نے یہ پُرصعوبت سفر اختیار کیا ہے۔
اُس نے بڑی روانی سے ایک تقریر شروع کی جس میں علمائے سُو سے ملت کو خبردار کیا گیا تھا اور جو تباہیاں وہ اس خاص شعبے میں لائے ہیں اُن کا بڑا گرافک بیان تھا۔ اس کا استدلال اچھا خاصا رہا ہوگا جبھی تو ہم اس خبردار کرنے والے ایلی یاہ پوستین پوش کی چمک اور گھن گرج سے سدھے کھڑے رہے۔ Ancient Mariner کے قابو میں آئے شادی کی تقریب کے مہمان کی طرح ہم اُس کی وائیلڈ ملکہ قطعی مسحور آنکھ کے حصار میں رُکے کھڑے تھے کہ اچانک کہیں کوئی گڑبڑ ہو گئی۔ علمائے سُو کی خرمردگیاں گناتے گناتے اُس نے قدموں میں پڑے اپنے تھیلے سے ایک مرتبان نکالا اور (اُس مقدس شکل وصورت والے نے) امساک کی چمک دار گولیاں بیچنی شروع کر دیں۔
اس واقعے کے بعد مہینوں تک ہم طوفان کے مرکز سے دور رہے، بیرونی محیط میں ایسا کچھ پڑھا لکھا، روٹی کماتا کرتے رہے۔
شاید ہمیں جلد shock لینے والے میٹھے رس لگے تھے۔

***

تقریباً اُسی زمانے میں مورہ کو آپریٹو مارکیٹ کے وسط میں اچانک ایمان کی حرارت والوں نے زمین پر قبضہ کر کے شب بھر میں ایک مسجد بنادی تھی۔
کئی سمتوں سے نعرۂ تکبیر اللہ اکبر اور دوسرے اہم نعرے لگائے گئے۔ اخباروں میں بڑی لے دے بھی ہوتی رہی۔ قرونِ اولیٰ کی مسجدوں کے حوالے quote کیے گئے، لکھا گیا کہ مسجد کی زمین کے لیے شرطِ اول اس کا مالک سے خریدا جانا ہے۔ جواب میں لکھا گیا کہ آخر فلسفۂ ہنگامی ضرورت بھی تو کوئی چیز ہے۔ کوآپریٹو مارکیٹ بنانے والوں نے گڑگڑا کر کہا کہ للہ! ہمیں مارکیٹ بنانے دو، ہم اندر ایک مسجد بنا کر نذر کر دیں گے۔
۵۸ یا ۵۹ کا سال تھا۔ ایوب حکومت نے (جو یہ معلوم کیا تھی، مگر کسی نظریاتی گمک کا سہارا لیے بغیر تھی اور کہیں کہیں ڈانواں ڈول تو ہو سکتی تھی) کچھ پکڑ دھکڑ بھی کی۔ اس سرتاسر ٹرانسپیرنٹ کارروائی میں صدر کے ایک مشہور کیسے کا سر سیدی حلیے کا (تاہم ملاں ٹائپ) مالک پیش پیش تھا۔ اُس نے حکومت کے مسجد دشمن (یا شاید اسلام دشمن) رویے کے خلاف جہاد کی تلقین بھی کی تھی اور کچھ دن کے لیے وہ بند بھی کر دیا گیا تھا۔ پھر شاید کہیں کوئی مصالحت ہو گئی۔ اُسی سال، یا شاید بہت برسوں بعد، (what difference does it make?) سر سیدی حلیے کا وہ ملاں ٹائپ خوش خوش راہیِ ملکِ عدم ہوا۔
مسجد وہیں ہے اور بسا ہے آباد ہے۔

***

موجودہ صدر پوسٹ آفس سے (جو آج کے زیرزمین راستے کے دہانے پر واقع ہے) پیرا ڈائز چوک تک کسی درجن (اگر یہ مبالغہ ہے تو سمجھیے ایک درجن) بک اسٹال تھے جن پر زیادہ تر گوا پیر ــــ ڈمی سوزے، ڈمی کاسٹے ــــ سیلزمین یا مالک ہوتے تھے۔ آدھی آستینوں والی قمیصیں (جن کی آستینوں کو اور بھی دو بار فولڈ کر کے اور ہاف سیس، مورسیس دکھا دکھا کے پہنا جاتا تھا)، کروکٹ بال، او پی پتلونیں (جن کے پائنچوں اور کریپ کے سوال والے جوتوں کے بیچ شوخ رنگوں والے ساکس کے چیک ڈرائی شکارے مارتے تھے) اور کوئی کوئی ڈیسمم کا فیلٹ ہیٹ بھی پہنے ہوتا تھا ــــ اصل نسل، رانڈ سیو، امپورٹ کیا ہوا ڈیسمم پورے دس روپے کا ملتا تھا، یا پندرہ کا۔

شام ہوتے ہی یہ ڈی سوزے، ڈمی کاسٹے بہت مستعدی سے اسٹالوں پر آکھڑے ہوتے۔ یہ رہ گیروں کو کبھی ہیلو کہتے کبھی مسکرا کر ہاوڈی کرتے۔ کوئی دوسرے شہر سے آتا ہو گا تو سمجھتا ہو گا کہ یہ گھر سے کتابیں بیچنے نہیں Howdy Man' کہنے اور مسکرانے کے لیے آتے ہیں۔

اور کتابیں؟ Omygod' پیلی کی، پینگوئن وغیرہ وغیرہ کی کوئی بھی اوسط درجے کی کتاب، پرنٹنگ ایک کی مسور کرنے والی سگندھ کے ساتھ اور ٹائیٹل پر (WOW!) پیپر بیک باینڈنگ مشین کی داب سے پڑی کسی جادو بھری ہلکی سلوٹ کے ساتھ، almost ahprodisiac، پانچ سات روپے میں مل سکتی تھی۔

یہ اسٹال والے ایسے مستقل گاہکوں کو پہچانتے تھے (جیسے گاؤں قصبے کے دکاں دار پہچانتے ہیں) اور یہ راہ چلتے ٹوکتے بھی تھے، ہے ــــ بگ میں! ہومر کی اوڈیسی کرم کیک کے مالک سیل ہو رہی ہے۔ ٹیک کیئر مین! ففٹیں ٹکس بارگیں پرائس سے ابھی بھی مس کیا تو you know، پھر نہیں ملیں گا۔ کم آن، ٹیک وَن!

ہم مسکرا کے ڈی سوزے، ڈمی کاسٹے کی صورت دیکھنے لگتے۔

وہ سمجھ جاتا۔ مسکرا کے وِنک کرتا۔ او کے، باؤنچ؟ ابھی کلاسی سا ہے؟ وہ میرے کو دیو، کتاب اٹھاؤ ایسڈرن۔ Run for your life! ہہہ ہاہا! بیلیس ٹیکٹ ٹائم دیا۔ Bye۔

کریز اور آپ کھوڑی کارڈں کا بازار ردی فروشاں۔ یہ فی الاصل کتاب دوستوں کا کسر بھی تھا۔ یہاں سے ایک بار ہمیں Complete Works of Shakespeare تول سے ساڑھے چودہ آنے میں ملی تھی۔ ڈھائی روپے دے کر ہم نے اُس کی جلد سوائی اور کولڈ لیٹرز سے اُس پر اپنے ممدوح کا نام چھپوایا۔ تاہم ساڑھے چودہ آنے ادا کر دینے کے بعد اُس دن ہمیں (بوجوہ) بازار ردی فروشاں سے پی آئی بی کالونی تک کا راستہ پیدل طے کرنا پڑا۔

***

ہم پھر لوٹتے ہیں۔ اور ہم کیپی ٹل والی گلی سے زیادہ دور نہیں جائیں گے۔
یہ سینما ــــ کیپی ٹل ــــ کسی شیکسپیئر پسند (یا طالب علم دوست) ستار ایدھی کی ملکیت میں ہو گا۔ یقیناً ایسا ہی ہو گا کیوں کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو کیوں وہ ہم (اس وقت کے انٹر، بی اے کے طالب علموں) کو اتنے مزے کراتا۔

دونوں ڈرامے *Julius Caesar* اور *The Twelfth Night* بالترتیب انٹر اور بی اے کے لازمی انگریزی کے کورسوں میں شامل تھے، تو امتحانوں کے قریب آتے آتے کیپی ٹل میں دونوں فلمیں میٹنی شو میں دکھائی جاتی تھیں۔ دونوں بلیک اینڈ وائٹ تھیں، جب کہ جولیس سیزر ــــ جیمز میسن، مارلن برانڈو والی ــــ تو کلاسکس میں گنی جاتی تھی۔
ایک روپے میں چاہے کہیں بھی بیٹھو کے اصول پر دس پندرہ دن تک یہ فلمیں یہیں رہتی تھیں۔ مشہور تھا کہ چار شو دیکھ لے تو ہیں میں سے بارہ نمبر تو ہو سکتے تھے نوٹکا اسٹوڈنٹ بھی بیٹ لے گا۔

جب تک شیکسپیئر چلتا پورا ہال ــــ پہلی صف سے آخری صف تک ــــ بھرا رہتا۔ وضع پائے ہوئے کچھ کواپیر، کچھ پارسی مرد عورتیں، اور باقی بانوے پرانوے فیصد طالب علم ــــ لڑکے لڑکیاں ــــ ونگز میں بھی کھڑے ہوئے، بالکنی کی دیوار پر بھی ٹکے ہوئے، لڑکے لڑکیاں ملے جلے، behave کرتے ہوئے۔ ایک استاذالاساتذہ کی مجلس میں سمجھو دوزانو بیٹھے ــــ یہ کسی دوسرے مطلقے، دوسری صدی کی بات لگتی ہے ــــ مگر سب جانتے ہیں کہ سب کچھ ایسا ہی تھا۔
کیسیئر کا سیئس ایسی محفل میں ایک اداس بروٹس کو سیزر کے خلاف بھڑکا رہا ہے
لڑکے لڑکیاں سخت غصے میں کاسیس کے ساتھ ساتھ بلکہ آگے، کبھی کہ اس سے آگے آگے بکے جاتے ہیں (سیزر اس وقت سخت نامقبول آدمی ہے)، اسی لوے آوازیں ایک ساتھ ایسا venom صرف کر رہی ہیں

Why Man He doth bestride the narrow world
Like a Colossus, and we petty men
Walk under His huge legs, and peep about
To find ourselves dishonourable graves

رات کا آخری پہر ہے۔ بروٹس اپنی حویلی کے صحن میں ٹہل رہا ہے۔ سناٹے میں دور کہیں سے جیسے پرندے کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دیتی ہے۔ بروٹس (جیمز میسن ــــ فلمیوں جیسا د

اُداس آدمی) اپسے کلیرڈ لیمے میں خادم کو پکارتا ہے

What Lucius, Ho!

اور کہتا ہے: ستاروں کو دیکھ کر تو نہیں کہہ سکتا، دن ہونے میں کتنی دیر ہے پھر حسرت سے لوسیئس جیسی نیندیں کاش! مجھے مل سکتیں۔

یہ سب باتیں وہ جاتی ہوئی رات کے احترام میں سرگوشیوں میں کہہ رہا ہے۔ سینکڑوں چلبلے نوجوانوں سے بھرے ہال میں سناٹا ہے۔ وہ اپنے خادم لوسیئس کو پھر آواز دیتا ہے۔ اسکرین پر لوسیئس نظر آتا ہے مگر اُس (اداکار) کے بولنے سے پہلے، رار کی تیسری چوتھی سیٹ سے پی آئی بی کالونی، ناظم آباد کی جمک لیے ہوئے ایک جوشیلی آواز بہت احترام سے پوچھتی ہے

Call'd you, my Lord?

لڑکے لڑکیوں کی بے ساختہ کھلکھلاہٹ سے کیپی ٹل جیسے چھلک پڑتا ہے۔

کوئی نمک ورَم کھسکھلاہٹ میں حکم دیتا ہے Silence! اور پورا ہال پھر دَم سادھ لیتا ہے۔ فلم چلتی رہتی ہے۔ فلم چل رہی ہے

پیاری! کہاں گئے وہ لوگ؟

***

کیپی ٹل والی گلی کتابیں پڑھنے، کتابیں سوچنے، کتابیں لکھنے والوں کی گلی تھی۔ یہ عزیز حامد مدنی صاحب کی گلی تھی۔ یہ سر شیروانی اور سُرخ مخملی ٹوپی والے بلگرامی صاحب کی گلی تھی جنھوں نے مدنی صاحب کی طرح کتابیں نہیں لکھیں اور جن کے بارے میں مَیں اس کے سوا کچھ نہیں جانتا کہ سنا ہے محمد حسن عسکری کے بعد انگریزی کے جید استادوں میں اُس وقت اُنھیں کا نام لیا جا سکتا تھا۔

اور یہ گلی تھے ہوئے، فالج زدہ برس صادق علی کی گلی تھی۔

اس کوچے میں کیسے گلوریا بھی تھا جہاں مناسب پیسوں میں نئے گندم کی مہک والے نرم، دبیز سلائسوں پر لائل پور کا بہت سا خالص مکھن لگا کر گاہکوں کے حوالے کیا جاتا تھا، جہاں سکھاشاہی کپوں میں اُسی وقت دَم کی ہوئی چائے ملتی تھی جس کی مہک پچاس قدم دور سے بے چین کر دیتی تھی۔

کیپی ٹل والی گلی کے ایک یا دوسرے سرے پر کامریڈ ڈانگے کی شکل کے، دبیز چہرے اور درمیانہ قد کاٹھ کے ایک صاحب کھڑے نظر آتے تھے۔ اُن کے بارے میں مشہور تھا کہ دہریہ پرست (؟) ہیں اور میر امن کو انگریزی میں ترجمہ کر رہے ہیں۔ اوپر کافی ہاؤس میں بھی وہ ایک طرف بیٹھے نوٹس لیتے دکھائی دیتے تھے۔ ہم نے پندرہ برس اُنھیں اسی طرح دیکھا۔ نہ معلوم کس نے اُڑا دیا تھا کہ وہ میر امن کا ترجمہ کر رہے ہیں، آج تک تو کوئی ترجمہ سامنے نہیں آیا۔ برسوں ہم کامریڈ ڈانگے کے اُن ہم شکل کو ڈھونڈتے رہے، نہ وہ نظر آئے نہ میر امن۔

کیپی ٹل والی گلی اَب کہیں نہیں ہے۔ اُس کی جگہ آواز اور حرکت کی ایک furious tunnel ہے جس میں بے حیثیت فصول چیزیں بیچنے اور خریدنے والوں کے ہجوم کسی بیند کے عالم میں ملتے اور آپس میں جرح کرتے رہتے ہیں۔

***

اب یاد آتا ہے کہ ہم جب تک طوفاں کے مرکز میں رہتے، بے غم رہتے تھے۔ بھوک، ضرورتیں، تسانی، ناکامیاں، فرسٹریشن، حکمرانوں کی دھاندلیاں ـــــ سب طرح کا کدت ودخل اس دائرے کے باہر سَنسَناتا ہوا گھمن گھیریاں کھاتا رہتا تھا۔ بیرونی محیط ایک پیس دینے والے فشار میں تھا جس میں سروائیو کرنے کے لیے ہم سب، اولمپس کے سبھی دیوتے، اپنے اپنے طور پر کچھ نہ کچھ جتن کر رہے تھے۔ باہر عافیت نہیں تھی، کبھی نہیں رہی۔ یہ ہم سے زیادہ کون جانتا ہوگا! تاہم دوسرے ناسمت لوگوں کی طرح ہم نے سروائیو کیا ـــــ یا نہیں کیا۔ اب یاد آرہا ہے ہم میں سے بعض لوگ جاں بر نہ ہوسکے۔

قمر زیدی نام کا ایک لڑکا تھا۔ شعبۂ انگریزی میں میرے ساتھ داخل ہوا تھا۔ تھنک (think) کو ہمارے اترگئے ساتھیوں کی طرح nasal تلفظ میں فِنک کی طرح ادا کرتا تھا۔ جو شعبہ انگریزی کے ایک سال پُرانوں کا مَیسرزم ہوتا تھا (یا اَب بھی ہے؟ پتا نہیں)۔ وہ پرانے، پھر سے کیمپس میں بار بار کی دُھلی ہوئی ایسی نائیلوں کی قمیصوں، ریں کی پتلونوں میں ملبوس قہقہے مارتا آتا جاتا رہا۔ وہ میرے ہی محکمے میں کلرکی کرتا اور کسی انقلاب کے خواب دیکھتا تھا کہ حکمرانوں کی جھپیٹ میں آگیا۔ شاید اُس نے کوئی پوسٹر لکھا تھا۔

(کامریڈ؟) قمر زیدی کو (عمر بیس سال یا اُس سے کم) کسی سمری کورٹ نے اتنے اتنے ماہ کی سزا سنائی ہوگی یا کوڑے لگوانے ہوں گے، یا ابھی سزا سنانے، کوڑے لگوانے کی نوبت ہی نہیں آئی تھی، پوچھ گچھ کے مرحلے ہی میں تھا کہ اس کے باپ کی موت واقع ہوگئی اور حکام نے اُسے جنازے میں شریک ہونے کے لیے خصوصی اجازت نامہ دے کر گھر بھیج دیا۔ یا شاید اُسے اس لیے چھوڑ دیا کہ پوچھ گچھ میں کہیں کوئی گڑبڑ ہوگئی تھی اور، آج کے برخلاف، اُس وقت قیدوبند میں کسی کا واصل بہ حق ہونا حکمرانوں کے لیے بدشگونی سمجھا جاتا تھا۔ (Human rights violation and all the relevant shit) تو وہ خصوصی اجازت پر (انسانی ہم دردی اور ترحم کی بنیاد پر؟) گھر آیا ہوا تھا جو اُس نے خون کی قے کی اور مر گیا۔ شاید دوسرے دن، یا اُسی دن باپ کی تدفین کے بعد، اُسے بھی گاڑ داب دیا گیا۔ دوسرے کامریڈوں نے قمر زیدی کی قبر پر بھی ستونِ دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ والے مشہور شعر کی تختی لگادی۔

میں ایک بار مرحوم سلطان پوری کی فرمائش پر کیمرا لے کے اُس کی قبر ڈھونڈتا ہوا میوہ شاہ گیا بھی تھا۔ وہ جگہ ہی نہ مل سکی۔

وہ جگہ ملتی بھی کیسے۔ وہ طوفان کے مرکز کے باہر تھی، براہ راست تمام سنسناہٹوں کی زد میں تھی۔

طوفان کے مرکز کے باہر جو بہت سی casualties ہوئیں اُن میں سے ایک میرے لیے (یہ یقیناً ایک پٹا ہوا استعارہ ہے) سے گھاؤ کی طرح آج بھی رِس رہی ہے۔

یہ کراچی یونیورسٹی سے فلسفے میں فاضل، سعیدالدین احمد (اور اگر اس کے کوئی معنی ہیں تو گولڈ میڈلسٹ) کی کیجولٹی ہے۔ میں نے یہاں پولیس محرروں کا پسندیدہ تلفظ کیجوَلٹی لکھا ہے، اس لیے نہیں کہ مجھے پولیس محرر پسند ہیں بلکہ اس لیے کہ یہ تلفظ برنس لائیک، ابعارمل، کولڈ بلڈڈ، جاہلانہ اور تقریباً اِن ہیومن لگتا ہے، اور اس تمام صورتِ حال میں ایک نحوست آثار سنگِ مزار کی طرح کھڑا ہوا ہے۔

مجھے سعیدالدین احمد کے سانحہ ارتحال کی کوئی اطلاع نہیں۔ خدا معلوم وہ ابھی تک وِیجی ٹیبل کی طرح زندہ ہے یا اس کی مشکل آسان ہو گئی۔

سعیدالدین احمد نے مجھے جان ڈن پڑھایا تھا۔

وہ تھا تو میرا ہم مکتب ہی، مگر فلسفے کا فارغ التحصیل ہونے اور بھیانک حد تک ذہین ہونے کے ناتے وہ میرا ایپٹا فرکس کا اَن اَوفیشل استاد بن بیٹھا تھا۔

مگر مجھے یہ واقعہ شروع ہی سے سنانا چاہیے۔

سعیدالدین احمد ایسی looks میں پچاس فی صد دراوڑی، پچاس فی صد نیگرو اور سو فی صد دُکھی تھا۔ بر سہاراؤ کی طرح جوڑے نتھنوں اور مارٹن لوتھر کنگ جو نیئر کے سے اُبھرے ہونٹوں والے اس فٹ بال کے چہرے پر کنگ جیسی نرمی اور ذہانت تھی اور موٹے چشمے کے پیچھے سے جھانکتی، I have a dream کہتی اُس کی آنکھیں اسے ایک دم ساؤتھ انڈیا سے آیا ہوا کنگ جونیئر سا دیتی تھیں۔

یاں سنڈھی جو ما مارکیٹ سے ملحق کراچی یونیورسٹی (اولڈ کیمپس) کے شعبہ انگریزی میں مَیں نے اُسے پہلی بار دیکھا تھا۔ یہاں پہنچنے کے لیے شعبے کے آدھے کمپاونڈ پر قابض لکڑیوں کی ٹال سے اور woodlanders کے بیچ سے لہراتے ہوئے گزرنا ہوتا تھا (وہ لیکچروں کے دوران بھی ٹھا ٹھا کر کے کلہاڑے چلاتے رہتے تھے)۔ ٹال سے گزر کر اور ایک سکڑا سمٹا، کھماودار زینہ چڑھ کے شعبے کا سیمینار آ جاتا تھا (جو L-4 روٹ کی کسی بھی بس کے برابر لمبائی چوڑائی رکھتا تھا)۔

میں پہنچا تو وہاں سیمینار روم کے دفتری خلیل بھائی کے ساتھ ایک بینچ پر وہ بیٹھا تھا — سعیدالدین احمد!

وہ خلیل بھائی کے بچوں کے نام پوچھ رہا تھا اور ہر نام پر واہ واہ کر کے داد دے رہا تھا، مُرتضیٰ ملِ، واہ! اور مُسن تَن صر اور مُدثّر، سبحان اللہ! یہ کہنے لگا، خلیل بھائی! اپنے اگلے بیٹے کا نام میکسی ملین

رکھا۔ خلیل بھائی یہ سُن کر سر ہلا ہلا کر ہنسنے لگا۔ بولا، سعیدالدین، تم یار نہیں آ تو کے! میں جب فلسفے کے سیمینار میں تھا تو اُس وقت بھی میرے کو ایسے ہی چلایا کرتے تھے۔ اب یہاں بھی آ گئے۔

میں نے ایسا تعارف کرایا، سامنے دوسری بینچ پر بیٹھ گیا، تو اس نے خلیل بھائی سے میرے لیے چائے بنانے کو کہا اور مسکرا کر مجھ سے بولا آئی تھنک یو آر راور اَرلی۔ An early bird?

Haanh? Out to get a worm that's me! Ha! Ha! Ha!

کڑک چائے کے گلاسوں پر ہم دوست بن گئے۔

ہم دونوں ایسی جلت پھرت سے سمجھو پہلے ہی دن اگلی ڈیسکوں پر، استادوں کے بالکل سامنے پہنچ گئے تھے۔ بس اُسٹھ ساٹھ کے طاقت ور بیورو کریٹس کے بچوں بچیوں اور مستقبل کے ڈپٹی اور ہوم اور ایڈیشنل سیکرٹریوں اور مستقبل کے سکتے ہوئے انگلش ٹیچروں اور آنے والے دنوں کے عادی بے حواروں اور compulsive راشیوں کے درمیان ہم دو آدمی پٹیوں چڑھے انگوٹھوں کی طرح دھڑکتے ہوئے بالکل الگ نظر آنے لگے پہلے اپنے کم حیثیت کپڑوں اور ایسے سوراخ والے چرچ چرچ کرتے جوتوں کی وجہ سے، پھر اپنے ٹیوٹوریلز کی اے پلس ، اے اور بی پلس گریڈنگ کی وجہ سے۔

ہمارے استادوں، پروفیسر نقوی، پروفیسر مسز مایا جمیل اور صدرِ شعبہ پروفیسر (اب ڈاکٹر) علی اشرف، نے سعید کو رفتہ رفتہ سوالوں کے جواب دینے سے روک دیا۔ علی اشرف صاحب نے کہا سعیدالدین احمد! تم ڈیلفی کے موٹے چشمے والے Oracle ہو۔ ہر سوال کا جواب تمہارے پاس ہوتا ہے۔ تو دوسروں کو بھی بولنے دو۔ Now behave yourself and keep quiet

رفتہ رفتہ ہم دونوں صبح کا ناشتا بھی ساتھ کرنے لگے جو گندم کے میادی مرے والی سادہ کڑک روٹی ہوتی تھی جسے (لسایانی) چائے کے گلاسوں میں ڈبوڈبو کے نگویا اور Basic Realities پر مکالمہ کرتے ہوئے کھایا جاتا تھا۔ مگر یہ سعید کی چالاکی تھی جو اس نے میرے ساتھ ناشتے کا پاکھنڈ رچایا تھا۔ وہ بال بچوں والا آدمی تھا، گھر سے کھا پی کے چلتا ہوگا۔ میرا گھر تو تھا نہیں، کسی بھی کزن، کسی بھی خالہ پھوپھی کے وہاں میں سو جاتا تھا اور سویرے ہی سویرے چل پڑتا تھا، تو مجھے پان منڈی کے چائے خانوں میں ناشتہ کرنا ہوتا تھا۔ اور کیوں کہ بالکل اکیلا تھا اور پیسے کی میکانکس کو سمجھتا نہیں تھا، تو کبھی میری مالیات سیٹ ہوتی تھی اور کبھی اَپ سیٹ ـــــ اور اَپ سیٹ کا مطلب تھا کہ پھر مجھے صبح کا ناشتا ایک بجے اپنے دفتر جا کر کرنا پڑتا تھا جہاں اِیسر جسی میں اُدھار دینے والے میرے ساتھی موجود رہتے۔ (کیرو بھسوا سٹوڈی گومر مجھے اُدھار دینے والوں کا سَر جیل تھا۔ ماشاءاللہ وہ ابھی زندہ اور خوب صحت مند اور خوش حال ہے اور زور شراب پیتا ہے۔ میں اُس کے لیے دعا کرتا ہوں کہ طویل برسوں تک وہ ایسا ہی جیونہال رہے، اور دعا کرتا ہوں کہ جب وہاں پہنچے جہاں اُسے پہنچنا ہے تو اسے کسی محترم رومن کیتھلک سینٹ کی ہمسائیگی نصیب ہو۔ Amen! تو یہ ٹونی گومر میرا کفیلِ ایجیف تھا اور بیس تاریخ کے بعد سے مجھے دو روپے روز اُدھار دینے لگتا تھا۔)

لیکن میں سعید الدین احمد کی بات کر رہا تھا۔

سعید نے ایسی ساؤتھ انڈین دانش میں اس سیٹ، اپ سیٹ مالیات اور ناشتہ حاضر، ناشتہ غائب مسئلے کا حل یہ نکالا کہ وہ میرے ساتھ کڑک روٹی کھانے اور چائے پینے لگا۔ اکثر و بیشتر وہ بل بھی ادا کرنے کی کوشش کرتا جو ساڑھے پانچ چھ آنے ہوتا تھا۔ ہم ساتھ ہی بس پکڑتے تھے۔

ایک روز بس میں بیٹھے بیٹھے میں نے کہا، سعید الدین احمد! جون ڈن مجھ پر نہیں کھل رہا۔ اُس کی مابعدالطبیعیات میری گرفت میں نہیں آتی۔ پٹھان بھائی ہوں، شاید اس لیے۔ کروڈ، کھری، رف، فزیکل چیزیں میری پکڑ میں جلد آ جاتی ہوں گی۔ میٹافزکس شاید بھاری پتھر ہے۔ وہ ایسی ساؤتھ انڈین ہنسی ہنسا جو کسی بھی تامل ٹائیگر کی طرح بے خوف بلکہ تقریباً violent تھی۔ پھر بولا 'Is that so' اور اس نے کھڑے ہو کر بس کی وہ ڈوری کھینچ دی جس سے گھنٹی بجتی اور بس رک جاتی تھی۔ ہم ابھی بہ مشکل رس روڈ تک ہی پہنچے تھے کہ وہ مجھے لے کے اُتر گیا۔

بس سے اُتر کے آہستہ آہستہ صدر روڈ پر آتے اور رتن تلاؤ کے بعد فٹ پاتھ سنبھالتے آدھا گھنٹا لگ گیا۔ پی آئی بی کالونی تک ہم شام ہوتے پہنچے۔ کالونی تک ڈن میرے لیے اتنے اندھیرے میں نہ رہا جتنا رتن تلاؤ کے فٹ پاتھ پر تھا۔ اب ایک مگر چاندنی میں اُس کے خدوخال واضح ہو رہے تھے۔ سعید نے اُس کا وہ مختصر مجموعہ نہیں کھلوایا جو مسز مایا جمیل نے recommend کیا تھا۔ دوسری کتابوں کے ساتھ وہ کتاب میری گرفت میں پیسے پیسے ہوتی رہی اور سعید ایسی یادداشت سے ڈن کے اشعار پہ اشعار quote کرتا اور ایسی دھاردار intellect سے اُسے آبِ رواں سا بناتا چلا گیا۔

دوسرے دن میں نے کہا، سعید! مجھے لگتا ہے تم ڈاکٹر جونس ہو اور میں تمھارا بوسویل جو سوال کر کر کے تمھارا ٹیپا کر دے گا۔ میں بہت دن ضائع کروں گا تمھارے۔

وہ چپ ہو گیا۔ پھر ہنسا۔ پھر آب دیدہ ہو کے بولا، تم بوسویل سے زیادہ ذہین ہو۔ اور جونس کا کیا کہتے ہو؟ وہ تو دیوزاد تھا، مجھے اُس کے مماثل مت کرو۔ میں ایک کم مایہ، مسکین مبتدی ہوں جو بہت کچھ سیکھنا چاہتا ہے مگر خود میں اتنا بوتا نہیں پا رہا۔

یہ بوتے والی بات اُس نے عجیب کہی تھی۔ شاید کسی طرح کی premonition تھی۔

ایک بار میں اُس کے ساتھ اُس کے گھر جا چکا تھا۔ گولی مار کی امام بارگاہ کے پیچھے کہیں کسی گراؤنڈ کے پاس اس کا بے پلستر کا، ٹین چڑھا مکان تھا۔ اُس کی بیگم کہیں پڑھاتی تھیں۔ بچے سبھی پڑھ رہے تھے۔ گھر میں ایک مستعلیق عسرت کا راج تھا۔ تاہم بیگم سعید نے وضع داری نباہی تھی، چائے کے ساتھ پلیٹ میں پاپے رکھ کے پیش کیے تھے۔

پھر دوسری بار میں اکیلا گیا جب اُس کی بیماری کا سُنا۔ کوئی گمبھیر بات تھی۔

مجھے اُس کے گھر میں گھستے دیکھ کر محلے کے لڑکوں نے کہا، اے پاگل پروفیسر کے گھر کوئی آیا ہے۔

اس بار اُس کے بچے کچھ سہمے ہوئے، کچھ شرمندہ سے لگے۔ بیگم اُداس مگر باہمت دکھائی دیں۔
وہ ایسے ہی استغراق میں تھا۔ چھت کی ٹین شیٹس ایک جگہ سے سرک گئی تھیں تو روشنی کا ایک shaft اس کے نیم تاریک کمرے میں در آیا تھا جس میں غور سے دیکھنے پر بے شمار روشن ڈسٹ پارٹیکلز گردش کرتے دکھائی دیتے تھے۔ سعیدالدین نے خوش ہو کے مجھے وہ دکھایا۔ کہنے لگا

Worlds on worlds are rolling ever
From creation to decay
Like the bubbles in th' river
Sparkling, bursting etc etc

کچھ دیر بیٹھ کر میں تقریباً روہانسا اور scandalized وہاں سے چلا آیا۔
اِس پورے پھیلاوے پر کہ جس میں لوگ پیدا ہوتے، ضائع کیے جاتے، مار دیے جاتے ہیں، مجھے بڑا غصہ تھا۔

یہ کسی نے بتایا و دھول بھرے پیروں میں ہوائی چپلیاں ڈالے، غیر معمولی رنگوں کا پھٹا ہوا اکیڈیمک گاؤن اپنے شانوں پر پھیلائے، چوبرجی میں ملا ملوانی کے فٹ پاتھ پر کھڑا رہتا ہے۔ لوگ اُس سے بچ بچ کے گزرتے ہیں مگر وہ اُن کی طرف دیکھتا بھی نہیں۔ ایسی (تامل ٹائیگر والی) مستی میں مستا ہوا خود سے طویل مکالمے کرتا ہے جو کبھی انگریزی میں ہوتے ہیں، کبھی اردو اور کبھی فارسی میں

بشنو از نے چوں حکایت می کند، وز جدائی ہا شکایت می کند، سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق، تا بگویم شرح درد اشتیاق، کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند، اور کیا اور کیا کہ مرد و زن نالیدہ اند ـــ یعنی کہ بانسری سے سنو وہ کیا کہتی ہے اور فراقوں جدائیوں سے (رنجور ہو) شکایت کرتی ہے تو کہتی ہے کہ مجھے تو پرزہ میں کھول دینے کے قابل سینے چاہییں تاکہ میں اپنے عشق کے درد کی شرح کر سکوں کیوں کہ جب سے مجھے اپنے نیستاں، اپنے بانسوں کے بن سے اکھاڑ دیا گیا ہے، اور کیا اور کیا ہوا ہے، اُس وقت سے میں روتی ہوں تو سب جن روتے ہیں

وہ نوبیل لاریٹ ڈاکٹر عبدالسلام کی ڈی رس کا گرائیں تھا۔ جیتا اور باہوش رہتا تو کسی نہ کسی شعبے کا ایک luminary ہوتا۔ میں عاجز اُس کا گرائیں کہلاتا۔

میں نئے کیمپس میں جانے لگا تھا جہاں ابھی سیمنٹ کی کاٹتی ہوئی بُو اور چھوٹے قلعی ڈسٹمپر کی سی چمک سانسوں کو اور آنکھوں کو چبھتی لگتی تھی۔
ایک بار خبر ملی کہ وہ بھی کیمپس آنے لگا ہے ـــ سعیدالدین احمد!
پتا چلا ایک روز پروفیسر بابا جمیل کی کلاس میں اُنھیں اپنی ماں کہتا گھس گیا تو اُنھوں نے اسے تسلی دی۔ کرسی منگا کے اُسے اپنے پاس بٹھا لیا اور لیکچر جاری رکھا۔ پھر وہ اُسے اپنے کمرے میں لے گئیں۔ چائے منگائی، اپنے ہاتھ سے بنا کے پلائی۔ ایک لڑکے کو بُلا کے بہت سے نوٹ اُسے دیے اور کہا، رکشا

کر لو۔ انھیں ان کے گھر چھوڑ آؤ۔ پھر آ کے مجھے بتانا۔

پروفیسر مایا جمیل وہی ہیں جنھیں قرۃ العین حیدر نے اپنی کسی کہانی میں یاد کیا ہے۔ (شاید میرے بھی ضمیم جانے، شاید سیتا ہرن معلوم نہیں!)

آخری بار مسلم لیگ کوارٹرز کے قریب ایک پنساری کی دکان کے سامنے وہ مجھے نظر آیا۔ شاید اس کے لیے مقویٰ جڑی بوٹی جاری تھی۔ ایک شریف صورت سادہ اندیش بڑے میاں اس کا ہاتھ تھامے کھڑے تھے۔ میں نے سلام کیا۔ وہ پہچان گیا۔ پوچھنے لگا، اسد! کیسے ہو؟ میں نے کچھ بھی کہہ دیا۔ وہ بولا، اب میں ٹھیک ہوں۔ مگر یہ باتیں اس نے آنکھیں جھکا کے کہی تھیں اور اس کی آنکھوں میں سرمہ لگا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ آپی آپ لرز رہا تھا اور تامل ٹائیگر والی ہنسی کی جگہ چہرے پر ایک fixed معذرت خواہانہ مسکراہٹ ہمہ وقت موجود تھی۔

شریف صورت سادہ اندیش اس کے باپ تھے۔ کہنے لگے، اب یہ روبصحت ہیں۔ شکر ہے پروردگار کا۔ بڑا بچہ سترہ اٹھارہ برس کا ہو گیا ہے، ایک جگہ ٹائپسٹ لگ گیا ہے تو مالی پریشانیاں بھی کم ہوئی ہیں۔

میں نے دیکھا، بجلی کے بے تلے وولٹیج سے جھٹکے دے کر اور strong کیمیکلز کے محتاط مگر مسلسل dosage سے تامل ٹائیگر کو زنجیر کر دیا گیا تھا۔ اس کا بدن بحال ہو چکا تھا، وہ کھانا کھاتا، نہاتا، کپڑے تبدیل کرتا تھا۔ مگر بڑے میاں نے بتایا کہ پڑھ نہیں سکتا، کسی کام نہیں کر سکتا۔

میں نے سوچا اس کا forte تو اس کا للکارنے مارتا دس سی تھا، وہ نہیں رہا تو باقی جو بچ رہا وہ سعید الدین احمد تو نہیں، ایک hulk ہے۔ ایک صحت یافتہ ویجی ٹیبل۔ میری دل جیسی ختم ہو گئی۔ اس طرح میری دل جیسی خود اپنی کہانی کے ایک کردار ناصر الدین ہمایوں میں ختم ہو چکی ہے۔

او بچے قد کاٹھ کے سعید وں سعید ناصر الدین ہمایوں کا forte اس کی حیران کن قوت مردمی تھی۔ وہ سر سبز نشاں زدہ گھروں میں سیڑھی لگا کر چڑھ جاتا اور باعصمت بی بیوں کو deflower کرتا۔ کہانی کے کسی ناہموار موڑ پر حداوند قدوس نے (Of course an act of God!) ایک بین لیس آپریشن کے ذریعے اسے اس کے خصیوں سے علیحدہ کر دیا۔ اب وہ صرف ایک half-witted non-entity اور ایک incommunicable hulk تھا ــــ ناصر الدین ہمایوں۔

An idiot (mouth-fucked by an imbecile
Jaguar with much sound and fury)
Signifying nothing

سعید الدین ایسی سوڈ کے بعد بیرونی محیط میرے لیے اعصاب شکن ہوتا جا رہا تھا۔ میں طوفاں کے مرکز میں لوٹ آیا۔ وہاں کسی بھی فلم کو ایک بار دیکھتا، پھر اسی کو دوسری بار دیکھنے کے لیے قطار میں لگ

جاتا۔ بہت سے بے سمت وقت گزر رہا تھا۔ مگر میں پُرسکون ہوتا گیا اور کسی عافیت کے ہلاوے میں دھیما ہوتا گیا۔

تو کچھ کو اَب کچھ نہیں رہا میں ایسے بیاں کے اختتام پر ہوں اور طوفاں کے مرکز میں۔

***

اور ہم مرکز میں تھے خوشاست اور تقریباً unruffled ہوتا ہے۔

مگر ابھی ہم وہیں تھے جو بیرونی محیط سے فیلڈمارشل کا بیٹا کئی سو ٹرکوں کا جلوس لے کر سدررروڈ سے طوفاں کے مرکز میں داخل ہوا اور اُسے درمیاں سے قطع کرتا، unruffled دائرے کو توڑتا، میموریکل فاؤنٹیں کی طرف نکل گیا۔ طوفاں کا مرکز اُتھل پتھل ہو گیا۔

وہ ــــ جسے برسوں، گندھاروں بعد، سفید ریشمی واسکٹ کی اوپری جیب میں مڑُوں کلر کا رومال اُڑس کے اسپیکر کی کرسی پر بیٹھنا تھا ـــــ بوڑھی فاطمہ جے پر ایسے پیا کی concocted فتح کا جشن مناتا، ایسے (سروس ۹) ریوالور سے بےحساب گولیاں چلاتا، طوفاں کے محفوظ دائرے کو ہمیشہ کے لیے دو نیم کرتا، سنسناتا ہوا، صاف نکل گیا۔ تیس ٹرکوں پر تو صرف اُس کے وہ کارندے سوار تھے جو بید کی کھوکھی ہوئی چھڑیوں سے ڈھول تاشوں پر ضرب میں لگا رہے تھے کہ دِرگہ دِرگہ دِرگہ دِرگہ دِرگہ دِرگہ دِرگہ دِرگہ

ہم سمجھ گئے کہ عافیت کا دائرہ اب کہیں نہیں رہا۔

***

اور عافیت ایک relative term ہے، اور جتنے دِن بھی رہا ہے براہِ راست سنسناہٹوں کے بیچ رہا ہے۔

تو اَب ہم وہیں ہیں۔

The fault, dear Brutus, is not in our stars
But in ourselves, that we
(Bookworms etcetera)
Are underlings

**

آئندہ صفحات میں پیش کیا جانے والا متن سویڈن سے تعلق رکھنے والی ناول نگار سگرڈ کاہلے (Sigrid Kahle) کے ایک مقالے کا ترجمہ ہے جو ۳۰ نومبر سے ۳ دسمبر ۱۹۹۵ تک اسلام آباد میں اکیڈمی آف لیٹرز کے زیرِ اہتمام منعقد ہونے والی ادیبوں اور دانشوروں کی بین الاقوامی کانفرنس میں پڑھا گیا۔ یہ کانفرنس ادب، کلچر اور جمہوریت کے موضوع پر منعقد کی گئی تھی اور اس مقالے کا عنوان The Role of Writers and Intellectuals in the Promotion of World Peace تھا۔ یہ اس کانفرنس کا غالباً واحد مقالہ تھا جس میں کراچی کا براہِ راست ذکر آیا۔ سگرڈ کاہلے نے کراچی کی تہذیبی زندگی کے ایک [illegible] دور کی یاد تازہ کی ہے جس میں وہ خود بھی شریک رہی تھیں۔

اس کے بعد پیش کیا جانے والا مضمون ایک اور ایسے ہی نایاب نقطۂ نظر کو سامنے لاتا ہے۔ یہ مضمون اینتا غلام علی نے ہماری درخواست پر اس انتخاب میں شمولیت کے لیے خاص طور پر تحریر کیا۔ اس کا انگریزی عنوان A View from the Memory Window ہے۔ اینتا غلام علی سندھی مسلمان خاندانوں کی اس قلیل تعداد سے تعلق رکھتی ہیں جو کراچی شہر کی زندگی میں تقسیمِ ہند سے پہلے سے سرگرم رہے ہیں۔ والدہ کی جانب سے ان کا رشتہ شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ سے ہے اور ان کے والد جسٹس فیروز . . . اپنی وفات تک عدلیہ کے ایک ممتاز رکن رہے۔ ان کی والدہ، مسز شیریں فیروز نانا، شہر کی قابلِ احترام ہستیوں میں سے تھیں۔ تاہم، اینتا غلام علی کا امتیاز محض سلسلۂ نسب تک محدود نہیں، ان کے نقطۂ نظر میں کراچی شہر کے کردار کا جوہر دکھائی دیتا ہے، جس کے سینے میں انسان کا دل تھا اور جس کے بازو کھلے تھے۔

سگرڈ کابلے

انگریزی سے ترجمہ ذی شان ساحل

۱۹۵۰ کے عشرے کا کراچی تھیٹر

O! Days thrice lovely! When at length the soldier
Returns home into life when he becomes
A fellow-man among his fellow-men
The colours are unfurl'd, the cavalcade
Marshals and now the buzz is hushed and hark
Now the soft peace-march beats Home, brothers home!
The caps and helmets are all garlanded
With green boughs, the last plundering of the fields
The city gates fly open of themselves
They need no longer the petard to tear them
The ramparts are all filled with men and women
With peaceful men and women that send onwards
Kisses and welcomings upon the air
Which they make breezy with affectionate gestures
From all the towers rings out the merry peal
The joyous vespers of a bloody day

یہ مکالمے ۱۹۵۵ میں کراچی میں، ایک باصلاحیت نوجوان پاکستانی اداکار راشد کاراپیٹ (Rashid Karapiet) نے فریڈرش شلر کے لیے *The Piccolomini* کی پیش کش میں ادا کیے۔ کراچی سے وابستہ میری جوانی کی بے پناہ یادوں کو واپس لانے والے بھی یہی مکالمے ہیں، اس کراچی کی یادیں جو کبھی پاکستان کا دارالحکومت تھا۔ یہ سطریں یورپ کی تیس سالہ جنگ (۱۶۰۸-۱۶۴۸) سے بے حال لوگوں کی آرزوؤں اور امن و سلامتی کی دعاؤں کو بیان کرتی ہیں۔ آج یہی سطریں دنیا بھر کی اس تمنا کو آواز کا روپ دیتے نظر آتی ہیں جو امن و استحکام، عدل و مساوات، احترام و برداشت اور انسانی عظمت کے لیے ہے۔ یہ انسانی فطرت سے پیوست دہشت، انتقام اور ہوس کے خاتمے کی امید کا بھی اظہار کرتی ہیں۔ اور یہی مکالمے دنیا میں امن کی جدوجہد میں ادیبوں اور دانش وروں کے کردار کی بھی وضاحت

کریں گے۔

میں ۱۹۵۲ میں، جوانی کے جوش اور ولولے اور خود اعتمادی سے بھرپور تیئیس برس کی عورت کے طور پر کراچی آئی تھی اور یہاں تھیٹر کی تحریک کو پروان چڑھانے میں مدد دینے کا فیصلہ کیا۔ پاکستان کی عمر اس وقت صرف پانچ سال کی تھی۔ ہر چیز نوزائیدہ حالت میں تھی۔ لاکھوں مسلمان ہندوستان سے اُمڈ آئے تھے۔ میں نے اور میرے پاکستانی دوستوں نے سخت محنت کی اور آخرکار ایک طرح کی تھیٹر کی تحریک کو تشکیل دینے میں کامیاب ہوئے۔ ہم نے، ثقافتی اور تخلیقی انتشار کی کیفیت کے باوجود، اردو اور انگریزی میں کھیل اسٹیج کیے۔ یہ ایک نہایت دشوار کام تھا۔ پاکستان کے نئے دارالحکومت میں نہ تو کوئی باقاعدہ اسٹیج موجود تھا اور نہ تھیٹر کے آلات وغیرہ دستیاب تھے۔ اسٹیج پر کام کرنے کے لیے لڑکیوں کو آمادہ کرنا (اور ان کے والدین سے اجازت لینا) بہت مشکل تھا۔ کام میں ڈسپلن پیدا کرنا بھی آسان نہ تھا۔ میں غیر ملکی تھی، لیکن بہرحال اسے فراموش کر دیا گیا تھا۔ کراچی میں میرے پانچ سالہ قیام کے دوران ہم نے بہت سے ڈرامے کیے، اور میرا خیال ہے خاصی عمدگی سے، اور ہم سب مل جل کر تھیٹر کو کراچی کے ثقافتی نقشے پر لے آئے۔

ہماری سب سے کامیاب پیش کش مرحوم ڈراما نگار اور استاد خواجہ معین الدین کا کھیل لال قلعے سے لالوکھیت تھا۔ اس کا مرکزی خیال ڈاکٹر مولوی عبدالحق کا تجویز کردہ تھا۔ اس کھیل کو انھیں دنوں انجمن ترقی اردو کی گولڈن جوبلی کے موقعے پر پیش کیا گیا تھا جب ہمارے گروپ کو اس کے بارے میں علم ہوا۔ اس اردو کھیل کے اداکار تو بے حد باصلاحیت تھے لیکن کھیل میں آواز اور روشنی کی تکنیک اور ساطر کی جزئیات خواہش کے مطابق نہیں تھیں۔ اتفاق سے پاکستان کا پہلا بین الاقوامی شہرت یافتہ اداکار ضیا محی الدین لندن کے رائل کالج آف ڈرامیٹک آرٹس سے تربیت لے کر تازہ تازہ واپس آیا تھا۔ خواجہ معین الدین اور ضیا کو یکجا کیا گیا، دونوں نے مل کر اس کھیل کی ایک رواں اور جدید پیش کش تیار کی جو اس سے پہلے چھ گھنٹے کے دورانیے پر محیط تھا۔ اس کھیل میں کوئی زنانہ کردار نہیں تھا، اس لیے اداکاروں کا انتخاب آسان ہو گیا تھا۔

لال قلعے سے لالوکھیت نے کراچی کے شہریوں کے دلوں کو چھو لیا — خاص کر ہندوستان سے آئے ہوئے مہاجروں کے دلوں کو، کہ یہ کھیل انھیں کے بارے میں تھا، اُن کی امیدوں، غموں، مشکلوں اور امنگوں کے بارے میں۔ اس کھیل میں دکھائے جانے والے بعض مہاجر، ہندوستان کے مسلم معاشرے کے اعلیٰ طبقے کے معزز رکن رہ چکے تھے، اور اب اپنی سماجی حیثیت سے محروم ہو کر پستی میں گرے ہوئے پناہ گزین بن گئے تھے۔ کھیل کے بعض دوسرے کردار ہمیشہ سے غریب تھے، مگر وہ کامیابی اور خوش حالی کی تلاش میں اپنے خوابوں کی تکمیل کے لیے پاکستان پہنچے تھے۔ اصل مہاجر — جو لالوکھیت کی غربت اور حقارت میں رہتے تھے — ہاتھوں میں ایک ایک روپے کے نوٹ لے کر یہ کھیل دیکھنے آئے اور جب انھیں معلوم ہوا کہ تمام ٹکٹ بک چکے ہیں تو مایوس واپس لوٹے۔

ان بدنصیب مہاجروں کے پاس نہ سر چھپانے کی جگہ ہے اور نہ روزگار، یہ ڈرامے کے بارے میں کس طرح سوچ سکتے ہیں؟ یہ بات خواجہ معین الدین نے میرے اور میرے شوہر کے لیے ہونے والے ایک الوداعیے میں تقریر کرتے ہوئے ۱۹۵۷ میں کہی تھی۔ یہ ماننا پڑے گا کہ ایک کم عمر ریاست ہونے کے ناتے اردو اچھے ڈراموں سے قریب قریب محروم ہے۔ تھیئٹر اور لوگوں کے درمیان تعلق پیدا کرنے والی بنیادی صورتحال اس ملک میں ابھی ناپید ہے۔ عوام کو ڈرامے کا شوق نہیں اور خواص اسے ایسی توجہ کے لائق نہیں سمجھتے۔ اس کے علاوہ تھیئٹر کے آلات اور مناسب تھیئٹر ہال بھی موجود نہیں ہیں۔ ۱۹۵۳ء میں لال قلعے سے لالوکھیت کو اسٹیج کرنے میں سخت مشکلات پیش آئیں، خصوصاً لاہور میں جہاں مہاجروں کا مسئلہ کراچی کی طرح نمایاں نہیں تھا۔ اور ہمارا واسطہ پہلی بار پیشہ ور اداکاروں سے پڑا تھا جن کو معاوضہ بھی ادا کیا جاتا تھا۔

ہر طرف مکمل بربادی کے مناظر دکھائی دیتے ہیں۔ ہر جگہ مہاجروں کی جھونپڑیوں کی لمبی لمبی قطاریں نظر آتی ہیں، خواجہ معین الدین نے اداسی سے کہا تھا۔ لیکن انسان ایک ایسی روح لیے ہوئے ہے جو اسے ہمیشہ متحرک رکھتی ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ جھونپڑیوں میں دیکھے جانے والے خواب محلوں میں دیکھے جانے والے خوابوں سے زیادہ حسین ہوتے ہیں۔ صرف خواب دیکھنا ہی وہ واحد حق ہے جو ان غریب لوگوں کو حاصل ہے۔ اور زندگی ایک خواب، ایک تمنا کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اگر دل دھڑکتا رہتا ہے اور اس میں آرزو زندہ ہے تو پھر محل یا جھونپڑی کوئی معنی نہیں رکھتے۔ اور پھر ہم مہاجروں نے یہ جھونپڑیاں رضاکارانہ طور پر، ایک نئے اور آزاد وطن کی جستجو میں، قبول کی ہیں۔ چیزوں کو اس روشنی میں دیکھنے کے بعد مایوسی کی چنداں گنجائش نہیں رہتی۔ یہی خوش امیدی مجھے ڈرامے لکھنے پر اکساتی ہے۔ یہ اجتماعی بربادی ہی میرا ہتھیار ہے، جھونپڑیاں میرا اسٹیج، اور مہاجرین میرے کردار۔

لیکن کبھی کبھی خواجہ معین الدین واقعی مایوس ہو جاتے۔ حکام نے ان سے کہا کہ وہ ڈرامے کا مایوس کن انجام بدل دیں۔ ان سے کہا گیا کہ ان کا طنز بہت تلخ ہے۔ خواجہ نے امیدوں اور امنگوں سے بھرا آخری منظر تیار کیا، لیکن انھیں محسوس ہوا کہ یہ حالات کی سچی تصویر نہیں۔ آخری لمحات تک انھوں نے ڈرامے کا اختتام طے نہیں کیا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ آخری ایکٹ والے سارے صفحات ہی کھو بیٹھتے۔ درحقیقت میں نہیں سمجھتی کہ لال قلعے سے لالوکھیت کبھی واقعی شائع ہوا ہوگا۔* اس کے باوجود، کراچی کے لوگوں کے اُس وقت کے احساسات کی غالباً اس سے بہتر تصویر کسی اَور تحریر میں نہیں ملتی۔ ہاتھ کے لکھے ہوئے اسکرپٹ میں (جو خواجہ کے دیے ہوئے ایک عزیز تحفے کے طور پر میرے پاس محفوظ ہے) وہ

---

* خواجہ معین الدین کا کھیل لال قلعے سے لالوکھیت نومبر ۱۹۷۵ میں شعبۂ تالیف، ڈراما گلڈ، ۲۸۰ خواجہ معین الدین روڈ، شریف آباد، کراچی کے زیرِاہتمام پہلی بار شائع ہوا۔ اس کے علاوہ ان کا ایک اَور کھیل مرزا غالب بندر روڈ پر بھی کراچی سے شائع ہو چکا ہے۔ (ا۔ ک۔)

کھیل کو امید کی کرن پر ختم کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''آج کی جھونپڑیاں کل کے محلوں کی ابتدا ہوں گی۔''

خواجہ معین الدین نے سیاسی رنگ آمیزی سے پر ڈرامے لکھے۔ "پرانے محل" اور "زوال حیدر آباد"۔ کشمیر کے ایسے کے موضوع پر "نیا نشان"، جو وزیرِ اعظم لیاقت علی خان کی ایک تقریر سے متاثر ہو کر لکھا گیا جو انھوں نے اپنے قتل سے بہت پہلے ۱۹۴۸ میں کی تھی۔ اس ڈرامے پر ہندوستانی حکومت نے ۱۹۵۲ میں پابندی لگا دی تھی۔ کئی سال بعد خواجہ نے اسے نظرثانی اور تبدیلیاں کر کے "وادیِ کشمیر" کے نام سے دوبارہ لکھا۔ اسے پاکستان میں ۱۹٦۷ میں کھیلا گیا۔ اس [ڈراما نگار] کی روح تلخی اور دہشت سے لبریز ہے، لاہور کے اخبار "پاکستان ٹائمز" نے ۷ نومبر ۱۹٦۷ کی اشاعت میں تبصرہ کیا۔ ۱۹۵٦ میں ہمارے گروپ نے خواجہ معین الدین کے ایک اور کھیل "مرزا غالب بندر روڈ پر" کی پیش کش کی تیاری شروع کی۔ پُرجوش ہدایت کار ضیا محی الدین نے اداکاروں کا چناؤ بھی کر لیا تھا اور ملبوسات کی منصوبہ بندی بھی ہو چکی تھی، کہ کسی وجہ سے یہ پیش کش رک گئی؛ غالباً مالی مشکلات حائل ہو گئیں۔

"مرزا غالب بندر روڈ پر" ہندوستانی مسلمانوں کی زبان اردو کے افسوس ناک انجام کے موضوع پر ہے۔ مہاجروں کو جلد ہی معلوم ہو گیا تھا کہ ان کے نئے وطن میں اردو زبان عام طور پر سمجھی نہیں جاتی۔ ۱۹٦۳ میں، جب آخر کار یہ ڈراما پیش ہوا، ایک نقاد نے لکھا "سطح کے نیچے، مصنف نے گہرائی میں جا کر ہمارے لامحدود سماجی تضادات کی نشان دہی کی ہے اور خوش نما اور پُرجوش الفاظ اور بدنما افعال کے درمیان، اسلام کے آدرش کی زبانی حمایت اور عملی مخالفت کے درمیان، کی گہری خلیج کو واضح کیا ہے، اور ان لایعنی اور شرمناک سرگرمیوں پر نکتہ چینی کی ہے جو پاکستان میں سیاسی اور سماجی سرگرمیوں کے نام پر جاری ہیں۔" (روزنامہ "لیڈر"، کراچی، ۹ مئی ۱۹٦۳)

لاہور کے ایک دانش ور صفدر میر نے تو اسے ایک قسم کی دعا قرار دیا۔ "یہ مرزا غالب جیسے مرحومین کا نوحہ نہیں بلکہ پاکستان کے زندہ باشندوں کے لیے ایک دعا ہے۔ اس کی اہم ترین خصوصیت اس کے مکالموں کا تیکھا اور ملامت آمیز طنز ہے۔ شاعر غالب کی روح کراچی آ کر عام لوگوں کے درمیان رہتی ہے اور پھر عالمِ بالا میں واپس پہنچ کر میر تقی میر کو اپنی دریافتوں کا احوال سناتی ہے۔ کہانی کا یہ خفیف سا رشتہ پاکستان کے سماجی تانے بانے پر مصنف کے گہرے طنز کا موقع فراہم کرتا ہے۔ مکالموں میں موجود تصیبات اتنی جاذب اور مصنف کی نیت اس قدر پُرخلوص ہے کہ دیکھنے والے کو گتھے ہوئے پلاٹ کی عدم موجودگی کا احساس تک نہیں ہوتا جسے عموماً اسٹیج ڈراموں کا لازمہ خیال کیا جاتا ہے۔"
(روزنامہ "پاکستان ٹائمز"، لاہور، ۲٦ اکتوبر ۱۹٦٦)

خواجہ معین الدین ۱۹۲۴ میں حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے۔ وہ ۱۹۴۸ میں پاکستان آئے اور ایک اسکول ٹیچر کے طور پر روزی کمانے لگے۔ انھوں نے ۱۹٦۸ میں حج کیا اور ۱۹۷۲ میں وفات پائی۔ میں نے انھیں آخری مرتبہ ۱۹٦۱ میں دیکھا جب میں اپنے شوہر کے ساتھ دوستوں سے ملنے

پاکستان آئی تھی۔ اُنھیں سراہا تو ضرور جاتا تھا لیکن پاکستان کے ثقافتی اور دانش ورانہ حلقوں میں وہ مقام نہیں دیا جاتا تھا جس کے وہ میرے خیال سے جائز طور پر مستحق تھے۔ اگر ان کی تھوڑی بہت حوصلہ افزائی کی جاتی تو وہ اردو کے اہم ترین ڈراما نگار بن سکتے تھے۔ وہ ایسے ڈراموں کا مرکزی خیال ہمیشہ عام لوگوں کی مسرتوں اور غموں سے اخذ کرتے اور وہ نمک بن جاتے جس کی کسی بھی قوم کو ضرورت ہوتی ہے، یعنی ایک ایسا ادیب جو کسی جمہوریت کی رگوں میں دوڑنے والے خون کی حیثیت رکھتا ہے، جہاں طنز اور تنقید سے خوف نہ کھایا جائے بلکہ اس کا خیر مقدم کیا جائے، جہاں سیاست دانوں اور عام زندگی کے بے رحم نقاد کو عوام کے ضمیر کی طرح عزیز رکھا جائے، ایک ایسا شخص جو عوامی اور نجی زندگی کے تضاد کو کھول کر رکھ دے اور اس طرح امن اور ہم آہنگی کی دنیا تخلیق کرے۔ خواجہ معین الدین ایک ایسے ہی آدمی تھے۔

خواجہ جو چاہتے وہی لکھنے میں کتنے آزاد تھے، اور ہم ۱۹۵۰ کی دہائی میں ایسے ڈراموں کے انتخاب کے سلسلے میں کتنے آزاد تھے؟ ہم دیکھ چکے ہیں کہ خواجہ کو کس طرح سیاست دانوں کو خوش کرنے کے لیے لال قلعے سے لالو کھیت کا آخری منظر تبدیل کرنا پڑا تھا۔ اُس تکلیف دہ زمانے میں خواجہ نے موقعے کی نزاکت کو سمجھا اور سر خم کر دیا۔ ایک بار ایک متعصب سرکاری افسر نے ہماری ایک بہت دلکش کلاسیکی پیش کش کو اسلام کے نام پر روکنے کی کوشش کی، لیکن اُسے ایسے افسرانِ بالا کی تائید حاصل نہ ہو سکی۔ کراچی ہمارے کام اور اس کے معیار سے بخوبی واقف ہو چکا تھا۔ ہمارے کچھ بہت اونچے سرپرست موجود تھے، گو کہ ہم اُن کی مدد نہیں لیتے تھے۔ ان میں حسین شہید سہروردی نمایاں تھے اور ان کی بیٹی شائستہ، اور عطیہ بیگم، جو دونوں غیر منقسم ہندوستان کی پہلی مسلمان لڑکیوں میں سے تھیں جنھوں نے مردوں کی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ محمد علی بوگرا ایسے گھر والوں کو ہمارے کھیل دکھانے لاتے۔ بیگم ملک فیروز خان نون (جو بعد میں لیڈی نون کہلائیں) اور سید امجد علی بھی ہمارے بہت سے خیر خواہوں میں شامل تھے جن میں سے کسی کو میرے دل نے فراموش نہیں کیا ہے۔

یہ یقیناً سیلف سنسرشپ کا دور تھا۔ سرد جنگ کے عروج کے اُس زمانے میں ہم بریخت کا کوئی کھیل پیش نہیں کر سکتے تھے جس کا ڈراما کاکیشین چاک سرکل مجھے بے حد پسند تھا اور اسے بعد میں لاہور میں اسٹیج بھی کیا گیا۔ برطانوی استعماریت کے ایک باقی ماندہ انگریز سرکاری افسر نے ہمیں لورکا کا کھیل یرما پیش کرنے سے باز رکھا۔ ہمارا ارادہ انگریزی کے ساتھ ساتھ پاکستان کی تمام قومی زبانوں میں ڈرامے پیش کرنے کا تھا، لیکن ہم صرف انگریزی زبان کے نہیں بلکہ دنیا بھر میں لکھے گئے کھیل پیش کرنا چاہتے تھے اور ان کی پیش کش کے انداز کو بھی مختلف النوع رکھنا چاہتے تھے ـــــ سوفوکلیس کے اینٹیگنی کے اعلیٰ کلاسیکی طرز سے لے کر مولیئر کے فرانسیسی کلاسیکی مضحک (farcical) انداز تک، اسٹرنڈ برگ کے روم تھیئٹر سے لے کر تھورنٹن وائلڈر کے بغیر سازوسامان کے تھیئٹر، اور ڈرائنگ روم کے کھیلوں گیس لائٹ اور اے روم وِد اے ویو تک۔ اردو ڈرامے حاصل کرنا بے حد دشوار تھا،

لیکن پھر بھی ہم نے چند ایک اردو کھیل پیش کیے۔ میرے جانے کے بعد ضیا محی الدین نے شیکسپیئر کے کئی ڈرامے اسٹیج کیے۔ ان میں سے رومیو اینڈ جولیٹ سب سے یادگار پیش کش تھی۔

تھیئٹر بطور جمہوریت ہمارے تجرباتی کام کا ایک اور پہلو تھا۔ ہم کسی بڑھئی (یا درزی) کو صرف انتہائی ضرورت کے موقعوں پر ایسے مناظر کی جزئیات پر کام کرنے کے لیے بلواتے، ورنہ ڈرامے کی کاسٹ کو تمام پس پردہ کام خود کرنے ہوتے تھے۔ برقی آلات حاصل ہونے سے پہلے ہم پانی سے بھرے برتنوں میں الیکٹروڈ ڈال کر تقریباً ایسی رنگ گیاں داؤ پر لگا دیا کرتے۔ یہاں تک کہ ایک فوجی افسر کو اسٹیج پر جھاڑو لگانی پڑی۔ ہر اداکار کو بڑے کرداروں کے ساتھ ساتھ چھوٹے سے چھوٹا کردار بھی ادا کرنے کے لیے تیار رہنا پڑتا۔ اسٹیج پر نظم و ضبط اور وقت کی پابندی لازمی تھی۔ ان سب چیزوں نے ہمیں مشترکہ ذمے داری اور یکجائی کے احساس کے ساتھ ساتھ کام کرنے کی مسرت بھی عطا کی۔ ہماری تنظیم بھی جمہوری طرز کی تھی، ہم نے ایسا ایک دستور طے کیا تھا اور اپنے اجلاسوں میں پارلیمانی اصولوں پر عمل کرتے تھے۔ یہ جیسا کہ سیاست میں ہوتا ہے، تھیئٹر میں بھی دھڑے بندیاں اور سازشیں ہونے لگیں۔ کراچی تھیئٹر کئی بار تقسیم ہوا اور گروپ تھیئٹر سے لے کر کراچی آرٹ تھیئٹر سوسائٹی (Kats) تک اس نے کئی نام بدلے۔ سب سے دشوار کام مالی مسئلوں پر حاوی آنا تھا۔ مجھے یہ بات کہتے ہوئے فخر محسوس ہوتا ہے کہ ہم نے کبھی کسی حکومت سے مدد نہیں لی۔ ہم نے مکمل طور پر خود کفالت کے اصول پر کام کیا۔

ہمارے گروپ میں عورتوں اور مردوں، لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان پوری طرح مساوات قائم تھی۔ ہم میں سے اکثر لوگ جوانی یا نوجوانی کے دور سے گزر رہے تھے، تاہم ہر عمر کی نمائندگی موجود تھی ستر سالہ مسز دیوبجا سے لے کر سات سالہ طارق اور روشنی تک۔ مسلمان، عیسائی اور پارسی ساتھ ساتھ اداکاری کرتے تھے۔ پاکستانیوں کے ساتھ ساتھ یورپی اور آسٹریلوی، پنجابیوں اور بنگالیوں کے ساتھ ساتھ ساتھ لکھنوی اور دلی والے ساتھ ساتھ تھے — نمایاں فرق بس مادری زبانوں اور انگریزی بولنے کے لہجوں میں تھا۔ لڑکیوں کے ساتھ گھر کا کوئی فرد ہوتا، بھائی یا نانی دادی۔ پہلی پیش کش کے اختتام پر ہونے والی ہماری پارٹیاں آزادانہ اور خوشگوار ماحول میں ہوتیں جن میں مشہور بڑے لوگ بھی شریک ہوتے۔ وہ ہم سب کے لیے بے حد تخلیقی دور تھا۔ بےشمار چھوٹی بڑی سرگرمیاں ہوتیں مصوری کی نمائشیں، تھیئٹر کے تربیتی کورس، ہر قسم کے ثقافتی موضوعات پر لیکچر، بات چیت، بحث مباحثے اور ایک دوسرے کو جاننے کے خوش گوار موقعے۔

اگر مجھے زیادہ اچھی طرح اردو سیکھنے کا موقع ملتا، اور میں شاعری پڑھنے اور ترجمہ کرنے کی استعداد حاصل کر پاتی، تو پھر شاید میں زیادہ اچھے اردو ڈرامے ڈھونڈنے کی کوشش کرتی جنھیں حاصل کرنا نہایت دشوار تھا۔ جتنے عرصے میں پاکستان میں رہی، اردو کے عظیم ترین شاعر فیض احمد فیض جیل میں رہے۔ اُنھیں دنوں ہم گورنمنٹ کالج لاہور میں اینٹیگنی پیش کرنے گئے۔ (ناقابلِ یقین لگتا ہے کہ ہم کس طرح

سارے سازوسامان سمیت وہاں جا اُترے اور اُس تہذیبی مرکز میں ہمارا کیسا شاندار استقبال ہوا!) وہیں میں فیض کی بیوی اور بیٹیوں سے ملی اور اُن کی شاعری سے واقف ہوئی۔ کراچی میں کوئی اُن کے بارے میں بات نہیں کرتا تھا ___ کم از کم مجھ سے کسی نے اُن کا ذکر نہ کیا ___ اور پھر بہت برسوں بعد میں نے اُن کی شاعری کو پڑھا اور اُن کی عظمت کی معترف ہوئی۔ اس باصلاحیت، انسانیت نواز اور اردو زبان پر مکمل قدرت رکھنے والے شاعر کو، جو اپنی شاعری کو غریب آدمی کی تاریک اور مجروح زندگی میں روشنی دینے والی ایک مشعل سا دیکھنا چاہتا تھا، (خواجہ معین الدین کے کھیل میں زمین پر واپس آنے والے) عظیم عالم کے اس بنا کردہ کو پاکستانی معاشرے سے جدا کر دیا گیا تھا کیوں کہ اسے کمیونسٹ فرض کیا گیا تھا ___ یہ ایسا لفظ تھا جسے اُن دنوں سرگوشی میں بھی مشکل ہی سے ادا کیا جاتا تھا۔

کیا ان مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اس عالم کے فروغ میں ادیبوں اور دانش وروں کا کوئی کردار ہے؟ میرا خیال ہے ایسا ہی ہے۔ میرا خیال ہے کراچی میں ہمارا ایک دوسرے کی ثقافت کو لامحدود تجسس اور کھلے دل کے ساتھ کھوجنے کا تجربہ بھی اسی جانب ایک قدم تھا ___ خواہ یہ قدم کتنا ہی چھوٹا اور کم اہم کیوں نہ ہو۔ حمید دائیں اور محسن شیرازی جیسے پُرجوش نوجوانوں نے ایک تحریک پیدا کر دی تھی۔ الیکس ایلمور جیسا ڈائرکٹر اس عمل کے لیے مہمیز ثابت ہوا۔ اسے زیادہ وسیع بنیادوں پر جاری رکھا جا سکتا ہے ___ بشرطیکہ ادیب اور فنکار کی اظہار کی آزادی اور خیال کی جستجو کو اقوامِ متحدہ کے چارٹر کے آرٹیکل ۱۹ کے مطابق باقی رہنے دیا جائے، اور اگر ضمیر، مذہب اور عقیدے کی آزادی کا وہ حق بھی دیا جائے جیسا کہ آرٹیکل ۱۸ میں کہا گیا ہے۔ یہی وہ اصول ہیں جن کی بنیاد پر ہمارا وحدانی مذہب مضبوطی سے قائم ہے ___ لااکراہ فی الدین۔

یہ اصول مسائل کا خاتمہ نہیں، مسائل کے حل کا محض آغاز ہیں۔ یہ لفظ ہر کسی کی زبان سے ایک ہی مفہوم میں ادا نہیں کیے جاتے۔ اس کا راستہ بے حد طویل اور پُرپیچ ہے۔ اس پر ہر قدم بہت سوچ سمجھ کر رکھنا پڑتا ہے۔ کراچی اب وہ شہر نہیں رہا جو ۱۹۵۰ کی دہائی میں تھا۔ شاید خواجہ معین الدین کے کھیل کا آخری منظر دوبارہ لکھا جانا چاہیے۔ کسی شہر میں، کسی ملک میں اور پوری دنیا میں اس کا دارومدار افراد پر ہوتا ہے جنھیں دوسرے فرد کو جاننے اور سمجھنے کے لیے ایسا احساس، فہم اور سچائی کی محبت کو پوری طرح بروئے کار لانا چاہیے۔ اور کسی ادیب، فنکار یا دانش ور کے ہر لفظ کو تمام انسانوں ___ مردوں اور عورتوں ___ کے وقار کا پاس رکھنا چاہیے، خواہ یہ انسان کہیں بھی رہتے ہوں۔ اور کسی تحریر کی پاکیزگی اور آزادی کو جبر کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ جیسا کہ فیض نے ___ جو جانتے تھے کہ خاموش کر دیے جانے کا کیا مطلب ہوتا ہے ___ کہا ہے

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول زباں اب تک تیری ہے

تیرا ستواں جسم ہے تیرا
بول کہ جاں اب تک تیری ہے
دیکھ کہ آہن گر کی دکاں میں
تند ہیں شعلے، سُرخ ہے آہن
کھُلنے لگے قفلوں کے دہانے
پھیلا ہر اِک زنجیر کا دامن
بول یہ تَھوڑا وقت بہت ہے
جسم و زباں کی موت سے پہلے
بول کہ سچ زندہ ہے اب تک
بول، جو کچھ کہنا ہے کہہ لے

انیتا غلام علی

انگریزی سے ترجمہ اجمل کمال

یادوں کے دریچے سے

میں اپنے بچپن کے دنوں کو بہت خوش ہو کر یاد کرتی ہوں۔ مجھے کسی طرح کا پچھتاوا نہیں ہے۔
میرے دادا بہت محبت کرنے والے انسان تھے۔ وہ ایک پُراثر شخصیت کے مالک تھے بڑی بڑی مونچھیں، شفقت بھرا سلوک، اور جب کبھی غصے میں آتے (جو صرف کبھی کبھار نہیں ہوتا تھا) تو اس کا چھپانا ناممکن ہوتا۔ ہم اس بڑے سے مکان میں رہتے تھے جو وِنڈسر پلیس کہلاتا تھا۔ ۱۹۴۰ کے عشرے میں جب میرے دادا حکومت سندھ کے شعبۂ تعلیم سے ریٹائر ہوئے تو انھیں وار رسک انشورنس آفیسر کا عہدہ دے کر کراچی میں تعینات کیا گیا۔ میرے چاچا چیف فوڈ راشننگ آفیسر تھے۔ ان دونوں نے گارڈن ایسٹ میں واقع سیسائٹس ٹاؤن میں وِنڈسر پلیس کرائے پر لینے کا فیصلہ کیا۔ اس سے دو سو گز دور کے ایک مکان میں (جو اب تک قائم ہے) ان کا دفتر اور ایک بہت وسیع باغ تھا۔ ہر ویک اینڈ پر پورا خاندان پکنک منانے اُس مکان میں جایا کرتا۔ سب دوست اور رشتے دار جمع ہوتے۔ ان پکنکوں کی سب سے عمدہ چیز آئس کریم ہوتی جسے بڑی بڑی لکڑی کی پیپوں میں تیار کیا جاتا۔ پیپوں کا ہینڈل گھنٹوں گھمانا پڑتا تھا۔ مگر آئس کریم کھا کر پاپا (میرے دادا) کے پیٹ میں سخت درد ہو جاتا تھا۔ چناں چہ ہر اتوار کی رات کو کھانے کے چند گھنٹے بعد وہ درد سے کراہنے لگتے؛ پھر ان کی کوئی بہو انھیں پیپرمنٹ کا محلول پینے کو دیتی اور یوں انھیں قرار آتا۔ مجھے یاد ہے ایک بار جب وہ گہری نیند میں تھے، میں نے اُن کی ایک مونچھ پر چیونگ گم چپکا دی تھی جس کے نتیجے میں انھیں اپنی مونچھ کا خاصا بڑا حصہ کاٹ کر الگ کرنا پڑا تھا۔ لیکن انھوں نے مجھے کچھ نہ کہا، کیوں کہ میں ان کی چہیتی پوتی تھی اور ۱۹۷۴ میں ان کے انتقال کے وقت تک رہی۔ مرنے سے پندرہ دن پہلے تک وہ چار پانچ میل آسانی سے پیدل چل لیا کرتے تھے۔
وِنڈسر پلیس، جہاں ہم رہتے تھے، سینٹ لارنس کانوینٹ کے قریب تھا جس میں ہم سب دس بچوں نے پڑھا ــــ یعنی پانچ ہم بہن بھائی اور پانچ میرے چاچا کے بیٹے بیٹیاں۔ چاچا کی سپانوی بیوی اسی مکان کے آدھے حصے میں رہتی تھیں۔ وہ نہایت نیک مزاج عورت تھیں اور اپنی پالی ہوئی درجنوں بطخوں، مرغیوں، ٹرکیوں اور گایوں کو کھانا دیتے ہوئے ان سے مسلسل باتیں کیا کرتی تھیں۔ وہ دونوں

گایوں کو خود دوہتیں اور اگر وہ اپنی دُمیں ہلاتیں تو انہیں سیالوی زدہ اردو میں خوب گالیاں دیتیں۔ بکری پر خفا ہوتیں تو اسے تھپڑ مارتیں اور خوش ہوتیں تو سینے سے لگا لیتیں۔ اپنے خرگوشوں کے منہ پر رومال باندھے رکھتیں، انہیں زور ہلاتیں اور ہلاتے ہوئے اسپیشل فلمی گانے گایا کرتیں جو اُن کے سوا کسی کی سمجھ میں نہ آتے۔ جب ہم بچوں کی کسی بات پر غصہ آتا تو کوٹ ٹانگنے کے ہینگر لے کر پورے مکان میں ہمارے پیچھے دوڑتیں، اور ہم خوب ہنستے۔

میری اماں خاموش اور گمبھیر طبیعت کی تھیں۔ وہ اپنا وقت لکھنے اور پڑھنے میں گزارتیں، اور اپنا حقہ اِدھر اُدھر چھپایا کرتیں جو میرے دادا انہیں پلانے پر مصر رہتے تھے۔ ان کے یوپی کی وضع کے غرارے (جو وہ ۱۹۴۰ کے آس پاس پہنا کرتی تھیں) اور کلائیوں کی درجنوں چوڑیاں (جو وہ آخر تک پہنا کیں) باقاعدگی سے تبدیل کی جاتیں، خصوصاً بچوں کو ہوم ورک کرانے کے بعد۔ ان کے لباس کی عجیب و غریب وضع پر، جو اُن کے اکہرے بدن اور دھیمی چال کی برکت کو بڑھا دیتا تھا، سب لوگوں کو حیرت ہوتی سوائے بوڑھی خالاؤں خجستہ، شاہ رُخ، ماہ رُخ اور دلشاد کے جو خود سیدھی شلوار پہنا کرتیں، اس کے نیچے چوڑی دار پاجامہ اور اوپر کلی دار کُرتا۔

میرے دادا خان بہادر نورالدین غلام علی (اُنہیں پیار میں بابا کہا جاتا تھا) محکمۂ تعلیمات میں رہے تھے اور اسی ملازمت کے سلسلے میں برصغیر کے کونے کونے میں تعینات ہو چکے تھے۔ ان کی پوسٹنگ سی پی میں رہی، وہ راجکوٹ کے راج کمار کالج کے پرنسپل رہے، اور پھر حیدر آباد کے ٹریننگ کالج کے پرنسپل رہے۔ جہاں جب وہ جہاں بھی جاتے ان کا کوئی نہ کوئی سابق شاگرد انہیں پہچان لیتا۔ وہ اپنے شاگردوں سے دوستوں کی طرح پیش آتے مگر ڈسپلن کا بھی خاص خیال رکھتے۔ میں نے تدریس کے کام میں لطف لینا اُنہیں سے سیکھا۔ میں آٹھ سال کی تھی تو وہ مجھے اپنے ساتھ سندھ مدرسہ لے جایا کرتے، جس کے بورڈ کے وہ یا تو ممبر ہوتے یا سیکرٹری۔ ان کے ساتھی ہاشم گزدر، خان بہادر کنٹریکٹر، غلام حسین ہدایت اللہ، حسن علی عبدالرحمن، پیر الٰہی بخش، ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتا، ڈاکٹر پوپٹ لال ــــ جو تعلیم یا ملازمت کے زمانے میں ان کے دوست بنے تھے ــــ ہمیشہ ہمارے گھر میں آیا جایا کرتے۔ ان میں سنجیدہ بحثیں بھی ہوتیں اور اسکول کے لڑکوں والے مذاق بھی۔ ونڈسر پلیس کے ارد گرد کا ماحول ۱۹۴۰ کی دہائی اور ۱۹۵۰ کی دہائی کے شروع کے برسوں کے کراچی کے اصل کردار اور خدوخال کا عکاس تھا۔ ہمارے مکان کے سامنے ایک بہت بڑا سا میدان تھا (یا شاید بچپن میں وہ اتنا بڑا سا دکھائی دیتا تھا) اور اس قطار میں دو اور مکان تھے۔ میدان کے اُس پار گیتا خاندان رہتا تھا، جو مال دار کاروباری لوگ تھے، اور ہمارے مکان کے ایک طرف کیتھولک سر چارلس لوبو اور دوسری طرف مسلمان، اور وہ بھی خلیج فارس کا ایک عرب خاندان۔ وہاں سے صرف دو سو گز کے فاصلے پر دو یہودی خاندان رہتے تھے اور اسکول کے آس پاس کیتھولک اور پارسی آباد تھے۔

گیتا خاندان سے تقریباً ملا ہوا مکان (جس میں اب سید محمد تقی رہتے ہیں) رواوی خاندان کا تھا جو

ماسی عرب ہے اور کراچی، بمبئی اور مسقط کے درمیاں تجارت کرتے تھے۔ ۱۹۹۵ کے وسط میں ان کا بیٹا ہز ایکسیلنسی عمر عبدالمنعم رواوی، ریاست عماں اور مسقط کا سپیکر وزیر، ایسے سرکاری پروگرام میں ترمیم کر کے صرف اس لیے کراچی رکا کہ میری اماں سے ملاقات کر سکے۔ ان کے اور ہمارے خاندان کے درمیاں ایک عجیب و غریب بندھن ہے، اور ہم سب نے اس بندھن کی عزت کی ہے اور اسے قائم رکھا ہے۔ اس رشتے کی بدولت میری اطالوی بھانجیاں (میری بہن کا شوہر ایک اطالوی ہے) مسقط اپنے تیسری نسل کے کزن سے ملنے گئیں۔ یہ بندھن اس طرح بندھا تھا کہ جب ہم تین بہنوں کے بعد روحیل پیدا ہوا تو ابھی وہ چند دن کا تھا کہ عمر رواوی کی ماں ہمارے گھر آئیں، سیدھی میری اماں کے کمرے میں گئیں، ان کی گود سے نومولود بچے کو اٹھایا اور سوا روپیہ ہاتھ پر رکھ کر اماں کی طرف بڑھا دیا۔ بولیں میں نے تمہارے بیٹے کو تم سے خرید لیا۔ اب یہ میرا ہو گیا۔ اُس دن سے میرا بھائی رواوی خاندان کے بیٹوں کے ساتھ ان کے تمام گھریلو معاملات میں شامل ہوتا اور اس کا اُسی طرح لاڈ کیا جاتا جیسے اُن کے اپنے بیٹوں کا۔

رواوی خاندان کے برابر کا مکاں نَوّاوالا خاندان کا تھا جو بہت معروف اور شائستہ بوہری تاجر تھے۔ اور، گویا ہمسائگی کو مکمل کرنے کے لیے، بالکل پیچھے جوجہ گارڈن جماعت خانہ تھا (جو اَب بھی ہے۔) میرے والدین کے مراٹھی دوست اور یہودی (جو مراٹھی اور انگریزی بولتے تھے) رام سوامی میں اور ڈی جے کالج کے ارد گرد کے علاقے میں رہتے تھے۔ وہ بڑے خوش باش اور شور کرنے والے لوگ تھے۔ سب لوگ چھٹی کے دن جمع ہوتے اور خصوصاً کسی بھی مذہبی تہوار پر ایک دوسرے کو مبارک باد دینا کبھی نہ بھولتے۔ اس کی وجہ صرف ان لوگوں کی ذاتی فراخ دلی نہ تھی اور نہ محض رسم کی پابندی، بلکہ وہ اپنے دوستوں کی خوشیوں میں سچ مچ شریک ہوتے تھے۔

جب میں دو برس کی ہوئی تو اماں کو خناق (ڈِپتھیریا) کا مرض لاحق ہو گیا اور مجھے چھُوت لگنے سے بچانے کے لیے اُن سے کہیں دور رکھنا ضروری ہو گیا۔ اُس وقت جس خاندان نے ہمارے گھرانے کی سب سے بڑی اور اُس وقت تک اکلوتی پوتی کو اپنے پاس رکھا وہ میرے والدین کے گجراتی ہندو دوست ملک کا گھرانہ تھا۔ یہ لوگ اس قدر کٹر تھے کہ پیاز لہسن تک کو نہ چھوتے تھے۔ لیکن مجھے اُنھوں نے تین مہینے تک اپنے پاس رکھا۔ ایسی آفت کی پرکالہ بچی کو رکھنے پر میں ان کی قسمت پر رشک نہیں کر سکتی

جب کبھی کوئی مجھ سے کہتا ہے کہ پاکستانی بیوں کے لیے اتنی ساری زبانیں سیکھنا بہت دشوار ہے تو میں بالکل خاموش رہ جاتی ہوں۔ میرے ابا (جسٹس فیروز نانا) اور چاچا (منوچہر نانا، امیگریشن اور پاسپورٹ آفیسر) گجراتی، مراٹھی، سندھی، اردو اور انگریزی روانی کے ساتھ بولتے تھے۔ علی گڑھ میں تعلیم پا کر اماں میں اپنے سے مختلف لوگوں کے ساتھ رہنے کا جذبہ اور بھی قوی ہو گیا تھا۔ کوئی کہاں کا ہے، اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا تھا۔

مجھے یاد ہے ۱۹۸۰ کی دہائی میں جب میں اپنے چاچا کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو میں نے

وہاں انھیں اسرائیل سے آئے ہوئے مہماں کی تواضع کرتے دیکھا۔ کراچی کا یہ یہودی باشندہ اُس برس کا نتیجہ تھا جس نے، جب اماں کالج میں پڑھتے تھے، سول اسپتال میں ان کی دیکھ بھال کی تھی۔ دوسری طرف لکشمی بائی بیٹھی تھیں جو کے ایم سی کی عمارت کے سامنے سوامی نارائن مندر کی جھا نواری میں رہتی تھیں۔ لکشمی بائی نے کہا ہم سو بھائی مارو بھائی چھے۔ لیکن جب انھیں کھانے پینے کو کہا انھوں نے شرما کر انکار کر دیا۔ بس کوکا کولا پی لوں گی۔ میرے چاچا نے انھیں اور ان کے شوہر کو دیکھ کر زور سے قہقہہ لگایا جیسے یہ بڑی مزاحیہ بات تھی۔ میرے والد سیوھن میں لعل شہباز قلندر کی درگاہ لے بھی رہتی تھے اور کراچی میں یہودیوں کے سائنا گوگ اور سندو ٹمپل کمیٹی کے بھی۔ بچپن میں ہم بہن بھائیوں نے ایسے دوستوں کے ساتھ مل کر اسکول کا وقت ختم ہونے کے بعد سینٹ لارنس چرچ نے سلور پریاش کی ہے۔ ہم میں سے کسی نے نہ کوئی دوسرا مذہب اختیار کیا اور نہ بے دین ہوئے۔

اماں غرارے اور سفید کوٹ میں ملبوس بیس برس تک باقاعدگی سے میری ایڈیلیڈ کے جذامیوں کے کلینک میں جایا کیں جو صدر میں واقع تھا۔ وہ وہاں کی واحد پاکستانی والنٹیئر تھیں اور ڈاکٹر رتھ فاؤ بھائی اور اُن کیتھولک ننوں کی مدد کرتیں جو اس کلینک کو چلاتی تھیں۔ اماں کو وہاں کام کرنے سے خوشی ملتی تھی جو مریضوں کو دوا پلانے، نسخوں کو نقل کرنے، مریضوں سے باتیں کرنے اور اوپر کی منزل پر لیٹے ہوئے چلنے پھرنے سے معذور جذامیوں کو تسلی دینے پر مشتمل تھا۔ انھوں نے کبھی ماں کر نہ دیا کہ یہ مشکل کام تھا۔ صرف ایک بار مجھے یاد ہے انھوں نے بتایا تھا کہ وہ ایک جذامی کی ناک سے نکلتے کیڑوں کو دیکھ کر بے ہوش ہوتے ہوتے بچی تھیں۔ لیکن وہ اس کا ہاتھ تھامے کھڑی رہیں یہاں تک کہ ان کی کیفیت زائل ہو گئی۔ مریض اور ننیں اُن کی آمد کے دنوں کا بے تابی سے انتظار کیا کرتے۔ وہ ننوں سے ایسی رواں سپانوی میں بات چیت کرتیں، اُن کے ساتھ مل کر حمدیں اور گیت گاتیں اور وہاں آنے والے خاندانوں کے آرام کا خیال رکھتیں۔

مجھے اُن کے مریضوں میں سے یونیورسٹی کا ایک طالب علم یاد ہے جسے وہ انگریزی پڑھاتی تھیں۔ انھوں نے اس کا نام اور شناخت ہم سے چھپائے رکھی۔ وہ صحت یاب ہو چکا تھا، پھر بھی اماں کو ڈر تھا کہ کہیں اس کو امتیازی سلوک کا نشانہ نہ بننا پڑے۔ وہ رنگوتی سے کلینک ہی میں واقف ہوئی تھیں اور اُس نے اپنی زندگی کی پوری کہانی اُنھیں سنائی تھی۔ بعد میں جب انھوں نے اپنے جوڑوں کے شدید درد کے باعث وہاں جانا چھوڑ دیا تو رنگوتی اُن سے ملنے باقاعدگی سے ہمارے گھر آتا رہا۔ آخری بار وہ اماں کے انتقال سے کچھ پہلے نومبر ۱۹۹۵ میں آیا تھا جب اسے ان کی حالت کے خراب ہونے کی اطلاع ملی۔ خواہ کوئی بھی اماں کے پاس بیٹھا ہو، رنگوتی کو فوراً بیٹھنے کے لیے کرسی دی جاتی، چائے پیش کی جاتی اور اماں اُسے رنگ برنگے لائٹر دیتیں جو وہ اُس کے لیے جمع کیا کرتی تھیں۔ رنگوتی کی جھڑی ہوئی ناک اور آدھی انگلیاں دیکھ کر ہمارے دوسرے مہماں دہشت زدہ ہو جاتے، مگر یہ اماں کا طریقہ تھا جس کے ذریعے وہ ملنے والوں کو اور ہمیں عملی طور پر بتاتیں کہ جذام قابلِ علاج مرض ہے۔

میرے ابا خاموشی سے اماں کی حوصلہ افزائی کرتے، ان کی دل چسپیاں جاری رکھنے میں مدد دیتے اور ان کی ذہانت کو تسلیم کرتے تھے۔ مگر وہ بنیادی طور پر شرمیلی طبیعت کے تھے اور ارد گرد پھیلی ہوئی بدعنوانی، دھوکا بازی، بے اعتمادی اور ناانصافی پر جلدی اُداس ہو جایا کرتے۔ اُن کو اماں کی بلند ہمتی اور داخلی مضبوطی کا بڑا سہارا تھا۔ وہ ان کی اور سب گھر والوں کی سمت بدھاتیں کہ وہ وہی کچھ کریں جسے دل سے صحیح سمجھتے ہوں۔ ابا گھر میں سب لیے دیے رہتے اور تمام فیصلے اماں پر چھوڑ دیا کرتے۔ ان کے روزمرہ معمولات کی وجہ سے، جن میں عدالت، ٹینس اور پارٹیاں شامل تھیں، ہم بچے انھیں چھٹی کے سوا گھر پر کم ہی دیکھتے۔ اماں پارٹیوں میں شاذ ہی جاتیں اور بہت سے لوگوں کا کہنا تھا، جیسا کہ وہ خود مسکرا کر بتاتیں، کہ جج صاحب کی بیگم یا تو کسی سنگین ذہنی مرض میں مبتلا ہیں یا گاؤں میں ان کی سوکن موجود ہے، دو بیویاں رکھنا اس علاقے میں مردوں کا حق سمجھا جاتا تھا۔

ابا نے بھی اپنے مخصوص انداز میں ہمیں اعلیٰ اقدار سکھائیں۔ مجھے یاد ہے ایک بار، جب وہ ہائی کورٹ میں تھے، انھوں نے پیسے بچا کر ایک نئی کار خریدی۔ چند ہی روز بعد اس میں خرابی پیدا ہو گئی۔ اسے معائنے کے لیے کمپنی کو واپس بھیجا گیا اور پتا چلا کہ کار میں مینوفیکچرنگ کے وقت کی خرابی ہے۔ کار واپس آ کھڑی ہوئی اور ابھی ابا سوچ ہی رہے تھے کہ کیا کیا جائے کہ اچانک کمپنی کی طرف سے ایک نہایت معذرت خواہانہ خط موصول ہوا جس میں اس کار کے بدلے ایک اور نئی کار کی پیش کش کی گئی تھی۔ ابا بے حد محتاط طبیعت کے تھے ــــ میرا خیال ہے ایسی عدالتی ملازمت کے باعث یہ احتیاط ان کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی ــــ انھوں نے خاموشی سے تحقیقات شروع کی۔ انھیں معلوم ہوا کہ کمپنی کے رویے میں یہ اچانک تبدیلی اس وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ اس کا کوئی مقدمہ ہائی کورٹ میں زیرِ سماعت ہے۔ ابا نے ایک لمحے کو بھی ہچکچاہٹ محسوس نہ کی اور جواب میں شکریے کا خط لکھ کر نئی کار کی پیش کش قبول کرنے سے معذرت کر لی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ انصاف اور قانونی فیصلوں کے معاملے میں کوئی ترغیب ان پر اثر انداز ہو۔

ابا نے مسٹر ڈنگومل کی مشہور قانونی فرم میں جونیئر وکیل کے طور پر اپنی پریکٹس کا آغاز کیا تھا۔ یہ فرم ذوالفقار علی بھٹو کے زمانے تک بھٹو خاندان کی قانونی مشیر رہی۔ بعد میں وہ جوڈیشل سروس میں شامل ہوئے اور سندھ لیجسلیٹو اسمبلی کے پہلے سیکرٹری رہے۔ اسمبلی کی عمارت کا افتتاح انھیں کے دور میں ہوا تھا۔ ابا ایک عمدہ کھلاڑی تھے اور علی گڑھ یونیورسٹی میں ٹینٹ پیگنگ (tent-pegging) اور ٹینس کے چیمپیئن رہے تھے۔ انھوں نے قانون کی ڈگری علی گڑھ یونیورسٹی ہی سے حاصل کی۔ وہ ۱۹۳۳ میں یونیورسٹی کی اسٹوڈنٹس یونین کے جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے اور آلِ احمد سرور نائب صدر۔ جب ۱۹۶۲ میں میرا علی گڑھ جانا ہوا تو انھوں نے مجھ سے فرمائش کی کہ یونیورسٹی کے رول آف آنر پر ان کا نام ضرور دیکھوں کہ اب تک موجود ہے یا نہیں۔ ان کا نام موجود تھا۔ انھیں اپنے علی گڑھ سے ہونے پر فخر تھا اور اس بات کا ذرا بھی ملال نہ تھا کہ انھیں بیرونِ ملک تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہ ملا۔ اماں

کے برعکس انھیں اپنے لباس اور جوتوں کی عمدگی کا بڑا خیال رہتا تھا۔ یہ دونوں میرے دادا میں بھی تھا اور میرے سب سے چھوٹے بھائی راشد میں بھی ہے۔ ابا کا خیال تھا کہ لباس کے بارے میں باقاعدگی اختیار کرنے سے آدمی ڈسپلن سیکھتا ہے۔ کئی وکیل جب ان کے سامنے پیش ہوتے تو وہ انھیں نرمی سے سمجھاتے کہ کورٹ کی رسمی باریک دھاریوں والی سیاہ پتلون کے ساتھ براؤن جوتے پہننا نامناسب ہے۔ پتا نہیں اگر آج وہ کورٹ میں وکیلوں کو سینڈل اور چپل پہن کر عدالت کے سامنے آتا دیکھتے تو ان کا کیا حال ہوتا۔

ابا اور اماں دونوں اپنے اپنے انداز سے اُن سرگرمیوں میں مصروف رہتے جن کی کسی باضمیر انسان سے توقع کی جانی چاہیے، لیکن اماں کے برعکس ابا کا رجحان مذہبی نہ تھا۔ وہ مذہبی معاملات میں وعظ اور نصیحت بالکل نہیں کرتے تھے، لیکن ان کے کوٹ کی بائیں طرف کی جیب میں قرآن شریف کا چھوٹا سا نسخہ چاندی کے فریم میں ہمیشہ رکھا ہوتا۔ ان کا کہنا تھا کہ اس کی موجودگی میں ان کا دل قوی رہتا ہے۔ جب ستمبر ۱۹۷۶ میں وہ یونیسکو کے اجلاس میں شرکت کے لیے پیرس روانہ ہوئے تو یہ نسخہ کہیں غائب ہو گیا۔ پورا گھر کھنگال ڈالا گیا لیکن نسخہ نہ ملا۔ دو دن بعد، ۲۷ ستمبر ۱۹۷۶ کو، ہم نے کراچی ایرپورٹ پر ان کی میت وصول کی۔ وہ پیرس میں دل کے شدید دورے کے باعث چل بسے تھے۔

میں اور میرا بھائی کیپٹن (پائلٹ) صفدر اپنی طالب علمی کے دنوں میں یونین کی سرگرمیوں میں زور شور سے حصہ لینے لگے تھے۔ ایوب خاں کا دور تھا اور ہم اپنی سرگرمیوں کے باعث حکومت اور پولیس کی نظروں میں آ گئے۔ ایک موقعے پر حکومت کے ایک اعلیٰ عہدے دار نے، جو ہمارا خاندانی دوست تھا، دبے لفظوں میں ابا سے ہماری سرگرمیوں کی شکایت کی اور کہا کہ اپنے بیٹوں کو سمجھائیں ورنہ وہ گرفتار ہو جائیں گے۔ ابا نے جواب دیا، دونوں بالغ ہیں اور انھوں نے اپنا راستا سوچ سمجھ کر منتخب کیا ہے۔ اگر وہ کسی کاز سے وابستہ ہیں تو انھیں اس کی مشکلات سے بھی گزرنا ہو گا۔ آپ اپنا فرض پورا کیجیے۔ میں بھی اپنا فرض پورا کرتے ہوئے ایک لمحے کے لیے نہیں سوچوں گا کہ اُن سے میرا کیا رشتہ ہے۔ اس طرح ہمیں احساس ہوا کہ ہر فرد اپنے افعال کا خود ذمےدار ہوتا ہے۔

آخر میں ابا نے سندھ پبلک سروس کمیشن کے چیئرمین کے عہدے سے مستعفی ہو کر موہنجودڑو کے تحفظ کے کمیٹی کی سربراہی سنبھالی۔ اس عہدے پر ان کی علامتی تنخواہ ایک روپیہ مہینا تھی۔ انھیں آرکیالوجی سے بےحد شغف تھا۔ جس سرکاری گاڑی میں وہ کمیٹی کے دفتر جاتے وہ ان کے واپس آنے پر تالے میں کھڑی کر دی جاتی جس کی چابی وہ اپنے بریف کیس میں رکھتے۔ گھر کے کسی فرد کو یہ گاڑی استعمال کرنے کی اجازت نہ تھی اور نہ وہ خود بھی ڈنر پارٹیوں میں جانے کے لیے اسے استعمال کرتے تھے۔ ابا کے سوئم کے دن اماں نے کمیشن کے سیکرٹری کو بلا کر یہ گاڑی اس کے حوالے کر دی۔

کبیر مجتبیٰ عزت آرا بیگم لگ بھگ تیس برس کی رہی ہوں گی جب وہ اپنے شوہر — انڈین میڈیکل سروس کے میجر ڈاکٹر ایم بی حسن — اور اپنے خاندان کے ساتھ لکھنؤ سے ہجرت کر کے کراچی

آئیں۔ رفتہ رفتہ ڈاکٹر صاحب نے نرسں روڈ کے ڈربہ نما فلیٹ میں رہائش اور پریکٹس شروع کی اور ان کا خاندان ابتدائی مشکلات سے نکل آیا۔ وہ پرانی وضع کے جنرل پریکٹشنر تھے جو مریضوں کا حال بڑی توجہ سے سنتے چنانچہ ان میں بہت مقبول تھے۔ تقسیم کی ہولناکیوں اور خاندانوں کے ایک دوسرے سے بچھڑ جانے کے بعد لوگوں کو ایسی ہستی کی ضرورت تھی جو صبر سے ان کی یادوں اور موجودہ مشکلوں کا حال سن سکے۔ ڈاکٹر حسن ایک حساس آدمی تھے اور موسیقی کا شوق رکھتے تھے۔ وہ بادوں لوگوں کی مختصر سی محفل میں گاتے اور ستار بجاتے تھے۔ لیکن ان کے گھر والوں اور دوستوں کو ان کی صحبت سے زیادہ دن لطف اندوز ہونے کا موقع نہ ملا۔ وہ جوانی اور خوش باشی کے دنوں ہی میں دل کے دورے سے وفات پا گئے۔ ان کی بیگم، جنھیں ہم نے ہمیشہ کلف دار غرارے اور سفید کُرتے میں ملبوس دیکھا تھا، اب سفید ساری پہننے لگیں اور ناظم آباد میں اپنے ادھ بنے مکان کے ایک کمرے میں منتقل ہو گئیں۔ ان کی موجودگی — اور اردو کے عظیم کلاسیکی شاعروں کے اشعار کی ادائیگی — ایسی متاثر کن تھی کہ آدمی کو خیال تک نہ رہتا کہ ان کے مکان کی دیواروں پر پلاسٹر نہیں ہے۔ میں گھنٹوں ان کے پاس بیٹھی ان کی باتیں سنا کرتی اور اردو زبان کی باریکیاں سیکھنے کی کوشش کرتی۔ میں ان کے گھر میں گزارے ہوئے ایک ایک لمحے سے لطف اندوز ہوتی تھی۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ میری اردو کی استاد وہ تھیں یا اُن کی بیٹیاں جو میری زبان سے تذکیر و تانیث کی غلطی سرزد ہو جانے پر کھلکھلا کر ہنس پڑتیں اور مجھے جاہل کا خطاب دیتیں۔ ان کے علاوہ اردو زبان میں نے کلاسیکی موسیقی سے اپنے شغف کے ذریعے سے سیکھی۔ مجھے اختری بائی فیض آبادی، کملا جھریا، ہیرا بائی بڑودکر، کیسر بائی کیرکر اور استاد بڑے غلام علی خاں خاص طور پر پسند تھے۔ میں ان کے ۷۸ اور ایل پی ریکارڈ دیوانگی کے ساتھ جمع کیا کرتی، رات رات بھر انھیں بجا بجا کر ایک ایک لفظ سیکھتی اور اگلے روز بی صاحبہ (کنیز مجتبیٰ) کے گھر جا کر ہر لفظ کے متعدد معنوں کے بارے میں دریافت کیا کرتی۔ وہ ایسا بھی کرتیں کہ میرے ساتھ ریکارڈ، خاص کر کملا جھریا کی گائی ہوئی نعتیں، سنا کرتیں۔ پھر اپنی آنکھوں کی نمی پونچھتے ہوئے کہتیں، "اے بی بی، یہ سچ مچ ہندو تھیں؟ کمبخت آواز بھی کیا چیز ہے۔" یوں مجھے پتا چلا کہ کس موقعے پر کمبخت کا لفظ استعمال کرنا موزوں ہوتا ہے۔ جب کبھی وہ غسل یا وضو کرتیں تو مجھے ان کے کپڑوں پر عطر لگانے کا اعزاز میسر آتا — گرمیوں میں خوشبو اور خس، سردیوں میں شمامۃ العنبر اور حنا۔ ان کی بدولت لکھنؤ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ کراچی کی زندگی میں گھُل گیا تھا اور میں ہر لمحے کی پُراشتیاق شاہد تھی۔ بی صاحبہ بھی مجھ سے سندھ کے گاؤں کی زندگی اور اماں کے خاندان کی روایت کے مطابق محرم میں پڑھے جانے والے نوحوں کا ذکر بڑے شوق سے سنتیں۔ آخر میں کہتیں، "بھائی کمال ہے، ہمارے یہاں بھی یہی ہوتا تھا۔ دُوری سے کچھ نہیں ہوتا،" اور اپنے خاموش ماضی کی یادوں میں کھو جاتیں۔ جس وقت رضویہ کے امام باڑے میں اُن کی آخری رسوم ادا کی جا رہی تھیں، میں اُن کے پیروں کے پاس کھڑی تھی اور آنسو بھری آنکھوں اور تشکر بھرے دل کے ساتھ میں نے ان کے پیر چھُو کر تعظیم ادا کی (جیسے کچھ عرصے بعد مجھے اپنی اماں کے پیر چھُونے تھے) کیوں کہ میں نے ان سے

اتنا کچھ سیکھا تھا۔

میرے والدین اور یہ سب لوگ ایک ایسے شہر میں، ایک ایسے دور میں، رہے جہاں صرف انسان رہا کرتے تھے، جہاں اپنے سے بڑی عمر کے لوگوں کی عزت کی جاتی تھی، مہربانی اور احسان کو یاد رکھا جاتا تھا، دوستوں اور پڑوسیوں کے ساتھ پرانے رشتوں کو مضبوط بنایا جاتا تھا۔ درحقیقت مجھے کبھی کبھی تعجب ہوتا ہے (صرف کبھی کبھی) جب میں یاد کرتی ہوں کہ کوئی شخص اپنی وضع یا عقیدے پر جتنا زیادہ راسخ، پابند یا کٹر ہوتا اُتنا ہی زیادہ اس کا احترام کیا جاتا۔ ایسے گزرے ہوئے دنوں پر نظر ڈال کر اب میں اس بات کو سمجھ سکتی ہوں اور اس کا تجزیہ بھی کر سکتی ہوں۔ ایمان داری، لگن، دوستی، فرض شناسی اور خدمت —— ان سب کی بنیادی شرط وضع داری ہی ہے۔ اور اس کے بعد ذہنی راستی، انکسار، مقصدیت اور انسانی اقدار کے احترام کا درجہ ہے۔ کراچی شہر کے سینے میں انسان کا دل تھا اور اس کے بازو کھلے تھے۔ انسانوں کے لالچ نے اسے اس کی روایات سے محروم کر دیا ہے اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے روبوٹ اُس وقت تک مشکل میں گرفتار رہیں گے جب تک وہ اپنی انسانیت کو بحال کر لے اور اپنے ساتھ کسی دوسرے کے لیے جگہ پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے۔

**

کراچی شہر اپنی چند صدیوں کی تاریخ میں بہت سی تبدیلیوں سے دوچار رہا ہے، اور پچھلی نصف صدی میں ان تبدیلیوں کی رفتار غیر معمولی طور پر تیز رہی ہے جس کے باعث شہر کی طبعی، سماجی اور سیاسی صورتِ حال پر نہایت اہم اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ آئندہ صفحات میں پیش کیا جانے والا مضمون ان تبدیلیوں اور ان کے اثرات کا مجموعی طور پر جائزہ لیتا ہے۔ اس مضمون کا متن عارف حسن کے مندرجہ ذیل مضامین کی مدد سے تدوین اور ترجمہ کر کے تیار کیا گیا ہے

1 A Changing Cityscape (Daily *Star* Karachi Special Report 7 June 1984)
2 A Pedestrian's Saddar (Monthly *Herald* Karachi July 1986)
3 Another Time Another Place (*Herald* August 1986)
4 Karachi's Disappearing Troughs (*Herald* September 1986)
5 The Death of the Indus Delta (*Herald* July 1989)
6 'The Changing Face of Karachi (*Herald* January 1993)

عارف حسن ۱۹۴۳ میں دہلی میں پیدا ہوئے اور ۱۹۴۷ میں اپنے والدین کے ساتھ کراچی آ گئے۔ تب سے وہ کراچی کے شہری ہیں۔ انھوں نے ۱۹۶۰ سے ۱۹۶۵ تک آکسفورڈ پولی ٹیکنیک میں آرکیٹیکچر کی تعلیم حاصل کی اور تین برس برطانیہ، فرانس اور اسپین میں کام کرنے کے بعد ۱۹۶۸ میں کراچی واپس آ کر اپنی پریکٹس شروع کی۔ انھوں نے پاکستان میں متعدد رہائشی، تجارتی اور تعلیمی عمارتیں ڈیزائن کی ہیں۔ ۱۹۸۲ سے وہ اورنگی پائلٹ پروجیکٹ کے کنسلٹنٹ ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے بہت سی عوامی انجمنوں، غیر سرکاری تنظیموں، حکومتی اداروں اور بین الاقوامی اداروں کے لیے مشاورت کی خدمات انجام دی ہیں۔ انھیں اپنے پیشہ ورانہ کام کے سلسلے میں کئی ملکی اور بین الاقوامی اعزاز مل چکے ہیں۔

عارف حسن پیشہ ور ماہرین کی سماجی ذمے داری کے نظری اور عملی طور پر قائل ہیں۔ انھوں نے پاکستانی معاشرے کے حالات اور مسائل کا نہایت ہم دردی اور ہوش مندی کے ساتھ جائزہ لیا ہے اور اپنی تحریروں کو ماہرانہ رپورٹوں کے علاوہ اخباری مضامین کی شکل میں بھی باقاعدگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ کراچی شہر کے طبعی معاشرتی اور سیاسی حالات عارف حسن کی تحریروں کا خاص موضوع رہے ہیں۔

عارف حسن

انگریزی سے ترجمہ اور تدوین افضال احمد سید

کراچی شہر — تغیرات کی زد میں

گردوپیش: انڈس ڈیلٹا

اس صدی کے اوائل میں پنجاب کی کینال کالونیوں کی تعمیر سے پہلے، اور ۱۹۳۶ سے ۱۹۶۰ کے دوران آبپاشی کے لیے بیراجوں کے وجود میں آنے تک، دریائے سندھ سے اوسطاً دو لاکھ کیوسک پانی کا بحیرہ عرب میں اخراج ہوتا تھا۔ یہ اخراج اُن ایک درجن سے زیادہ معاون نہروں اور کریکوں (Creeks) کے ذریعے ہوتا تھا جن کے نام ہندوستانی، عرب اور افریقی ساحلوں کی سیاسی اور کشتی رانی کی تاریخ اور زیریں سندھ کے لوک ورثے کا اہم حصہ ہیں۔ اس اخراج کی وجہ سے پیدا ہونے والی سمندری رَویں ساحل سے ۵۰۰ کلومیٹر دور تک کشتی رانی پر اثرانداز ہوتی تھیں اور دریائے سندھ کا گدلا پانی ۶۰ کلومیٹر تک بحیرۂ عرب کے نیلگوں سرمئی ساحل کو دھندلا سا دیتا تھا۔

سمندر اور دریا کے درمیان اس شدید کشمکش کی وجہ سے دریائے سندھ کا پانی اس کے دہانے کی مختلف نہروں (channels) میں آجاتا تھا۔ اس طرح انڈس ڈیلٹا کا خطہ وجود میں آیا۔ یہ علاقہ تین ہزار مربع کلومیٹر پر محیط تھا اور، چوں کہ دریا کی لائی ہوئی دس لاکھ ٹن مٹی کا بیشتر حصہ یہیں جمع ہوتا تھا، یہ دریائے سندھ کی وادی کا سب سے زیادہ زرخیز خطہ تھا۔

ڈیلٹا کا خطہ تین واضح علاقوں پر مشتمل تھا۔ (۱) بالائی حصے میں لائی (tamarisk) کے گھنے جنگلات تھے، جن کی نشوونما دریا کے سالانہ سیلاب سے ہوتی تھی۔ (۲) ان جنگلات کے نشیب میں مٹی کی ہموار سطح کے علاقے تھے جو سوہاند اور پال گھاس اور لاما جھاڑیوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ (۳) اس سے مزید نشیب میں، جہاں سمندر اور ڈیلٹا کی نہریں ملتی ہیں، تمر (mangrove) کی دلدلیں تھیں جن میں ساحلی خطے کی بحری حیات کی تقریباً تمام اقسام پائی جاتی تھیں۔

ان تینوں اقسام کی نباتات نے مٹی کو تھام رکھا تھا اور ڈیلٹا کو نہ صرف دریا کی لائی ہوئی باریک

ریت (silt) کو حدت کر سکنے ملکہ ایسے حطے کو سمندر میں ہر سال تقریباً تین مربع کلومیٹر تک آگے ڑھانے کے قابل سایا تھا۔

ڈیلٹا کے مختلف حصوں میں ساتات کی انواع وہاں ہونے والی پیداواری سرگرمیوں کا تعین کرتی تھیں۔ ڈیلٹا میں سے والاحت قبیلہ لائی کے جنگلات کو کاٹ کر ڑی تعداد میں عمارتی لکڑی حاصل کرتا۔ ان لکڑیوں کے بیشتر حصّے کو جلا کر کوئلہ سایا جاتا۔ یہ عمل تراں اور سردیوں میں ہوتا جب دریا پیچھے کو ہٹ چکا ہوتا۔ معدنی کوئلے کا استعمال شروع ہونے سے پہلے تک، نارتھ ویسٹرن ریلوے سندھ میں ہر سال ایک کروڑ مکعب فٹ لکڑی ایندھن کے طور پر استعمال کرتی تھی۔

مٹی کے ہموار علاقے میں اُگنے والی سوبانہ اور پال گھاس گایوں اور بھینسوں کا عمدہ چارا تھی، جہاں یہ اس علاقے میں گھی اور مکھن کافی مقدار میں پیدا ہوتا تھا۔ کاشت کاری، جو تمام تر سُرخ چاول اگانے پر مشتمل تھی، عموماً بغیر ہل جوتے کی جاتی تھی کیوں کہ کسانوں کے بکھیرے ہوئے بیجوں پر دریا باریک مٹی کی تہہ بچھا دیتا تھا۔ یہاں پیداوار کی شرح وادیِ سندھ میں سب سے زیادہ تھی۔ لانا جھاڑیاں اور تمر، دونوں اونٹوں کی خوراک کے لیے موزوں تھے، اور اس طرح دلدلوں سے متصل علاقے میں سندھ کے عمدہ ترین اونٹوں کی پرورش ہوتی۔ اور آخری شوررده کریکوں میں رہنےوالا دا ملو قبیلہ ماہی گیری پر بسر اوقات کرتا تھا۔

ڈیلٹا کے حطے میں عمارتی لکڑی، کوئلہ، گھی، چاول اور اونٹ وافر تھے۔ ان کی اضافی پیداوار سندھ کی بندرگاہوں سے مسقط، دوارکا، عدن، گومتی اور خلیج فارس کی بندرگاہوں کو برآمد کی جاتی جن میں سے بیشتر کا مکمل انحصار ڈیلٹا کی اجناس پر تھا۔ دریائے سندھ کی حیدری اور اوجھنو بہروں پر واقع شہر ــــ کیٹی بندر اور شاہ بندر ــــ مصروف بندرگاہ تھے اور یہاں عرب بادبانی جہازوں (dhows) اور خلیج اور جزیرہ نمائے ہند کے مغربی ساحل سے آنے والے جہازیوں کا اژدحام رہا کرتا تھا۔ ان دونوں بندرگاہوں کی آبادی بیس ہزار سے زیادہ تھی اور ان کے میمن اور نیپدی تاجر اور ہندو ساہوکار ایک خوشحال اور کاسموپولیٹین برادری کی تشکیل کرتے تھے، جن کے سمندر پار کے شہروں سے وادیِ سندھ کے شہروں کی نسبت زیادہ مضبوط روابط تھے۔ کیٹی بندر میں شہر کے انتظام کے لیے ایک میونسپل کمیٹی تھی، سڑکوں پر روشنی کا بندوبست تھا اور یہاں چاول چھڑنے کا ایک بڑا کارخانہ اُس زمانے میں موجود تھا جب میکانیکی طریقے سے چلنے والے کارخانے خال خال تھے۔

مگر اب سب پر تغیر آنے والا تھا۔

موجودہ صدی کے آغاز پر، پنجاب میں کینال کالونیوں کی تعمیر شروع ہوئی اور دریائے سندھ کی پانچ مشرقی شاخوں کے پانیوں کی بڑی مقدار کو پنجاب کے دوآبوں میں مستقل آبپاشی کے لیے موڑ دیا گیا۔ تاہم یہ پانی دریائے سندھ کے پانی کے مجموعی حجم کا بہت معمولی حصہ تھا۔ اس طرح انڈس ڈیلٹا کے علاقے پر زیادہ اہم اثرات نہیں پڑے، سوائے اس کے کہ ڈیلٹا کی انتہائی مغربی موسمی نہریں مکمل طور پر

بند ہو گئیں اور طغیانی کی حد میں ایک عمومی کمی واقع ہوئی۔ اس کمی کی وجہ سے لائی کے جنگلات کا پانچ فیصد حصہ متاثر ہوا۔

۱۹۳۶ میں سکھر بیراج مکمل ہوا اور اس کے نتیجے میں دہانے سندھ کی نہروں میں، سوائے حیدری اور اوچٹو کی شاخوں کے، سال کے چار مہینے تازہ پانی آنا بند ہو گیا۔ ان مہینوں میں سمندر کے مٹی کے ہموار علاقوں تک داخل ہو جانے سے بہ کو دریا کا تازہ پانی ہم ہونا ختم ہو گیا۔ اس وجہ سے ڈیلٹا کے باشندوں کے لیے بہت زیادہ دشواریاں پیدا ہوئیں اور پیداواری اور تجارتی سرگرمیاں بڑی حد تک کم ہو گئیں۔ تاہم، انھوں نے ان تبدیلیوں سے مطابقت پیدا کر لی اور اپنی گزر بسر بحال رکھی۔

۱۹۵۶ میں غلام محمد بیراج (کوٹری) کے شروع ہونے کے بعد ڈیلٹا کی نہروں میں، سوائے سیلاب کے موسم میں ایک دو ہفتوں کے، تازہ پانی آنا بالکل موقوف ہو گیا۔ سمندر دریائے سندھ کی معاون ندیوں کے زیریں حصے میں ہمیشہ کے لیے داخل ہو گیا اور زرخیز مٹی کی ہموار سطح شور زدہ دلدلوں میں تبدیل ہو کر کاشت کے لیے ناموزوں ہو گئی۔ چاولوں کے کارخانے بند ہو گئے اور دریا میں سیلاب کے پانی کی عدم دستیابی کی وجہ سے ڈیلٹا کے بالائی حصے میں لائی کے جنگلات کے بڑے قطعات ختم ہو گئے۔

پینے کا پانی، جو تمام تر دریا سے حاصل کیا جاتا تھا، اب سوائے سندھ کے حیدری دہانے کے کہیں اور دستیاب نہیں تھا، اس لیے اس علاقے میں انسانوں اور جانوروں کا زندہ رہنا ناممکن ہو گیا۔ جس سے بن پڑا وہ اپنے مویشیوں سمیت جاتی، ٹھٹھہ، بدین اور سجاول میں نئی آبادیوں پر منتقل ہو گئے۔ جو وہاں نقل مکانی نہیں کر پائے وہ دیگر علاقوں میں بے زمین مزدوروں کی حیثیت سے کام کرنے کے لیے چلے گئے۔ پیداوار بمشکل گزر اوقات کے لیے بھی ممکن نہیں رہ گئی اور اس طرح کشتیوں نے اپنے بادبان کھولے اور سندھ کے ساحل سے رخصت ہوئیں۔ میمن اور شیدی تاجر کراچی آ گئے، اور کیٹی بندر اور شاہ بندر کے شہر چند سو افراد کی چھوٹی چھوٹی بستیاں بن کر رہ گئے۔ ان کے عالیشان مکانات اور میونسپل عمارتیں سمندر برد ہو گئیں یا حسرت ناک کھنڈر بن کر رہ گئیں۔ اس طرح انڈس ڈیلٹا کسی ماتم کے بغیر دم توڑ گیا اور اس کے ساتھ چار ہزار سال کی تجارتی تاریخ اپنے اختتام کو پہنچی۔

مگر داستان یہیں پر ختم نہیں ہوتی۔ جس وقت زیریں ڈیلٹا پر سمندر کا تسلط ہو رہا تھا، بالائی حصے میں غلام محمد بیراج سے نہری آبپاشی کے مستقل نظام کی تکمیل ہوئی۔ لائی کے جنگلات کے باقی ماندہ درخت کاشت کے لیے زمین حاصل کرنے کی خاطر کاٹ ڈالے گئے یا جلا دیے گئے۔ کشش ثقل پر مبنی نکاس کا موثر نظام قائم نہیں کیا جا سکا، کیوں کہ ڈیلٹا کے حصے کی زیادہ تر سطح ہموار تھی اور پانی کے میکانیکی نکاس کے لیے بجلی اور دیگر وسائل کی ضرورت تھی جو دستیاب نہیں تھے۔ اس لیے سیم اور تھور بڑے پیمانے پر پھیل گئے اور روایتی غذائی فصلیں اب برائے نام پیداوار حاصل کرنے کے لیے بھی کاشت نہیں کی جا سکتی تھیں۔ آم کے قدیم باغات تباہ ہو گئے اور ان کی جگہ ناریل، گنے، کیلے اور ٹماٹروں نے لی جو زمین کی شور آلودگی کو برداشت کر سکتے ہیں۔ یہ فصلیں آگے چل کر کیسی پیداوار دیں گی، یہ دیکھنا ابھی

باقی ہے۔ اس کے باوجود ان فصلوں کی کاشت کے لیے کسانوں کو معقول سرمایہ اور ابتدائی نقصان کو برداشت کرنے کی سکت درکار ہے۔ غریب اور کم خوش حال کاشتکار ان کو اگانے کی استطاعت نہیں رکھتے اور وہ مزید بدحال ہو گئے ہیں۔

ڈیلٹا کے زیریں خطے میں بھی سی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں۔ ۱۹۶۰ کے عشرے کے اوائل میں حکومتِ پاکستان نے فشریز ڈپارٹمنٹ کو متحرک کیا اور کشتی سازی، کشتیوں کی میکانائزیشن اور نئی قسم کے جالوں کے لیے قرضے جاری کیے گئے۔ کراچی کے موقع شناس افراد نے میمن اور شیدی دلالوں اور بیوپاریوں کے ذریعے ان سہولتوں کا فائدہ اٹھایا اور خود مقامی ماہی گیروں کو ماہی گیری کی صنعت کو ترقی دینے کے لیے قرضے اور ہدایات فراہم کرنے لگے۔ ماہی گیری اب ڈیلٹا میں ایک اہم سرگرمی ہے اور نہ صرف دابلو قبیلے کے افراد بلکہ جت اور جاموٹ بھی، جو کسی وقت اس پیشے کو اپنے لیے باعثِ تحقیر سمجھتے تھے، اسے اختیار کرنے پر مجبور ہیں۔ تاہم، ڈیلٹا کے ماہی گیر بیوپاریوں کے بے انتہا مقروض ہیں اور نتیجتاً اپنی مچھلیاں ان کے ہاتھ نصف قیمت پر بیچنے پر مجبور ہیں۔

اگرچہ ماہی گیری کی صنعت کو سائنسی بنیادوں پر ترقی نہیں دی گئی ہے اور اس کے امکانات سے پورا استفادہ نہیں کیا گیا ہے، پھر بھی یہ صنعت حکومتِ پاکستان کے لیے زرِمبادلہ حاصل کرنے میں چھٹے نمبر پر ہے۔ اس کے علاوہ انڈس ڈیلٹا کے خطے میں تمر کی دلدلیں نہ صرف مچھلیوں بلکہ ہمارے ساحلوں پر دیگر بحری حیات کا بہت بڑا سہارا ہیں۔ تاہم، ۹۰ فیصد پانی کے آبپاشی کے لیے کھینچ لیے جانے کی وجہ سے بحری حیات کی اس عظیم رسدگی کے نابود ہو جانے کا خدشہ ہے۔

دریائے سندھ تاریخی طور پر سمندر میں نہ صرف تازہ پانی کی بڑی مقدار، بلکہ بہت زیادہ مقدار میں پودوں کے لیے غذا بخش اجزا اور زرخیز مٹی بھی لے جاتا تھا۔ اس طرح تمر کا پورا ماحولی نظام برقرار رہتا تھا۔ ڈیلٹا کی نہروں کے معدوم ہونے سے مچھلیوں کی تازہ افزائشِ نسل میں نمایاں کمی ہوئی ہے اور بحری حیات کی اہم انواع، مثلاً پلا مچھلی، تقریباً معدوم ہو گئی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ، توانائی بخش اجزا اور تازہ پانی کے نہ ملنے اور ساحلی علاقوں کے بڑے پیمانے پر سمندر میں شامل ہو جانے کی وجہ سے، تمر کے ہزاروں ایکڑ کے جنگل ضائع ہو گئے۔ یہ عمل اب بھی جاری ہے اور جیسے جیسے دریائے سندھ کی لاکھوں سال پرانی زرخیز مٹی بہہ کر سمندر میں جا رہی ہے، ان جنگلوں کا ضیاع اور بھی زیادہ ہو گا۔

انڈس ڈیلٹا ختم ہو چکا ہے اور زیریں ڈیلٹا کا خطہ جو اس عظیم دریا نے بنایا تھا نزع کے عالم میں ہے۔ ڈیلٹا کی نہروں کو بحال کرنے کے لیے اب کچھ نہیں کیا جا سکتا، مگر یہ ضرور ممکن ہے کہ تمر کے ماحولی نظام کو بحال کیا جا سکے اور اس خطے کی بحری اور بشری زندگی کو نابود ہونے سے بچایا جا سکے۔

***

برطانوی قبضے سے قبل کا شہر

اٹھارھویں صدی کے پہلے ربع میں موجودہ کراچی کے مغرب کی سمت کھڑک بندر بحیرۂ عرب پر ایک اہم بندرگاہ تھی۔ اس کا قطعی محلِ وقوع متنازعہ ہے، مگر اہم شہادتیں اس امر کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ یہ حب دریا کے دہانے پر راس ماری پر واقع تھا۔ اس مقام پر آبادی کے آثار اس دعوے کو مزید تقویت پہنچاتے ہیں۔ ۱۷۲۰ کے عشرے کے اواخر میں، حب کا دہانہ طاس کے علاقوں میں شدید بارش کی وجہ سے باریک ریت سے اٹ گیا اور یہ جہازرانی کے قابل نہیں رہ گیا۔ اس لیے کھڑک بندر کے تاجروں کو قرب وجوار میں ایک ایسی قدرتی بندرگاہ کی تلاش ہوئی جہاں سے ان کی وسط ایشیا، افریقا اور ہندوستان کے ساتھ اچھی طرح مستحکم تجارت جاری رہ سکے۔ کافی غوروخوض کے بعد کراچی کھاڑی کا انتخاب کیا گیا اور کھڑک کی آبادی اپنے تمام مال و متاع کے ساتھ نئے مقام پر منتقل ہو گئی۔ کہا جاتا ہے کہ اُن دنوں کراچی میں بیس پچیس جھونپڑیوں پر مشتمل ماہی گیروں کی ایک چھوٹی سی بستی تھی اور اسے درنو کے نام سے جانا جاتا تھا۔ درنو کے شمال مغرب میں املی کے پیڑوں سے گھرا ایک تالاب تھا۔ اس کو کلاچی جو کُن کہتے تھے۔

کولاچی ایک بلوچ قبیلے کا نام ہے، اور شمال مغربی سرحدی صوبے کے کولاچی ضلعے سے (جہاں اب کوئی کولاچی فرد موجود نہیں ہے) تھرپارکر میں ٹنڈو کولاچی تک، اس نام کی کئی آبادیاں موجود ہیں۔ اس قبیلے کے بزرگوں کا دعویٰ ہے کہ کسی وقت کراچی کھاڑی ان کے آباواجداد سے آباد تھی اور لفظ کلاچی کولاچی سے نکلا ہے۔

شاہ عبداللطیف نے اپنے رسالے کے سُر گھاتو میں کلاچی کا بھی ذکر کیا ہے، جس کی کھاڑیاں، دلدلی علاقے اور سمندر اس سُر کا منظر ہیں۔ ان کے بیان کردہ واقعات راجا دلورائے کے عہد میں، جو روایت کے مطابق پندرھویں صدی میں حکمران تھا، واقع ہوئے۔ اس راجا کا پایۂ تخت قیاس کیا جاتا ہے کہ اس جگہ رہا ہو گا جو اب مانھ آئی لینڈ ہے۔ کراچی کے ایک انیسویں صدی کے باشندے نے درج کیا ہے کہ اس نواح میں ۱۸۵۹ تک کسی شہر کے کافی آثار موجود تھے۔

درنو کی بستی میں، جہاں کھڑک بندر کے تاجر منتقل ہوئے، کوئی اہم تاریخی تعمیر نہیں تھی۔ تاہم اس کے قریبی نواح میں کئی قدیم تیرتھ واقع تھے۔ اب ہندوؤں کے یہ متبرک زیارتی مقامات شہر کی حدود میں آ چکے ہیں۔ پرانا کلفٹن، اُس جگہ سے جہاں درنو واقع تھا، ڈھائی میل پر ہے۔ عہدقدیم سے یہ مہادیو کہلاتا تھا۔ سمندر کے رخ پر، اس سو فٹ اونچی پہاڑی میں غاروں کے ایک سلسلے پر مشتمل شو کا مندر ہے۔ یہاں شو کی مہادیو یا عظیم خدا کی حیثیت سے پرستش کی جاتی تھی۔ اس مندر کا ذکر رامائن میں آیا ہے، اور ہمیں علم ہے کہ یہاں زائرین دوارکا اور گومتی سے کشتیوں کے ذریعے اور مارواڑ سے خشکی کے راستے سے پہنچتے تھے۔ یہ مندر برطانوی عہد سے پہلے کیسا رہا ہو گا اس کا ہمیں کوئی علم نہیں ہے۔ موجودہ

عمارت ۱۹۳۹ میں تعمیر ہوئی ہے۔

مہادیو کے غاروں سے چند سو گز کے فاصلے پر عبداللہ شاہ غازی کی درگاہ ہے۔ وہ یہاں ۷۶۳ عیسوی میں دفن ہوئے اور ان کا مقبرہ پاکستان کی سب سے قدیم مسلم درگاہ ہے۔ صدیوں سے تمام سندھ سے لوگ اس مقام پر آتے ہیں اور ان کا سالانہ عُرس منایا جاتا ہے۔ موجودہ مزار حالیہ تعمیر ہے اور کسی قدیم عنصر کو اس کی ساخت کے نقشے (plan form) یا پیش رُخ میں شناخت کرنا دشوار ہے۔ تاریخ نے ہمارے لیے کوئی کوائف نہیں چھوڑے کہ ہم جان سکیں کہ اس کی اصل شکل کیا تھی۔ کراچی کے معمر باشندوں کو گدری کے پتھروں کی بنی ایک عمارت یاد ہے جس میں گوشوں پر کنگرے اور چار نوکیلی محرابیں تھیں اور اس کا ایک نیچا گنبد تھا۔ مزار تک جانے والی اصلی پتھر کی سلیں اب سیمنٹ کی سیڑھیوں کے نیچے ہیں۔

غازی عبداللہ شاہ کے بھائی یوسف شاہ منوڑا کے جزیرے میں مدفون ہیں۔ یہاں بھی مزار کی اصل عمارت معدوم ہو چکی ہے اور ایک نئی عمارت نے اس کی جگہ لے لی ہے۔ آرنیسل برٹش کمپنی کے میرین کا جان پورٹر، جس نے ۱۷۷۴ میں کراچی کا دورہ کیا، درگاہ کا ذکر کرتے ہوئے اسے سفید مینار کہتا ہے۔ بعد میں کراچی کا دورہ کرنے والے دوسرے انگریز ہمیں بتاتے ہیں کہ کوئی بھی جہاز منوڑا پیر کی درگاہ پر نذرانہ دیے بغیر بندرگاہ سے روانہ یا بندرگاہ میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ کراچی ہاربر کے اس نقشے میں جو انڈین نیوی کے کیپٹن کارلیس نے ۱۸۳۹ میں تیار کیا، درگاہ کی ساخت اس سے کچھ مختلف دکھائی گئی ہے جو ہمیں غازی عبداللہ شاہ کے اصل مزار کے تذکروں سے دستیاب ہے۔

دِربو کے محلِ وقوع سے ساڑھے سات میل پر منگھوپیر کی وادی ہے۔ یہ مقام ڈھائی ہزار سال سے آباد ہے اور یہاں کمال الدین کا مزار ہے جو آپ منگھوپیر کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ وہ اس وادی میں تیرھویں صدی میں دفن ہوئے اور ان کا مقبرہ واحد مسلم درگاہ تھی جس کو ٹالپر انتظامیہ کی طرف سے تیل کا نذرانہ ملا کرتا تھا۔ اس جگہ ایک ہندو مندر بھی ہے جو لالہ جَسراج سے منسوب ہے اور ان کے عقیدت مندوں کے لیے زیارت کا ایک قدیم مقام ہے۔

کمال الدین کے مقبرے کی برٹش عہد سے پہلے کی تفصیلی صراحتیں موجود ہیں۔ یہ ایک مربع نما عمارت تھی جس کے چاروں جانب ایک وسیع دالان (terrace) تھا۔ عمارت کے کونوں پر پہلے منارے اور بیچ میں ایک گنبد تھا۔ اندرونی حصے میں قبر کے اطراف منقش چوبی چھتر متناسب ستونوں کے سہارے کھڑا تھا۔ چھتر پر دلکش اور نفیس مرصع کاری تھی اور یہ سنگی عمارت اور دالانوں کی طرح شاندار حالت میں تھا۔

مقبرے کی اندرونی چوکور عمارت، گنبد اور منارے اب بھی ثابت وسالم ہیں مگر ان کے اوپر سیمنٹ کا پلاسٹر اور سفید اینمل پینٹ کر دیا گیا ہے۔ عمارت کے چوبی شہتیروں کی جگہ اب کنکریٹ کے بیموں نے لے لی ہے۔ چوڑے دالان غائب ہو چکے ہیں اور ان کی جگہ بدنما برآمدوں اور ڈیوڑھیوں نے

لے لی ہے جو اب عمارت کا حصہ ہیں۔ منقش چوب کاری بھی جس کو مار یر آنے والوں نے بیان کیا تھا، رنگی جاچکی ہے اور اس کا بہت سا حصہ خراب ہو چکا ہے۔

ابتدائی انیسویں صدی کے سیاحوں نے پتھر کے بنے دو بڑے بڑے حوضوں کا ذکر کیا ہے جن پر نقش ونگار بنے ہوئے تھے۔ ان میں منگھوپیر کے گندھک کے چشموں کا پانی جمع ہوتا تھا اور یہ روایتی غسل کے لیے استعمال کیے جاتے تھے۔ اب یہ حوض اُن نے سمار گھاٹوں میں، جنھیں کراچی کے ابتدائی بیسویں صدی کے مخیر حضرات نے تعمیر کرایا تھا، اپنی شناخت کھو چکے ہیں۔

سب سے اہم تعمیراتی کام جو کھڑک بندر کے تاجروں نے کراچی منتقل ہونے کے بعد اپنے ذمے لیا وہ ۱۷۲۹ میں نئی بستی کے گرد فصیل کی تعمیر تھی۔ یہ فصیل گارے سے بنائی گئی تھی جس میں مضبوطی کے لیے تمر کے ٹھنوں کو شامل کیا گیا تھا۔ اس منصوبے کی وسعت کی وجہ سے باہر کے مزدوروں کو بھی اس تعمیراتی کام میں مقامی لوگوں کی مدد کرنے کے لیے بلایا گیا۔ ان کو مزدوری گریں اور مسقط سے آنے والی خشک اور تر کھجوروں کی شکل میں ادا کی جاتی۔ برطانوی یادداشت میں اس فصیل بندی کا، جو ۳۵ ایکڑ رقبے پر محیط تھی، تفصیلی بیان موجود ہے۔ فصیل کے ہر رخ پر بُرج تھے تاکہ گردونواح پر مکمل نگاہ رکھی جاسکے اور ہر گوشے پر مدور مینار تھے جن پر توپیں نصب تھیں۔ فصیل بندی سولہ فٹ اونچے مٹی کے پشتے پر کی گئی تھی اور اس پر سے ہوتے ہوئے مورچے مزید دس فٹ اونچے تھے۔ شہر کے دو دروازے تھے سمندر کے رخ پر واقع دروازہ کھارادر اور دوسرا دریائے لیاری کی خشک سطح کے میٹھے پانی کے کنووں کی طرف والا میٹھادر کہلاتا تھا۔ ٹالپر اسٹطامیہ کے فارسی وقائع میں ان کا ذکر شور دروازہ اور شیریں دروازہ کے نام سے آتا ہے۔ ۱۸۳۹ میں کراچی پر قبضہ کرنے والی سندھ ریزرو فورس کے کیپٹن ڈیلیئٹ کا بیان ہے دروازے اور بالائی بُرج، جن پر بلوچ پہرے دار مقرر تھے، ایک پُرشکوہ منظر پیش کرتے تھے۔

کراچی کی فصیلوں اور دروازوں کے قطعی مقام کا تعین آسان ہے۔ دیواروں کو انگریزوں نے ۱۸۴۹ میں مسمار کرادیا تھا اور ان کی جگہ جنوب اور مغرب میں رمپارٹ روڈ، جنوب میں ریور روڈ (حالیہ آغا خان روڈ) اور مشرق میں حاجی عبداللہ اسٹریٹ نامی سڑکیں بنا دی گئیں۔ ان سڑکوں سے گھرا ہوا ۳۵ ایکڑ کا علاقہ ابھی تک اولڈ ٹاؤن کوارٹر کے نام سے جانا جاتا ہے اور گردونواح سے دس سے پندرہ فٹ تک بلند ہے۔

کھارادر کا قطعی محل وقوع اس مقام اتصال پر تھا جہاں اب مچھی میانی روڈ کی طرف جاتے ہوئے رمپارٹ روڈ اور ایلیاس اسٹریٹ ایک دوسرے کو قطع کرتی ہیں۔ مچھی میانی روڈ جو اس زمانے میں راہ بندر کہلاتا تھا، دروازے سے شروع ہو کر بندرگاہ پر اس جگہ ختم ہوتا تھا جو اب نیٹو جیٹی (Native Jetty) ہے۔ میٹھادر شہر کی شمال مشرقی حد پر، ریور روڈ اور گاؤ گلی کے مقامِ اتصال پر تھا۔

دریائے لیاری، جو شہر کی شمالی دیوار کے ساتھ بہتا تھا، اس کا رُخ برطانوی قبضے کے بعد نہر (channel) نکال کر اور زیادہ شمال کو موڑ دیا گیا، کیوں کہ اس کے سالانہ سیلاب سے شہر کو خطرہ رہا کرتا تھا۔

برطانوی قبضے کے وقت فصیل کی حالت بہت خستہ تھی۔ تاہم یہ فصیل ۱۷۷۲ اور ۱۷۷۳ میں دو طویل محاصروں کا مقابلہ کر چکی تھی۔ آخر میں ۱۷۷۴ کے تیسرے محاصرے میں پرانے شہر نے طویل مذاکرات کے بعد ہتھیار ڈال دیے اور اس کی کنجیاں ٹالپر افواج کے کمانڈار میاں فقیرو کے حوالے کی گئیں۔ اس طرح کراچی قلات کی عملداری سے نکل کر سندھ کے ٹالپر امیروں کے قبضے میں آ گیا۔

ٹالپر کراچی کی عسکری اہمیت سے بہت آگاہ تھے اور اسی لیے ۱۷۹۷ میں انھوں نے جزیرہ منوڑا پر بندرگاہ میں داخلے کے راستے کی حفاظت کے لیے قلعہ تعمیر کرایا۔ قلعے کے ساتھ، بندرگاہ کے داخلے کی سمت، ایک مدور دیدبان (watchtower) تعمیر کیا گیا۔ دونوں عمارتیں پتھروں سے بنی تھیں۔ قلعہ ایک مربع نما عمارت تھی، جس کے مرکز میں ایک چوگوشہ میدان تھا۔ اس کے کونوں پر بُرج بنائے گئے تھے اور اسے ایک نیم مدور چھوٹے احاطہ بند مورچے سے مزید مضبوط بنایا گیا تھا۔ اس کے گرد اونچی دیواروں میں بندوقچیوں کے لیے روزن بنے ہوئے تھے۔ انگریزوں کی فتح کے وقت پچیس جوکھیو اور دس دوسرے بلوچ قلعے کی حفاظت پر مامور تھے۔ ان سب کو مجموعاً ۱۲۰ روپے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔

قلعے کا کچھ حصہ ۱۸۳۹ میں کراچی پر برطانوی قبضے سے پہلے ہونے والی گولاباری کی وجہ سے تباہ ہو گیا۔ جو حصہ محفوظ رہا اُسے ماسٹر اٹینڈنٹ کی رہائش میں تبدیل کر دیا گیا، اور اس کے بعد، ۱۸۸۹ میں، اس کی وضع میں تبدیلی کر کے اسے پورٹ آفیسروں کی قیام گاہ بنا دیا گیا۔ البتہ قلعے کا مدور دیدبان مکمل طور پر معدوم ہو گیا؛ اب مغرب کی سمت ساحل کی حفاظتی دیوار (groyne) کی لکیر اس جگہ سے گزرتی ہے جہاں پہلے یہ مینار قائم تھا۔

برطانوی قبضے سے پہلے کراچی کی سب سے زیادہ پُرشکوہ عمارت چبوترا یا کسٹم ہاؤس تھی۔ یہ بندرگاہ کے آخری سرے پر واقع تھی جہاں سے اب نیٹو جیٹی کا فلائی اوور پُل شروع ہوتا ہے۔ یہ پانچ شاندار محرابوں پر بنائے گئے ایک طویل ہال پر مشتمل تھی۔ کراچی آنے والے تمام مسافر یہاں اترتے اور پھر کھارادر تک جانے کے لیے بیل گاڑیاں استعمال کرتے۔ چبوترے کا استعمال، مختلف اضافوں کے ساتھ، موجودہ کسٹم ہاؤس کی تعمیر تک جاری رہا۔ چبوترے کے فوٹوگراف یا خاکے ہندوستان کے مختلف دستاویزخانوں میں سے کسی میں ضرور موجود ہوں گے۔

ہمیں کراچی آنے والے ایک سے زیادہ سیاحوں سے معلوم ہوتا ہے کہ چبوترے کے قریب ایک مسجد اور ہندو سمندری دیوتا دریالعل سے منسوب ایک مندر تھا۔ مندر میں کوئی مورتی نہیں تھی، مگر ایک تیل کا چراغ ہمیشہ روشن رہتا تھا۔ کوئی ہندو جہاز مندر کے متولی کو معمولی نذرانہ دیے بغیر چینی بار (موجودہ نام چینا کریک) سے روانہ یا اس میں داخل نہیں ہوتا تھا۔ مندر کو ٹالپر انتظامیہ کی طرف سے ماہانہ ساڑھے سات سیر تیل ملتا تھا۔ اس روایت کو انگریزوں نے بھی کئی برس قائم رکھا۔ آج اس مقام پر واحد

مسجد کسٹم ہاؤس کے عقب میں ہے جو ۱۹۸۳ میں تعمیر ہوئی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ قدیم مسجد کی جگہ پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا تھا اور اس کی عمارت معدوم ہو گئی تھی۔

اس جگہ کے نواح میں ہندوؤں کے دو مندر ہیں۔ پیٹو جیٹی پر لکشمی نارائن مندر اُس مقام پر بنایا گیا جہاں قدیم زمانے سے سمندر کے دیوتا کو نذر چڑھائی جاتی رہی تھی۔ دوسرا مندر ویسٹ وہارف روڈ پر ہے اور دریالعل مندر کہلاتا ہے۔ اس کی موجودہ عمارت ۱۹۲۸ میں بنی، اور باور کیا جاتا ہے کہ پرانے مندر کی اراضی پر قائم کی گئی۔ مسجد یا مندروں کی قدیم عمارتوں کی کوئی تفصیل ہم تک نہیں پہنچی، سوائے اس کے مسجد سفید رنگ کی تھی۔

برطانوی قبضے کے وقت مسلمانوں کی ۱۲ مسجدیں اور ۱۳ پیر جائے اور ہندوؤں کے ۳۴ مندر اور دھرم شالے شہر اور اس کے نواح میں موجود تھے۔ ان میں سے بیشتر کی اب بھی شناخت ہو سکتی ہے، اگرچہ مندوؤں کے بہت سے پرستش کے مقامات، خاص طور پر اولڈ ٹاؤن کوارٹر میں، اب رہائش، گودام اور اسکولوں کے لیے استعمال ہو رہے ہیں۔

شہر میں ایک اور اہم عمارت خواجانہ تھی جسے ٹالپر انتظامیہ چلاتی تھی۔ یہ واحد جگہ تھی جہاں قسمت آزمائی کے کھیلوں کی اجازت تھی۔ اس کے طرزِ تعمیر کا کوئی تذکرہ ہم تک نہیں پہنچا، مگر کراچی کی اُس وقت کی دوسری عمارتوں کی طرح یہ بھی سرو رلکڑی کے شہتیروں کی مضبوط بندش کے ساتھ گارے سے تعمیر کی گئی ہو گی۔ یہ خواجانہ انگریزوں نے ۱۸۴۳ میں بند کر دیا تھا۔

شہر کی عام خصوصیات اور اس کے مقامی طرزِ تعمیر کو کئی یورپی سیاحوں نے بیان کیا ہے، ان میں جان پورٹر بھی شامل ہے جس نے کراچی کا ۱۷۷۴ میں دورہ کیا تھا۔ مکانوں کی چھتیں سپاٹ تھیں، ان کی تعمیر لکڑی کے ڈھانچے پر ہوتی تھی جس پر بھوس ملے ہوئے گارے سے پلاسٹر کیا گیا تھا۔

چھتوں پر موسم گرما کی ہواؤں کو اسیر کرنے کے لیے مغرب کے رُخ بادگیر (wind-catchers) بنائے جاتے تھے۔ بہت سے مکانات دو یا تین منزلہ تھے۔ پرانے شہر میں بہت سی عمارتیں اب بھی اس ساخت پر پوری اترتی ہیں مگر وہ تیزی سے ختم ہو رہی ہیں۔

کراچی کے مقامی طرزِ تعمیر کا کچھ حصہ ضرور مرعوب کن رہا ہو گا، کیوں کہ ہندو تاجر بہت خوش حال تھے۔ ان کے پاس کشتیوں کی ایک بڑی تعداد تھی، اور وہ چین، افریقا اور وسطِ ایشیا سے تجارت کیا کرتے تھے۔ ان کی معاشرتی اور مذہبی زندگی کا علم ہمیں مہینے بھر تک جاری رہنے والی تیرتھ یاتراؤں، سالگرہوں اور شادیوں کی شاہ خرچ تقریبوں، ضیافتوں اور تفصیلی سفری انتظامات کے تذکروں سے ہوتا ہے۔

کراچی کا صنعتی علاقہ شہر سے باہر اس حصے میں واقع تھا جو اب لیاری کہلاتا ہے۔ یہ علاقہ چمڑا رنگنے، پارچہ بافی، سوئے کا تیل نکالنے، پینٹ اور رنگوں کی تیاری کے چھوٹے چھوٹے کارخانوں پر مشتمل تھا۔ اس علاقے کے متعلق ہمیں اب صرف اتنا علم ہے کہ یہاں پرست شور اور چمڑا صاف کرنے کی ناقابلِ برداشت بدبو ہوتی تھی۔ ۱۹۹۷ میں تعمیر ہونے والی برٹش فیکٹری کے آثار لیاری کے شمال مشرق

میں، جہاں اب گاندھی گارڈن واقع ہے، پائے جاتے ہیں۔

جیسا کہ بیان کیا گیا، کراچی پر برطانوی قبضے سے پہلے کی تعمیرات کا تقریباً کچھ بھی باقی نہیں رہا، اور جو کچھ بچ رہا ہے یا تو وہ اپنی شکل تبدیل کر رہا ہے یا معدوم ہوتا جا رہا ہے۔ تاہم، تسکین کی واحد بات یہ ہے کہ برطانوی قبضے سے پہلے کا کراچی اولڈ ٹاؤن کوارٹر کے شہری نقشے (town plan) میں زندہ رہے گا، جہاں کی تنگ گلیوں میں دو گھڑسوار بمشکل ایک دوسرے کے قریب سے گزر سکتے ہیں، جہاں چھوٹے چھوٹے چوک ہیں اور سیڑھیاں گزرگاہوں کی غیر ہموار سطح کی نشاندہی کرتی ہیں۔ اگر عمارتیں معدوم بھی ہو جائیں تو کھارادر، میٹھادر، جیمی بار، لیاری اور کھڈا کے نام ہمارے شہر کی ابتدا کو یاد دلاتے رہیں گے، بشرطیکہ ہم اس کی تاریخ کو لکھ ڈالیں اور اسے اگلی نسلوں تک پہنچائیں۔

***

مرکزِ شہر

۳ فروری ۱۸۳۹ کو ایچ ایم ایس ویلزلی نے منوڑا کے قلعے پر گولا باری کی۔ تین گھنٹوں کے اندر قلعے کا مغربی بازو مسمار ہو گیا، اور کراچی بارود کے دھوئیں میں گھر گیا۔ چار دن بعد، ۷ فروری ۱۸۳۹ کو، منوڑا کے قلعے کے صوبے دار، خاصل بن بچاخان، نے اپنے عسکری افسر کی جانب سے، اور سیٹھ خان نے ٹالپر حکومت کی شہری انتظامیہ کی طرف سے، شہر کو سر فریڈرک لیوس میٹلینڈ (ایسٹ انڈیز میں سر رٹینک میجسٹی کی بحری افواج کے کمانڈر انچیف) کی تحویل میں دینے کے معاہدے پر دستخط ثبت کیے۔

ہتھیار ڈالنے کی دستاویز کی شرائط کے تحت، انگریزوں کو منوڑا پر قبضہ اور کراچی شہر میں فوج رکھنے کا حق حاصل ہو گیا۔ تاہم شہر کی انتظامیہ کی عنان، سندھ کے ٹالپر امیروں کے ہاتھ میں رکھنے دی گئی۔ پہلا برٹش ملٹری کیمپ پرانے فصیل بند شہر اور اس کے نواح میں واقع ایک قدیم باغ ـــ رام باغ ـــ کے درمیان کی میدانی جگہ میں قائم ہوا۔ یہ باغ ہندوؤں کے لیے مقدس تھا کیوں کہ رام چندر اور ان کی بیوی سیتا اپنے بن باس کے دنوں میں ہنگلاج جاتے ہوئے ایک رات یہاں رکے تھے۔ یہ باغ اب آرام باغ کہلاتا ہے اور یہاں ایک اہم مسجد واقع ہے، جب کہ کیمپ کے علاقے کو بعد میں سرائے کوارٹر کہا جانے لگا۔

ملٹری کیمپ قائم ہونے کے تھوڑے ہی دنوں بعد، صدر بازار، جسے انتظامی طور پر صدر کوارٹر کہا جاتا تھا، برٹش کنٹونمنٹ کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے بنایا گیا۔ انگریزوں نے میروں پر دباؤ ڈالا کہ

صدر بازار میں فروخت کے لیے آنے والے اسباب کو راہ کے محصول سے مستثنیٰ قرار دے دیں۔ بالآخر حکومت کو انگریزوں کے اصرار پر اسباب کی نقل و حمل پر محصول معاف کرنا پڑا، مگر اس نے صدر میں مقامی باشندوں کے کاروبار اور تجارتی سرگرمیاں شروع کرنے کی کوششوں کی کامیاب طور پر حوصلہ شکنی کی۔ اس لیے صدر ۱۸۴۳ میں یورپ سندھ پر برطانوی قبضے کے بعد ان ایک نو یدیز تجارتی علاقہ ساجہاں یوروپی خواتین ایک ایسے گردوپیش میں خریداری کے لیے نکل سکتیں جو ان کے لیے بہت زیادہ غیر مانوس نہیں تھا اور وہ وطن سے آئی ہوئی تازہ ترین اشیا، موسم کے فیشن کے مطابق ملبوسات، ایسٹر کے انڈے یا کرسمس کارڈز، بالکل نئے قسم کے مسالے اور عمدہ ترین شرابیں خرید سکتی تھیں۔ ۱۸۴۳ میں کراچی کے برطانوی عملداری میں آجانے کے بعد ملٹری کیمپ یہاں سے ختم کر دیا گیا اور کیمپ کے سکونت گزیں لوگ زیادہ مستقل رہائش کی خاطر بازار کے شمال اور مشرق میں منتقل ہو گئے۔

۱۸۵۷ میں برٹش حکومت کے خلاف بغاوت میں ناکامی کے بعد صدر کی نشوونما تیز ہو گئی۔ پھر بھی صدر بازار ۱۹۲۰ کے عشرے کے اواخر ہی میں جا کر پرانے شہر کی مضبوط تجارتی طاقت کا حریف بن سکا۔ صدر کی ترقی نہ صرف انگریزوں کے تجارت کے فروغ کی کوششوں کی، بلکہ سندھوں اور پارسیوں کے پہل کارانہ مزاج کی مرہونِ منت ہے۔ (بہت دنوں بعد بازار میں اپنا کاروبار شروع کرنے والی مسلمان تجارتی برادری نے بھی صدر کی ترقی میں حصہ لیا۔) ان لوگوں نے علاقے کی شہری زندگی میں فعال دلچسپی لی اور یہاں کے بیشتر پائیدار ادارے قائم کیے۔ پارسی اور گوانی رہائشی علاقے خود بازار کے اندر واقع تھے اور یوروپی کوارٹرز اس کی خارجی سرحد پر تھے۔

آزادی کے وقت تک بہت سے اہم ادارے، جن میں سے زیادہ تر عیسائی یا گوانیوں اور پارسیوں کے کمیونٹی ادارے تھے، صدر میں واقع تھے۔ اسکول (جن میں چند ۱۸۴۸ میں بنے تھے)، کمیونٹی ہال، کتب خانے، دلکش کاسٹ آئرن یا چوبی پیویلینوں والے جم خانے، ڈرامیٹک کلب اور چرچ اس علاقے میں بکثرت تھے۔ شراب خانے اور بلیرڈ روم، دیسیوں کے لیے ایرانی کیفے اور گورا صاحب لوگوں کے لیے شاندار ٹی روم بھی فروغ پر تھے۔

صدر نے فصیل بند شہر کی کھاکھمی سے جدا علاقے کے طور پر اپنی حیثیت کو برقرار رکھا، ہرچند کہ گھوڑے سے کھینچی جانے والی ٹرام وے نے اسے ۱۸۸۵ میں مقامی علاقوں سے جوڑ دیا تھا۔ سندھی کے معروف ادیب پیر علی محمد راشدی نے اپنی نوعمری کے زمانے کے صدر کو بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ ۱۹۳۰ تک کوئی بدوضعی سے ملبوس شخص بازار میں داخل ہونے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ صدر کا ذکر دانشوروں کی آماجگاہ اور انگریزی طرز کی اعلیٰ دکانوں کے مرکز کے طور پر کرتے ہیں۔

کراچی کی ترقی کے ساتھ ساتھ صدر شہر کا مرکز بن گیا اور ۱۹۴۰ کے عشرے تک اپنے بازاروں، چرچوں، کمیونٹی ہالوں اور لائبریریوں کے علاوہ سینماؤں، ریستورانوں، شراب خانوں، بلیرڈ روموں اور کتابوں کی دکانوں پر فخر کر سکتا تھا۔ اس کی گوتھک اور نشاۃ ثانیہ کی طرز پر بنی پیلے پتھر کی عمارتیں

لسانی تناسب رکھتی تھیں۔ صدر میں تعمیرات کا کام کرنے والے مزدور پڑوسی صوبے راجستھان سے آتے تھے۔

تقسیم کے بعد بھی صدر نئے دارالحکومت کا ثقافتی اور معاشرتی مرکز بنا رہا۔ سرکاری افسران اور غیر ملکی سفارت کاروں کی بیگمات اپنی روزمرہ کی ضروریات کی خریداری کے لیے ایمپریس مارکیٹ جایا کرتیں اور صدر کے ٹی ہاؤس اور کتابوں کی دکانیں، طالب علموں، دانشوروں اور سیاستدانوں کے پسندیدہ ٹھکانے تھے۔ کاغذ کے پھول اور چینی لالٹینیں اس زمانے کی کلارک اسٹریٹ اور میسفیلڈ اسٹریٹ کے نکڑ پر اور اصلی پھول پلس اینڈ کمپنی کی عمارت کی سنگی محرابی گزرگاہ کے اندر فروخت ہوتے ـــ جسے اب ایک شاپنگ پلازا میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ بوہرہ اسٹریٹ کے فٹ پاتھوں پر بہہ کر آنے والے رنگ جمع ہوتے اور موچی گلی سے چمڑے اور کیمیائی مادوں کی بو آیا کرتی۔

آزادی کے بعد ۶ لاکھ مہاجر کراچی میں آئے۔ نئے ملک کے دارالحکومت میں آنے والے زیادہ تر مہاجر صدر سے متصل کنٹونمنٹ کے علاقے میں آباد ہوئے۔ سرکاری ملازمین پرانی فوجی بیرکوں میں رہنے لگے، زیادہ مفلوک الحال مہاجر ان دونوں کے درمیان کی خالی جگہ میں بسے۔ نئی آبادی میں شاعر، مصور، موسیقار اور دانشور بھی شامل تھے۔ اسی عرصے میں، نئی حکومت کے افسروں کی رہائش کے لیے بازار سے متصل بیرکیں بھی تعمیر کی گئیں۔ ان نئی تبدیلیوں کی وجہ سے اگرچہ صدر کوارٹر کی آبادی چار سو فیصد بڑھ گئی مگر فاصلوں میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا۔ لوگ پیدل یا سائیکلوں پر کام کو جایا کرتے، بندرگاہ پر کام کرنے والے ٹراموے استعمال کرتے، اور اگرچہ کراچی میں اُن دنوں صرف آٹھ بسیں تھیں، آمدورفت میں کوئی دشواری نہیں تھی۔

مہاجروں کی آمد نے صدر کی معاشرتی اور دانشورانہ فضا کو زرخیز کیا۔ صدر کی مقامی آبادی میں بیوروکریٹ، سفارت کار، ادیب، مصور اور سیاست داں شامل ہوئے اور جگہ جگہ کتابوں کی دکانیں، بلیرڈ روم، شراب خانے، لائبریریاں، سینما اور طعام گاہیں کھلنے لگیں۔ کراچی کے قدیم کالج پہلے ہی صدر کی خارجی سرحد پر واقع تھے، آزادی کے بعد ایک نئی یونیورسٹی بازار سے چند قدم کے فاصلے پر بنائی گئی۔ طلبا بھی، بقیہ آبادی کے ساتھ باہم دگر اثرانداز ہوتے ہوئے، صدر کی سہولتوں اور اداروں کا فراخ دلانہ استعمال کیا کرتے۔

۱۹۶۵ تک ایک مربع کلومیٹر سے بھی کم رقبے میں، صدر کے بازار کے اندر ۳۷ مناسب طعام گاہیں، ۹ شراب خانے، ۱۱ بلیرڈ روم، ۱۸ کتابوں کی دکانیں، ۷ آڈیٹوریم، ۴ ڈسکوتھیک اور ۱۳ سینما موجود تھے۔ پیشہ ورانہ اداروں کی طرف سے سیمینار منعقد ہوتے، طلبا مباحثے اور ورائٹی پروگرام ترتیب دیتے، اور حکومت صدر کے آڈیٹوریموں اور ہالوں میں اپنی کانفرنسیں کرتی۔ ان سب کے شہر کا کھانا کھانے کے لیے مٹرگشت کرتے ہوئے قریب کی طعام گاہوں تک پہنچتے۔

پریڈی اسٹریٹ اور وکٹوریہ روڈ کے مقامِ اتصال پر یورٹ ویو بلڈنگ ہے جس کی پہلی منزل
انڈیا کافی ہاؤس ہوا کرتی تھی۔ ۱۹۶۰ میں اسے بند ہونے کے وقت تک یہ سیاسی اور دانشورانہ
مباحثوں کا مرکز تھا۔ شہر کے سرکردہ پیشہ ور ماہرین اور سیاست داں یہاں کثرت سے آیا کرتے۔ ان
میں سے کچھ اُس وقت طالب علم تھے اور ایوب دور میں طالب علم اور ٹریڈ یونین رہنما، مثلاً علی مختار رضوی
اور عزیز احمد خاں، یہیں سے گرفتار ہوئے تھے۔ اب یہاں پلمبنگ کے سامان کا گودام ہے۔

انڈیا کافی ہاؤس کے قریب فریڈرک کیفے ٹیریا اور کیفے جارج تھے، جن کی میزوں کا بالائی حصہ
سنگ مرمر کا تھا اور فرش پر رنگین ٹائلیں لگی تھیں۔ یہاں آنے والوں میں دوسروں کے علاوہ عرب تاجر
اور طالب علم بھی تھے جو آج خلیج کی ریاستوں کے اہم رکن ہیں اور دنیا کے امیر ترین افراد میں شمار کیے
جاتے ہیں۔

صدر کی چند کتابوں کی دکانیں باقی رہ گئی ہیں مگر ان کے ارد گرد کا طبعی اور معاشرتی ماحول تبدیل ہو
چکا ہے۔ پاک امریکن نے اپنے بیرونی رخ میں بہتری پیدا کی ہے مگر اپنے پرانے خدوخال کو کھو دیا۔
ٹامس اینڈ ٹامس کا ماکروں اور ریگل بس اسٹاپ کی آلودگی نے کلاکھوٹ دیا ہے اور اب اس دکان کے
خریداروں میں صدر کوارٹر کے کافی ہاؤسوں میں بیٹھنے والے باقی نہیں رہ گئے۔ ٹامس اینڈ ٹامس، بہر
حال، اب تک قائم ہے، مگر کتاب محل جہاں اردو کی تمام مطبوعات موجود ہوتی تھیں، کیپیٹل سینما کی
عمارت کے مسمار ہونے کے ساتھ ختم ہو گیا۔ گدری پتھر کے کلاسیکی رومی طرز کے ستونچے اور عمود، جن
سے اس کا بیش رخ سجا تھا، کل سستے شیشوں اور کنکریٹ میں منقلب ہو چکے ہیں۔

کیفے ڈی جاں وہاں تھا جہاں آج محبوب مارکیٹ کی عمارت کھڑی ہے۔ اس کی تعمیر یک منزلہ
تھی اور اس کے باغیچے میں تخت بچھائے جاتے دن چڑھتے ہی شروع ہو جاتے اور رات کو کباب پراٹھے کھانے پر
ختم ہوتے۔ کم خوش حال لوگوں کے لیے ایمپریس مارکیٹ پر کھسیٹا خاں کا حلیم موجود تھا۔

صدر میں بڑی تعداد میں شراب خانے اور بلیرڈ روم تھے۔ پیراڈائز سینما کے بالمقابل رٹز بار
نفیس شراب خانوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ اس میں ٹیک کے ڈیزائنوں والے شیشے کے پارٹیشن اور حصے کا
سا ایک کاؤنٹر تھا۔ کبھی کبھی انتظامیہ کی طرف ہندوستانی فلموں کے گانے بجائے جاتے، جن سے متاثر ہو
کر کئی گاہکوں کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ ایمپریس مارکیٹ میں اولڈ ٹوڈی شاپ، جہانگیر پارک کے
سامنے یو بار (U bar) اور ٹرام پٹے پر ورر بار زیادہ عوامی نوعیت کے شراب خانے تھے
اسلامائزیشن کے ساتھ ہی شراب خانے معدوم ہو گئے اور صرف ایک بلیرڈ روم جو لکی اسٹار کے نزدیک
ہے باقی رہ سکا۔ وہ اکھڑ لوگ (toughs) جو ان اداروں کو چلاتے تھے، انسانوں کی ایک خاص نسل سے
تعلق رکھتے تھے۔ وہ اور ان کے خریدار ایسی زبان اور رنگ ڈھنگ میں اظہار کرتے جو ہندوستان کے ساحلی
شہروں سے مخصوص تھی اور اب پاکستان میں صرف ہندوستانی فلموں میں سنی جاتی ہے۔

سینما جانا کراچی میں ایک اہم سماجی موقع ہوتا تھا۔ صدر میں شہر کے دو اہم ترین سینما واقع تھے۔

کیپٹیل اور پیراڈائز دونوں، ایسے سنگ حدوخال کے ساتھ جو دوسری عمارتوں کے تعمیراتی پیمانے سے ہم آہنگ تھے، اب معدوم ہو چکے ہیں۔ ان کے عروج کے دنوں میں سب سے اچھی درآمد شدہ فلمیں یہیں دکھائی جاتی تھیں اور فلم فیسٹیول باقاعدگی سے ہوا کرتے تھے۔ وقفے کے دوران لوگ دوستوں کو سینما کے کیفے میں ضرور مدعو کرتے اور ان کے ساتھ چائے کا ایک کپ پیتے۔ کیپٹیل کی خاص پیشکش کیوڑے کے ذائقےوالی چیوک مار تھی۔ فلم ختم ہونے کے بعد کوالیٹی (Kwality) میں آئس کریم کھائی جاسکتی تھی یا یاسیر پر فالودے کے لیے رکا جاسکتا تھا۔ چاٹ عبدالخالق کی دکان کے سامنے سے کھوکھوں سے مل سکتی تھی۔

ان سرگرمیوں کے ٹھیک مرکز میں ایمپریس مارکیٹ ایستادہ تھی۔ اسے پھولوں کے تختوں سے گھیر رکھا تھا اور اس کے بیسوں دروازوں کے سامنے نقل وحمل کے جانوروں کے پانی پینے کے لیے [illegible] کے خوبصورت پیاو (troughs) بنے ہوئے تھے۔ صدر کے مکین اور قریبی کنٹونمنٹ میں رہنے والے بیوروکریٹ اور سفارت کار یہاں پابندی سے خریداری کرتے، جب کہ نوجوان طبقہ مارکیٹ میں [illegible] کے لیے جمع ہوا کرتا۔

صدر کوارٹر کے سرے پر کئی اہم اور سرگرم ادارے تھے۔ راجہ طہ علی خان روڈ پر کراچی گوئن (Goan) ایسوسی ایشن ہال اور سہراب کٹرک ہال ثقافتی تقریبوں اور کرسمس اور پارسی تہواروں کو منانے کے لیے کثرت سے استعمال کیے جاتے۔ اسی طرح پارسی جم خانہ اور کراچی گوئن جم خانہ میں کھیلوں کے مقابلے باقاعدگی سے ہوتے اور روزانہ کرکٹ کی مشق کا اہتمام کیا جاتا۔ ان جم خانوں کے پیویلین خوش نما تعمیر کیے گئے تھے۔ گوئن جم خانہ کا پیویلین فولاد سے بنا ہے اور اس پر ***art nouveau*** کے نقش ونگار ہیں جو ۱۹۲۰ کے عشرے کے پیرس کی سڑکوں کے ڈیزائن کی یاد دلاتا ہے۔ یہ تمام عمارتیں سب خستہ ہو چکی ہیں اور جلد ہی معدوم ہو جائیں گی۔

صدر رہائشی علاقہ بھی تھا۔ دکانوں کے اوپر اپارٹمنٹ تھے اور ساتھ کی گلیوں میں تین منزلہ مکانوں کی قطاریں تھیں جن میں آہنی جالیاں یا چوبی جافریاں تھیں۔ کوارٹر کا مشرقی حصہ گوا کے تارکین وطن سے آباد تھا اور شام کو نوجوان مردوں اور عورتوں کے چھوٹے چھوٹے گروہ اسٹریٹ کے نکڑ پر جمع ہو باتیں کرتے اور بچے کھلی جگہوں پر کھیلا کرتے۔ معمر افراد اپنے دروازے پر بیٹھے بیٹھے دنیا کا نظارہ کرتے۔ موجودہ سی آئی اے آفس کے بالمقابل سینٹ پیٹرک کیتھڈرل کے قریب سیاری والا بلڈنگ کے احاطے میں ابھی تک وہی فضا ہے۔ تاہم ٹرام پٹے پر واقع گوئن کلب موٹرسائیکلوں کی ایک ورکشاپ میں تبدیل ہو گیا ہے۔

ان تمام سرگرمیوں کی وجہ سے صدر شام کو ساڑھے آٹھ بجے دکانوں کے بند ہو جانے کے بعد بھی بارونق رہا کرتا تھا۔ زندگی رواں دواں رہتی اور، چوں کہ ٹریفک زیادہ نہیں تھا اور شور اور فضائی آلودگی بائث نہیں تھے، دوسرے علاقوں تک سے لوگ یہاں چہل قدمی کرنے آتے اور دوستوں سے ملتے اور خود

ایک بڑے کُل کا حصہ محسوس کرتے۔ یہاں بے گانگی کا احساس نہیں تھا، کیوں کہ صدر انسانوں پر مشتمل تھا۔ صدر ایک فرحت انگیز مقام تھا۔

***

مگر یہ سب کچھ کوئی پچیس سال پہلے کی بات ہے۔

پُرانتشار ٹریفک، پاور ہارنوں کے شوروغوغا، کثیف دھویں اور غلاظت میں کراچی کا کرشمہ خوش وضع اور شائستہ مرکزِ شہر اب شناخت کی حد سے زیادہ تبدیل ہو چکا ہے۔ جہاں پہلے کبھی پُرشکوہ ریتیلے پتھروں کی تعمیرات تھیں، اب وہاں تجارتی پلازا، گودام اور زوال پذیری کے واضح آثار ہیں۔ یہ تصور کرنا دشوار ہے کہ اس علاقے میں متعدد رقص گاہیں، ملیرڈ روم، شراب خانے، تھیئٹر واقع تھے اور یہاں ثقافتی سرگرمیاں، مثلاً مے بال (May Ball)، منعقد ہوتی تھیں۔ اب صدر کے پرانے ادارے باقی نہیں رہ گئے۔ شہر کا ثقافتی مرکز ٹریفک، آلودگی اور تجارتی سرگرمیوں کے نرغے میں دم توڑ چکا ہے۔ سینما معدوم ہو گئے اور ان کی جگہ کثیر منزلہ عمارتوں نے لے لی جنھوں نے ایک نئے تعمیراتی پیمانے کو متعارف کیا جو پرانے تناسب سے متصادم ہے۔ چند استثنیٰ بہرحال موجود ہیں جیسے پاہیں عبداللہ والا بلڈنگ جو اپنے نشیتوں کے بیرونی حصوں کے باوجود پرانے پیش رُخ کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔

کافی ہاؤس بھی گردوپیش کی معاندانہ فضا میں خدمت انجام دینے سے قاصر تھے، سو ختم ہو گئے۔ شور اور آلودگی نے صدر کے تعلیمی اور ثقافتی اداروں کا قائم رہنا ناممکن بنا دیا۔ ان اداروں میں سے ایک جو ۱۸۴۸ میں قائم ہوا تھا، جلد ہی شاید کسی اور پلازا کے لیے جگہ فراہم کرتے ہوئے یہاں سے منتقل ہو جائے گا۔ اب کوئی ہال میں ایسٹر بال کا یا کٹرک ہال میں ورائٹی پروگرام کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

دفتروں، گوداموں، گارمنٹ فیکٹریوں اور ہوٹلوں نے صدر کے رہائشی علاقے کی جگہ لے لی ہے اور علاقے میں نئی طرح کے باشندے آ گئے ہیں۔ زمین کا استعمال بدل چکا ہے اور اسی وجہ سے نئی عمارتوں میں مختلف تعمیراتی تقاضے نمایاں ہیں۔

اسی اثنا میں ایمپریس مارکیٹ کے قریب کا علاقہ بسوں کے ایک بڑے اڈے میں تبدیل ہو گیا اور جانوروں کے پانی پینے کے لیے پتھروں کے رومی طرز تعمیر کے نقش و نگار والے پیاؤ اس کے ذیلی حصوں سے معدوم ہو گئے۔ عمارت کے دونوں طرف کے باغات دکانوں سے ڈھک گئے اور درخت گاڑیوں کے دھویں سے سیاہ ہو گئے۔ اب کوئی شخص مارکیٹ کے گوتھک مینار کی ستائش کرنے لیے کرم علی ٹالپر روڈ پر آہستہ خرامی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ جیمز اسٹریچن، جس نے اس عمارت کا نقشہ تیار کیا تھا، ضرور لحد میں بے چینی سے کروٹیں بدل رہا ہو گا۔

۱۹۵۰ کے عشرے کے آخر اور ۱۹۶۰ کے عشرے کے آغاز سے صدر کی تقدیر ملند (یا یست) ہونا شروع ہوئی۔ سرکاری ملازمین کے لیے نئی ہاؤسنگ سوسائٹیاں شہر کی بلدیاتی حدود سے باہر بنائی گئیں، اور وہ تمام افسر ان جلد ہی صدر سے باہر منتقل ہو گئے۔ ان کی تقلید میں ادیب، مصور، صحافی بھی، جو چائے خانوں اور کتاب کی دکانوں میں جمع ہوتے تھے، مضافات میں جا بسے۔ یونیورسٹی بھی اسی عرصے میں شہر کے مرکز سے میلوں دور چلی گئی، اور کراچی ملک کا دار الحکومت بھی نہ رہا۔ صدر کی تقدیر پر شہر کے انتظامی منصوبوں نے گہرا اثر ڈالا۔

۱۹۵۰ میں شہر کے مسائل سے نمٹنے کے لیے کراچی امپرووومنٹ ٹرسٹ (KIT) قائم کیا گیا جسے ۱۹۵۷ میں توسیع کے بعد کراچی ڈویلپمنٹ اتھارٹی (KDA) کا نام دیا گیا۔ شہر کو درپیش اہم ترین انتظامی مسئلہ یہ تھا کہ شہر میں آ بسنے والے لاکھوں مہاجرین کو کس جگہ آباد کیا جائے اور وفاق کا انتظامی مرکز کس مقام پر واقع ہو۔ یہ مہاجرین شہر کے مرکزی علاقوں میں آ بسے تھے جہاں پہ شہر کی وحدت برقرار تھی۔ ۱۹۵۲ میں ٹرسٹ نے سویڈن کی ایک کنسلٹنگ فرم ایم آر وی (MRV) کی مدد سے کراچی کے لیے ایک ماسٹر پلان تیار کیا جسے گریٹر کراچی پلان کہا جاتا ہے۔ یہ منصوبہ دار الحکومت کے لیے ایک انتظامی علاقے کے قیام پر مشتمل تھا جسے تیز رفتار سڑکوں کے ذریعے پرانے شہر سے منسلک کیا جانا تھا۔ اس منصوبے نے شہر کی وحدت کا احترام کیا جس میں عوام کے رہائشی علاقے انتظامی دفتروں، اعلیٰ سرکاری اور سفارتی عہدے داروں کی رہائش کے قریب ہی واقع تھے اور شہر کا ایک مشترکہ مرکز تھا جو کسی ایک طبقے کے لیے مخصوص نہ تھا۔ منصوبے کے تحت مہاجرین کے رہنے کے لیے دریائے لیاری کے ساتھ ساتھ کثیر منزلہ اپارٹمنٹ ہاؤس بنائے جانے تھے جہاں سے ان کی روزگار کی جگہوں کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ انتظامی مرکز کو کنٹری کلب روڈ (موجودہ یونیورسٹی روڈ) پر تعمیر کیا جانا تھا اور لوکل ریلوے کے ذریعے ماس ٹرانزٹ کے ایک نظام کا خاکہ بھی تیار کیا گیا تھا۔ مگر پاکستانی حکومت کے نقطہ نظر کے مطابق شہر کی عام آبادی اور انتظامی مرکز کے درمیان فاصلہ ہونا ضروری تھا اور اعلیٰ عہدے دار یہ فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ دونوں میں سے کس کو شہر کے اندر رکھا جائے اور کسے شہر سے باہر منتقل کیا جائے۔ یہ ۱۹۵۱ سے ۱۹۵۹ تک کا زمانہ ملک میں سخت سیاسی عدم استحکام کا دور تھا جس پہ گریٹر کراچی ماسٹر پلان پر عمل درآمد شروع نہ کیا جا سکا۔

۱۹۵۸ میں مارشل لا نافذ ہو گیا اور چوں کہ فوجی حکومت کسی کو جواب دہ نہ تھی، اس لیے اس نے بعض میعادی مسائل پر ایسے فیصلے کیے جنھوں نے کراچی کی آبادیاتی صورت حال اور شہر کے غریب لوگوں کے رہائش کے معاملات پر گہرا اثر مرتب کیا۔ فیصلہ کیا گیا کہ شہر کے باہر نیا انتظامی مرکز تعمیر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، بلکہ عام آبادی کو شہر سے دور بسایا جائے اور ملک کو تیزی سے صنعتی ترقی دی جائے۔ (بعد میں دار الحکومت کو کراچی سے راولپنڈی منتقل کر دیا گیا۔) اس مقصد سے یونان کی فرم ڈاکسیاڈِس (Doxiades) کو منصوبہ بندی کا کام سونپا گیا جس نے گریٹر کراچی ری سیٹلمنٹ پلان

تیار کیا۔ اس منصوبے کے تحت شہر سے پندرہ بیس میل باہر کورنگی اور نیو کراچی میں مہاجرین کی بستیاں بسائی جانی تھیں اور ان کے روزگار کے لیے نئے صنعتی علاقے بھی وہیں قائم کیے جانے تھے تاکہ یہ علاقے شہر سے الگ سٹیلائٹ ٹاؤن کے طور پر آباد ہو سکیں۔ یونیورسٹی کو بھی شہر کے مرکزی حصے سے ہٹا دیا گیا۔

۱۹۶۲ تک حکومت نے مہاجر آبادی کو کراچی کے باہر کورنگی، لانڈھی اور نیو کراچی کی بستیوں میں منتقل کر دیا۔ لیکن ان بستیوں میں روزگار کے مواقع منصوبے کے مطابق پیدا نہ کیے جا سکے، جہاں یہ زیادہ تر مہاجر پرانے شہر، صدر کے مغرب میں واقع سائٹ کے صنعتی علاقے یا بندرگاہ پر کام کرتے رہے۔ اُن دنوں میں ان تینوں مقامات تک جانے والا واحد راستہ صدر سے ہو کر جاتا تھا۔ اس طرح ۱۹۶۵ میں ۸۰ ہزار سے زیادہ افراد ہر روز صدر سے گزر کر اپنے کام کے مقامات پر جاتے تھے اور ایمپریس مارکیٹ ایک اہم ٹرانسپورٹ جنکشن بن چکی تھی۔

مہاجر بستیوں کے قیام کے فوراً بعد، ان کی روزانہ آمدورفت کا ساتھ دینے کے لیے صدر میں تجارتی سرگرمیاں تیز ہونا شروع ہوئیں۔ ٹرانسپورٹ انڈسٹری کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ورکشاپس، عوامی حماموں، طعام گاہوں اور ساگروں کی تعداد صدر سے گزرنے والے افراد کی تعداد کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئی۔ یہ تقریباً تمام سی کاروباری سرگرمیاں فٹ پاتھوں پر یا بازار کے اندر خالی جگہوں میں، صدر کے تنزل کے عمل کو تیز کرتے ہوئے، انجام دی جاتیں۔

صدر کوارٹر کے نئے ماحول میں رہنا دشوار ہو جانے کی بنا پر علاقے کے خوشحال پرانے مکینوں نے یہاں سے اُٹھنا شروع کیا۔ اسی عرصے میں، چہار ستارہ اور پنج ستارہ ہوٹلوں کا کلچر کراچی میں رائج ہوا۔ معاشرتی، علمی اور فنونِ لطیفہ سے متعلق تقریبات، یہاں تک کہ صدر میں رہنے والی برادریوں کی تقریبات بھی، اس جگہ جہاں اب پرل کانٹینینٹل ہوٹل واقع ہے، یا شہر میں قائم غیر ملکی ثقافتی مرکزوں میں منعقد ہونے لگیں۔ اس تبدیلی کی اہم وجوہ میں سے ایک یہ تھی کہ صدر کا طبعی اور معاشرتی ماحول اب ان تقریبات کے انعقاد کے لیے موزوں نہیں سمجھا جاتا تھا۔ گوئی ایسوسی ایشن ہال میں نئے سال کے انعقاد کا اب تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔

صدر کے زوال کی آخری منزل ۱۹۷۰ کے عشرے میں آئی۔ مضافات میں ان مقامات کے اپنے تجارتی مراکز اور تفریحی ادارے بننے لگے اور ان کے باشندے عام خریداری کے لیے صدر کی طرف آنا بند ہو گئے۔ پرانی دکانیں جو ایک صدی تک قائم رہنے کے بعد ادارے بن چکی تھیں، بند ہو گئیں یا مضافات کو منتقل ہو گئیں۔ خلیج سے آنے والی دولت نے تجارتی سرگرمیوں کو تیز کر دیا اور ایک صارفانہ (کنزیومر) کلچر شہر پر محیط ہو گیا۔ گودام، تھوک مارکیٹیں اور ترسیلی منڈیاں ان سرگرمیوں کو جاری رکھنے کے لیے ضروری تھیں، اور نئے علاقے کی عدم موجودگی میں اپنے نسبتاً بہتر سڑکوں کے نظام، انفراسٹرکچر اور زمین کے بدلتے ہوئے استعمال کی بنا پر، صدر ان سہولتوں کو قائم کرنے کے لیے بہترین مقام سمجھا

کیا۔ صدر کے مغربی اور شمالی حصے میں گوداموں اور مارکیٹوں نے کتابوں کی دکانوں، طعام گاہوں اور اداروں کی عمارتوں کی جگہ لے لی۔ جنوبی حصے میں صارفانہ تجارت کی ضرورتوں کو پورا کرتے ہوئے ہوٹلوں نے پرانی رہائشی اپارٹمنٹ ہاؤسوں کی جگہ لی۔

ادارہ ترقیات کراچی (KDA) کے ۸۵-۱۹۷۵ کے ماسٹر پلان کے تحت اس علاقے میں چھوٹے پلاٹوں کو ملا کر بڑے پلاٹ بنانے اور اونچی عمارتوں کی تعمیر کی اجازت نے صدر کے زوال کے عمل کو آسان بنا دیا۔

۱۹۷۷ میں شراب بندی نافذ کی گئی اور شراب خانے ختم ہو گئے۔ چند برسوں کے بعد ملیرڈروم بھی، چوں کہ وہ شراب خانوں کے بغیر اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتے تھے، اسی انجام کو پہنچے۔ ۱۹۸۰ کے عشرے کے وسط تک، بہت سے سینما پلازوں میں تبدیل کر دیے گئے اور صدر کے قدیم رہائشی علاقے کا بیشتر حصہ دن کو ٹرانزٹ کیمپ اور رات کو قبرستان میں تبدیل ہو جانے لگا، جہاں شام کے بعد سماجی طور پر ناپسندیدہ افراد اور منشیات کے عادی بڑی تعداد میں آ جاتے۔ شہر کا ثقافتی اور تفریحی مرکز کسی متبادل کے قیام کے بغیر دم توڑ چکا تھا۔

***

صدر میں جو تبدیلیاں آئیں ان کی دو بنیادی وجوہ ہیں۔ پہلی یہ کہ آزادی کے بعد شہر کا انتظام سنبھالنے والوں اور منصوبہ ساز اداروں کو کراچی اور اس کی تاریخ سے کوئی محبت نہیں تھی، بلکہ انھوں نے شہر اور اس کے ماضی کو حقارت سے دیکھا۔ دوسری یہ کہ موزوں منصوبہ سازی کے فقدان کی وجہ سے صدر تیزی سے بڑھتے ہوئے ٹریفک، اور شمال اور مشرق میں واقع نئے رہائشی علاقوں سے لوگوں کی مغرب کی طرف ـــ کاروباری علاقوں اور بندرگاہ کی طرف ـــ آمدورفت کی گزرگاہ بن گیا۔

شہر کے بااختیار منتظموں کے کراچی سے محبت کے فقدان کی وجہ سے عمارتوں کی شکلیں مسخ ہو گئیں، یادگاریں اور خراج تحسین کی عمارتیں ہٹا دی گئیں، کھلی جگہوں پر تجاوزات کی سرکاری اجازت دی گئی، اور سڑکوں، پارکوں اور عمارتوں کے نام تبدیل کر دیے گئے جب کہ یہ نام شہر کی تاریخ کا بہت اہم حصہ ہوتے ہیں۔

صدر میں لوگوں، گاڑیوں، شور اور دھوئیں سے پیدا ہونے والی گھٹن نے اُن باشندوں کو یہاں سے انخلا پر مجبور کیا جو یہاں کئی عشروں سے رہ رہے تھے اور یہاں کے اداروں کی تخلیق اور عمل کے ذمےدار تھے۔ اس طرح زمین کے استعمال میں ایک تبدیلی کا آغاز ہوا، جس نے اس علاقے کو صنعتی اور بڑے پیمانے کی تجارتی سرگرمیوں کے لیے موزوں بنا دیا۔ زمین کی قیمتوں میں اضافہ ہوا اور ۱۹۷۰ کے عشرے میں تعمیراتی گرم بازاری کے دوران زمین کے تاجر پرانی عمارتیں اور ادارے خریدنے کے لیے

مستعد ہو گئے۔ محلوں اور برادریوں کا تصور ختم ہو گیا۔ دنیا بھر میں شہروں کے قدیم مرکزی علاقے، جو ابتدا میں رہائش، ثقافتی سرگرمی اور خوردہ فروشی کی بدولت ایسے مخصوص کردار کے حامل ہوتے ہیں، ماحولیاتی زوال کے عمل میں کئی مرحلوں سے گزرتے ہیں تھوک فروشی اور ٹرانسپورٹ کی سرگرمیاں علاقے کو رہائش کے لیے ناموزوں بنا دیتی ہیں، پھر رفتہ رفتہ تھوک فروش دکانوں کی جگہ ورکشاپس اور صنعتی کارخانے قائم ہونے لگتے ہیں۔ صدر بھی ترل کی انہیں مرحلوں سے گزرا۔

اس علاقے کو دوبارہ زندہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ امن و سکون جو کبھی اس کی خصوصیت تھی، اس احیا کے لیے لازمی ہے۔ طبعی ماحول میں ایسے ردوبدل کے بعد جو معاشرتی تبدیلیاں لاسکے، یہ امن وسکون واپس آسکتا ہے۔ اس تبدیلی کو لانے کے لیے سب سے اہم قدم اس علاقے میں ٹریفک کو بنیادی طور پر نئے سرے سے منظم کرنا ہے۔

صدر میں آنے والا ٹریفک دو طرح کا ہے وہ ٹریفک جو اس علاقے کی ضرورت کو پورا کرتا ہے، اور وہ ٹریفک جو یہاں سے گزر کر شہر کے ایک علاقے سے دوسرے علاقے کو جاتا ہے۔ دوسری قسم کے ٹریفک کا حجم بہت زیادہ ہے اور یہ کاروں کے علاوہ بسوں اور ٹرکوں پر مشتمل ہے۔ اس ٹریفک کو کوارٹر کی بیرونی سرحدوں تک محدود رہنا چاہیے جس کے لیے پریڈی اسٹریٹ کے ایک حصے، سرمد روڈ، اسٹریچن روڈ اور میسفیلڈ اسٹریٹ کو شامل کرتے ہوئے صدر کے گرد ایک رنگ روڈ بنانا ہو گا۔ صدر سے کسی ٹریفک کو گزر کر جانے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے اور رنگ روڈ سے نکلنے والے تمام سڑکوں کو کار پارکنگ میں تبدیل کر دینا چاہیے جو بند گلیوں میں ختم ہوں۔ اس طرح صدر کوارٹر کا مرکزی حصہ پھر سے پیدل چلنے والوں کا علاقہ بن سکتا ہے۔

اس اسکیم میں سڑکوں کو بنانے اور کشادہ کرنے کے لیے کنٹونمنٹ اور نجی زمینوں کو حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ زمین کے تاجروں اور دکانداروں کی انجمنیں بطور طاقتور سیاسی گروہ اس اسکیم کی مخالفت کریں گی۔ یک طرفہ رنگ روڈ سے موٹر سواروں کا فاصلہ بڑھے گا، مگر اس اسکیم کے فائدے اس سے پیدا ہونے والی مشکلات کی نسبت بہت زیادہ ہیں۔ صدر کے تمام ٹریفک کا غالب حصہ یہاں سے گزرنا بند کر دے گا۔ اس طرح شور سے ہونے والی آلودگی تقریباً ختم ہو جائے گی اور گزر کر جانے والے ٹریفک کے ختم ہونے سے نہ صرف گاڑیوں کے پارک کرنے کی جگہ کافی حد تک بڑھ جائے گی بلکہ تحفظ کی ایک فضا پیدا ہو گی جس سے صدر کے قدیم ادارے اور باقی رہ جانے والے رہائشی علاقے ایک بار پھر سے سانس لینے کے قابل ہو سکیں گے۔ طبعی ماحول میں اس تبدیلی کے ساتھ زمین کا استعمال بھی تبدیل ہو گا اور صدر کا زیادہ تر حصہ رہائشی عمارتوں کے لیے استعمال ہو گا۔ اگر مخصوص قوانین کے ذریعے پلاٹوں کو جوڑ کر بڑے پلاٹ بنانے کی روک تھام موثر طور پر کی جا سکے اور عمارتوں کی نہ صرف اونچائی بلکہ ان کی چوڑائی کی بھی حد مقرر کی جا سکے تو تعمیراتی تناسب برقرار رہ سکتا ہے۔

سڑکوں کی چوڑائی اور ٹریفک کے حجم کا لحاظ رکھتے ہوئے رِنگ روڈ کے صحیح محلِ وقوع کا حتمی طور پر تعین کیا جانا چاہیے۔ جن سڑکوں کو کار پارک میں تبدیل کرنا ہے وہ موزوں ہونی چاہییں اور علاقے کے لوگوں کی گاڑیوں کی پیدل علاقے میں آمدورفت اور یہاں دستیاب ہونے والی سہولتوں کا درست تخمینہ لگانے کی ضرورت ہے۔ اس نقطۂ نظر میں بہرحال کوئی خامی نہیں ہے؛ اسے دنیا کے کئی شہروں میں تاریخ اور شہر کے مرکز کو محفوظ رکھنے کے لیے عمل میں لایا گیا ہے۔

لندن کے کووینٹ گارڈن اور پیرس کے لیز آل (Les Halles) کی پُرہجوم، آلودہ اور غیر صحت مند فضا جو مکمل طور پر مارکیٹ کی قوتوں کے زیرِ اثر تھی، آخرکار نئے اور صحت مند ماحول سے شکست کھا گئی۔ ایسا صرف ان مارکیٹوں کے ہٹائے جانے سے نہیں ہوا جو ان جگہوں پر موجود تھیں، بلکہ آمدورفت کے نظام میں بنیادی تبدیلیوں کی وجہ سے ممکن ہوا۔ گزر کر جانے والے ٹریفک کو مقامی ٹریفک اور پیدل چلنے والوں کے استعمال میں آنے والی سہولتوں سے الگ کر دیا گیا ہے۔

***

تبدیلیوں کا یہ عمل جس نے صدر کو متاثر کیا، شہر کے دوسرے پرانے علاقوں میں بھی جاری تھا، یہ ضرور ہے کہ جن عوامل نے لی مارکیٹ اور میری ویدر ٹاور جیسے علاقوں پر اثر ڈالا وہ کسی حد تک مختلف نوع کے تھے۔

لی مارکیٹ شہر کے بیپیئر کوارٹر میں اور میری ویدر ٹاور سرائے کوارٹر میں واقع ہے۔ صدر کے برخلاف یہ دونوں علاقے اولڈ ٹاؤن کوارٹر (یعنی سابقہ فصیل بند شہر) اور بندرگاہ سے زیادہ نزدیک ہیں۔

کراچی کے فصیل بند شہر کو کھڑک بندر کے ہندو تاجروں نے، دریا کے دہانے کے ریت سے اٹ جانے، اور سخت سیلابوں کی وجہ سے علاقے کے بے کار ہو جانے کے بعد، ۱۷۲۹ میں تعمیر کیا تھا۔ شہر کے دو دروازے تھے سمندر کی طرف کا دروازہ کھارادر کہلاتا تھا اور دوسرا، جس کا رخ موسمی ندی لیاری کے شمال کی طرف تھا، میٹھادر کے نام سے جانا جاتا تھا۔ وہ علاقے جہاں یہ دروازے ایستادہ تھے اب بھی انہیں ناموں سے مشہور ہیں، اگرچہ دیواریں اور دروازے انگریزوں نے ۱۸۴۹ میں مسمار کرا دیے تھے۔ کھارادر بندرگاہ سے راہ بندر نامی سڑک کے ذریعے ملتا تھا جو ۱۸۶۰ میں انگریزوں کے بنائے ہوئے بندر روڈ کا حصہ بن گئی۔ اسے اب ایم اے جناح روڈ کہا جاتا ہے۔ یہ سڑک سرائے کوارٹر کو شہر کے پرانے علاقوں کے شمالی سرے سے جدا کرتی ہے۔

کراچی تجارتی مقاصد کے تحت خصوصی طور پر بسایا گیا شہر تھا اور اس نے اٹھارھویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں وسطِ ایشیا سے تجارتی سرگرمیوں میں اضافے کی وجہ بہت خوش حالی حاصل کی۔ ۱۷۹۴ میں ٹالپوروں کے زیرِ تسلط آنے کے بعد سے پہلی بار فصیل بند شہر میں تحفظ کا

احساس بیدار ہوا اور یہ احساس بہت جلد اس کی دیواروں کو عبور کر گیا۔ شہر کے مضافات میں پارچہ بافی اور چمڑے کو صاف کرنے کی صنعتیں قائم ہوئیں۔ ان مضافات میں سے ایک پرانے شہر کے شمال میں واقع لیاری کا علاقہ تھا جہاں شہر کے غریب لوگ، کشتیوں پر کام کرنے والے اور بندرگاہ کے مزدور، رہتے تھے۔ یہیں پر چمڑے صاف کرنے کے ناگوار بدبو پھیلانے والے کارخانے زیادہ تھے۔ ۱۸۴۳ میں سندھ میں انگریز کی فتح کے بعد، لیاری ترقی کرنے والے علاقوں میں اول تھا۔ اسے فاتح سندھ سر چارلس نیپیئر کے نام پر نیپیئر کوارٹر کا نام دیا گیا۔ کھلے بازار کا علاقے بھی وسیع ہوا اور ۱۹۲۷ میں اس پر لی مارکیٹ کی تعمیر ہوئی۔

پرانے شہر کا ایک اور نواحی علاقہ جس نے ۱۹۲۰ میں ترقی حاصل کی، قافلہ سرائے تھا۔ یہ سرائے وسط ایشیائی تجارت میں حصہ لینے والے افغانی تاجروں کے اونٹوں کے کارواں کی منزل تھی۔ ۱۸۳۰ میں ٹالپروں نے راہ بندر کو سرائے تک وسعت دی تھی۔ میری ویدر ٹاور اُس علاقے میں ایستادہ ہے جو برٹش عملداری میں قافلہ سرائے کے حوالے سے سرائے کوارٹر کہلایا۔ یہ علاقہ ۱۸۵۰ سے ۱۸۹۰ تک کے عشروں میں ان تجارتی کوٹھیوں، تجارتی کمپنیوں، بینکوں اور گوداموں کے قیام کے لیے بسایا گیا تھا جو تجارت اور بندرگاہ کی سرگرمیوں میں اضافے کے نتیجے میں وجود میں آ رہے تھے۔ بندرگاہ کا کپاس اور گندم پیدا کرنے والے اندرونی زرعی علاقوں سے رابطہ بھی اس کوارٹر کی دو خاص شاہراہوں، بندر روڈ (موجودہ ایم اے جناح روڈ) اور میکلوڈ روڈ (موجودہ آئی آئی چندریگر روڈ) کے ذریعے تھا۔ بندرگاہ تک ریل کی پٹریاں میکلوڈ روڈ کے متوازی چلتی ہیں اور ریلوے کا مارشلنگ یارڈ اس کی قریبی حدود میں تھا اور اب بھی وہیں ہے۔

۱۹۴۷ میں جب پاکستان وجود میں آیا، نیپیئر اور سرائے کوارٹر اہم تجارتی علاقے بن گئے۔ پہلے سے موجود سہولتوں کے علاوہ متعدد تھوک مارکیٹیں اور متعلقہ گوداموں کے سلسلے وجود میں آئے۔ پرانا شہر، سوائے پارچہ جات کی تھوک فروشی کے، عام طور پر ایک رہائشی علاقہ تھا جہاں بیشتر مندر اور درگاہیں واقع تھیں جن کے گرد شہر اور اس کے نواح کے علاقوں کی ثقافتی اور مذہبی رسوم کا انعقاد ہوتا تھا۔ جہاں پرانے شہر اور نیپیئر کوارٹر میں تاجر اور درآمد برآمد کرنے والے رہائش پذیر تھے، وہیں قریبی لیاری اور مچھی میانی کوارٹروں میں بندرگاہ اور تعمیراتی جگہوں پر کام کرنے والے مزدور، نقل و حمل کے محنت کش اور صنعتی مزدور رہا کرتے تھے۔ کام تک جانے کا فاصلہ کم تھا اور ٹراموے کے ذریعے بندرگاہ تک بہ آسانی جایا جا سکتا تھا۔ سارے علاقے میں صرف دو ٹرانسپورٹ ٹرمینل یا اہم جنکش تھے لی مارکیٹ اور میری ویدر ٹاور۔

پرانا شہر اور اس کے نواحی کوارٹر یوروپی انداز کے جائل صدر سے بہت مختلف تھے۔ نقل و حمل کی اہم شاہراہوں سے دور، یہاں کی سڑکیں تنگ اور پُرپیچ تھیں، دکانوں اور بازاروں میں خرید و فروخت دیسی طریقے سے ہوتی تھی، اور اگرچہ چائے خانے، شراب خانے اور ملیر ڈروم ان علاقوں میں بھی موجود

تھے، مگر ان کی فضا اور ان میں جانے والے لوگ بہت مختلف اور کم پُر تکلف تھے۔ یہاں بڑے بال، ڈراما، پولیس بینڈ اور ایسٹر کی ضیافتیں نہیں تھیں، اس کے بجائے دیوالی، میلاد، صوفیوں کے عرس اور محرم کا زور شور سے اہتمام کیا جاتا۔

***

پرانے شہر اور اس کے نواح کو زوال آشنا کرنے والے کئی عوامل ہیں۔ ان میں سب سے اہم، صنعت اور تجارت کا فروغ ہے جس کے نتیجے میں بندرگاہ کی سرگرمیوں میں اضافہ ہوا۔ ۱۹۴۵ میں کراچی کی بندرگاہ سے ۲٫۰۷۷ ملین ٹن اسباب کی درآمد اور برآمد ہوئی۔ ان اسباب کو ذخیرہ کرنے کی سہولتیں بندرگاہ یا ریلوے کے مارشلنگ یارڈز میں موجود تھیں۔ سوائے مال کو شہر کے تھوک بازاروں تک پہنچانے کے، تمام تر اسباب کی ترسیل ریلوے کے ذریعے ہوتی تھی۔ ۱۹۶۹ تک، خاص طور پر صنعتی ترقی اور زراعت میں سبز انقلاب کی ٹیکنولوجی کا استعمال شروع ہونے کے نتیجے میں ۷٫۴ ملین ٹن اسباب کی درآمد اور برآمد ہوئی۔ ۱۹۸۴ تک یہ اعداد ۱۵ ملین ٹن تک پہنچ گئے، یعنی ۱۹۴۵ کے مقابلے میں پانچ گنا سے بھی زیادہ تجاوز کر گئے۔

اس اضافے کے باوجود، بندرگاہ اور مارشلنگ یارڈوں میں ذخیرہ کرنے کی سہولتوں کو اس تناسب سے وسعت نہیں دی گئی۔ یہ صورت حال بندرگاہ کو سہولت بہم پہنچانے کی ریلوے کی صلاحیتوں کے ۱۹۴۷ کے بعد سے روبہ انحطاط ہونے کی وجہ سے اور خراب ہوئی۔ اسی دوران، بندرگاہ کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں اور شہر کی آبادی میں ۱۹۴۵ کے بعد سے ۲۵ گنا اضافے کے لحاظ سے، شہر کی تھوک مارکیٹوں میں کاروبار کے حجم میں اضافہ ہوا۔

ان عوامل کے نتیجے میں، پرانے شہر کے بہت بڑے حصے اور بیپیئر اور لیاری کوارٹروں کے تقریباً تمام علاقے، بندرگاہ اور تھوک مارکیٹوں کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے گوداموں میں تبدیل ہو گئے۔ پتھر کی بنی پُرانی رہائشی عمارتیں، جو عموماً دو یا تین منزل بلند تھیں، توڑ ڈالی گئیں اور ان کی جگہ تقریباً ایک سے نقشے کی چھ منزلہ عمارتوں نے لے لی۔ ان عمارتوں میں عموماً نچلی منزل پر اسٹور اور اوپر کی منزلوں پر بندرگاہ یا ٹرانسپورٹ سے متعلق دن کو کام کرنے والے مزدوروں کے لیے چھوٹے فلیٹ یا انفرادی کمرے ہوتے ہیں اور عموماً ایک بڑا اپارٹمنٹ عمارت کے مالک کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔ یہ تعمیراتی سرگرمیاں تعمیراتی اداروں کی شروع کی ہوئی تھیں جن کے پاس مقامی آبادی کو مائل کرنے کے لیے قیمتوں اور نقشوں کے پیکیج تھے۔

علاقے میں قواعد وضوابط کی جی بھر کر خلاف ورزی کی گئی ہے۔ نئی عمارتیں نہ صرف ناکافی طور پر روشن اور غیر ہوادار ہیں بلکہ ان کی پلمبنگ اور بجلی کی تنصیبات بھی ناقص ہیں۔ بہت سے اصل مالکوں

نے ایسی جائیدادیں فروخت کر دیں اور یہ سوچ کر شمالی کراچی کی کچی بستیوں (squatter settlements) کو منتقل ہو گئے کہ اُس علاقے میں معاشرتی اور طبعی صورت حال اندرونی شہر کی نسبت بہتر ہے۔

سدر گاہ، اندرونی شہر اور اس سے متصل علاقوں میں وجود میں آنے والی وسیع تھوک مارکیٹوں اور گوداموں کے درمیاں سے گزرنے والی سڑکیں، اور سدر گاہ اور کراچی کے اہم صنعتی علاقے سائٹ کے درمیاں کی مصروف سڑکیں، میکانیکی ٹرانسپورٹ کی گزرگاہیں ہیں۔ افراد اور اسباب کی تمام تر نقل و حمل، اور اس کے ساتھ سدر گاہ اور اندروں ملک اور دوسرے صنعتی علاقوں کا لیاری، سپیپر اور سرائے کوارٹروں سے رابطہ، یہاں سے گزرنے والی شاہراہوں کے ذریعے ہوتا ہے۔ ۱۹۵۳ سے ۱۹۸۴ تک یہ نقل و حمل ۷ گنا بڑھ چکی تھی، اور اس میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

میکانیکی ٹرانسپورٹ میں اضافے کے نتیجے میں کم از کم دو بڑے ٹرک اسٹینڈ قائم ہوئے اور ایک اہم سروس سیکٹر وجود میں آیا جو نہ صرف ورک شاپوں، طعام گاہوں، ہوٹلوں اور اسپیئر پارٹس بنانے والوں پر، بلکہ جسم فروشی کے خفیہ اڈوں اور منشیات فروشی کی جائےواردات پر مشتمل تھا۔ ان میں سے بیشتر سرگرمیاں سرکاری زمین پر قبضہ کرنے کے بعد کی گئیں۔ ان تجاوزات کی سمت افزائی کے نرخ مسلمہ طور پر طے ہو چکے ہیں۔ درحقیقت غیر رسمی سطح پر شہری انتظامیہ، جائیداد کے مالکان اور تجاوز کرنے والے، سب اس عمل میں شریک ہیں اور اس سے نفع حاصل کر رہے ہیں۔

***

تبدیلی کے متذکرہ طریقِ عمل نے، سوائے اکادکا محفوظ گوشوں کے، کراچی کے اندرونی شہر میں اہم معاشرتی تبدیلیاں رونما کی ہیں۔ اب روایتی ثقافتی سرگرمیاں ختم ہو چکی ہیں کیوں کہ نئی آبادی کی بڑی اکثریت ملک کے دیگر علاقوں سے نقل مکانی کر کے آنے والے کارکنوں پر مشتمل ہے جو اپنے خاندان کے بغیر رہتے ہیں۔ اس بات سے تفریحات، خورد و نوش کی جگہوں اور دکانوں کی نوعیت اور علاقے کے مکینوں کے رویوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ٹرانسپورٹر اور ڈرگ مافیا کے لوگ علاقے کی سب سے اہم معاشی طاقت، اور نتیجتاً اہم ترین سیاسی قوت، ہیں۔ علاقے کے لوگوں کی جانب سے منشیات کے خلاف چلائی جانے والی تحریکوں کو ہمیشہ پولیس اور پیوستہ مفادات رکھنے والے دوسرے گروہوں نے کچل دیا ہے۔ بہت زیادہ دن نہیں گزرے کہ منشیات کے خلاف کام کرنے والوں کو قتل تک کیا گیا۔ تجاوزات کے خلاف مہم، صارفین سے واجبات وصول کرنے کی تحریک اور ٹریفک کے قوانین کو نافذ کرنے کی کوششیں بھی اسی باعث ناکام رہیں۔

معاشرتی تبدیلیاں سرائے کوارٹر کے صرف ایک مخصوص حصے میں واقع ہوئیں۔ طبعی تبدیلیاں

بھی اس کوارٹر کے مختلف حصوں میں یکساں طور پر نہیں ہوئیں۔ میکلوڈ روڈ اور صدر روڈ سے متصل علاقے میں، گوداموں کے بجائے اونچی دفتری عمارتیں تعمیر کی گئی ہیں، جب کہ کوارٹر کے مشرقی حصے میں پرانے رہائشی علاقے ابھی تک موجود ہیں۔ البتہ کوارٹر کی اہم شاہراہیں صدر گاہ تک افراد اور اسباب کے لیے گزرگاہ فراہم کررہی ہیں اور بہت سی تھوک مارکیٹیں ان شاہراہوں پر واقع ہیں۔

ان چاروں مقامات پر علاقے کی بحالی کے کسی موثر منصوبے کے لیے یہاں کی معاشرتی، اقتصادی اور ماحولیاتی صورت حال ناسازگار ہے۔ تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ ان علاقوں میں رہنے اور مستقل بنیادوں پر کام کرنے والوں کی اکثریت اپنے اردگرد کے طبعی اور معاشرتی ماحول سے ناخوش ہے۔ ان کا صریحی مطالبہ ہے کہ ان میں تبدیلیاں لائی جائیں۔

صدر کے علاقے میں زیادہ تر لوگ محسوس کرتے ہیں کہ اگر شہر کے ایک حصے سے دوسرے کو جانے کے لیے صدر سے گزرنے والے ٹریفک ممنوع قرار دے دیا جائے تو یہ علاقہ سابقہ حالت پر آسکتا ہے۔ یہ احساس بھی پایا جاتا ہے کہ علاقے کے پرانے ادارے ناقابلِ بازیافت طور پر معدوم نہیں ہوئے ہیں اور اگر ماحولیاتی صورت حال اجازت دے تو دوبارہ زندہ ہوسکتے ہیں۔

ایک تجویز صدر کے گرد رنگ روڈ تعمیر کرنے کی تھی۔ دوسری تجویز سینٹ پیٹرک کیتھیڈرل سے سندھ ہائی کورٹ تک کی سڑک کو پیدل چلنے والوں کے لیے مخصوص کرنے کی تھی تاکہ صدر سے گزرنے والے تمام ٹریفک کو نئی سمت سے گزارا جاسکے۔ تھوک مارکیٹوں اور گوداموں کی ترقی اور وسعت کے لیے مرکز شہر سے باہر پرکشش علاقے میں مناسب جگہ مہیا کی جانی چاہیے جس کے ساتھ انفراسٹرکچر کی ضروری سہولتیں اور صدرگاہ اور ہائی وے تک آسان رسائی بھی حاصل ہو۔ اس کے بعد کے مراحل بحالی کے منصوبے کے ذریعہ طے ہوسکتے ہیں۔

پرانے شہر اور اس سے متصل علاقے میں مکینوں، ٹرانسپورٹروں اور تاجروں کی ایک بڑی تعداد سے انٹرویو کیا گیا۔ ہر گروہ کی اپنی مخصوص شکایتیں تھیں اور ان کے انھوں نے کئی ممکنہ حل پیش کیے۔ ٹرانسپورٹر بھی واضح طور پر اندرونی شہر میں کام کرنے کے حالات سے ناخوش تھے یہ علاقے بہت گنجان ہیں، یہاں ٹریفک کی حرکت سست اور توانائی کا ضیاع زیادہ ہے۔ تاجروں نے بھی ذخیرہ کرنے کی سہولتوں کی بابت شکایت کی اور خاص طور پر وہاں میکانیکی ٹرانسپورٹ کے ذریعے کام کرنے کی دشواریوں کا ذکر کیا، مگر ان کے پاس کوئی متبادل حل نہیں تھا۔

کراچی ماسٹر پلان (۱۹۷۴-۱۹۸۵) میں صدرگاہ کو شہر سے باہر نکلنے والی ہائی وے — نیشنل ہائی وے اور سُپر ہائی وے — سے منسلک کرنے کے لیے دو بائی پاس تجویز کیے گئے تھے۔ کراچی کے اہم صنعتی علاقے بھی انھیں ہائی وے پر واقع ہیں۔ ان بائی پاسوں کی تعمیر سے اندرونی شہر میں ٹریفک کا دباؤ مناسب حد تک کم ہوسکتا ہے۔ اگرچہ یہ بائی پاس ماسٹر پلان میں تجویز کیے گئے تھے مگر ان میں تھوک

مارکیٹوں، گوداموں اور متصلہ رہائشی اور سروس سیکٹر کی ترقی کو مدنظر نہیں رکھا گیا تھا۔ درحقیقت، اگر منصوبہ بندی کے تحت گوداموں کی سہولتیں اور ان کو مدد دینے والا انفراسٹرکچر (بشمول ٹیلی فون، ٹیلکس اور بینکاری کی سہولتوں کے) مہیا کیا جاسکے تو اندرونی شہر کے تاجروں کی بڑی تعداد بغیر کسی دیگر مراعات کے وہاں سے منتقل ہونے پر آمادہ ہوجائے گی۔ ان کے ساتھ باشندوں کی ایک بڑی تعداد بھی منتقل ہو جائے گی اور اس کے بعد ٹرانسپورٹ کے اڈے بھی ختم ہو جائیں گے۔ اس تمام دباؤ کے جانے سے موجودہ گھرے ہوئے اندرونی شہر کی آبادی کو سانس لینے کی گنجائش ملے گی اور پرانے شہر کا جو کچھ بچ رہا ہے اس کو بحال کرنے کا موقع ملے گا۔

***

شہر کے معدوم ہوتے ہوئے پیاؤ

۱۹۲۰ کے عشرے کے وسط سے پہلے کراچی میں نقل و حمل کے تقریباً تمام ذرائع کا انحصار جانوروں پر تھا۔ گدھا گاڑیاں، بیل گاڑیاں اور اونٹ گاڑیاں باربرداری کے لیے اور عربیوں کی سواری کے طور پر استعمال ہوتیں، جبکہ امرا ایسی گھوڑوں سے کھینچی جانے والی وکٹوریاؤں یا گاڑیوں میں آمدورفت کرتے جنہیں وردی پوش رکاب دار چلایا کرتے۔ ایسٹ انڈیا ٹرام وے کمپنی ۱۸۸۵ میں قائم ہوئی اور کیماڑی جیٹی سے صدر تک اور وہاں سے کنٹونمنٹ اسٹیشن تک کے لیے چلنا شروع ہوئی۔ ٹرام کے ڈبوں کو بھی گھوڑے کھینچتے تھے۔

نقل و حمل کے لیے استعمال ہونے والے جانوروں کی ضروریات کے لیے شہر کی انتظامیہ نے شہر میں بہت سی چارا کھلانے اور پانی پلانے کی جگہیں بنا دی تھیں۔ شہر کے مخیر اور فلاحی اداروں اور وقفوں (trusts) نے ان کی تعداد کو اور بڑھایا۔

زیادہ تر پیاؤ (troughs) مارکیٹوں، پارکوں، تفریحی مقامات، ریلوے اسٹیشنوں اور بندرگاہ کے نزدیک تھے ـــ یعنی ہر اُس جگہ جہاں جانوروں کو اسباب یا مسافروں کے انتظار میں رکنا پڑتا۔ کراچی کے یہ پیاؤ تعمیر کے خوب صورت نمونے ہوتے تھے۔ ان میں سے بیشتر سنگ بری پتھر سے بنائے گئے تھے۔ چند ایک، جیسے کلفٹن کے پیاؤ یا کسٹم ہاؤس کے پاس بھلاح رائے رَواجند بھاٹی کا پیاؤ، نشاۃ ثانیہ کے تعمیراتی اسلوب میں بنائے گئے تھے۔ دیگر، جیسے ہیٹو جیٹی فلائی اوور کے قریب کا پیاؤ، اطالوی انداز تعمیر سے قریبی مماثلت رکھتے تھے اور اگر روم یا فلورنس میں ہوتے تو نامانوس معلوم نہ ہوتے۔ چند ایک میں، جیسے مانک واڑا گارڈن کا پیاؤ، یورپی اور ہندوستانی عناصر کا امتزاج تھا؛ یہ طرزِ تعمیر کراچی میں ۱۹۲۰ کے عشرے کے اواخر میں بہت مقبول تھا۔

کراچی کے پیاؤ شہر کی تاریخ، اس کے آبا اور اس کے اداروں کا ریکارڈ بھی ہیں، کیوں کہ ان میں بہت سوں کو اس کے اہم شہریوں نے تعمیر کرایا تھا یا اُن کی یاد میں تعمیر کرایا گیا تھا۔ دوسرے پیاؤ شہر کو مخیر اداروں کی طرف سے عطیہ ہوئے تھے۔ گرومندر کا پیاؤ ہیرام ایڈل جی نے ۱۸۹۳ میں اپنے متوفی والد اور والدہ کی یاد میں تعمیر کرایا تھا۔ ہیرام ایڈل جی کو ۱۹۰۰ کے عشرے میں بیپسٹر ہول کی تعمیر کا بھی اعزاز حاصل ہوا تھا۔ صدر میں ایڈلجی ڈنشا ڈسپنسری کے عقب میں اُنھیں کا تعمیر کرایا ہوا پیاؤ بہت دن ہوئے معدوم ہو چکا ہے۔ سول اسپتال کے نزدیک مشن روڈ پر واقع پیاؤ ۱۹۲۷ میں شہر کے سرویئر دیوان ڈیارام جیٹھارام میرچندانی کی یاد میں اُن کی بیوی نے تعمیر کرایا تھا۔ اسی طرح نومرہ پیر پیاؤ ۱۹۳۴ میں بہادر نسروانجی مہتا کی یاد میں نسروانجی کمپنی کے ملازمین کی طرف سے تعمیر کرایا گیا تھا۔ مانک واڑا گارڈن کا پیاؤ ڈمپ ایمپل فنڈ اور سولجر بازار کا پیاؤ انجمن برائے انسدادِ بے رحمیِ حیوانات (SPCA) کی طرف سے شہر کو عطیہ کیا گیا تھا۔

۱۹۶۰ کے ابتدائی برسوں تک ان پیاؤوں کی دیکھ بھال کی ذمے داری کے ڈی اے پر تھی۔ ہر پیاؤ پر ایک ملازم مقرر تھا جو جانوروں کو پانی پلانے اور آس پاس کی زمین کو صاف رکھنے کا ذمے دار ہوتا۔ اب دیکھ بھال کا یہ سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔ تین کے سوا باقی پیاؤ اب استعمال بھی نہیں کیے جاتے اور ان کی حالت خستہ ہو چکی ہے۔ میرچندانی پیاؤ اب کھنڈر ہو چکا ہے اور اس کے بہت سے منقش پتھر لوگ اٹھا لے گئے۔ نومرہ پیر کا پیاؤ کوڑے کا ڈھیر بن چکا ہے، اور گھوڑی گارڈن، جس کے ٹسکنی (Tuscan) ستون خوش نما تناسب میں قائم تھے، بدصورت عوامی بیت الخلا میں تبدیل ہو چکا ہے۔ مانک واڑا گارڈن کا پیاؤ اب ایک کاٹھ کباڑ کی دکان کا حصہ ہے اور لی مارکیٹ کے پیاؤ وہاں نمودار ہو جانے والے کھوکھوں کے لیے چبوترے کے طور پر استعمال ہو رہے ہیں۔

چند خوب صورت ترین پیاؤ مکمل طور پر تلف ہو چکے ہیں۔ ان میں ایمپریس مارکیٹ، کنٹونمنٹ اسٹیشن، پرانی نمائش، فریئر ہال، پٹیل پارک (موجودہ نشتر پارک) اور سٹی کورٹ کے پیاؤ شامل ہیں۔ اب ان کی جگہ عمارتوں، عوامی لیٹرینوں، بلدیہ کے اسباب کے اسٹوروں اور ناجائز تجاوزات نے لے لی ہے۔

جو تین پیاؤ ابھی تک استعمال میں ہیں وہ سولجر بازار، بیپسٹر ہول اور گرومندر پر واقع ہیں، وجہ یہ ہے کہ موقع شناس افراد نے اُن کا انتظام سنبھال لیا ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور یہاں اپنی گاڑیاں معاوضے پر دھلواتے ہیں اور تانگوں اور گھوڑا گاڑیوں والے قیمت ادا کر کے اپنے جانوروں کو پانی پلا سکتے ہیں۔ خود مقرر کردہ چوکیدار پانی کی آمد اور نکاس کا انتظام کرتے ہیں، مگر یادگاری تعمیر کو نقصان سے نہیں بچا سکتے۔ سولجر بازار میں مست حال چوکیدار نے پیاؤ کی گگر کو توڑ کر اس پر پلاسٹر کر دیا ہے۔

گرومندر کے پیاؤ کی دیکھ بھال کرنے والا عبدالرحمن اس کی تعمیر کو پسند کرتا ہے اور اس کا خیال ہے کہ پتھر سیمنٹ سے کہیں زیادہ خوب صورت ہوتا ہے۔ پھر بھی، چوں کہ پتھر آہستہ آہستہ گھستا جا رہا ہے، اس کے پاس اس کے سوا کوئی حل نہیں کہ وہ پتھر کی سطح پر پلاستر کر دے۔

کراچی میں بار برداری کی گاڑیوں میں جتے ہوئے جانوروں کو پانی پلانے کا نیا نظام رائج ہوا ہے۔ جہاں کہیں کوئی تانگا اسٹینڈ ہے، کوئی شخص وہاں ایک کنواں کھود کر اس پر ہینڈ پمپ یا الیکٹرک موٹر نصب کر دیتا ہے۔ گاڑیوں والے یہاں سے اپنے جانوروں کے لیے بالٹیوں میں پانی لے جاتے ہیں۔ انھیں یہ طریقہ پرانے طریقے سے زیادہ پسند ہے جس میں انھیں جانوروں کو پیاؤ تک لے جانا پڑتا تھا۔

یہ درست ہے کہ جانوروں کی تعداد میں کمی اور ان کو پانی پلانے کے لیے الیکٹرک موٹروں اور بالٹیوں کے استعمال کی وجہ سے کراچی کے پرانے پیاؤ اپنی افادیت کھو چکے ہیں۔ تاہم انھیں معدوم نہیں ہونے دیا جانا چاہیے، شہر کی تاریخ کا ایک ریکارڈ ہونے کے علاوہ وہ فنِ تعمیر کے نفیس نمونے بھی ہیں اور کراچی خوش قسمت ہے کہ اسے ماضی سے یہ یادگاریں ورثے میں ملیں۔

پرانی عمارتوں کو محفوظ کرنا مشکل اور پیچیدہ عمل ہے۔ اس کی شرط اول ایسے قوانین کی تشکیل، حوصلہ افزائی، توثیق اور نفاذ ہے جو کرایہ داری اور ملکیت کے موجودہ قوانین کا اطلاق اُن تعمیروں پر نہ ہونے دیں جنھیں محفوظ کیا جانا ہے۔ اس کوشش کے دوران تجارتی مفاد رکھنے والوں، مالک مکانوں اور لینڈ مافیا کی (جو سب کے سب طاقتور سیاسی گروہ ہیں) مخالفت لازمی ہے۔ البتہ کراچی کے پیاؤوں کو محفوظ رکھنے کے لیے ایسے قوانین کی ضرورت نہیں ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ان کی نشان دہی کی جائے، کلاسیکی طرزِ تعمیر سے واقف تجربہ کار ماہرین کی مدد سے ان کی مرمت اور تجدید (renovation) کرائی جائے اور بلدیہ کے سالانہ فنڈ سے ان کی دیکھ بھال کی جائے۔ شاید ہی پانچ لاکھ روپے سے زیادہ رقم ان پیاؤوں کے احیا اور ڈھائی لاکھ روپے کی رقم ہر سال ان کو شاندار حالت میں رکھنے پر صرف ہو گی، اگر اس رقم میں تیس فیصد تصرفِ بے جا کی گنجائش بھی رکھ لی جائے۔

جانوروں کو پانی پلانے کے لیے تعمیر کرائے گئے ان پیاؤوں کی ایک بڑی تعداد کا معدوم ہو جانا اور باقی رہ جانے والوں کی خستہ حالت اس امر کو ایک بار پھر ثابت کرتی ہے کہ کراچی کی تاریخ کو کوئی اپنانے کو تیار نہیں ہے۔ یہ ایک یتیم ماضی کا شہر ہے جس کا انتظام سنبھالنے والوں نے نہ صرف اسے نظر انداز کیا ہے بلکہ اپنی طمع، بے حسی اور بے بصیرتی کی وجہ سے اس کو غارت کرنے کی اجازت بھی دی ہے۔

***

شہر کا بدلتا ہوا منظر

سندھ پر برطانوی قبضے کے بعد کراچی شہر کو نئی عمارتوں کے منصوبے کے تحت توسیع دی گئی تھی۔ اس منصوبے سے روگردانی صرف کہیں کہیں یادگاری تعمیرات کے سلسلے میں کی جاتی تھی جس سے

برطانوی سلطنت کے امیج کو تقویت ملتی تھی۔ جہاں چہ میری ویدر ٹاور بیپسر مول کے پُل کی بالکل سیدھ میں بنایا گیا تھا۔ ریل کی پٹری کے اوپر انگریزوں ہی کے بنوائے ہوئے پل نے اس جغرافیائی توازن کو ختم کر دیا۔ سینٹ پیٹرک کیتھیڈرل اُس سڑک کی سیدھی لکیر پر تعمیر کیا گیا جو کلارک اسٹریٹ کہلاتی تھی۔ اسی سڑک کے دوسرے سرے پر، اسی سیدھی لکیر میں، ہائی کورٹ کی عمارت واقع ہے۔ مغرب کی طرف اس عمارت کا بیش رُخ ایک اَور سڑک کی سیدھ میں ہے جسے آج کل شاہراہ کمال اتاترک کہا جاتا ہے۔ اسی طرح جو سڑک پہلے سمرسٹ اسٹریٹ تھی، ایڈلجی ڈِنشا جیرِ ٹیبل ڈسپنسری کے کلاک ٹاور پر ختم ہوتی ہے۔ اس قسم کی اَور بھی متعدد مثالیں موجود ہیں۔

۱۸۸۳ میں ایمپریس مارکیٹ کھلی۔ اس کا گوتھک وضع کا کلاک ٹاور ایک اَور سڑک کے سرے پر، جسے اب کرم علی ٹالپر روڈ کہا جاتا ہے، عین درمیاں میں واقع ہے۔ جب کنٹونمنٹ ریلوے اسٹیشن کا ڈراس تیار کیا گیا تو اس کے بلند مرکزی حصے کو اسی کی سیدھ میں رکھا گیا۔ اس سڑک کو ایمپریس مارکیٹ کے مخالف سرے پر ایک عالی شان چوک پر ختم ہونا تھا۔ تاہم اس اسکیم کو مکمل نہ کیا جا سکا، اور یہ سڑک اب لکی اسٹار سے آگے نہیں جاتی۔ ایک دوسرے کی سیدھ میں بنائی گئی ان عمارتوں کا مجموعی نقشہ اب دکھائی نہیں دیتا، کیوں کہ لکی اسٹار اور کنٹونمنٹ اسٹیشن کے درمیاں بڑی تعداد میں کثیر منزلہ عمارتیں وجود میں آ گئی ہیں۔

برطانوی دور کے اوائلی برسوں کا طرزِ تعمیر عارضی فوجی اور انتظامی مقاصد کے لیے تھا، جہاں چہ اس کی نوعیت سادہ اور افادی تھی۔ کلکٹر لین میں واقع کمشنر آفس اس طرزِ تعمیر کی مثال ہے۔ اس کی ایک اَور مثال وہ عمارت ہے جسے اب سینٹ جوزف کانونٹ اسکول کے کثیر المقاصد ہال کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ ہال شروع میں ایک چرچ تھا اور اس کے باہر لگی ہوئی تختی بتاتی تھی کہ یہ لادین سندھ میں خداوند کا پہلا گھر ہے۔ یہ تختی، قابلِ فہم طور پر، غائب ہو چکی ہے۔ موجودہ گورنمنٹ ہاؤس کی جگہ پر بنے ہوئے پرانے گورنمنٹ ہاؤس کی تعمیر بھی اسی طرز کی تھی۔

البتہ ۱۸۵۰ کے بعد سے کراچی کے برطانوی طرزِ تعمیر میں تفصیلی خصوصیات نمایاں ہونا شروع ہوئیں۔ عمارتوں کے بیش رُخ نشاۃ ثانیہ اور گوتھک اسالیب میں تعمیر کیے جانے لگے، اور ان اسالیب کی آمیزش سے تیار کی جانے والی مقامی تعمیری صورتیں بمبئی اور مدراس سے شہر میں در آمد کی جانے لگیں۔ اس طرزِ تعمیر کا ایک بڑا حصہ بیپسر روڈ اور رمپارٹ روڈ کے کنارے اب بھی باقی ہے، گو دوسری جگہوں پر نابود ہو چکا ہے۔ اہم عمارتیں ـــ مثلاً سٹی کورٹ، فریئر ہال، موجودہ سنا ہیں کامپلیکس کے بالمقابل پرانے میوزیم کی عمارت، ڈی جے کالج وغیرہ ـــ انھیں اسالیب میں بنائی گئی تھیں۔ یوروپی اور مقامی باشندوں کی بنوائی ہوئی نجی عمارتوں میں بھی کلاسیکی اور نشاۃ ثانیہ کے یہ تعمیری عناصر راہ پا گئے، ان کی مثالیں پرانے کلفٹن، کیماڑی اور کھارادر کی رہائشی عمارتوں میں اب بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔

برطانوی دور سے پہلے کا طرزِ تعمیر ـــ جو پتھروں کی بنیاد پر کھڑے کیے گئے لکڑی کے ڈھانچے،

اس پر مٹی اور گارے کے پلاسٹر اور چھت پر بنے ہوئے بادگیروں پر مشتمل تھا ___ بیسویں صدی کے پہلے عشرے تک مکمل طور پر متروک ہو چکا تھا۔

۱۹۲۰ کے عشرے میں دہلی کے نئے نوآبادیاتی دارالحکومت کے تعمیری اثرات کراچی میں محسوس کیے جانے لگے۔ چناں چہ متعدد عمارتیں اس ہند یوروپی طرز میں ڈیزائن کی گئیں۔ یوروپی طرز کے پیش رخوں اور عمارتی نقشوں میں ہندوستانی اور اسلامی عناصر کی آمیزش کی گئی۔ اس تعمیری اسلوب کی مثالوں میں ہندو جم خانہ، موہٹا پیلیس، ایوانِ تجارت و صنعت کی پرانی عمارت اور صدر روڈ کی میونسپل بلڈنگ شامل ہیں۔ ان میں اول الذکر تین عمارتیں اُس دور کے ایک ممتاز ماہر تعمیر آغا احمد حسین نے ڈیزائن کی تھیں۔ شہر کے تعمیراتی ورثے میں اپنے اس نمایاں حصے کی بدولت آغا احمد حسین اس بات کے مستحق ہیں کہ کسی سڑک یا چوک کو ان سے موسوم کیا جائے۔

برطانوی دور اور اس سے پہلے کے مقامی طرزِ تعمیر میں کراچی کے مخصوص موسمی حالات کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ جنوب مغرب کے رخ چلنے والی مون سونی ہواؤں سے فائدہ اٹھانے کے لیے برطانوی دور سے پہلے کی تعمیرات میں چھتوں پر بادگیر بنائے جاتے تھے، اور نوآبادیاتی دور کی عمارتوں میں کمروں کو ہوا کے رخ پر رکھا جاتا تھا۔ اسی طرح اندر آنے والی حدت کو کم رکھنے کے لیے یا تو کھڑکیاں، روشن دان اور دروازے چھوٹے رکھے جاتے تھے یا ان کے آگے جنوب یا مغرب کی سمت وسیع برآمدے تعمیر کیے جاتے تھے۔ آج کل ان خصوصیات کا لحاظ نہیں رکھا جاتا۔

۱۸۸۵ میں ایسٹ انڈیا ٹراموے کمپنی نے کراچی میں کام کرنا شروع کیا۔ ابتدا میں ٹراموں کو کوئلے کے انجنوں سے چلایا گیا۔ تاہم، شور اور حفاظتی مسائل کے پیشِ نظر ٹرام کے ڈبوں کو گھوڑے کھینچنے لگے، اور بعد میں انھیں ڈیزل سے چلایا جانے لگا۔ ہو جرالڈ کر ٹراموں کا ڈیزائن افادیت پسندانہ تھا، پھر بھی وہ دیکھنے میں اچھی لگتی تھیں۔ ٹراموے کے جانے نے کراچی کا اپنے ماضی سے ایک اہم رشتہ منقطع کر دیا۔ اگر ٹرام کے ان ڈبوں کو، ابتدائی ٹراموں کے ماڈلوں اور کراچی کی پبلک ٹرانسپورٹ کی کہانی کے ساتھ، شہر کے باشندوں کے لیے نمائش پر رکھا جا سکے تو بہت دل چسپی کا باعث ہوگا۔ ۱۹۴۸ تک شہریوں کے لیے ان ٹراموں کے ذریعے شہر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک سفر کرنا ممکن تھا۔

آزادی کے بہت عرصے بعد تک کراچی کے مضافاتی علاقے پھلوں کے باغات سے ڈھکے ہوئے تھے۔ دریائے لیاری کے ساتھ ساتھ، بیٹھادر سے موجودہ گلشنِ اقبال تک، کھجور اور آم کے باغ تھے جن میں بعض کو اٹھارھویں صدی میں لگایا گیا تھا۔ شہر کے باشندے چھٹی کے دن وہاں سیر کو جاتے تھے۔ ملیر کا نخلستانی علاقہ بھی ایک زرعی خطہ تھا۔ یہ سرسبز پٹی اب تقریباً ختم ہو چکی ہے اور جہاں کہیں باقی ہے وہاں اسے تجارتی مفادات اور کے ڈی اے کی رہائشی اسکیموں سے خطرہ لاحق ہے۔

برطانوی دور سے پہلے کا کراچی پرانے محلوں اور نواحی علاقوں کے ناموں میں اب بھی زندہ ہے، لیکن نوآبادیاتی دور کا شہر مادی تعمیرات اور ناموں کی تبدیلیوں کے باعث مر رہا ہے۔ مادی تعمیرات کی وجہ

آج کل کی زندگی کا بڑھتا ہوا دباؤ ہے اور ناموں کی تبدیلی سرکاری پالیسی کا حصہ ہے۔ پرانے نام، جو شہر کی تاریخ کا حصہ اور اس کے محسنوں کی یادگار تھے، اب بدلے جا چکے ہیں۔ سڑکوں اور پارکوں میں لگائے گئے تاریخی اہمیت کے حامل مجسمے بلدیہ کے کاٹھ کباڑ کے گودام میں پڑے ہیں۔ اہم عمارتوں کے باہر لگائی گئی یادگاری اور معلوماتی تختیاں بیش تر اپنی جگہ سے غائب ہو چکی ہیں۔

ضروری ہے کہ کراچی کی سحرانگیز کہانی اور بیش قیمت ورثے کے اجزا کو احتیاط سے جمع کیا جائے اور دستاویزی معلومات کے ساتھ شہریوں کے لیے مستقل نمائش پر رکھا جائے تاکہ وہ فخر کے ساتھ اپنے شہر کے ماضی سے تعلق استوار کر سکیں۔

آزادی کے قبل کے کراچی کے طرز تعمیر اور شہری منصوبہ سازی میں برٹش راج کی روح موجود تھی، جبکہ آزادی کے بعد کا کراچی اس دور کے سیاسی انتشار، اقتصادی لوٹ کھسوٹ اور ثقافتی بحران کا آئینہ دار ہے۔ اس صورتِ حال کا ایک اور، اگرچہ نسبتاً کم اہم، عنصر پیشہ ور ماہرین کی نااہلی، تکنیکی محدودات اور تخیل کا فقدان ہے۔

نئے ملک کا دارالحکومت اور اس کی واحد بندرگاہ ہونے کے باعث کراچی کا پھیلاؤ بہت تیزی سے ہوا۔ تاہم، دوسری جنگ عظیم کے بعد کی تیسری دنیا کے اکثر ملکوں کے شہری منتظمین کی طرح، اس شہر کے منصوبہ ساز اور منتظمین ان معاشرتی اور اقتصادی تغیرات سے بے خبر تھے جو آزادی کے بعد رونما ہونے والے تھے، اور جن کے باعث نئے شہروں کی جانب دیہی علاقوں سے آبادی کی یلغار شروع ہونے والی تھی۔ دیہات کی غربت اور نوآبادیاتی دور کے غیر صنعتی شہروں کی مقابلتاً خوش حالی نقل مکانی کی اس یلغار کا بنیادی سبب تھی۔

۱۹۴۷ کے بعد کے ابتدائی برسوں میں کراچی کی توسیع اُن سڑکوں کے ساتھ ساتھ ہوئی جو شہر کو مضافات سے، اور ملک کے باقی حصوں سے، ملاتی تھیں۔ البتہ بعد کے برسوں میں پرانے شہر کے ارد گرد سرکاری اہلکاروں اور معاشرے کے دوسرے بارہ مالداروں کی ہاؤسنگ سوسائٹیاں بننے لگیں۔ اس طرح یہ سڑکیں تجارتی سرگرمیوں کا مرکز بن گئیں اور یہاں کے بیچ بیچ سے ٹریفک ارد گرد کے علاقوں میں آنے جانے لگا۔ اس پالیسی کے جاری رہنے کی وجہ سے شہر میں ٹریفک کے بہاؤ پر تباہ کن اثرات پڑے ہیں۔

۱۹۶۰ کے عشرے کے آخری برسوں تک ایک دوسرے سے چند میل کے فاصلے پر واقع بستیوں کے درمیان آنے جانے کے لیے اکثر صورتوں میں مرکزِ شہر تک جانا اور پھر مخالف سمت میں واپس آنا پڑتا تھا۔ شہر کے نئے علاقوں کو ایک دوسرے سے ملانے والی سڑکوں کا تصور آزادی کے بعد کے شہری منصوبہ سازوں کے لیے اجنبی تھا۔

کم آمدنی والے گروہ، جو ۱۹۵۸ تک مرکزِ شہر کے آس پاس کچی بستیوں میں رہتے تھے، ان مقامات سے اکھاڑ دیے گئے اور شہر سے بہت دور کے مضافات — کورنگی، لانڈھی اور نیو کراچی — میں

منتقل کر دیے گئے۔ یہ مقامات ان کی روزگار کی جگہوں — بندرگاہ اور سائٹ — سے بہت فاصلے پر تھے۔ کراچی میں ٹرانسپورٹ کے مستقل مسائل اسی باعث پیدا ہوئے۔ ان مقامات پر منتقل کیے جانے والے شہریوں کو ٹرانسپورٹ کے اخراجات میں کئی گنا اضافے کا بوجھ برداشت کرنا پڑا۔ اس اقدام نے مزدور پیشہ شہریوں کو شہر کی سماجی اور ثقافتی زندگی میں شامل ہونے کے موقعے سے بھی محروم کر دیا۔ اس بڑے طبقے کی معاشرتی محرومی اور مالدار طبقے کی رنگین دنیا کا تفاوت حکمرانوں کی اسی ذہنی معذوری کا خوفناک نتیجہ ہے کہ وہ منصوبہ سازی کو اس کے مادی پہلو سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتے۔

۱۹۵۰ کے عشرے کے اواخر سے کے ڈی اے کے منصوبہ ساز ایسی گفتگو میں جدید شہری اصطلاحات استعمال کرنے لگے تھے، تاہم ۱۹۶۹ میں کراچی ماسٹر پلان ڈپارٹمنٹ کے قیام کے بعد ہی یہ ممکن ہوا کہ ترقی اور نشوونما کے مختلف پہلوؤں کو شہر کے ایک مجموعی منصوبے میں سمویا جائے۔ اس پلان میں آخر کار شہر کو سڑکوں کا ایک منطقی نقشہ دیا گیا، اگرچہ اس نقشے کا بیشتر حصہ ابھی تک صرف کاغذ پر وجود رکھتا ہے۔ تاہم کے ڈی اے دیگر شہری مسائل پر ایسے مطالعات کو قابلِ عمل منصوبوں کی شکل دینے میں ناکام رہا۔ یہی وجہ ہے کہ کے ڈی اے کی نئی رہائشی اسکیمیں اب بھی شہر کو مضافات سے ملانے والی بڑی سڑکوں کے ساتھ ساتھ قائم کی جا رہی ہیں۔ اس پالیسی کے باعث ان سڑکوں کے آس پاس تجارتی سرگرمیوں میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے جس سے ٹریفک کے بہاؤ میں رکاوٹ بڑھ جاتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ اسکیمیں شہر کے ارد گرد کے دیہی علاقوں کو اندھادھند ہڑپ کرتی جا رہی ہیں۔ مختلف سیکٹروں کے درمیان کھلے دیہی علاقوں کے بفر زون اب بھی نہیں رکھے جاتے، جس کے باعث ٹریفک کی زیادتی اور آلودگی کا شکار، بے ساخت شہری انتشار ہر طرف پھیلتا جا رہا ہے۔ نیو کراچی کا بفر زون، جسے اسی مقصد کے لیے رکھا گیا تھا، شہر کے انتہائی گنجان مضافات میں شامل ہو کر رہ گیا ہے۔

زمین کی سرمایہ کاری کرنے والوں کی سیاسی طاقت کے باعث زمین کی قدر کا تخمینہ صرف مالی اعتبار سے لگایا جاتا ہے جس سے زمین کا موثر اور منصوبہ بند استعمال ناممکن ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم شہر کی دو مصروف ترین سڑکوں کے مقامِ اتصال پر سات سو بستروں کا ایک اسپتال تعمیر ہوتا دیکھتے ہیں۔ اس سے شہر کے لیے جو ماحولیاتی مسائل پیدا ہوں گے اُن کی معلوم ہوتا ہے کہ کسی کو پروا نہیں ہے۔ اسی طرح ایم اے جناح روڈ اور شارعِ فیصل کے درمیان صدر سے متصل لائنز ایریا کے ری ڈویلپمنٹ پروجیکٹ نے اس کم گنجان رہائشی علاقے کو، جو پہلے ٹریفک میں اضافہ نہیں کرتا تھا، اب بے تحاشا ٹریفک والا علاقہ بنا دیا ہے، اور اس کے اثرات نہ صرف ارد گرد کی بڑی سڑکوں پر پڑے ہیں بلکہ شہر کے بیشتر حصوں میں ٹریفک کے بہاؤ میں محسوس کیے جا سکتے ہیں۔

کراچی میں آج بھی تمام منصوبہ سازی گاڑیوں کی سہولت کو مدِ نظر رکھ کر کی جاتی ہے۔ سڑکوں کو گاڑیوں اور پیدل چلنے والوں میں تقسیم کرنے کا تصور کبھی استعمال نہیں کیا گیا۔ جہاں یہ سڑکیں غیر محفوظ ہیں اور بچوں کو اسکول لانے لے جانے اور روزمرہ کا سودا سلف خریدنے کے لیے لوگوں کو

مصروف سڑکوں کے ٹریفک کی زد میں چلنا پڑتا ہے۔ گاڑیوں کی سہولت کو مقدم رکھنے والی یہ منصوبہ سازی کم آمدنی والے ان علاقوں میں بھی برقرار رکھی جاتی ہے جہاں گاڑیاں بہت کم تعداد میں ہیں۔ ان علاقوں کی گلیاں سڑکوں میں تبدیل ہوتے ہی غیر محفوظ ہو جاتی ہیں اور گلی کے باشندوں کے سماجی میل ملاپ میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔

مرکزِ شہر ٹریفک کے شدید مسائل کا شکار ہے۔ وہاں کی سڑکیں اس ٹریفک کا دباو برداشت کرنے کی سکت رکھتی ہیں لیکن ان پر کی جانے والی پارکنگ اور پارکنگ کی تلاش میں گھومنے والی گاڑیوں نے ان کی افادیت ستر فیصد کم کر دی ہے۔ یہ مسئلہ شہر کے تجارتی اور کاروباری علاقوں میں مسلسل جاری تعمیراتی سرگرمیوں کے باعث اور زیادہ سنگین ہو گیا جہاں ۵۳ کثیر منزلہ آفس اور شاپنگ پلازا زیرِ تعمیر ہیں۔ ان عمارتوں سے مرکزِ شہر میں دو ہزار گاڑیوں کا اضافہ ہو گا، جبکہ ان میں رکھی جانے والی پارکنگ کی گنجائش کے ڈی اے کے ضوابط کے حساب سے بہت کم ہے۔ پارکنگ کے لیے رکھی جانے والی یہ جگہ بھی اکثر، ایک تحقیق کے مطابق، تکمیل کے بعد دکانوں اور گوداموں میں تبدیل کر دی جاتی ہے۔

یہ انتہائی ضروری ہے کہ سڑکوں پر پارکنگ کا خاتمہ کیا جائے اور بلدیاتی ادارے تمام تر ممکنہ زمین کو پارکنگ کے لیے حاصل کریں۔ علاوہ ازیں، شہر کے مرکزی علاقوں میں مزید تعمیر کی حوصلہ شکنی کی جانی چاہیے، اور سڑکوں پر ٹریفک کے دباو کو کم کرنے کے لیے ایک تیز رفتار ٹرانسپورٹ سسٹم قائم کیا جانا چاہیے۔ یہ سسٹم تعمیر اور دیکھ بھال کے لحاظ سے آسان اور شہریوں کی مالی استطاعت کے اعتبار سے ارزاں ہونا چاہیے۔ اس کے لیے ضروری ہو گا کہ کسی بے حد ترقی یافتہ اور پیچیدہ سسٹم کے بجائے سادہ اور کم ترقی یافتہ سسٹم کا انتخاب کیا جائے۔

شہر کی سرحدوں پر کچی آبادیوں میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ کم آمدنی والے شہریوں کو رہائشی سہولتیں فراہم کرنے والے اس غیر رسمی سیکٹر کو شہر کے ماسٹر پلان میں کوئی جگہ نہیں دی گئی ہے۔ کچی آبادیوں کا پھیلاو جاری رہے گا، کیوں کہ شہر کے غریب باشندے منصوبہ بند علاقوں کی پانی، نکاسی اور سڑکوں کی سہولتوں کی اونچی قیمت ادا نہیں کر سکتے۔ یہ طریقہ قابلِ عمل ہو سکتا ہے کہ منصوبہ بند علاقوں میں اس طبقے کے لوگوں کو زمین ان سہولتوں کے بغیر فراہم کی جائے اور ان سہولتوں کی مرحلہ وار تکمیل کا کام خود اُن کے سپرد کر دیا جائے۔ اس کی ایک عملی مثال ادارہ ترقیات حیدرآباد (HDA) نے خدا کی بستی نامی رہائشی منصوبہ قائم کر کے فراہم کر دی ہے۔ کراچی کے بلدیاتی ادارے ایسی تنظیمیں قائم کر سکتے ہیں جو اس کام میں ان لوگوں کی مدد کریں، جیسے اورنگی پائلٹ پروجیکٹ (OPP) نے اورنگی کے ایک بڑے علاقے کے رہنے والوں کو ان کاموں کی تکمیل کے لیے تکنیکی امداد فراہم کی ہے اور ان شہریوں نے نکاسی کا پورا نظام اپنے ہاتھوں سے اور اپنے خرچ پر تعمیر کیا ہے۔ ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ اس کام کی لاگت سرکاری کام کی مروجہ لاگت کے ساتویں حصے کے برابر آئی ہے۔

کراچی کے شہری مسائل کا حل تنہا پیشہ ور ماہرین اور بلدیاتی اداروں کے منصوبہ سازوں کے بس کی

بات نہیں ہے۔ منصوبہ سازوں کو اپنے اداروں پر پڑنے والے شدید سیاسی دباؤ کی شکایت ہے جس کے باعث منصوبہ سازی کا پورا عمل مذاق بن کر رہ جاتا ہے۔ یہ مسائل صرف قانون سازی سے بھی حل نہیں ہو سکتے۔ موثر تبدیلی صرف تب لائی جا سکتی ہے جب کراچی کے شہری ایک طرف حکام کو اپنے نقطۂ نظر کا قائل کرنے کی منظم کوشش کریں، دوسری طرف بلدیاتی اداروں پر سیاسی دباؤ ڈالیں، اور تیسری طرف ایسے میں صارفانہ شعور پیدا کر کے پرائیویٹ سیکٹر کے ڈویلپرز کے ہتھکنڈوں کا کامیابی سے مقابلہ کریں۔ اس سیاسی عمل اور صارفانہ شعور کے ساتھ قائم کیے جانے والے اداروں کے بغیر کسی تبدیلی کا آنا ناممکن ہے اور ہمارے شہر کا پھیلاؤ ہمارے معاشرے کی خرابیوں کو منعکس کرتا رہے گا۔

***

ماحولیاتی تنزل

پاکستانی شہروں کے وہ تمام علاقے جہاں - سارے شہری تعمیراتی ورثے کے نمونے واقع ہیں، شدید ماحولیاتی تنزل اور طبعی شکست و ریخت سے دوچار ہیں، چناں چہ ان علاقوں کو محفوظ کرنے کے اقدامات کی ضرورت محسوس کی جانے لگی ہے۔ تاہم، اس تنزل کا سبب محض ان الگ الگ علاقوں کے حالات نہیں، بلکہ پچھلے چار عشروں کے عرصے میں ملکی سطح پر وضع اور نافذ کی جانے والی ترقیاتی پالیسیاں ہیں۔ لہٰذا ان علاقوں کو محفوظ کرنے کا کوئی قابلِ عمل منصوبہ تیار کرنے کے لیے نہ صرف یہاں کے حالات کا جائزہ لینا اور ان حالات کے اسباب جاننا ضروری ہے بلکہ ماحولیاتی تنزل کے اس عمل کی نوعیت کو سمجھنا بھی اتنا ہی ضروری ہے، کیوں کہ ایسے کسی منصوبے کے سلسلے میں اٹھنے والے دشوار سوالوں کا جواب اسی عمل میں پوشیدہ ہے۔

۱۹۵۰ اور ۱۹۶۰ کے عشروں میں پاکستانی حکومت نے دو بڑے فیصلے کیے جنھوں نے اس ملک کی انسانی آبادیوں ــــ دیہات، قصبوں اور شہروں ــــ میں گہری اور دوررس تبدیلیاں پیدا کیں۔ پہلا فیصلہ زرعی پیداوار میں سبز انقلاب (Green Revolution) کی ٹیکنولوجی کو متعارف کرانے کا اور دوسرا فیصلہ ملک کو صنعتی طور پر ترقی دینے کا تھا۔ ان کلیدی فیصلوں کے نتیجے میں ملک میں شہری آبادی کا تناسب بہت تیزی سے بڑھا اور دیہات اور شہروں کے درمیان، اور بیرونی ملکوں کے ساتھ تجارت میں نمایاں اضافہ ہوا۔ اس کا ایک اور نتیجہ میکانیکی ٹرانسپورٹ کا فروغ تھا جس کی مالی اور تکنیکی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے رسمی اور غیررسمی سروس سیکٹر وجود میں آیا۔ تاہم، ان تمام تبدیلیوں کو دیکھتے ہوئے مارکیٹوں، گوداموں اور ٹرانسپورٹ کے ٹرمینلوں کی تعداد میں اس قدر اضافہ نہیں ہوا اور نہ مواصلات کا جدید انفرااسٹرکچر قائم کیا گیا۔ چناں چہ ان تبدیلیوں سے پیدا ہونے والی تجارتی سرگرمیوں

کے پھیلاو کو جگہ دینے کے لیے شہروں کے مرکزی حصوں میں واقع منڈیاں اور ٹرمینل بے تحاشا پھیل گئے۔ اس پھیلاو نے شہروں کے پرانے رہائشی علاقوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا جن میں اہم ثقافتی، مذہبی اور دوسرے ادارے واقع تھے۔ شہروں کے یہ مرکزی علاقے دیہات سے شہروں کی طرف بڑی تعداد میں نقل مکانی کرنے والوں کو روزگار فراہم کرنے کی جگہوں میں تبدیل ہو گئے۔ یہ مرکزی علاقے اپنی اصل ساخت اور سہولتوں کے اعتبار سے ان سرگرمیوں کے لیے موزوں نہ تھے۔ نتیجے میں ایک طبعی انتشار، سماجی افراتفری اور انتظامی بے بسی نے جنم لیا۔ ان سرگرمیوں کی شدت کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۶۰ کے عشرے میں صرف پنجاب میں ۳۶۰ کروڑ روپے کا سرمایہ دیہات سے شہروں کو منتقل ہوا۔

اس صورت حال کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ماحولیاتی تنزل کے دباو سے پرانے شہر میں رہنے والے اونچے طبقے کے لوگ ان علاقوں سے اُٹھ کر مضافات میں نئی بنائی جانے والی ہاؤسنگ سوسائٹیوں میں منتقل ہو گئے جہاں، پرانے شہر کے برعکس، ان کی تازہ یافتہ گاڑیوں کی آمدورفت کی بھی گنجائش موجود تھی۔ شہروں کے پرانے مرکزی علاقوں میں رہنا فرسودہ سمجھا جانے لگا، اور رفتہ رفتہ ان علاقوں میں جانا بھی، وہاں کے شوروغوغا، ہنگامے، آلودگی اور عامیانہ کلچر کے باعث، ایک ناخوشگوار تجربہ بن گیا۔

ان علاقوں سے ممتاز لوگوں کے چلے جانے کا مطلب یہ تھا کہ پرانے شہر سے سیاسی طاقت بھی رخصت ہو گئی چناں چہ اسی اعتبار سے انتظامیہ اور شہری اداروں نے شہروں کے قدیم مرکزی حصوں کو اہمیت دینا چھوڑ دیا۔ ان کے چلے جانے سے ان علاقوں میں رہنے والوں کا سماجی اتحاد بھی کمزور پڑ گیا اور ثقافتی، مذہبی اور دوسرے اداروں کا کوئی سرپرست نہ رہا۔ ان اداروں کی عمارتوں اور روایتی سہولتوں کی دیکھ بھال کرنا اور انھیں چلانا پرانے شہر کے تیزی سے کم ہوتے ہوئے وسائل کے پیش نظر دشوار ہوتا گیا۔ ان میں سے بہت سی عمارتوں کو مسمار کر کے ان کی جگہ مارکیٹیں اور گودام تعمیر کر لیے گئے ہیں اور باقی ماندہ عمارتیں بھی اسی انجام کی منتظر ہیں۔

پاکستان کے شہری تعمیراتی ورثے کے ان نمونوں کو محفوظ کرنے کا کوئی بھی منصوبہ ان قدیم مرکزی علاقوں میں ماحولیاتی بہتری پیدا کیے بغیر قابلِ عمل نہیں ہو گا ـــ اور یہ بہتری ماحولیاتی تنزل کے اسباب کو دور کیے بغیر ناممکن ہے۔ چناں چہ یہ مقصد صرف شہر یا شہروں کی سطح پر کی جانے والی منصوبہ بندی ہی کے ذریعے پورا ہو سکتا ہے جس میں کاروباری سرگرمیوں کے لیے شہر کے کسی اَور حصے میں متبادل جگہ فراہم کی جائے، ٹریفک کے بہاو کو نئے طریقے سے منظم کیا جائے اور ٹرانسپورٹ کے ٹرمینل کسی دوسری جگہ بنائے جائیں۔ بیش تر صورتوں میں یہ اقدامات بےحد دشوار، تقریباً ناممکن، ہوں گے اور اس کا سبب محض مالی اور انتظامی دقتیں نہیں بلکہ طاقت ور لابیوں اور مافیاؤں کی طرف سے سخت مخالفت بھی ہو گی جن کے سیاسی اور مالی مفادات کو ان اقدامات سے بڑی زک پہنچے گی۔

شہروں کے ان قدیم مرکزی علاقوں کو محفوظ کرنے کا فیصلہ اور اس کے لیے موزوں قوانین کی

تیاری، عام خیال کے برعکس، ایک سیاسی فیصلہ ہوگا۔ اس کی کامیابی ان لابیوں کی طاقت پر منحصر ہے جو ان علاقوں کو محفوظ کرنا چاہتی ہیں۔ یہ فیصلہ صرف اسی صورت میں کیا جائے گا اگر یہ لابیاں انتظامی اور قانون ساز اداروں کو اپنے نقطہ نظر کا قائل کر سکیں۔ ان اداروں کے قائل ہونے کا انحصار اس پر ہوگا کہ ان کی ترقیاتی ترجیحات کس طرح کی ہیں، فیصلہ کرنے والے افراد کا تعلیمی اور طبقاتی پس منظر کیا ہے اور قرض اور امداد دینے والے بین الاقوامی ادارے ان پر کس حد تک دباؤ ڈالتے ہیں۔ آج کل یہ موخرالذکر عنصر بھی بہت اہمیت رکھتا ہے کیوں کہ تیسری دنیا کے ملکوں کے ترقیات سے متعلق فیصلوں میں قرض اور امداد دینے والے ادارے زیادہ فعال کردار ادا کرنے لگے ہیں۔

کسی مخصوص شہر کے مخصوص علاقے کو ماحولیاتی طور پر بہتر بنانے اور محفوظ کرنے کا تفصیلی منصوبہ تیار کرنا اور اسے نافذ کرنا مقامی سطح کا تکنیکی عمل ہوگا۔ اگر شہروں کے پیشہ ور ماہرین اور بلدیاتی اداروں میں سیاسی عزم اور تکنیکی مہارت موجود ہو تو وہ رفتہ رفتہ اس عمل کو سرانجام دینے کے قابل ہو سکیں گے۔ البتہ شہروں کے قدیم مرکزی علاقوں کو محفوظ کرنے کے فیصلے کو وسیع تر اقتصادی اور معاشرتی حقائق سے مربوط کرنا، اس فیصلے کے طبعی اور سماجی اثرات کا احتیاط سے اندازہ لگانا اور ان تبدیلیوں کو سہارا دینے کے لیے موزوں ادارے قائم کرنا اس سے کہیں زیادہ دشوار اور پیچیدہ عمل ہوگا۔ اور اس قسم کے تقریباً تمام منصوبے اسی مقام پر پہنچ کر ناکام ہو جاتے ہیں۔ اس ناکامی کا بنیادی سبب یہی ہے کہ تعمیراتی ورثے کو محفوظ کرنے کے عمل کو ہمہ گیر صوبائی اور شہری منصوبہ بندی کے تناظر میں نہیں دیکھا جاتا۔

پاکستان کے دوسرے شہروں کی طرح کراچی میں بھی شہری منصوبہ بندی مکمل طور پر بیوروکریسی کے ہاتھ میں ہے۔ عوام، یا محلے یا بلدیات کی سطح پر ان کے نمائندے، اس سلسلے میں کوئی اختیار نہیں رکھتے۔ دوسری طرف معاشی اور سیاسی مفادات رکھنے والی طاقتور لابیاں شہر میں سرگرم دکھائی دیتی ہیں۔ یہ لابیاں نہ صرف منصوبہ بندی کے عمل پر اثرانداز ہوتی ہیں بلکہ کسی منصوبے کے ایسے اجزا کو نافذ ہونے سے روکنے کی بھی طاقت رکھتی ہیں جو ان کے فائدے میں نہ ہوں۔

کراچی شہر میں سرگرم ایک رسمی لابی رسمی سیکٹر کے ڈویلپروں پر مشتمل ہے۔ اس کا بنیادی مقصد شہر کے مرکزی علاقوں میں زمین اور جائیداد کی قیمتیں اونچی رکھنا ہے کیوں کہ ان میں سے بہت سی زمینیں اور جائیدادیں انہیں کی ملکیت ہیں۔ یہ لابی شہری زمین کے استعمال (land use) اور رہائشی مکانوں کے لیے دیے جانے والے قرضوں سے متعلق پالیسیوں پر بھی اثر ڈالتی ہے۔ صدر اور دوسرے مرکزی علاقوں پر سے تجارتی دباؤ کم کرنے اور ان علاقوں کو محفوظ کرنے کے کسی بھی منصوبے کی ناکامی ان کے مفاد میں ہے۔

دوسری لابی غیر رسمی سیکٹر سے تعلق رکھنے والے ان لوگوں کی ہے جو زمین پر غیر قانونی قبضہ

کرتے ہیں۔ شہر کے اکثر ترقیاتی اداروں سے ان کے قریبی، گو غیرقانونی، تعلقات ہیں۔ ترقیاتی منصوبے عوام کو معلوم ہونے سے پہلے ان کے علم میں آجاتے ہیں اور یہ اپنی حکمت عملی پہلے سے وضع کر لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر، جب شہر میں شمالی اور جنوبی بائی پاس تعمیر کرنے کا منصوبہ تیار کیا گیا تو انھوں نے ان مجوّزہ سڑکوں کے آس پاس کی زمین پر پہلے ہی سے قبضہ کر لیا۔

تیسری طاقت ور لابی ٹرانسپورٹروں کی ہے۔ یہ بات عام طور پر معلوم ہے کہ بسوں کے روٹ، بس اسٹاپ اور کرائے انھیں کی مرضی کے مطابق متعین کیے جاتے ہیں۔ شہر کے اہم منافع بخش راستوں پر سرکاری بسوں کی سہولت ان کے دباو پر ختم کی گئی ہے۔ انھوں نے ٹریفک کے قوانین اور ٹریفک کے بندوبست کی سرکاری کوششوں کو مذاق سا کر رکھ دیا ہے۔

اسی طرح تاجروں اور دکان داروں کی ایسوسی ایشنیں بھی شہر کی سطح پر تیار کیے جانے والے منصوبوں سے اپنا مفاد وابستہ رکھتی ہیں۔ ماضی میں بعض سڑکوں کو ون وے ٹریفک کے لیے مخصوص کرنے اور بعض پر پارکنگ ممنوع قرار دینے کے فیصلے ان کے دباو پر تبدیل کیے جاتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے صدر کے ٹریفک مینیجمنٹ پلان میں تبدیلیاں کرائی ہیں ــــ اور یہ تبدیلیاں عوامی مفاد میں ہرگز نہیں تھیں۔

لابیوں کے اثرورسوخ سے قطع نظر، کراچی شہر کا تیزرفتار پھیلاو بجائے خود بہت سے مسائل پیدا کر رہا ہے۔ ترقیاتی کام کسی منصوبہ بندی سے پہلے ہی عمل میں آجاتا ہے، اور منصوبے جب تیار بھی کیے جاتے ہیں تو معاشرتی حقائق سے ہم آہنگ نہیں ہوتے اور سرکاری محکموں کی ناکارکردگی کے باعث ان کا نفاذ ناممکن ہوتا ہے۔ ہر کام کے غیررسمی طریقے رائج ہو گئے ہیں جن کے نتیجے میں انتشار، انتظامی بے بسی اور بدعنوانی بڑھتی جا رہی ہے۔ اس ماحول نے ڈرگ مافیا کو شہر کی سب سے بڑی طاقت بنا دیا ہے۔ درحقیقت ڈرگ مافیا شہر کی بیش تر ترقیاتی سرگرمیاں کو اگر براہِ راست کنٹرول نہیں کرتا تو ان سرگرمیوں کو مالی وسائل ضرور فراہم کرتا ہے۔

شہر کے متعدد کاروباری گروہوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے ان کی تنظیمیں موجود ہیں۔ لیکن کراچی میں کوئی عوامی لابی موجود نہیں جو شہر کے مجموعی مفاد کی حفاظت کر سکے اور حکومت کو موزوں ترقیاتی حکمت عملی اختیار کرنے پر آمادہ کر سکے۔ کراچی کے شہریوں کی بڑھتی ہوئی تعداد ایسی لابی کی ضرورت محسوس کر رہی ہے چناں چہ انھوں نے بہت سی غیرسرکاری تنظیمیں (NGOs) قائم کر لی ہیں۔ ان تنظیموں کے پلیٹ فارم سے وہ حکمرانوں کے ساتھ مکالمہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن چند ایک تنظیموں کو چھوڑ کر ایسی بیش تر تنظیموں پر اوپر کے درمیانہ طبقے کا غلبہ ہے جس کا شہر کے کم آمدنی والے عوام سے کوئی رابطہ نہیں۔ علاوہ ازیں، ان تنظیموں کا انحصار عموماً بیرونِ ملک سے آنے والی مالی امداد پر ہے اور یہ ان سرکاری محکموں سے ربط پیدا کرنے میں دشواری محسوس کرتی ہیں جو شہری منصوبہ بندی اور ماحولیاتی بہتری کے ذمے دار ہیں۔

کراچی میٹروپولیٹن کارپوریشن واحد پلیٹ فارم ہے جسے ترقی دے کر موثر عوامی لائی میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ کارپوریشن کی کاؤنسل ۲۳۰ منتخب کاؤنسلروں پر مشتمل ہوتی ہے جن میں سے ہر ایک تقریباً ۴۰ ہزار شہریوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ کاؤنسل کے انتخابات ہر چار سال بعد منعقد ہوتے ہیں اور کاؤنسلروں کو، خصوصاً کم آمدنی والے علاقوں میں، مقامی مسائل کا متواتر سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایسے موقعوں پر ان کا رسمی جواب یہی ہوتا ہے کہ یہ معاملہ کارپوریشن کے اختیار سے باہر ہے۔ بدقسمتی سے یہ بات سچ بھی ہے۔

کراچی کی ترقیاتی منصوبہ بندی مکمل طور پر کے ڈی اے کے ہاتھ میں ہے جو صوبائی حکومت کے ماتحت ایک سرکاری محکمہ ہے۔ اس منصوبہ بندی میں دخل دینے کا کارپوریشن کو کوئی اختیار نہیں۔

کراچی کے بہت سے شہری، خاص طور پر وہ لوگ جو ماحولیاتی تنزل کا شکار ہونے والے علاقوں میں کام کرتے ہیں، اس بات سے متفق ہیں کہ کارپوریشن کو شہری حکومت کا درجہ اور شہری منصوبہ بندی کا اختیار دیا جانا چاہیے۔ عوامی دباؤ کے زیراثر محصولات، امن و امان کے مسائل اور ماحولیاتی تنزل کی صورت حال رفتہ رفتہ قابو میں آ سکتی ہے۔ تاہم، اس کے لیے یہ بھی ضروری ہوگا کہ کارپوریشن کی تکنیکی اور انتظامی صلاحیت کو بہتر بنایا جائے۔ اس کے نتیجے میں غیرسرکاری تنظیموں اور کمیونٹی گروپوں کو بھی موقع ملے گا کہ شہری اور علاقائی منصوبہ بندی کے عمل میں تعمیری کردار ادا کر سکیں ـــ جن کے بغیر شہر کے قدیم مرکزی علاقوں کو مضبوط کرنے کا عمل کامیاب نہیں ہو سکتا۔

**